

# مرزا عبدالقادر بیدل حیات اور کارنامے

(ہندوستانی اسلوب کے عظیم ترین نمایندہ شاعر  
مرزا عبدالقادر بیدل کی حیات اور ان کی تصانیف کا  
تازہ ترین تحقیقات پر مبنی ایک جامع، مستند اور مفصل مطالعہ)

جلد اول  
(حیات)

ڈاکٹر سید احسن الظفر

سابق ریڈر شعبہ فارسی  
لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

رام پور رضا لائبریری، رام پور

## فہرست مضامین

### مضمون

صفحہ

۱۳

۱۷

پیش لفظ : (پروفیسر) شاہ عبدالسلام

اپنی بات : سید احسن الظفر

### باب اول

۲۷

۲۸

۳۱

۳۳

۵۳

۱۰۵۴ھ تا ۱۱۳۳ھ کے دوران ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور ادبی حالات

فنکار کے ماحول کا مطالعہ ضروری کیوں؟

سیاسی حالات

سماجی حالات

ادبی حالات

### باب دوم

۶۳

۶۴

۶۹

۷۰

۷۷

۷۸

بیدل کے حالات زندگی

خاندان بیدل

نام، تخلص اور تاریخ ولادت

بیدل کی جائے پیدائش

نتیجہ

ایک بزرگ کی پیشین گوئی



سلسلہ مہجوعات رام پور رضا لاہوری  
© رام پور رضا لاہوری، رام پور ۲۰۰۹

Name of the Book : ... Aur Karname

Vol-I

Name of Author : Dr. Syed Ahsan Zafar

Edition : 1430AH / 2009AD

Published By : Prof. Shah Abdus Salam

O.S.D, Rampur Raza Library, Rampur

○ ناشر کی پہلے سے اجازت حاصل کیے بغیر، اس کتاب کے کسی بھی حصے کو دوبارہ پیش کرنا، یادداشت کے ذریعے بازیافت کے سسٹم میں اس کو محفوظ کرنا یا برقیاتی، میکانیکی، فوٹو کاپنگ اور ریکارڈنگ کے کسی بھی وسیلے سے اس کی ترسیل کرنا منع ہے۔  
○ اس کتاب کو اس شرط کے ساتھ فروخت کیا جا رہا ہے کہ اسے ناشر کی اجازت کے بغیر، اس شکل کے علاوہ جس میں کہ یہ چھاپی گئی ہے یعنی اس کی موجودہ جلد بندی اور سرورق میں تبدیلی کر کے، تجارت کے طور پر نہ تو مستعار دیا جاسکتا ہے، نہ دوبارہ فروخت کیا جاسکتا ہے، نہ کرایہ پر دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی تلف کیا جاسکتا ہے۔

نام کتاب : مرزا عبدالقادر بیدل: حیات اور کارنامے

(جلد اول [حیات])

نام مصنف : ڈاکٹر سید احسن الظفر

سن اشاعت : ۱۴۳۰ھ / ۲۰۰۹ء

صفحات : ۵۰۴

قیمت : 500/- روپے

مطبع : ڈاکٹر پرنٹرز، نئی دہلی - 9811126868

ناشر : پروفیسر شاہ عبدالسلام

افسر بکار خاص، رام پور رضا لاہوری، رام پور

Rampur Raza Library, Rampur

Phone Library : 0595-2325045, 2327244

0595 - 2325346

Fax : 0595 - 2340546

Website : www.raزالibrary.com

E-mail : osdrampurrazalibrary@gmail.com

رام پور رضا لاہوری

حامد منزل، رام پور - ۲۳۳۹۰۱ (یو. پی.)

۴

تہذیب

میرزا عبدالخالق کی وفات

آغوش مادر میں بیدل کی تربیت

میرزا قلندر کی زیر کفالت بیدل کی مدرسہ میں تعلیم و تربیت

بیدل کی ذہانت کا ایک واقعہ

ترک مکتب کا واقعہ

بیدل کے روحانی اساتذہ

مرزا قلندر

مولانا شیخ کمال قادری

شاہ ملوک

شاہ یکہ آزاد

شاہ فاضل

بیدل کی فوج میں شرکت

مرزا ظریف

بیدل کی مجلس رقص و سرود میں شرکت

شاہ ابوالفیض معانی

بیدل اوڑیسہ میں

شاہ قاسم ہوالہی

خاندوراں محمود کی بیماری کا واقعہ

حکیم طاہر گیلانی کا واقعہ

بیدل کا شمالی ہند کا سفر

دہلی میں شاہ کاہلی سے ملاقات

قلعہ متھرا کا قصہ

بیدل کی شادی

۱۹۹	اعظم شاہ کی خدمت میں ملازمت	۷۸
۲۰۵	مولانا عبدالعزیز سے مشق سخن	۷۹
۲۰۸	ملازمت سے استعفا کا قصہ	۸۲
۲۲۳	خواب میں حضور ﷺ کی زیارت کا واقعہ	۸۲
۲۲۹	اکبر آباد میں ادبی مقابلے کا قصہ	۸۳
۲۳۴	شاہ قاسم ہوالہی کے انتقال کا واقعہ	۸۴
۲۳۷	بیدل کا سفر لاہور و حسن ابدال و کشمیر	۸۸
۲۴۱	ایک قلم تراش کا قصہ	۸۹
۲۴۲	بیدل کی ایک برہمن سے ملاقات اور مسئلہ قیامت پر بحث	۹۳
۲۵۲	بیدل جنوبی ہند میں	۹۷
۲۵۵	بیدل دہلی میں شکر اللہ خاں کی معیت میں	۱۰۵
۲۵۸	متھرا کے گرد بد امنی اور بیدل کی دہلی روانگی کا واقعہ	۱۰۹
۲۶۴	بیدل کی دہلی میں مستقل سکونت	۱۱۵
۲۷۳	بیدل کے احباب	۱۲۶
۲۷۵	سلاطین اور شہزادے	۱۲۹
۲۷۶	اورنگ زیب	۱۳۱
۲۸۲	اعظم شاہ	۱۳۶
۲۸۳	شاہ عالم بہادر شاہ	۱۳۹
۲۸۷	جہاندار شاہ	۱۵۲
۲۸۸	فرخ سیر	۱۵۵
۲۹۲	نواب و امرا	۱۴۵
۲۹۳	عاقل خاں رازی	۱۹۵
۲۹۸	شکر اللہ خاں خاکسار	۱۹۷

دوستی اور اخلاقی پہلو

سماجی پہلو

ادبی پہلو

لطف اللہ خاں مخاطب بشکر اللہ خاں ثانی

میر عنایت اللہ شاہ کرخان

کرم اللہ خاں مخاطب بہ عاقلخان

قیوم خان ندائی

میر عبدالحی

مرزا کامگار خان

امیر الامرا سید حسین علی خاں

سید عبداللہ خاں

نظام الملک

قابل خان نشی

مرزا انصاف خان

مرزا محمد نعیم

مرزا سلیمان

شیخ محمد ماہ

مرزا زین العابدین

نواب ذوالفقار خان

نواب سیف الدین عبدالصمد خان

نواب عزت خان

خان بہادر لعل محمد خان

شعرا و ادبا

عبدالعزیز عزت

۳۰۱

۳۰۶

۳۰۹

۳۱۵

۳۲۰

۳۲۶

۳۲۹

۳۳۲

۳۳۴

۳۳۷

۳۴۱

۳۴۱

۳۵۱

۳۵۲

۳۵۳

۳۵۴

۳۵۵

۳۵۷

۳۵۹

۳۶۰

۳۶۱

۳۶۱

۳۶۳

۳۶۴

ایزد بخش رسا

رفیع خان باذل

میر محمد زمان راج

حاجی اسلم سالم

حکیم الممالک شیخ شہرت حسین شہرت

میر محمد احسن ایچاد

میر عظمت اللہ بنجر

شیر خان لودھی

مرزا محمد امین عرفان

محمد عاشق ہمت

مرزا سہراب رونق

مرزا عباد اللہ و روح اللہ

قاضی عبدالرحیم

مرزا خسرو بیگ

ملادرویش والہ ہروی

منعم خان خاتمان

میر عبدالجلیل بکرامی

میر محمد علی راج

محمد فاضل گجراتی

مرزا احسن ذوالقدر

جعفر زلی

محمد سعید اعجاز

آقا محمد ابراہیم فیضان

خواجہ عبداللہ ساقی

۳۶۸

۳۷۲

۳۷۳

۳۷۴

۳۷۴

۳۷۴

۳۷۶

۳۷۷

۳۷۷

۳۸۱

۳۸۲

۳۸۳

۳۸۶

۳۸۷

۳۸۹

۳۸۹

۳۹۰

۳۹۱

۳۹۱

۳۹۱

۳۹۲

۳۹۲

۳۹۲

۳۹۳



مرزا محمد بقا

شیخ علاء الدین متول

بیدل کے شاگرد

سراج الدین علی خان آرزو

آندرام نخلص

شرف الدین علی پیام

عطاء اللہ عطا

بندرا بن داس خوشگو

میر عبدالصمد خن

سید محمد بن عبدالخلیل

سید مرتضی قانع

احمد عبرت

مرزا پروردار بیک

شیخ سعد اللہ گلشن

حافظ محمد جمال تلاش

شیخ عظمت اللہ کامل

سید محمد اشرف حسرت

شیخ صدر الدین محمد

میر معصوم وجدان

محمد پناہ قابل

شیخ محمد احسن سامع

مغل خان قابل

معنی یاب خان شاعر

۳۹۴

۳۹۴

۳۹۵

۳۹۵

۳۹۶

۳۹۶

۳۹۷

۳۹۷

۳۹۸

۳۹۹

۴۰۰

۴۰۰

۴۰۰

۴۰۱

۴۰۱

۴۰۱

۴۰۱

۴۰۲

۴۰۲

۴۰۳

۴۰۳

۴۰۳

۴۰۳

مہر علی پیکس

ابوالفیض مست

میر رضی وحدت

لالہ حکم چند ندرت

کریم بخش حضوری

سری گوپال تمیز

لالہ سکھ راج سبقت

لالہ شیو رام داس حیا

امانت رام امانت

رامی

شاہ فصیح فصیح

ایجاد عبدالعزیز

ہنرور خان عاقل

بیدل کے رقیب

شاہد

ناصر علی سرہندی

افضل سرخوش

حکیم مرزا نعمت خان عالی

عبدالرحیم

ناظم خان فارغ

غیر شاعر احباب

مرزا ابوالوقار

مرزا محمد معین

۴۰۳

۴۰۳

۴۰۴

۴۰۴

۴۰۴

۴۰۴

۴۰۴

۴۰۴

۴۰۵

۴۰۵

۴۰۵

۴۰۵

۴۰۵

۴۰۶

۴۰۶

۴۰۶

۴۰۹

۴۱۱

۴۱۲

۴۱۳

۴۱۵

۴۱۵

۴۱۵

ملا باقر لیلانی

شیخ غلام محی الدین

مرزا ابوالخیر

مرزا فاضل بیک

بیدل کے اعزہ

بیدل کی شریک حیات

بیدل کا لڑکا عبدالخالق

مرزا روح اللہ و مرزا عباد اللہ

مرزا محمد سعید

حکیم محمد حفیظ خان و حکیم مرزا افضل اللہ

احمد خان

اخلاق بیدل

فقر و استغنا

توبہ و اعساری

حسن خلق

کمالات بیدل

بیدل کا پیشہ

بیدل کا حلیہ

بیدل کی جسمانی طاقت

عصای بیدل

بیدل کے عادت و اطوار

غذا

بیدل کی حقہ کشی

۴۱۶

۴۱۶

۴۱۶

۴۱۷

۴۲۰

۴۲۰

۴۲۳

۴۲۶

۴۲۶

۴۲۶

۴۲۷

۴۲۸

۴۲۸

۴۳۰

۴۳۱

۴۳۵

۴۳۸

۴۴۰

۴۴۱

۴۴۴

۴۴۵

۴۴۵

۴۴۸

موسی بچلوں کا استعمال

روغنیات کا استعمال

موسیقی سے دلچسپی

لباس و پوشاک

بیدل کا اندرونی اضطراب

سادات بارہہ کا واقعہ اور بیدل کا لاہور کو فرار

بیدل کی دہلی واپسی

بیدل کی وفات

بیدل کا مقبرہ

بیدل کا عرس

حاشیہ

کتابیات



## پیش لفظ

ڈاکٹر سید احسن الظفر صاحب (سابق ریڈر، شعبہ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی) کی تصنیف ”مرزا عبدالقادر بیدل - حیات اور کارنامے“ ان کی گزشتہ برسوں کی تحقیق و تفتیش کا ثمرہ اور ایک بلند پایہ علمی، ادبی اور تحقیقی کام ہے۔ مرزا بیدل کا شمار فارسی شاعری کے ہندوستانی اسلوب کے تین عظیم نمائندہ شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان میں مرزا بیدل کو افکار و خیالات کی رنگارنگی و بوللمونی کے لحاظ سے اور اسلوب کی تازگی و بہار ایجاد کے لحاظ سے بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ اردو فارسی کے عظیم اور مشہور ترین شاعر غالب نے اپنی شاعری میں بیدل کی بہار ایجاد سے متاثر ہو کر اس کی پیروی شروع کی، پھر اس کی پیروی جب قیامت سے کسی طرح کم نہیں لگی تو اسے ترک کر دیا مگر بقول حالی خیالات میں بیدیت آخر تک قائم رہی۔ اس طرح اردو داں طبقہ میں غالب نے نہ صرف یہ کہ بیدل کو متعارف کرایا بلکہ ان کو ادھر متوجہ بھی کرایا۔ اسی اہمیت کی بنیاد پر بیدل کی حیات اور شاعری پر بحث کا سلسلہ عرصہ سے جاری ہے۔ اس پر اب تک کے تحقیقی یا سرسری کام کا ایک مختصر جائزہ خود مصنف نے اپنے مقدمہ میں پیش کیا ہے۔ بیدلیات کی متعلق کتابوں میں احسن الظفر صاحب کی یہ کتاب اس لحاظ سے ایک اہم علمی اور تحقیقی کاوش کی حیثیت رکھتی ہے کہ اکثر مقالہ نگاروں اور مصنفوں نے بیدل کی زندگی اور اس کی شاعری اور خیالات کے بہت سے مختلف فیہ اور تحقیق طلب گوشوں کو نشہ چھوڑ دیا تھا۔ مثلاً بیدل کی جائے پیدائش، اعظم شاہ کے دربار میں اس کی مدت ملازمت، دربار سے استعفیٰ کے اسباب، استعفیٰ کے بعد بیدل کی منزل، سفر پنجاب و لاہور، بیدل کی نامردی اور چار شادیوں کا معاملہ، بیدل کی مخصوص وزنی عصا ”نولاسی“، قیامت اور جنت و دوزخ سے متعلق بیدل کے خیالات، سماج کے مختلف طبقوں سے بیدل کے روابط کی نوعیت بیدل کے کلام پر ناقدین کی رائے اور ان کا جواب، بیدل کے دینی، عرفانی، اخلاقی اور سماجی افکار و خیالات کی تحلیل و تجزیہ وغیرہ ان سب اختلافی مسائل اور تشنہ تحقیق موضوعات پر مصنف نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ ان کے علاوہ بیدل کی دو مزید تصانیف ”نصائح پادشاہاں“ اور ”مثنوی سادہ و پرکار“ جن کا ابھی حال میں پتہ چلا ہے، ان کا بھی جائزہ لیا ہے۔ اس طرح یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ بیدلیات کی فہرست میں یہ کتاب ایک اہم اضافہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ اہل علم میں اس کی پذیرائی ہوگی اور اس کاوش کو قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

الحسن الظفر صاحب نے دارالعلوم دیوبند سے فضیلت کے علاوہ لکھنؤ یونیورسٹی سے فارسی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، اس کے بعد ۱۹۷۸ء سے لے کر ۲۰۰۶ء تک شعبہ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ فارسی زبان و ادب میں ان کی مجموعی خدمات پر صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر اے۔ پی۔ جے عبدالکلام نے انہیں پریسی ڈنٹ ایوارڈ سے نوازا۔ ظفر صاحب کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ہندوستان میں رہ کر جدید فارسی زبان و ادب میں مہارت اور تحریر و تقریر میں ایرانی لب و لہجہ میں دسترس حاصل کی چناں چہ ۱۹۷۸ء میں ایک اہم کتاب ”عصری فارسی شاعری اور شعراء“ کے نام سے تصنیف کی جو مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے اور اساتذہ و طلبہ میں کافی مقبول ہوئی۔ اس کے علاوہ امیر خسرو، بیدل، غالب، مولانا جلال الدین رومی، نقتہ، اور غیاث الدین وغیرہ پر بیسیوں مضامین لکھے اور مختلف قومی اور بین الاقوامی سمیناروں میں شرکت کر کے مقالے پڑھے۔ ان کے مقالے زیادہ تر قد قاری دہلی، دانش اسلام آباد، کتاب داری تہران، اینڈ وائر انکا کلکتہ اور رضا لاہوری رام پور کے جزل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس طرح وہ فارسی ادبیات سے متعلق مختلف زبانوں اور مختلف میدانوں میں اپنی مہارت کا ثبوت پیش کرتے رہے ہیں۔

رضا لاہوری رام پور کا شعبہ نشر و اشاعت معتبر اور مشاہیر ادباء شعراء اور محققین کی معیاری کتابوں کو شائع کرتا رہا ہے۔ اسی سلسلے کی یہ کتاب ”مرزا عبدالقادر بیدل: حیات اور کارنامے“ بھی ہے۔ امید ہے کہ فارسی ادبیات سے ذوق و شوق رکھنے والے حضرات میں اس کتاب کی پذیرائی ہوگی اور رضا لاہوری کے اشاعتی پروگرام میں ایک گراں قدر اضافہ ہوگا۔

اس کتاب کی اشاعت کے لیے مہامہ شری بی۔ ایل۔ جوشی چیرمین رام پور رضا لاہوری بورڈ، شری جی پٹنا نیک، پرنسپل سکریٹری گورنر آف اتر پردیش، سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا، شری جواہر سرکار سکریٹری کلچر اور جوائنٹ سکریٹری ڈاکٹر ٹی کمار کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اشاعت کے لیے معقول وسائل فراہم کئے۔ اس کتاب کی اشاعت کے مختلف مراحل میں رضا لاہوری کے لاہوریین ڈاکٹر ابوسعید اصلاحی، جناب عتیق جیلانی، ڈاکٹر عرفان احمد، ڈاکٹر ارشاد احمد نوگانی، مس مؤمنی رانی اور مسز بلقیس فاروقی کے مفید مشورے شامل رہے اس لیے لاہوریین ان حضرات کی ممنون ہے۔

(پروفیسر) شاہ عبدالسلام

افسر کار خاص

رام پور رضا لاہوری، رام پور



ابوالمعالی میرزا عبدالقادر بیدل

(بگھر یہ جناب فائز الرحمن صاحب جنہوں نے افغانستان کے ویب سائٹ سے یہ تصویر حاصل کر کے فراہم کی۔)

## اپنی بات

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

مرزا عبدالقادر بیدل (۱۰۵۴ھ تا ۱۱۳۳ھ ۱۶۴۲ء تا ۱۷۲۰ء) کا شمار ہندوستانی اسلوب کے مشہور نمائندہ اور چوٹی کے شاعروں میں ہوتا ہے جس کا کلام ہندوستان کی سرحدوں کو پار کر کے مرکزی ایشیا کے ممالک افغانستان، ازبکستان، تاجیکستان اور ترکستان حتیٰ کہ مدینہ منورہ تک پہنچ گیا اور اپنے وطن سے کہیں زیادہ ان ملکوں میں مقبول ہوا۔

بیدل کی زندگی، اس کی شاعری اور اس کے افکار و خیالات ایک عرصہ سے ملک و بیرون ملک کے دانشوروں کے درمیان موضوع بحث رہے ہیں۔ مجموعی طور پر ہم ان کو دو گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ایک گروہ مداحوں کا اور دوسرا نقادوں کا۔

اس طرح ہر ایک طبقہ (بہ استثنائے چند) کم و بیش افراط و تفریط کا شکار رہا ہے جیسا کہ اس کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا۔

اس کے مداحوں میں ایک طرح کی خوش فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ اس کو ایک صوفی باصفا اور عارف و خدا شناس سمجھتے ہیں۔ اس کی شخصیت کو بایزید، جنید اور ابو بکر شبلی رحمۃ اللہ علیہم کا ہم پلہ اور اس کے کلام کو سنائی، عطار اور رومی کا ہم رتبہ قرار دیتے ہیں۔ دوسری طرف نقادوں کا ایک طبقہ ہے جو اسے دروغ گو سمجھتا ہے اور اس کے کلام پر تنقید کرتے ہوئے یہاں تک کہہ گیا ہے کہ بیدل نے شاعری کے حسین و جمیل پیکر کو مسخ کر دیا۔

بیدل کے بابت لوگوں کی آراء میں اس افراط و تفریط نے راقم السطور کو اس بات پر آمادہ کیا کہ بیدل کی شخصیت اس کی شاعری اور افکار و خیالات کا دقیق و عمیق مطالعہ کر کے ان کا جامع اور ایماندارانہ جائزہ لیں۔

راقم السطور کی ساری توجہ اس نکتے پر مرکوز رہی ہے کہ بیدل کے بابت تذکرہ نگاروں کے مختلف بیانات، اس پر اب تک لکھی گئی کتابوں اور مقالوں نیز معاصر دانشوروں کی آراء سب کو سامنے

رکھ کر جمیل کے بیانات سے ان کا موازنہ کریں اس کے بعد مستند اور معتبر دلائل پر مبنی نتائج پر پہنچیں۔  
راقم السطور کو اس سلسلے میں کتنی کامیابی ہوئی ہے اس کا فیصلہ قارئین حضرات کریں گے۔

بیدل پر اب تک جو کچھ تحقیقی یا سرسری کام ہوا ہے اس کا ایک مختصر تذکرہ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔

بیدل کا تعارف سب سے پہلے اسد اللہ خاں غالب (۱۷۹۷-۱۸۶۹ء) نے کیا جنہوں نے اپنے اشعار اور خطوط میں کبھی اس کو سراہا اور کبھی گرایا۔ کبھی اس کو ”محیط بی ساحل“ ”قلزم فیض“ ”صاحب جاہ و دستگاہ“ اور ”غیر نادان“ کے بھاری بھر کم القاب و آداب سے نوازا اور کبھی جادہ شناس اور کج رفتار کا خطاب دیا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں ”بیدل کی فارسی کیا“ دوسری جگہ کہتے ہیں ”بیدل کا شعر مجھ کو مزادیتا ہے“۔ کہیں کہتے ہیں ”کمال باہر ہے“ کہیں سند کے طور پر کہتے ہیں ”متاخرین میں سے بھی مرزا عبدالقادر بیدل کہتا ہے“ جو لوگ غالب اور بیدل کا تقابلی مطالعہ کرنا چاہتے تھے ان کے لئے غالب کے یہ متضاد بیانات حیرانی اور ذہنی کشاکش کا باعث ثابت ہوئے ہیں لیکن ایک بات مسلم ہے کہ بیدل کے کلام کی جو گہری چھاپ غالب کے ذہن و دماغ پر پڑی تھی اس کو دور کرنے کے سارے جتن کے باوجود وہ اسے دور نہ کر سکا اور اس کی ”بہار ایجاد“ اس پر چھائی رہی اسی لئے ان کے شاگرد رشید حالی نے لکھا ہے ”خیالات میں بیدلیت آخر تک قائم رہی۔“

اس طرح دیکھا جائے تو غالب پہلا شاعر اور ادیب ہے جس نے اردو فارسی کے دانشوروں کے درمیان بیدل کا تعارف کرایا اور ان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ بیدل کے کلام کی خصوصیات کا بھی مطالعہ کریں۔ یہاں سے بیدل اور غالب کے کلام کے تقابلی مطالعہ کا سلسلہ شروع ہوا اور مشہور ماہر غالبیات عابد علی عابد، پروفیسر حمید احمد خان، نیاز فتح پوری، ڈاکٹر عبدالغنی اور بنگن ناتھ آزاد وغیرہ نے اس پر مقالے لکھے۔ ان کے علاوہ غنی طور پر حالی، شبلی، محمد حسین آزاد، یگانہ چنگیزی، غلام رسول مہر، آل احمد سرور، احتشام حسین، غلیل الرحمن، یوسف حسین خاں، رشید احمد اور قاضی عبدالودود وغیرہ نے بھی اس موضوع پر قلم فرسائی کی۔

غالب کے بعد اقبال نے اپنے اشعار اور ڈائری کے نوٹس کے ذریعہ بیدل کا تعارف کرایا ایک طرف اس کے لئے ”مرشد کامل“ کا لقب اختیار کر کے اس سے اپنی ارادت کا اظہار کیا تو دوسری جانب ڈائری میں بیدل سے اپنی ممنونیت، مسئلہ حیرت پر بیدل کے شعر سے حد درجہ تاثر اور بیدل کے کلام سے سند پیش کرنے کے علاوہ شکر اچاریہ کے بعد بیدل کو سب سے بڑا مفکر قرار دے کر، بیدل کے کلام کا ایک انتخاب تیار کر کے اور نکات بیدل کو پنجاب یونیورسٹی کے نصاب میں شامل کر کے بیدل کی اہمیت کو

اچاگر کیا۔ یہاں سے بیدل و اقبال کے تقابلی مطالعہ کا سلسلہ شروع ہوا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر معز الدین، ڈاکٹر محمد ریاض، پروفیسر عبدالحق اور ڈاکٹر اخلاق احمد آہن وغیرہ نے بیدل و اقبال کا تقابلی مطالعہ کر کے اس پر مقالے لکھے۔

احمد حسن شوکت ایڈیٹر ”شعن“ میرٹھ نے ۱۹۰۵ء میں ”نکات بیدل“ کا اردو ترجمہ ”حل نکات بیدل“ کے عنوان سے کیا۔ غلام لٹین خان نیازی، بقول ڈاکٹر عبدالغنی، پہلے شخص ہیں جنہوں نے بیدل کی زندگی اور اس کی تصانیف پر اپنا مقالہ لکھا جو اورینٹل کالج میگزین لاہور ۱۹۳۲ء میں تین قسطوں میں شائع ہوا۔

نیاز فتح پوری ایڈیٹر ”نگار“ لکھنؤ نے اگرچہ بیدل پر کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی لیکن جو مضامین اپنے رسالہ نگار (۱۹۲۵ء سے ۱۹۶۰ء) کے بارہ شماروں میں شائع کئے اور راقم السطور نے ان سب کو جمع کیا ہے، واضح کرتے ہیں کہ انہوں نے بیدل کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور ان کی بنا پر وہ ہندوستان کے صف اول کے بیدل شناسوں میں ہیں۔ یہ مضامین بیدل کی حیات، شاعری، فلسفہ، ملک کے دانشوروں کی رائے، بیدل پر تحقیق کی نوعیت اور بعض اشعار کی توضیح و تفسیر سے وابستہ ہیں۔

سید سلیمان ندوی سے بیدل کے ہم وطن ہونے کے ناطے توقع تھی کہ وہ بہت کچھ اس پر لکھتے لیکن انہوں نے صرف ایک مضمون ”کیا بیدل عظیم آبادی نہ تھے“ معارف اگست ۱۹۴۷ء میں شائع کیا۔ خواجہ عبداللہ اختر پہلے شخص ہیں جنہوں نے ۱۹۵۲ء میں ”بیدل“ کے عنوان سے اردو میں ایک مستقل کتاب لکھی جس کو ثقافت اسلامیہ لاہور نے شائع کیا، انہوں نے بیدل کے حالات، شاعری خصوصاً تصوف پر تفصیل سے بحث کی ہے اور اس لحاظ سے وہ اہمیت کی حامل ہے۔

مجنوں گورکھپوری کا شمار اردو کے مشہور ادیبوں میں ہوتا ہے انہوں نے ۱۹۵۷ء میں بیدل پر ایک طویل مضمون لکھا جو بڑے سائز کے تقریباً ۲۸ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور مجلہ سوریا سالنامہ ۱۹۵۷ء میں ”پردیسی کے خطوط بیدل کے سلسلے میں“ کے عنوان سے شائع ہوا یہ مقالہ ان کو بیدل شناسوں کی صف اول میں جگہ دیتا ہے اس میں انہوں نے غالب و بیدل کا موازنہ، بیدل کو غالب پر ترجیح، بیدل کی شاعری، شخصیت، اس کے ہم گیر مقام، اس کی حق ناشناسی اور فلسفہ وغیرہ پر بڑی دلچسپ بحث کی ہے۔

ڈاکٹر عبدالغنی لاہور نے بیدل پر ایک مستقل کتاب ۱۹۶۰ء میں Life and Work of Bedil کے عنوان سے انگریزی میں لکھی، یہ درحقیقت ان کے پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جس کو یونائیٹڈ پبشر لبریری لاہور نے شائع کیا۔ میر محمد آصف انصاری نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔ موصوف نے بقول خود اپنی سات سالہ تحقیق کے بعد اسے مکمل کیا۔ ان کا خیال ہے کہ بیدل کا کلام ایک بحر ذار ہے جو آدمی

جنت کھرائی میں اس کی اترے گا اسی قدر قیمتی موتی اس کے ہاتھ لگیں گے۔ پھر بھی تحقیق کی کوئی حد معین نہیں ہے ادھر چالیس سال کے عرصہ میں بہت سی تازہ دریافتیں ہوئی ہیں جن کی اساس پر اس میں حذف و ترمیم کی گنجائش ہے۔ ڈاکٹر عبدالغنی نے کتاب کے علاوہ بیدل پر مضامین بھی لکھے ہیں جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے اور ۱۹۶۸ء میں ان کا مجموعہ ”روح بیدل“ اور ”فیض بیدل“ کے نام سے شائع ہوا۔ سارے مضامین نہایت قابل قدر ہیں۔ اور ان کی بنا پر وہ صف اول کے بیدل شناسوں میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔

ڈاکٹر کاشی ناتھ پنڈتا (کشمیر یونیورسٹی) نے ۱۹۶۲ء میں ”شرح احوال و افکار بیدل عظیم آبادی“ کے عنوان سے پی ایچ ڈی کا ایک مقالہ فارسی میں تہران یونیورسٹی میں لکھا۔ ان کا کہنا ہے کہ دس سال بعد جب میں نے غور کیا تو محسوس ہوا کہ بہت سی باتیں اس میں کہنے کی رہ گئی ہیں اور بیدل کا تعارف جیسا چاہئے تھا نہیں کر اس کا۔

شیخ اکرام نے اپنے کتاب شعر الہم فی الہند میں بیدل کی حیات و شاعری پر مختصر بحث کی ہے، ان کا خیال ہے کہ بیدل کی کشف و کرامات اور تعویذ گنڈے کے ماحول میں پرورش ہوئی اس لئے انہوں نے دور از ذہن دقیق و باریک افکار و خیالات کو عارفانہ تاویلات و توجیہات کے ساتھ پیش کیا اور اپنے عہد کے خیال آفرین اور مضمون بند شاعر کہلائے۔

پروفیسر نور الحسن انصاری مرحوم نے ”فارسی ادب بہ عہد اورنگ زیب“ میں مختصر طور پر بیدل کی حیات اور شاعری سے بحث کی ہے جو ان کی کتاب کا ایک قابل قدر حصہ ہے۔ ظاہر ہے جو آدمی عہد اورنگ زیب کے تمام شاعروں اور ادیبوں کی تمام منشور و منظور تالیفات و تصنیفات کا جائزہ لینے کی ذمہ داری لے گا وہ ہر ایک کے بارے میں ساری معلومات فراہم نہیں کر سکتا۔

پروفیسر نبی ہادی صاحب (علی گڑھ) نے ۱۹۸۱ء میں ”بیدل“ کے عنوان سے ایک کتاب لکھی۔ یہ کتاب سوانح، تنقید اور انتخاب کے عنوان سے تین حصوں پر منقسم ہے۔ انہوں نے بیدل کے حالات اور خیالات پر بحث کے دوران فطری ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا نیز بیدل کی زندگی کے بعض حالات اور ان کے اسلوب نگارش کا مذاق اڑایا ہے جس کی ایک سنجیدہ ادیب سے امید نہیں کی جاتی ہے۔

ان حضرات کے علاوہ پروفیسر امیر حسن عابدی، یعقوب بزی، غلام رسول خاں، شفیق خواجہ، فخر عالم، سید محمد اصغر، عبدالباری آسی، ضمیر علی بدایونی، ڈاکٹر محمد شفیع، اسرار احمد ندوی، شاہ ولی الرحمن، کاکوروی، پروفیسر محمود عالم، شریف حسین قاسمی، شرف عالم، غلام غفور آرزو، علی محمد موذنی، ابوالقاسم رادفر، اسد اللہ حبیب، عبدالخالق راشد، مہوش وحید دولت، نرگس جابری نسب، حسین فقہی، ادلیس احمد، عزیز مجبور،

علی رضا مظفری۔ عطا کا کوئی، پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر سید حسن، کلیم ہسرامی، شوکت علی خاں، محمد صدیق، سمیع الحق، رضوان الحق ندوی، منظور الحسن برکاتی، سید علی حیدر، طلحہ رضوی برق، غلام محسنی اور عطا کریم برق ہیں۔

ان کے علاوہ اور بھی حضرات ہیں جنہوں نے بیدل پر مضامین لکھے جو انٹرنیشنل کانفرنس پٹنہ اور دہلی میں پڑھے گئے۔ یہ مضامین بیدل کی زندگی، اس کی شاعری اور اس کے افکار و خیالات کے کسی ایک پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں۔

ہندوستانی اور پاکستانی دانشوروں کے علاوہ افغانی، ایرانی اور تاجیکی دانشوروں نے بھی بیدل پر اہم کام کئے ہیں۔ ان میں صلاح الدین سلجوقی کی کتاب ”نقد بیدل“ سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ بظاہر یہ کتاب بیدل کے کلام کا تنقیدی مطالعہ ہے لیکن درحقیقت تو صنفی مطالعہ ہے اس کے علاوہ انہوں نے بیدل کے حالات اور اس عہد کی سماجی کیفیت پر صرف ایک صفحہ لکھا ہے جو انتہائی تشنہ ہے۔ استاد خلیل اللہ خلیلی نے ایک کتاب ”فیض قدس“ کے نام سے ۱۹۵۵ء میں لکھ کر شائع کی۔ یہ کتاب بڑے سائز میں ایک سو دو صفحے پر مشتمل ہے اور اس میں زیادہ تر بیدل کے حالات سے بحث کی گئی ہے۔ خلیلی کا سب سے بڑا کارنامہ کلیات بیدل کو چار جلدوں میں ایڈٹ کر کے شائع کرنا ہے اس طرح بیدل کی ساری تصانیف ان کی نظر سے گزر گئی اور تصحیح کی ذمہ داری کی وجہ سے ان کو غور سے پڑھنے کا موقع بھی انہیں ملا۔

پروفیسر غلام حسن مجددی نے ایک کتاب ”بیدل شناسی“ کے عنوان سے دو جلدوں میں لکھ کر کابل یونیورسٹی سے شائع کیا اس میں زیادہ تر ”فیض قدس“، نقد بیدل اور ڈاکٹر عبدالغنی کی کتاب ”احوال و آثار بیدل“ سے ماخوذ اقتباسات ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ بہت سے مضامین بھی افغانستان میں بیدل پر شائع ہوئے جن کو ”سی مقالہ در بارہ بیدل“ کے عنوان سے محمد سرور پاکھر نے ۱۹۸۴ء میں ایک جگہ مرتب کر کے شائع کیا۔ اس کے مضمون نگار قاری عبداللہ، عبدالحی حبیب، محمد ابراہیم خلیل، محمد اسلم خلیل، اسبق، محمد داؤد الحسنی، طاہر بدخشی، عالم شاہی، محمد حیدر ژوبل، سرور گويا، پروفیسر نورانی، شفیعی کدکنی، مولانا خستہ اسد اللہ حبیب، غلام حسن مجددی، رضوان حسین، میر نعمت اللہ حباب، عارف پڑماں وغیرہ ہیں۔ ان سب نے بیدل کی زندگی اور اس کی شاعری کے کسی ایک پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ ان حضرات کے علاوہ محمد عثمان خواجہ، محمد کاظم کاظمی، عبدالعزیز مجبور نے بھی مقالے اور کتابچے لکھے ہیں۔

تاجکستان میں بھی بیدل پر خاصا کام ہوا ہے ایک افغانی دانشور ڈاکٹر اسد اللہ حبیب نے ”بیدل شناسی اتحاد جماہیر شوروی“ کے عنوان سے ایک مقالہ مجلہ ادب کابل دورہ ۲۱ شمارہ ۵، ۶ میں



شائع کیا۔ تاجیکی دانشوروں میں صدرالدین عینی کی کتاب ”بیدل“ اور ان کی صاحبزادی خالدہ عینی کی کتاب ”مثنوی عرفان“ بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ جان رپکا اور ریڈی بچکانے اپنی کتابوں میں ان کے حوالے دیئے ہیں۔ خاکسار نے صدرالدین کی کتاب روسی رسم الخط میں پروفیسر سید حسن مرحوم پٹنہ کے پاس دیکھی تھی اس لئے اس سے استفادہ تو ممکن نہیں ہو سکا۔ ہاں اسد اللہ حبیب نے جو کچھ اس کے بابت لکھا ہے اس سے اندازہ ہوا کہ عینی کو بیدل کے سلسلے میں بہت سی جگہ غلط فہمیاں ہوئی ہیں۔ حال ہی میں عبدالغنی مرزا ایف اور اسلام شاہ محمد اوف اور الیاس نظام الدین اوف نے بھی بیدل پر کتابیں لکھی ہیں مگر ان کا مآخذ عینی کی کتاب ہے۔

ریڈی بچکانے ”ادبیات فارسی در تاجیکستان“ کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جس میں ”بیدل و بیدل گرائی“ کے عنوان سے ایک پوری فصل لکھ ڈالی جس میں تاجیکی دانشوروں کے کام کا ایک جائزہ ہے۔ جان رپکا Jan Rypka نے اپنی کتاب Literary History of Iran میں اس فصل کو قدرے تبدیلی کے ساتھ جوں کا توں نقل کر دیا۔

پروفیسر عبدالغنی مرزا ایف نے ایک مقالہ ”روابط ادبی ماوراء النہر، افغانستان و سند در زمینہ گسترش مکتب ادبی بیدل“ کے عنوان سے لکھا۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں بیدل کی وفات کو ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ اس کی تصانیف سند اور پاکستان کے راستے افغانستان اور وہاں سے ماوراء النہر پہنچیں۔ یہاں کے شاعروں نے جب بیدل کے کلام کا مطالعہ کیا تو اسے اپنے ذوق سے ہماہنگ پا کر فوراً اس کی پیروی شروع کر دی۔ بیدل کا اسلوب اور اس کے عارفانہ افکار و خیالات چونکہ ماوراء النہر شاعروں کے رجحان طبع سے ہماہنگ تھے اس لئے اس کے طرفداروں میں آئے دن اضافہ ہوتا گیا۔

ایران میں بیدل شناسی کا جائزہ مشہور شاعر و ادیب حسن حسینی نے لیا ہے ذیل میں اس کا خلاصہ انہیں کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

”ایران میں بیدل شناسی کا سلسلہ ذرا دیر سے شروع ہوا۔ انقلاب اسلامی سے پہلے ایرانی نقاد بیدل کی شاعری اور اس کے اسلوب کی اکثر مخالفت ہی کرتے تھے اس عہد میں جب کبھی ہندوستانی اسلوب اور اس کے سوقیانہ پن کا تذکرہ کرنا منظور ہوتا تو ازراہ طغر بیدل کا نام بیچ میں ضرور گھسیٹ لیا جاتا۔ درحقیقت اس عہد کے نقاد شبلی نعمانی اور اڈورڈ براؤن کے سر میں سر ملا کر گاتے رہے ہیں۔ البتہ یہ زمانہ خارج آہنگ، نغمے سے یکسر خالی نہیں رہا۔ علی دشتی کے نزدیک ”نگاہی بہ صایب“ میں بیدل صایب کا زبردست رقیب ہے۔

معاصر نقاد، مترجم، اور شاعر ڈاکٹر شفیع کدکنی کے نقطہ نظر سے اس زمانے یعنی ۱۳۳۷/۱۹۶۹ء میں بیدل اور اس کا کلام مجموعی طور پر ان جواں ایرانی شاعروں کے لئے درس عبرت ہے جن کی دیدہ و دانستہ یہ کوشش رہتی ہے کہ اس انداز سے شاعری کریں کہ کسی کے پتے ہی نہ پڑے اور سمجھتے ہیں کہ ابہام اور وہ بھی جھوٹی نوعیت کا دانستہ ابہام ان کے کلام کو پائیدار اور زندہ جاوید کر دے گا اور فارسی زبان کے عظیم شاعروں کی تخلیقات کے دوش بدوش ان کو بھی آنے والی نسل کے لئے محفوظ کر دے گا۔

انقلاب اسلامی کی کامیابی کے بعد بیدل کی شاعری پر دھیرے دھیرے سنجیدگی سے توجہ دی جانے لگی۔ اس سلسلے میں علی معلم پہلا شاعر ہے جس نے اس دور کے جواں شاعروں میں بیدل کے نام کا چرچا کیا۔

بر سخن غالب نہ شد چوں ما معلم تا کسی ریزہ خوار خوان عبدالقادر بیدل نہ شد (معلم کی طرح کوئی شخص شاعری میں کمال حاصل نہ کر سکا جب تک کہ وہ خواں بیدل کا ریزہ خوار (جو ٹٹا کھانے والا) نہیں ہوا۔

معلم ایک ایسا شاعر ہے جس نے اپنی مثنویوں میں بیدل کی سنجیدہ زبان و خیال کا سب سے زیادہ اثر قبول کیا ہے اور چونکہ معلم کا کلام اپنے رزمیہ لہجے کی بنا پر مختلف انداز سے انقلاب اسلامی کے بعد کے اکثر شاعروں پر اثر انداز ہوا ہے اس لئے ایک طرح سے معلم انقلاب اسلامی کے بعد کے شاعروں پر بیدل کی بالواسطہ اثر اندازی کا ذریعہ بنا ہے۔

اس دور کے جواں شاعروں میں یوسف علی میرشاک پہلا شاعر ہے جو معلم سے اپنی والہانہ وابستگی کی وجہ سے بیدل اور اس کے سحر آمیز کلام کا دلدادہ ہوا اس نے ۶۰-۱۳۵۹/۸۲-۱۹۸۱ء میں بیدل کے حالات اور شاعری پر چند مقالے روزنامہ جمہوری اسلامی میں شائع کئے، اس کے بعد بڑی عرق ریزی اور جانفشانی سے غزلیات بیدل کو دو جلدوں میں آفسٹ پر چھپوایا۔ اس طرح ایران میں ادب دوست حضرات کو بیدل کے کلام سے آشنائی حاصل کرنے کے لئے یہ ایک اولین سنجیدہ اور موثر کوشش تھی۔

بیدل کی غزلیات کے مطالعہ کے بعد مضمون نگار (حسن حسینی) نے ”حوزہ اندیشہ و ہنر اسلامی“ کے چند ہفتہ وار جلسوں میں بیدل کی شاعرانہ خصوصیات اور ہندوستانی اسلوب پر گفتگو کی۔ ان گفتگوؤں کے ماحصل کو چند دوسرے مقالوں کے ساتھ ملا کر ایک مستقل کتاب ”بیدل و سپہری و سبک ہندی“ کی شکل دیدی جس میں ہندوستانی اسلوب کی خصوصیات، بیدل کی شاعری اور عصری فارسی شاعری کی ایک شاخ پر اس کے اثرات سے بحث کی گئی ہے۔ ۱۳۶۶/۱۹۸۸ء کے موسم سرما میں بیدل کی چند چیدہ غزلیات اور رباعیات ڈاکٹر شفیع کدکنی۔ جو ایران میں بیدل شناسی کے واقعی ہیرو ہیں۔ کے چند



مقالوں کے ساتھ ”شاعر آئینہ ہا“ کے نام سے شائع ہوئیں۔۔۔ یونیورسٹی کے اساتذہ اور فارسی ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے حلقوں میں اس کا بڑی گرمجوشی سے استقبال ہوا۔

ایران کے بیدل شناسوں میں ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا بھی ہیں۔ انہوں نے تاریخ ادبیات ایران میں چار صفحات بیدل اور اس کی شاعری کے لئے مخصوص کئے ہیں۔ انہوں نے انقلاب سے پہلے عام ایرانی نقادوں کی طرح اس سے بحث کی ہے مگر آخر میں ان الفاظ میں اس کی ستائش بھی کی ہے:

”بیدل کے بابت چاہے جو کچھ کہا جائے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس کے خیالات کی لہروں میں کبھی کبھی صفائی اور پاکیزگی بھی ہوتی ہے جس کو نظر انداز کرنا ایک قسم کی نا انصافی ہوگی۔“

حسن حسینی کی کتاب ”بیدل و سپہری و سبک ہندی“ کا تذکرہ ان کے اپنے مضمون میں گذر چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حسینی ایران میں بیدل کی دفاع کی ذمہ داری نہایت حسن و خوبی سے انجام دے رہے ہیں۔ ڈاکٹر سید علی محمد سجادی نے ”بیدل در دیار بیدلاں“ کے عنوان سے ایک مقالہ مجلہ دانشکدہ ادبیات و علوم انسانی شمارہ ۶ میں شائع کیا بہت اچھا مقالہ ہے اور ایک نا آشنا دوست کی حیثیت سے انہوں نے اپنا مقالہ میرے پاس بھیجنے کی زحمت کی۔ ان حضرات کے علاوہ سعیدی سیرجانی اور خسرو فرشید ورد نے اپنے مضامین میں بیدل کا حوالہ دیا ہے۔

بیدل کے پورچین مفسنین میں الکز نڈر بوزانی واحد شخص ہیں جنہوں نے بیدل کا سنجیدہ مطالعہ کیا ہے۔ انہوں نے کابل یونیورسٹی کے ہال میں بیدل پر تین اہم مقالے پڑھے ”وصف طبیعت در اشعار بیدل“ ”ملاحظات در بارہ ریاض بیدل“ نظریات ایک دانشمند اروپائی در بارہ بیدل“ یہ تینوں مقالے کتاب بیدل شناسی میں شامل ہیں۔

راقم السطور نہایت ایمان داری اور خلوص کے ساتھ اعتراف کرتا ہے کہ اس کتاب کی تیاری میں ان سب کتابوں، مقالوں اور مضامین سے استفادہ کیا ہے اور جا بجا ان کے حوالے دیئے ہیں۔

ان تصانیف کی موجودگی میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ بیدل پر مزید تحقیقی کام کی پھر کیا ضرورت اور اہمیت رہ جاتی ہے اس سلسلے میں عرض ہے کہ تحقیق کی کوئی آخری حد نہیں ہوتی ہے۔ خود بیدل کا یہی نظریہ ہے

ہر کس اینجا از مقام و حال خود گوید خیر

جس کو جتنا مواد مل سکا اور جتنی گہرائی سے بیدل کا مطالعہ کیا ان کی روشنی میں اس نے جو کچھ سمجھا لکھا۔ راقم السطور نے بھی جو کچھ لکھا اس کے بابت یہی خیال ہے کہ وہ میری حد نظر ہے۔ ہو سکتا

ہے آئندہ نسل میں ایسا کوئی دیدہ ور پیدا ہو جو اس حد کو پار کر کے آگے بڑھ جائے۔ ان تخلیقات میں بیدل کی زندگی اور کارناموں کے کسی ایک پہلو پر زیادہ روشنی ڈالی گئی تھی اس لئے ضرورت تھی کہ بیدل کا ایک جامع و مانع مطالعہ کیا جائے جس میں اس کے حالات کے مختلف فیہ مسائل خصوصاً جائے پیدائش، سفر لاہور، اعظم شاہ کے دربار میں ملازمت کی مدت، استعفا کا مسئلہ، مسئلہ قیامت پر بیدل کا نظریہ وغیرہ، سماج کے مختلف طبقات سے اس کے تعلقات اس کی نثری و شعری تصنیفات اور اس کے عرفانی، دینی، اخلاقی، سماجی، سیاسی، علمی و ادبی افکار و خیالات کا وسیع پیمانے پر جائزہ لیا جائے اور ایک مستند مرتع پیش کیا جائے، اس کتاب کے بابت خود کچھ کہنا منہ میاں مٹھو بننے کے برابر ہے البتہ ہندوستان کے مشہور محقق پروفیسر نذیر احمد اور پروفیسر رفیع الدین کی رائے ذیل میں دی جاتی ہیں جس سے اتنی ساری کتابوں اور مقالوں کے درمیان اس کی حیثیت واضح کیے گی۔ پروفیسر نذیر احمد لکھتے ہیں:

”بیدل چونکہ فارسی کا ایک عظیم مشکل پسند شاعر سمجھا جاتا ہے اس لئے بہت کم لوگوں نے اس کے حالات اور تصنیفات کا جامع مطالعہ کیا ہے یہ بات اطمینان بخش ہے کہ احسن الظفر صاحب نے اس شاعر کے سنجیدہ مطالعہ کی ذمہ داری سنبھالی اور ایک گرانقدر اور معیاری مقالہ سپرد قلم کیا۔ شاعر کی زندگی اور کلام سے متعلق دستیاب تمام مواد کو ایک جگہ اکٹھا کیا اور ان کا شاعر کی خود اپنی تصانیف سے حاصل ہونے والی معلومات سے موازنہ کیا۔ بیدل سے متعلق جملہ معلومات کو اکٹھا کر کے ان کا تقابلی مطالعہ کر کے صحیح نتائج پر پہنچے اور بیدل کی حقیقی ادبی حیثیت متعین کرنے میں مصنف نے غیر معمولی کاوش اور صلاحیت کا مظاہرہ کیا اور ایک مشکل موضوع کو نہایت کامیابی کے ساتھ نبھایا، اس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔“

ڈاکٹر رفیع الدین لکھتے ہیں:

”مصنف نے بیدل کے حالات مفصل اور جامع شکل میں پیش کئے ہیں اور اس کی تصانیف کا تنقیدی مطالعہ کیا ہے، جن نتائج پر وہ پہونچا ہے مجموعی طور پر توازن اور انصاف پر مبنی ہیں۔ یہ تعریف مصنف کی نئے حقائق کی دریافت اور معلوم شدہ حقائق کو نئی تعبیر دینے کی صلاحیت پر گواہ ہے۔ اسلوب نگارش بھی بہت دلچسپ اور واضح ہے۔“

آخر میں ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں جنہوں نے اس کتاب کی تیاری میں کسی طرح کا تعاون کیا خصوصاً اپنے شفیق و مخلص استاد و نگراں پروفیسر ولی الحق انصاری کا جنہوں نے اپنی گرانقدر آرا کے ساتھ پوری یکسوئی سے کام کرنے کا موقعہ فراہم کیا اور کئی اہم قلمی اور مطبوعہ نسخے اپنے ذاتی کتب خانہ سے مطالعہ کے لئے عطا کئے، پروفیسر نیر مسعود صاحب کا جنہوں نے کلیات بیدل

مطبوعہ کابل کے علاوہ اپنے ذاتی کتب سے فراخ دلی سے استفادہ کا موقعہ دیا، پروفیسر حکیم الدین قریشی سابق صدر شعبہ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی کا جن کے ذریعہ پروفیسر پنڈتا اور پروفیسر میر حسن شاہ سے تعارف اور تعاون دونوں حاصل ہوا، امتیاز علی خاں عرشی ناظم رضا لائبریری رامپور، نثار احمد صاحب استاد ندوۃ العلماء عزیز دوست ڈاکٹر سید حسن عباس صاحب بنارس یونیورسٹی، محمد حسین رضوی لائبریرین آزاد لائبریری علی گڑھ، اسلم محمود صاحب، محمد ہاشم کاردوش سابق کلچر کونسلر ایرانی سفارتخانہ دہلی کا جنہوں نے بہت سی ادبی اور تنقیدی کتابیں تحفے میں عطا کیں، ڈاکٹر کزبرٹش میوزیم لندن کا جنہوں نے بیاض بیدل کے ایک صفحے کا نوٹو بھیجا۔ ان کے علاوہ قاضی عبدالودود صاحب، پروفیسر عطاء الرحمن عطا کا کوئی صاحب، پروفیسر سید حسن صاحب، پروفیسر حسن عسکری صاحب، پروفیسر امیر حسن عابدی صاحب، پروفیسر فیاض حیدر و جمیل مظہری کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری ہے ان حضرات نے انٹرویو کے دوران قیمتی مشورے کے ساتھ رہنمائی کے فرائض انجام دیئے اور ریسرچ اس کالرز عزیز ی احمد حسن صاحب کا جنہوں نے کپوٹنگ کا بڑا کام انجام دیا۔

آخر میں قارئین سے گزارش ہے کہ راقم السطور شاعر نہیں ہے اس کے باوجود بیدل کے بعض اشعار کا منظوم ترجمہ کرنے کی سعی غیر مشکور کی ہے۔ اس میں شاعرانہ خامیاں اگر نظر آئیں (ضرور نظر آئیں گی) تو ان سے چشم پوشی کی جائے، مقصود صرف مفہوم کا ادا کرنا ہے۔

سید احسن الظفر

لکھنؤ، ۲۰۰۹ء

## باب اول

۱۰۵۴ ہجری تا ۱۱۳۳ ہجری ۱۶۶۴ء تا ۱۷۲۰ء

کے دوران ہندوستان کے سیاسی سماجی اور ادبی حالات

ہستی جز جاگنی و خون خوردن نیست  
از عالم مرگ و عیش جان بردن نیست  
در خلق، برون خلق بودن غلط است  
صحبت با زندگی است، بامردن نیست (بیدل<sup>(۱)</sup>)  
کہتے ہیں جس کو 'ہستی' وہ ہے جاگنی کا نام  
ممکن نہیں بچے کوئی موت و حیات سے  
مخلوق سے فرار نہیں رہ کے ان کے بچ  
صحبت تو زندگی سے ہے، نہ کہ ممات سے

## فنکار کے ماحول کا مطالعہ ضروری کیوں؟

ہر مقامی معنی تغیر مای پرورد  
آب اگر در برگ باشد، سبز و برگل احراست (بیدل)  
ہوتا ہے ہر جگہ کا تقاضا الگ الگ  
پتے پہ قطرہ سبز ہے تو پتھڑی پہ لال  
”ہر فضا مستلزم ہوا نیست و ہر پردہ مقتضای نوائی“ (۲)

ہر فضا کی ایک مخصوص ہوا ہوتی ہے اور ہر راگ کی ایک مخصوص صدا۔

مشہور افغانی دانشور صلاح الدین سلجوقی نے بیدل پر ایک اہم تصنیف ”نقد بیدل“ کے نام سے لکھی ہے۔ یہ گر انقد تصنیف و تحقیق بیدل کے کلام کا تنقیدی مطالعہ (یہ قول شفیعی کدکنی، توصیفی و تعریفی مطالعہ) ہے اس لئے بیدل کے حالات زندگی کے سلسلے میں کوئی قابل ذکر نکتہ اس میں نظر نہیں آتا۔

بیدل کے مزار، ان کے چچا مزار قلند، ماموں مرزا ظریف، بیدل کی جسمانی توانائی، ان کے مخصوص عصا ”نولاسی“، مدح سرائی سے ان کے اجتناب اور اعظم شاہ کی ملازمت سے استعفی وغیرہ سے متعلق انتہائی مختصر معلومات جو تقریباً نیم صفحے پر پھیلی ہوئی ہے، فراہم کرنے کے بعد، ان کے تفصیلی حالات سے پہلو تہی کرنے کا درج ذیل سبب سلجوقی نے بتایا ہے:

”راقم السطور چونکہ مؤرخ نہیں ہے اس لئے کسی عالم، ادیب اور فلسفی کا اس کے کلام کے علاوہ کسی اور جگہ مطالعہ کرنا مجھے گوارا نہیں۔ درج بالا چند کلمے بھی دوسروں کی زبانی نقل کر دئے ہیں تاکہ جن لوگوں نے بیدل کی حیات کے بارے میں دوسروں کی تصانیف کا مطالعہ نہیں کیا ہے ان کو اس کی زندگی کی کم از کم مختصر معلومات تو حاصل ہو جی جائیں، ورنہ جہاں تک میرا تعلق ہے بیدل کے حسب و نسب، حالات زندگی اور ماحول کے مطالعہ کے سلسلے میں ان کا صرف یہ شعر میرے لئے کافی ہے۔

چہ شد اطلس فلکی قبا کہ درید آن مکی ردا  
کہ درین زیانکدہ فنا پی یک دو گز کفن آمدی  
[ہوا کیا ترا فلکی قبا، کیا چاک جس کو ملک نے ہے  
کہ فنا کے اس مقام پہ نہیں کچھ سوائے کفن کے ہے]

بیدل اور مولانا جلال الدین رومی اپنے قلمی، روحانی اور افادی پہلو کے لحاظ سے عظیم ہستیاں تھیں۔ ان کی بزرگی اور عظمت ان کے کلام میں نمایاں ہے۔ ان کے کلمے جڑے تہن و توش، فقر و غنا خورد و نوش، خواب و بیداری، لین دین اور قوم و برادری میں نہیں ہے۔ اس نوع کے واقعات ایک نابغہ عصر آدمی کے پایے کو ایک عام آدمی کے رتبے تک گرا دیتے ہیں۔ جو چیز ان کے امتیاز کا سبب ہے وہ ہے ان کا کلام جو عوام کو بتانا اور سمجھانا چاہئے۔“ (۳)

فاضل مصنف نے بیدل کے سوانح حیات کو قلم بند نہ کرنے کے جو دلائل پیش کئے ہیں وہ خالی از تردید نہیں ہیں کیونکہ سب کو معلوم ہے انسان ماحول کا پیداوار اور اس کا پروردہ ہوتا ہے۔ ماحول کی اثر پذیری سے وہ خود کو کسی طرح بچا نہیں سکتا۔ چنانچہ بیدل کہتا ہے:

ہر مقامی معنی تغیر مای پرورد  
آب اگر در برگ باشد سبز، و برگل احراست

(ہر مقام مخصوص قسم کی تبدیلی کا تقاضا کرتا ہے۔ پانی اگر پتے پر ہو تو سبز اور پھول کی پتھڑی پر ہو تو سرخ نظر آتا ہے) خصوصاً ایک شاعر کی روحانی اور فکری ارتقاء اور اس کے افکار و خیالات کے سوتے کی دریافت منظور ہو تو اس کے تفصیلی حالات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہی بات کہ ایک فلسفی، ادیب اور عالم کا مطالعہ صرف اس کے کلام کے ذریعہ کرنا چاہئے تو بہت ممکن ہے اس کے افکار و خیالات پر بحث کے دوران یہ امر کسی غلط فہمی پر منتہی ہو، کیونکہ بہت سے اشعار مخصوص واقعات کے زیر اثر شعری لباس اختیار کرتے ہیں۔ ایسی شکل میں ضروری ہے کہ ان واقعات کو پیش نظر رکھ کر اس کے کلام کا مطالعہ کریں۔ بیدل عنصر دوم کے آغاز میں لکھتا ہے:

”از آنجملہ وارداتیہ در ضمن بعضی احوال از پردہ تامل ظہور نموده بود، و در ذیل فوائد محسبہ  
از تنقیر بیہوشی چہ وقوع کشود، بہ جلوہ گاہ تحریری آرد، تا مبرہن گردد کہ خیالات بیدلی نیز عالمی  
دارد“ (۴)

یعنی مجملہ ان کے وہ واقعات و واردات ہیں جو بعض حالات کے تحت پردہ تامل سے منصفہ شہود پر رونما ہوئے اور فوائد صحبت کے ذیل میں پردہ بیہوشی سے وقوع پذیر ہوئے، ان کو اس لئے رشتہ تحریر میں لایا تاکہ یہ واضح ہو کہ بیدل کے افکار و خیالات کی اپنی ایک الگ دنیا ہے۔

اسی طرح عنصر چہارم کے آغاز میں لکھتا ہے۔

”درین عنصر، مطرب انجمن تقریر را، بہ انشای رموز بعضی مقامات آہنگ منتخب نوائست۔  
و نقاش صورت خامہ تحریر را، در پردہ از نقوش بعضی احوال، رنگی بگردش ذوق رنگین ادائی۔“

تا گوش اثر اسرار نبش بر مزمع قانون بیدلی بساط تغافل نہ چہند۔ ونگاہ معنی ازین رنگ  
شکستہ بال غبار انحراف نہ بیند۔ (۵)

یعنی اس (چوتھے) عنصر میں انجمن تقریر کے مطرب (بیدل) کو بعض مقامات کے اسرار و رموز لکھ کر ان سے پردہ اٹھانے کا ارادہ ہے اور صورت خامہ تحریر کے نقاش (بیدل) کو بعض حالات کی نقاشی میں رنگین ادائی کے ذوق میں رنگ آمیزی کرنا ہے۔ تاکہ گوش اسرار نبش بیدل کے نغموں پر غفلت کا فرش نہ بچھائے (ان پر توجہ کرے) اور نگاہ معنی آگاہ کو اس شکستہ بال کے رنگ سے انحراف کی گرد نہ دیکھنی پڑے۔

درج بالا دونوں اقتباس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ مختلف قسم کے واقعات و حالات کے زیر اثر، نیز روحانی اساتذہ کی خدمت اور صحبت میں حصول فیض کے دوران، بیدل نے اپنے افکار و خیالات کو نظم کا روپ بخشا۔ اس لئے اس کے افکار و خیالات کو اس کی زندگی ساتھ وہی نسبت ہے جو جان کو جسم کے ساتھ ہے۔

اس بنا پر بیدل کے حسب و نسب، حالات زندگی اور ماحول کی وضاحت بھی اسی درجہ اہم ہے۔ کیونکہ ماحول اور نسلی خصوصیات انسانی زندگی کے دھارے کی تعیین میں دواہم عامل تسلیم کئے گئے ہیں جو فنکار کی شخصیت کی تعمیر اور اس کی معنوی و روحانی ارتقا میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ چنانچہ بیدل ماحول کی اہمیت کے بارے میں ایک جگہ لکھتا ہے:

”تا نسخہ اندیشہ از ہستی رقم تو ہی دارد، باہر زہ سوادان مکتب امتیاز ہم سبق بودن  
ناچار ریت۔ و تا خامہ مومن، از نفس سطر خیالی می نگارد، بہم مشق اطفال این دبستان فرسودن  
بی اختیار۔ در آب افتادہ راہوای دست از خشکی شستن تری فطرت۔ و در آتش نشسته  
راء، دعوی دامن از دور کشیدن داغ جلّت۔“ (۶)

نسخہ فکر کو جب تک ”ہستی“ کی وہی تحریر منظور ہے، مکتب امتیاز کے ”بیہودہ سوادوں“ کا ہم سبق رہنا ناگزیر ہے۔ اور جب تک مومن، کا قلم صفحہ سانس پر سطر خیالی لکھتا رہے گا اس مکتب کے بچوں کے ساتھ مشق و تمرین کا سلسلہ لازم ہے۔ دریا میں غرق آدمی کو خشکی سے دست کشی کی خواہش تری فطرت (خلاف فطرت) ہے اور آگ میں پڑے آدمی کو دور سے دامن کشی کا دعوی ندامت و پشیمانی کا داغ ہے۔

”تا نفس باقیست باید با علائق زیستن“

مشہور ایرانی نقاد مجید یکتائی اپنے ایک مقالہ ”ہنر چیست“ میں فن سے متعلق بعض ادیبوں کی

اے سے استناد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”فنکار کی شخصیت کی تعمیر اپنے ساج اور ماحول سے ہوتی ہے۔ نہ صرف سماجی عوامل بلکہ فطری عوامل جیسے آب و ہوا اور سر زمین کا بھی اس پر اثر ہوتا ہے۔ اور یہ اثر فنکار کے تخلیقی عمل میں مفید ثابت ہوتا ہے۔“ (۷)

مشہور معاصر ایرانی نقاد و ادیب ڈاکٹر پرویز ناطق خاطر کی زندگی کی ذاتی خصوصیات کو فنکار کی تخلیقات کی پرکھ میں اگر چہ موثر نہیں سمجھتے لیکن عظیم شاعروں کو اس اصول سے مستثنی سمجھتے ہیں، لکھتے ہیں:

”یہ صحیح ہے کہ دنیا کے محققین اور ناقدین اکثر بڑے ادیبوں اور شاعروں کی زندگی کی جزئیات کے متعلق بہت زیادہ غور و فکر کرتے ہیں لیکن اس قسم کی تحقیقات کا موقع جب ہے جب ان کے مقام بلند کو عام طور سے تسلیم کیا جاتا ہو۔ شیکسپیر گوئے، ویکٹور ہوگو جیسے ہر ایک ادیب و شاعر کی خصوصی زندگی سے متعلق ہزاروں اوپر کتابیں، رسالے اور مقالے لکھے گئے ہیں۔“ (۸)

اور اس میں شک نہیں کہ بیدل کا شمار بھی عظیم شاعروں کی فہرست میں ہوتا ہے۔

اس باب میں ہم ان سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ادبی حالات کا مختصر جائزہ لیں گے جن میں بیدل نے آنکھ کھولی اور اپنی زندگی کے قیمتی لحاظ گزارے۔

### سیاسی حالات:

ابوالحانی مرزا عبدالقادر بیدل ۱۰۵۴ ہجری ۳۵- ۱۶۴۴ عیسوی میں پیدا ہوئے اور ۱۱۳۳ ہجری ۱۷۲۰ عیسوی میں وفات پائی۔ اس طرح بیدل نے شاہجہاں، اورنگ زیب، شاہ عالم بہادر شاہ، جہاندار شاہ، فرخ سیر اور احمد شاہ رنگیلے چھ مغل سلاطین کے عہد کا نہ صرف یہ کہ آنکھوں سے مشاہدہ کیا بلکہ ان کے عروج و زوال اور بلندی و پستی کے دوران اپنی زندگی کے مختلف ادوار گزارے اور ان کے ساتھ ساتھ ابھرتے ڈوبتے رہے۔

### عہد شاہجہاں:

مشہور مغل بادشاہ محمد شاہاب الدین شاہجہاں ۱۰۳۷ ہجری ۱۶۲۸ء میں تخت پر بیٹھا۔ اس کی تخت نشینی کے ۱۷، ۱۸ سال بعد ۱۰۵۴ ہجری ۳۵- ۱۶۴۴ عیسوی میں بیدل پیدا ہوا۔ اس عرصے میں شاہجہاں نے لگاتار کامیابیوں کی بدولت اپنی حکومت کی اساس مستحکم کر لی تھی۔ اس کے عہد میں پورے ملک میں

آمن و امان کا دور دورہ تھا۔

مشہور چکوسلوواکی مصنف یان رپکا (JAN RYPKA) کا خیال ہے کہ مغلیہ سلطنت کا زوال جہانگیر اور شاہجہاں ہی کے دور سے شروع ہو گیا تھا۔ دونوں نے اکبر کی پالیسی کے خلاف منفی رد عمل کا اظہار کیا۔ خصوصاً شاہجہاں نے اپنے عہد میں تاج محل اور تخت طاؤس کی تعمیر پر بے حساب دولت خرچ کر کے ملک کی معیشت پر کاری ضرب لگائی تھی۔ (۹)

لیکن بیدل نے ۱۰۷۶ ہجری میں شاہجہاں کی وفات پر جو مرثیہ اس کی تعزیت میں کہا ہے وہ بالکل اس کے برعکس تصویر پیش کرتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یاد آن موسم کہ بی وہم بہار و فصل دی داشت مینای فلک جام طرب لبریزی  
اس دور کو یاد کرتا ہوں جب مینائے فلک کا جام طرب موسم بہار کا تصور کئے بغیر شراب سے لبر  
پڑ رہا کرتا تھا۔

انجمن نازاں، چمن خنداں، طراوت گل فشاں شاخ گل رقاص، و بلبل بستہ در منقارنی  
انجمن کشور اپنے حالات پر ناز کرتی تھی، چمن دہر میں ہر طرف مسکان پھیلی رہتی تھی اور ترنہ  
زگی ہر جگہ گل افشانی کرتی تھی، پھول کی شاخ عالم مستی میں رقص کرتی اور بلبل مارے خوشی کے چکا  
کرتی تھی۔

دور سعدی بود و عہد امن و ایام شریف خلق در حمد خدا از عدل شاہ نیک پی  
وہ ایک خوشگوار اور مبارک عہد تھا، ہر طرف امن و امان کا دور دورہ تھا اور نیک دل بادشاہ کے  
عدل و انصاف سے خوش ہو کر عوام خدا کی حمد و ستائش میں لگی رہتی تھی۔

کامران شاہی چو او نگزشتہ در اقلیم دہر کم ترین چاکرانش بادشاہ مصر و ری (۱۰)  
زمانے میں اس جیسا کوئی کامیاب بادشاہ نہیں گزرا، مصر و رے کے سلاطین بھی اس کے کتر  
بن چاکروں کی صف میں جگہ پاتے ہیں۔

یاد رہے کہ بیدل نے یہ اشعار ۱۰۷۶ھ ۱۶۶۵ء میں اس وقت کہے تھے جبکہ وہ بہار، بنگال،  
اڑیسہ اور اتر پردیش کے بعض علاقوں کی سیاحت کرنے اور وہاں کے حالات کا مشاہدہ کرنے کے بعد  
دہلی پہنچا تھا اور دربار تو دور درباری امراء سے بھی اس کا کوئی تعلق قائم نہیں ہوا تھا کہ اس میں خوشامد  
اور تملق کا پہلو نکلے۔ اس لئے ڈاکٹر عبدالغنی کا یہ خیال بجا ہے کہ تاج محل، تخت طاؤس، لال قلعہ اور مسجد  
شاہجہانی کی تعمیر یہ بتاتی ہے کہ عوام عموماً خوشحال تھے اور فراغت سے زندگی بسر کرتے تھے۔ (۱۱)

## جنگ جانشینی اور اورنگ زیب کی تخت نشینی:

شاہجہاں نے اپنے بڑے بیٹے داراشکوہ کو زندگی ہی میں اپنا ولیعہد نامہ مقرر کر دیا تھا۔ یہ امر  
داراشکوہ کے غرور و تکبر اور اس کے دوسرے بھائیوں کے درمیان باہمی نزاع اور حسد کا سبب ثابت ہوا۔  
داراشکوہ خود کو ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک کا واحد حقیقی فرمانروا تصور کرتا تھا اور اپنے منصوبے کو عملی  
جامہ پہنانے کے لئے اپنے بھائیوں کو راستے سے ہٹانا چاہتا تھا۔

شاہجہاں کو اپنے لڑکوں کی اس باہمی کشمکش کا اندازہ ہو گیا تھا اس لئے امن و امان اور صلح و آشتی  
قائم رکھنے کی غرض سے اس نے مختلف صوبہ جات کو شہزادوں میں تقسیم کر دیا؛ بنگال شاہ شجاع کے، دکن  
اورنگ زیب کے اور گجرات مراد بخش کے حوالے ہوئے۔ ۱۰۶۲ ہجری ۵۲-۱۶۵۱ عیسوی میں شاہجہاں کا  
بل میں تھا۔ اس نے وہاں سے مذکورہ شہزادوں کو اپنے متعلقہ صوبہ جانے کی ہدایت کی۔ اورنگ زیب  
اور شاہ شجاع دونوں بھائیوں نے اکبر آباد پہنچ کر آپس میں یہ عہد کیا کہ داراشکوہ کی برادر کش پالیسی کا سختی  
سے مقابلہ کیا جائے اور اسے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا موقع نہ دیا جائے۔

۱۰۶۸ ہجری ۵۷-۱۶۵۸ء میں شاہجہاں جس بول (پیشاب رک جانے) کی بیماری میں  
مرقاہ ہوا تو حکومت کی باگ ڈور مکمل طور پر اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ داراشکوہ نے موقع غنیمت  
سمجھا، دارالسلطنت تک پہنچنے کے سارے راستے اس نے بند کر دیئے لیکن تاکہ شاہجہاں کی بیماری کی  
افواہ رفتہ رفتہ پورے ملک میں پھیل گئی اور ہر جگہ بد امنی اور فساد کا لاوا پھٹ پڑا۔ دکن میں اورنگ زیب،  
جرات میں مراد بخش اور بنگال میں شاہ شجاع نے داراشکوہ کی پالیسی کے خلاف کھلی بغاوت کا اعلان کر  
دیا۔ بہار پر قبضہ کرنے کی خاطر شاہ شجاع پٹنہ تک پہنچا۔ اس علاقہ کے راجہ مہاراجہ اور زمیندار  
شاہجہاں کی بیماری کی خبر سنتے ہی اس کی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کر بیٹھے۔ شاہ شجاع نے  
غیوں کی سرکوبی اور خزانے کی وصولیابی کے لئے اپنی فوج کے بہت سے دستے مختلف مقامات پر  
طمانت کر دئے تھے۔

بیدل نے اپنی خودنوشت سوانح عمری ”چہار عنصر“ میں بھی اس سیاسی اٹھل پھل کا تھوڑا سا نقشہ  
کھینچا ہے۔ لکھتے ہیں:

”سالیکہ شاہ شجاع بن شاہجہاں بیماری پدیدرراستہ مضمون سلطنت اندیشیدہ جنبہ جنونی بی  
تامل بحرم دارالخلافہ دہلی کشید تا پایہ منبر ہوس بختلہ باد بلند گرداند..... مصدیان امور  
جلال از خطہ بنگال تا سرحد ملکہ بہار مگرد آوری خزان فوج جہای گماشتہ و گنیمتی بی شمار  
بہ تحصیل زر و گوہری انباشتہ“ (۱۲)

جس سال شاہ شجاع بن شاہجہاں نے باپ کی بیماری کو مضمون سلطنت کے لئے سکتہ تصور کیا (انتظامیہ کو مفلوج جانا) اور دارالخلافت دہلی (پر قبضہ) کے ارادے سے اپنے جنوں کا زرہ بکتر بے سوچے سمجھے وہاں روانہ کرنا شروع کر دیا تاکہ ”منبر ہوس“ کا پایہ اپنے ہوائی خطبے کے ذریعہ کچھ بلند کرے، شاہی امور کے کارندوں نے بنگال سے لے کر بہار کے مختلف علاقوں تک خزانے کی جمع آوری کے لئے فوجی دستے بٹھادیئے اور سونے چاندی اور جواہرات وغیرہ کے بے شمار گنجھائی گرا نمایا کٹھنے کئے۔

یہاں بیدل کا لہجہ بڑا تلخ بلکہ انتہائی طنز آمیز ہے۔ ”جنوں کا زرہ بکتر“ ”بے سوچے سمجھے“ اور ”منبر ہوس“ وغیرہ الفاظ اور ترکیبات کی تہ میں جو تکی اور تیر و نشتر پوشیدہ ہے وہ بتاتا ہے کہ بیدل تقسیم مملکت کے سلسلے میں شاہجہاں کے فیصلے کو ملک و ملت کے حق میں بہتر اور بجا سمجھتا تھا۔ اور نگزیب چونکہ دوسرے بھائیوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ حوصلہ مند تھا اور داراشکوہ کے لئے در سر ثابت ہو رہا تھا اس لئے شاہجہاں کو اس کی طرف سے بدگمان اور متنفذ کرنے کی غرض سے داراشکوہ نے مختلف بہانوں سے باپ کو اس بات پر راضی کر لیا کہ اپنے رکاب کی ساری فوج اس کے حوالے کر دے۔ شاہجہاں کی زندگی میں پہلے شجاع اور مراد بخش کو راستے سے ہٹا کر دکن کے مہم میں مصروف ہونے کے ارادے سے، داراشکوہ نے شاہجہاں کو اس کی انتہائی سخت بیماری کے عالم میں، دہلی سے اکبر آباد منتقل کر دیا، سلیمان شکوہ کی قیادت میں راجہ جے سنگھ کو شاہی فوج اور اپنی فوج کے ساتھ شاہ شجاع کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔

ادھر شاہ شجاع بنارس پہونچا تھا کہ اس کی مڈھ بھیڑ سلیمان شکوہ سے ہو گئی۔ جنگ میں شکست کا منہ دیکھنے کے بعد شجاع پٹنہ واپس ہو گیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے تخت پر قبضہ کرنے کی سرگرمیاں تیز کر دیں۔

دوسری جانب اورنگ زیب کی پیش قدمی کو روکنے کی خاطر داراشکوہ نے راجہ جسونت سنگھ کی قیادت میں ایک عظیم فوج مالوہ کی طرف، جو دکن کے راستے میں واقع تھا، روانہ کیا اور قاسم خان کی قیادت میں ایک الگ فوجی دستہ راجہ موصوف کے ساتھ اس ہدایت کے ساتھ اجین بھیجا کہ مراد بخش سے حسب مصلحت پیش آئے۔

ادھر اورنگ زیب باپ کی ملاقات کی خاطر اورنگ آباد سے برہانپور روانہ ہوا اور احتیاطاً کچھ ضروری ہتھیار بھی ساتھ لے لئے۔ یکم جمادی الاول ۱۰۶۸ ہجری ۲۵ جنوری ۱۶۵۸ء کو برہانپور پہنچ کر اس نے شاہجہاں کو ایک خط لکھا، لیکن ایک مہینے تک اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ اس کی بیماری کی وحشتناک خبریں لگاتار آ رہی تھیں۔ ادھر داراشکوہ کی حوصلہ افزائی اور تحریک و ترغیب پر جسونت سنگھ مقابلہ کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ ۲۵ جمادی الاول کو اورنگ زیب نے مستقر الخلافت اکبر آباد کا رخ کیا۔ دیبا پور

پار کرتے ہی احمد آباد سے مراد بخش بھی آ کر اس سے مل گیا۔ دھرمات پور کے مقام پر اورنگ زیب اور جسونت سنگھ کے درمیان زبردست جنگ چھڑ گئی جو بالآخر اورنگ زیب کی کامیابی اور جسونت سنگھ کی ناکامی پر ختم ہوئی۔ اورنگ زیب نے دریائے چنبل کو پار کیا تو اسے خبر ملی کہ داراشکوہ دھوپور سے آگے بڑھ رہا ہے۔

اسی سال کے خاتمے پر ۶ رمضان کو الہ آباد سے دس کروہ ”تقریباً بیس میل“ کے فاصلے پر واقع مقام راجپور میں اورنگ زیب اور داراشکوہ کی فوجوں میں گھسان کارن پڑا۔ داراشکوہ کے مشہور سپہ سالار رستم خان، راؤ چھتر سال اور راجہ جے سنگھ راٹھور سب جنگ میں کام آ گئے، پھر بھی داراشکوہ کی فوج بڑی تعداد میں موجود تھی لیکن وہ اتنا خوفزدہ ہو چکا تھا کہ ہاتھی سے اترا اور گھوڑے پر سوار ہو کر فرار کر گیا۔ اس طرح اورنگ زیب کو بہت بڑی کامیابی نصیب ہوئی۔ داراشکوہ ناکام ہو کر لڑکوں اور چند نوکروں سمیت شام کے وقت اکبر آباد پہونچا پھر وہاں سے دہلی کے لئے روانہ ہو گیا۔

اس کے بعد داراشکوہ کے خیمے میں داخل ہو کر اورنگ زیب نے کچھ دیر قیام کیا پھر اکبر آباد روانہ ہوا اور وقوع جنگ پر معذرت سے متعلق ایک خط شاہجہاں کو لکھا۔ شاہجہاں نے اس کا جواب دیا۔ دوسرے دن ”عالگیر“ نام کی ایک تلوار اسے تحفے میں بھیجی۔ اورنگ زیب داراشکوہ کے تعاقب میں دہلی روانہ ہوا۔ وہاں اسے پتہ چلا کہ وہ بھاگ کر لاہور چلا گیا ہے۔ اسی وقت اس نے پنجاب تک اس کا تعاقب کرنے کا فیصلہ کیا۔

نوجویوں سے مشورہ کے بعد یکم ذی قعدہ ۱۰۶۸ ہجری ۲۱ جولائی ۱۶۵۸ء بروز جمعہ دہلی کے پاس ایک مقام ”اغراباد باغ“ میں اورنگ زیب تخت شاہی پر براجمان ہوا اور فوجی سپہ سالاروں اور ارکان دولت کو اس نے انواع و اقسام کے انعامات سے نوازا۔ یہ پہلا جلوس تھا، دیگر مراسم دوسرے جلوس کے لئے ملتوی کر دیے گئے۔

اس اثنا میں اسے خبر ملی کہ بنارس کے پاس شاہ شجاع کو شکست دینے کے بعد سلیمان شکوہ وہاں سے ہردوار کی طرف روانہ ہو گیا ہے اور اب اس کا ارادہ ہے کہ سہارنپور کے راستے اپنے باپ سے جا ملے۔ اورنگ زیب نے اس مہم کو سر کرنے کے لئے شاید خاں کو روگلی کا حکم دیا۔

اسی سال ذی قعدہ کی دوسری تاریخ کو اورنگ زیب داراشکوہ کے تعاقب میں پنجاب کی طرف روانہ ہوا۔ ۱۵ ذی قعدہ کو اسے پتہ چلا کہ جو فوجی دستہ داراشکوہ کے تعاقب کے لئے دریائے ستلج کے کنارے روانہ کیا تھا وہ اسے پار کر چکا ہے۔ لاہور پہنچنے کے بعد داراشکوہ نے بیس ہزار سوار جمع کر لئے تھے۔ اورنگ زیب کی فوج کے دریا پار کرنے کی خبر سنتے ہی اس نے اپنے بیٹے سپہر شکوہ کی قیادت

آیا (۱۳ الف)۔ بیدل نے بھی 'عصر چہارم' میں اس جنگ کے بعض حالات کا تذکرہ اس طرح کیا ہے:

”در عین گیر و دار استقلال، کہ صدای غلغل این لشکر، پای صدمہ بر کوہی افشرد، و قطره ایں سیل، گرد امواج دریا پیش می برد، جاسوسان کمین گاہ عبرت خبر آوردند کہ در سودا و صلاہ آباد، دودریای بیکراں بہم در افتادند و با امواج بی زمینہا برق تیغ و تفنگ، داد و تلام دادند“ (۱۳ ب)

ترہت، میں اس جنگ کے دوران، جس فوجی دستے میں بیدل بھی شریک تھا اور جو شاہ شجاع کی طرف سے مرزا عبداللطیف کی قیادت میں وہاں کے باغی راجاؤں سے برسر پیکار تھا اس کا نقشہ کھینچتے ہوئے بیدل کہتا ہے کہ عین مستقل مزاجی سے معرکہ آرائی کے دوران، جبکہ اس فوجی دستے (جو مرزا عبداللطیف کی قیادت میں لڑ رہا تھا) کے شور و ہنگامے نے پہاڑوں (دشمن کی بھاری فوج) کو نقصان پہونچانا شروع کر دیا تھا اور اس سیلاب کا قطرہ دریا سے لہروں کو اڑائے لئے جارہا تھا، کمین گاہ عبرت کے جاسوسوں نے آ کر یہ خبر دی کہ الہ آباد کے پاس دودریا نے نا پیدا کنار یعنی اورنگ زیب اور شاہ شجاع کی عظیم فوجیں آپس میں بھڑگئیں اور تیغ و تفنگ کی بے پناہ لہروں سے تلامطم کی داد دینے لگی ہیں۔

۴۲ رمضان المبارک ۱۰۶۹ھ ۲۶ مئی ۱۶۵۸ء کو اورنگ زیب نے تمام لوازمات کے ساتھ تخت شاہی پر دوبارہ جلوس کیا اور پچاس سال تک پورے آن بان اور شان و شوکت کے ساتھ ہندوستان کے وسیع و عریض علاقے پر حکومت کی۔ یہاں بھی بیدل کے الفاظ میں تیر و نشتر چھپے ہوئے ہیں۔ لکھتا ہے:

”اورنگ زیب عالمگیر بہ عزم فرماں روائی دہلی سبقت کرد و حقوق خدمت پدر را پیش از دیگران بجا آورد“۔ (۱۳)

دہلی پر فرمانروائی کے ارادے میں اورنگ زیب نے پہل کی اور اس طرح اس نے باپ کی خدمت کا حق دوسرے بھائیوں سے پہلے ادا کیا۔

تیسری جنگ جانشینی اور بہادر شاہ کی تخت نشینی:

پچاس سال، دو ماہ اور بیس دن کی حکومت کے بعد ۱۱۱۸ھ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کی احمد نگر میں وفات ہو گئی۔ دولت آباد (دکن) میں ”شاہ بریان غریب“ کے مقبرہ کے پاس اسے دفن کیا گیا۔ اورنگ زیب کی وفات کے وقت اس کا دوسرا لڑکا محمد معظم عرف شاہ عالم بہادر شاہ کا بل میں تھا اس لئے تیسرا لڑکا اعظم شاہ ارکان دولت کے اتفاق رائے سے ۱۰ اردی الحجہ ۱۱۱۸ھ ۴ مارچ ۱۷۰۷ء کو احمد نگر

میں ایک فوجی دستہ اس کی پیشقدمی کو روکنے کے لئے روانہ کیا۔ ادھر اورنگ زیب نے بھی فوجی کمک روانہ کر دی۔ اس کے مقابلے کی تاب نہ لا کر داراشکوہ لاہور سے ملتان اور وہاں سے بھکر روانہ ہو گیا۔ پریشانی اور بے سروسامانی کے عالم میں اس کے بہت سے نوکر اس سے بچھڑ گئے۔ داراشکوہ کا تعاقب چھوڑ کر اورنگ زیب آہستہ آہستہ مسافت طے کرتا ہوا ملتان پہونچا۔

دوسری جنگ جانشینی:

اس بیچ اسے خبر ملی کہ شاہ شجاع، جس سے اورنگ زیب کے قبل از جلوس خوشگوار اور مخلصانہ تعلقات تھے، بنگال سے روانہ ہو کر جنگ کا ارادہ رکھتا ہے۔ اسی وقت ۳ ربیع الاول ۱۰۶۹ ہجری ۲۰ نومبر ۱۶۵۸ء کو ملتان سے وہ دہلی واپس ہوا۔ شاہ شجاع تب تک بنارس کے آس پاس پہنچ چکا تھا۔ شہزادہ محمد سلطان کو شاہ شجاع کے ہم کوسر کرنے کی ہدایت ملی اور خود سوروں کی شکار گاہ پہنچ کر مزید خبروں کا انتظار کرنے لگا۔ اورنگ زیب خط و کتابت کے ذریعہ شاہ شجاع کے ارادے معلوم کرنا چاہتا تھا۔ لیکن جب قطعی طور پر اسے معلوم ہو گیا کہ خاطر مدارات بے سود ہے، تو بہ ارادہ دفاع سوروں سے آگے بڑھا اور شہزادہ محمد سلطان کو ہدایت کی کہ غلت سے کام نہ لے۔

آخر کار الہ آباد سے پچاس کیلو میٹر پہنچتے ”کھجورہ“ کے مقام پر ۱۹ ربیع الاول ۱۰۶۹ ہجری ۵ ستمبر ۱۶۵۸ء کو فریقین میں محاذ آرائی شروع ہوئی، کچھ توپ خانے آگے بھیج کر شاہ شجاع خود کچھ فاصلے پر ٹھہرا رہا۔ اس کے بعد دونوں کے بیچ میدان کا رزار گرم ہوا۔ رات کے وقت شاہ شجاع نے توپخانے پیچھے ہٹائے۔ لڑائی موقوف ہو گئی۔ آخر شب مہاراجہ جسونت سنگھ نے، جو بظاہر اورنگ زیب کا طرفدار تھا اور درپردہ شاہ شجاع سے ملا ہوا تھا، فرار کا ارادہ کیا اور شاہ شجاع کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ اس طرح اس کی زیر قیادت پوری فوج نے علم بغاوت بلند کر دیا اور شہزادہ کی فوج پر حملہ کر کے اس کے مال و اسباب لوٹ لئے۔ اورنگ زیب اتنا بلند حوصلہ اور باعزم انسان تھا کہ اس کے پائے استقامت میں ذرہ برابر بھی لغزش نہیں آئی۔ اورنگ زیب کی فوج اس وقت اگرچہ دو ہزار سے زیادہ نہیں رہ گئی تھی پھر بھی اس نے ہمت نہیں ہاری اور انتہائی دلیری اور پامردی سے شاہ شجاع کی فوج سے ٹکری۔ معرکہ کا رزار دوبارہ گرم ہوا اور گھمسان کی لڑائی شروع ہو گئی۔ اورنگ زیب خود بھی دلیری اور پامردی سے لڑتا رہا اور فوج کے حوصلے بھی بڑھاتا رہا۔ آخر شاہ شجاع کے پائے استقلال میں لغزش آ گئی اور اس نے فرار کو غنیمت سمجھا۔ شاہ شجاع کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی اور اس کے بہت سے سوار کام آ گئے۔ اورنگ زیب نے شہزادہ محمد سلطان کو شاہ شجاع کے تعاقب میں روانہ کیا اور خود ۲۶ ربیع الآخر تک وہاں ٹھہر کر واپس لوٹ



میں تخت نشین ہوا۔ یہ خبر جب بہادر شاہ کو ملی تو ایک بڑے لشکر کے ساتھ اس نے دہلی کا رخ کیا۔ ملک کو بھائیوں میں تقسیم کرنے اور جنگ سے باز رہنے کے متعلق ایک خط اس نے اعظم شاہ کو بھیجا۔ لیکن یہ تجویز اس نے رد کر دی اور بہارادہ جنگ احمد نگر سے اپنی فوج کے ہمراہ اکبر آباد (آگرہ) کا رخ کیا۔ جب اکبر آباد سے ۱۲ کیلومیٹر پر واقع مقام ”دھوپور“ پہونچا تو دونوں کی فوجیں آپس میں بھڑگئیں۔ اس جنگ میں محمد اعظم شاہ اپنے دو بیٹوں بیدار بخت اور سلطان والا جاہ نیز بہت سے امرا کے ساتھ مارا گیا۔ یہ واقعہ ۱۸ ربیع الاول ۱۱۱۹ھ / ۸ جون ۱۷۰۷ء کو پیش آیا (۱۵)۔ اس واقعے کی پرچھائیں بیدل کے کلام میں اس انداز سے ملتی ہے۔

بو ہم دولت بیدار خواہا دیدند

در آخر اعظم و بیدار بخت خوابیدند (۱۶)

اعظم شاہ اور بیدار بخت ”دولت بیدار“ کا وہی طور پر خواب دیکھ رہے تھے انجام کار دونوں ابدی نیند کی آغوش میں پہونچ گئے۔ یہاں بیدل کا انداز بیان بتاتا ہے کہ وہ شاہ عالم کی جانشینی کے حق میں تھا یا کم از کم اس کی تقسیم مملکت کی تجویز کو مناسب سمجھتا تھا۔

جنگ میں کامیابی کے بعد بہادر شاہ ۱۹ ربیع الاول ۱۱۱۹ھ کو اکبر آباد (آگرہ) میں تخت سلطنت پر بیٹھا اور شاہ عالم کے لقب سے مشہور ہوا۔ اس نے خود اپنی تاریخ جلوس اس طرح نکالی ”ما آفتاب عالمنا بیم“ (۱۱۱۹ھ) اور منعم خان کو ”خان خانات“ کے خطاب کے ساتھ منصب وزارت پر فائز کیا۔ (۱۷)

### کام بخش کا قتل:

شاہ عالم کے چھوٹے بھائی محمد کام بخش نے، جو اورنگ زیب ہی کے عہد سے بیجا پور کا صوبہ دار چلا آ رہا تھا، مکمل طور پر خود کو آزاد اور خود مختار دکھانے کے لئے ۱۷۰۸ء میں سکے اور خطبے میں اپنا نام شامل کر دیا۔ بہادر شاہ، ایک بڑی فوج کے ساتھ کام بخش سے جنگ کے لئے روانہ ہوا۔ جب حیدر آباد کے قریب پہونچا تو کام بخش بھی اپنی فوج کے ساتھ میدان کارزار کی طرف بڑھا، لڑا اور مارا گیا۔ (۱۸)

### چوتھی جنگ جانشینی اور جہاندار شاہ کی تخت نشینی:

۱۷۱۲ھ / ۱۷۱۲ء میں بہادر شاہ کی وفات کے بعد اس کے لڑکوں جہاندار شاہ، اعظم الشان، جہانشاہ اور رفیع الشان میں جانشینی کے لئے ایک بار پھر زبردست جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں ایک طرف

جہاندار شاہ، رفیع الشان اور جہانشاہ تینوں بھائی اور امیر الامراء ذوالفقار خان تھے اور دوسری جانب صرف عظیم الشان تھا جو خود کو مغل تخت و تاج کا واحد وارث سمجھتا تھا۔ یہ دونوں دو مقابل فریق کی حیثیت سے برسر پیکار ہوئے۔ اس جنگ میں عظیم الشان کام آ گیا اور تخت و تاج جہاندار شاہ کے ہاتھ لگا۔ امیر الامراء ذوالفقار خان کی خواہش تھی کہ جہاندار شاہ سب سے بڑے بھائی ہونے کے ناطے تخت نشین ہو، اس لئے تین دن بعد دوبارہ جنگ کے شعلے بھڑکنے لگے۔ رفیع الشان اور جہانشاہ اپنے بیٹے فرخندہ کے ساتھ اس جنگ میں کام آ گیا۔ معز الدین جہاندار شاہ بغیر کسی مزاحمت کے صفر ۱۱۲۳ھ فروری ۱۷۱۲ء میں لاہور میں تخت سلطنت پر متمکن ہوا۔ چند دنوں بعد عظیم الشان کے لڑکے سلطان محمد کریم کو بھی گرفتار کر کے ذوالفقار خان کے حسب وصیت ختم کر دیا گیا۔ (۱۹)

### پانچویں جنگ جانشینی اور عہد فرخ سیر:

لیکن کچھ ہی دنوں بعد بساط سلطنت پر ایک زبردست انقلاب رونما ہوا۔ بہادر شاہ کا لڑکا عظیم الشان، جو عہد عالمگیر سے بنگال کا صوبے دار چلا آ رہا تھا اور کچھ دنوں پٹنہ میں بھی رہ کر اس نے اس شہر کے نظم و نسق اور اس کی استواری و استحکام پر توجہ دی تھی، عالمگیری کی وفات کی خبر ملتے ہی اپنے بیٹے محمد فرخ سیر کو اپنی جگہ بٹھا کر خود اپنے باپ بہادر شاہ کے پاس آ گیا اور یہاں اعظم شاہ اور بہادر شاہ کے بیچ پڑنے والی جنگ میں باپ کی طرف سے لڑنے لگا، پانچ سال بعد بھائیوں کے درمیان ہونے والی جنگ جانشینی میں کام آ گیا۔ اس واقعہ کے نو مہینے بعد فرخ سیر کو باپ کے مارے جانے کی خبر ملی، چنانچہ باپ اور بھائی کے خون کا بدلہ لینے کے لئے اس نے دہلی کا رخ کیا۔ جہاندار شاہ نے اپنے بڑے لڑکے اعز الدین شاہ کو دفاع کی غرض سے فوج دے کر بھیجا۔ محمد فرخ سیر جب الہ آباد پہونچا تو الہ آباد کے صوبے دار سید عبداللہ خاں اور بہار کے صوبے دار سید حسین علی خاں کو کافی منت سماجت سے اپنا حامی اور نذر کر لیا اور ایک زبردست فوج کے ساتھ الہ آباد سے پچاس کیلومیٹر پر واقع مقام کچھو پہونچا۔ وہاں دونوں فریق کے بیچ معرکہ کارزار گرم ہوا۔ اعز الدین کو شکست و ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، وہاں سے آگرہ کی طرف بھاگا۔ فرخ سیر نے بھی آگرہ کا رخ کیا۔ وہاں اسے دوبارہ جہاندار شاہ کی فوج سے پلا پڑا۔ جہاندار شاہ شکست کھا کر میدان سے بھاگ کھڑا ہوا اور داڑھی مونچھ منڈا کر دہلی پہونچا۔ محمد فرخ سیر ۱۸ شوال ۱۱۲۳ھ / ۹ نومبر ۱۷۱۲ء کو اکبر آباد میں تخت پر بیٹھا، کچھ دنوں بعد دہلی روانہ ہوا۔ دہلی میں مقام خضر آباد پہونچ کر اس نے امیر الامراء ذوالفقار خان کو جو جنگ میں شکست کا منہ دیکھنے کے بعد باپ کے پاس چلا گیا تھا، اپنے حضور طلب کیا۔ ذوالفقار خان اس خیال سے کہ وہ جہاندار شاہ کا طرفدار



فرخ اور محمد فرخ سیر کے بھائی کو مارا یا مارنے کا مشورہ دیا تھا، اس کے سامنے جانا نہیں چاہتا تھا مگر باپ کی تسلی اور دلا سے پرچلا گیا۔ فرخ سیر نے جو انتقام کے درپے تھا، ذوالفقار خاں اور جہاندار شاہ کو قتل کرنے کے بعد ان کے سر تن سے جدا کر دیئے اور انہیں بھالے کی انی پر لٹکا دیا اور ان کی بے جان لاش کو ہاتھ پیر باندھ کر ہاتھی کی پیٹھ پر لٹکا دیا اور اس طرح پورے شہر میں اس کی گشت کروائی۔ اقتدار کی دستیابی میں سادات بارہہ کی خدمات کی قدر دانی کے طور پر فرخ سیر نے عبداللہ خاں کو قطب الملک بہادر و فادار ظفر جنگ کے خطاب سے اور اس کے بھائی امیر الامراء حسین علی خان کو امیر الامراء کے خطاب سے نوازا۔

فرخ سیر پانچ سال تک برسر اقتدار رہا۔ اس اثنا میں بیشتر امور مملکت کی باگ ڈور بہ تدریج سادات بارہہ کے ہاتھ پہنچ گئی۔ سادات کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو خطرے کی گھنٹی سمجھ کر اسے کم کرنے یا ختم کرنے کے لئے فرخ سیر نے سادات کے خلاف ایک سازش رچی، جو بالآخر ان کے درمیان باہمی عداوت اور نزاع کا سبب ثابت ہوئی۔ بدگمانی جب حد سے بڑھ گئی تو قطب الملک نے اپنے بھائی امیر الامراء حسین علی خان کو جو اس وقت دکن کے صوبہ دار تھے، بلا بھیجا۔ ان کے دہلی آنے کے بعد دونوں بھائی ۸ ربیع الاول ۱۱۳۱ھ ۱۸ جنوری ۱۷۱۹ء کو بہ وقت صبح قلعہ میں داخل ہوئے۔ اپنے معتد نوکروں کو مناسب مقامات میں بٹھایا۔ سادات کے خوف سے فرخ سیر حرم سرا میں روپوش تھا۔ دس دن کے بعد سادات نے نوکروں کو حکم دیا کہ فرخ سیر کو زبردستی باہر نکال لائیں، چنانچہ انہوں نے انتہائی ذلت و خواری کے ساتھ اس کو حرم سرا سے باہر نکالا، اس کے بعد تروپولہ کے قلعہ میں نظر بند کر کے آنکھوں میں سلائی پھیر دیا۔ دو مہینے بعد ۱۲ جمادی الثانی کو قطب الملک کے حسب حکم فرخ سیر کو قید خانے میں قتل کر دیا گیا اور وہ مقبرہ ہمایوں میں دفن ہوا (۲۰)۔ اس افسوسناک واقعہ پر بیدل نے نہایت تنکھے رد عمل کا اظہار کیا۔ کہتا ہے:

دید کی چه با شاه گرامی کردند صد جور و جفا از ره خامی کردند  
تاریخ چو از خرد بختم فرمود ”سادات بہ وی نمک حرامی کردند“ (۲۱)  
گرامی قدر بادشاہ کے ساتھ جو یکٹرو ظلم و جبر اور جور و جفا کا برتاؤ (ان سادات نے) محض بدگمانی میں کیا، تم نے اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کیا۔ میں نے عقل سے جب اس کی تاریخ دریافت کی تو اس نے کہا: سادات بہ وی نمک حرامی کردند (۱۱۳۱ھ) یعنی سادات نے اس کے ساتھ نمک حرامی کی۔ اس رباعی کی شہرت حالات وقت سے مکمل ہم آہنگی کی وجہ سے اتنی ہوئی کہ بیدل کو سادات کے ڈر سے دہلی چھوڑ کر لاہور میں نواب عبدالصمد خاں کے پاس پناہ لینی پڑی۔

### رفیع الدرجات بن رفیع الشان:

فرخ سیر کو تاپینا کرنے کے بعد سادات بارہہ نے رفیع الدرجات کو جو اس وقت قلعہ سلیم گڑھ میں نظر بند تھا، قید خانے سے نکالا اور ۹ ربیع الثانی ۱۱۳۱ھ ۱۸ فروری ۱۷۱۹ء کو اسے تخت پر بٹھایا لیکن تمام امور سلطنت کی باگ ڈور بدستور سادات ہی کے ہاتھ میں رہی۔ رفیع الدرجات چونکہ بیمار اور کمزور تھا اس لئے تین مہینے گیارہ دن حکومت کرنے کے بعد وہ اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔ (۲۲)

### رفیع الدولہ بن رفیع الشان:

رفیع الدرجات کا بڑا بھائی رفیع الدولہ بھی اس زمانے میں قید خانے میں تھا۔ سادات بارہہ چاہتے تھے کہ تمام امور سلطنت بہ ظاہر ایک تیوری شہزادہ کے ہاتھوں انجام پائے، اس غرض کے لئے انہوں نے رفیع الدولہ کو قید خانے سے آزاد کر کے ۲۰ رجب ۱۱۳۱ھ ۲۸ مئی ۱۷۱۹ء کو اسے تخت شاہی پر بٹھایا اور ”شاہ جہان ثانی“ کا لقب دیا۔ رفیع الدولہ بھی اپنے بھائی کی طرح بیمار اور نحیف تھا اس لئے تین مہینے چند دن کی حکومت کے بعد وہ بھی چل بسا۔ (۲۳)

### محمد شاہ غازی:

محمد شاہ کا اصلی نام ناصر الدین شاہ بن جہان شاہ تھا، رفیع الدولہ کی وفات کے بعد سادات بارہہ نے ناصر الدین شاہ کو ۷ سال کی عمر میں ۱۵ رذیقعدہ ۱۱۳۱ھ ۱۸ نومبر ۱۷۱۹ء کو آگرہ میں تخت پر بٹھایا اور اسے ”محمد شاہ“ کا لقب دیا۔

محمد شاہ اپنے پیشرو مسلمانین کی بہ نسبت کسی حد تک سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔ امور سلطنت پر سادات کا تسلط اور ان کا غیر معمولی اثر و رسوخ اس کے لئے ایک تشویشناک بات تھی۔ اس لئے در پردہ ان کی طرف سے اس کے دل میں کدورت پیدا ہوئی آخر ایک دن ان کو راستے سے ہٹانے میں کامیاب ہو گیا۔

### امیر الامراء حسین علی خاں کی شہادت:

محمد شاہ، جو سادات بارہہ کے اقتدار اور اثر و رسوخ کو ختم کرنے کی در پردہ کوشش میں لگا ہوا تھا، آخر ۷ ذی قعدہ ۱۱۳۲ھ ۳۰ اگست ۱۷۲۰ء کو اپنی سازش میں کامیاب ہو گیا۔ امیر الامراء جب دکن کے راستے میں تھا تو شاہ موصوف کے حسب حکم محمد امین خاں کے اغواء سے میر حیدر کاشغری کے ہاتھوں مارا گیا۔

## عبداللہ خاں کا قتل:

اس کے بعد اس کے بڑے بھائی عبداللہ خاں نے اپنے چھوٹے بھائی نجم الدین خاں کو جو اس وقت ”حارس دہلی“ کے عہدے پر فائز تھا خط لکھا کہ قید خانے سے ایک شہزادے کو نکال کر تخت پر بٹھائے ۱۲/۱۲ ذی الحجہ ۱۱۳۲ ہجری کو شہزادہ سلطان بن رفیع الشان کو تخت پر بٹھایا گیا۔ دو دن بعد قطب الملک بھی دہلی آ گیا۔ محمد شاہ اور قطب الملک کی فوجوں کے درمیان گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ قطب الملک کو جب اپنی شکست کا احساس ہونے لگا تو ہاتھی سے اتر کر خود کو محمد شاہ کے سامنے پیش کر دیا۔ حیدر علی خان نے اسے پھر ہاتھی پر سوار کر کے بادشاہ کے سامنے پیش کر دیا۔ بادشاہ نے اس کی جان بخش تو دی مگر اس کو قید خانے میں ڈال دیا۔ اس کے بعد ذی الحجہ ۱۱۳۵ ہجری کی آخری تاریخوں میں اسے زہر دیدیا گیا۔ (۳۴)

یہ تھے عہد بیدل کے سیاسی حالات۔ مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ تیموری حکومت عہد اورنگ زیب میں اپنے کمال کو پہنچ چکی تھی۔ ۱۱۱۸ ہجری ۷۰۶ عیسوی میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس میں زوال آنا شروع ہوا۔ لیکن یہ انحطاط کچھ زیادہ محسوس شکل میں نظر نہیں آتی ہے۔ ۱۱۲۳ ہجری ۱۷۱۲ عیسوی میں شاہ عالم بہادر شاہ کی وفات کے بعد زوال کا احساس شدت سے ہوتا ہے۔ کیونکہ ۱۱۲۳ ہجری سے لے کر ۱۱۳۴ ہجری تک سیاسی اسٹیج پر زبردست انقلابات رونما ہوئے جس کے نتیجے میں کیا شہزادے کیا امرا اور کیا فوجی سپہ سالار سب کو اپنی جانوں سے ہاتھ دھونا پڑا تا آنکہ فرخ سیر کی شہادت اور سادات بارہہ کے ہاتھ سے امور مملکت کی باگ ڈور نکلنے اور ان کی شہادت کے بعد تیموری حکومت کی بنیادیں بری طرح ہل گئیں۔

اس طرح بیدل نے مغلیہ سلطنت کے عروج و زوال کا نہ صرف یہ کہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا بلکہ اس کی آپ بیتی بھی جیسا کہ آئندہ صفحات میں ہم پڑھیں گے، ان سیاسی واقعات کے زیر اثر نشیب و فراز کے مختلف ادوار سے گذری۔ درج ذیل چند اشعار میں ان واقعات کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں:

گیر و دار اورج دولہا غباری بیش نیست      بر ہوا چوں گرد باد اورنگ شاہی می رود  
عروج حکومت کی گرد و دار ایک گرد و غبار سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی، تخت شاہی گرد باد کی طرح ہوا پر معلق ہے۔

روزی کہ ہوسہا در اقبال کشودند      آخر ہمہ رفتند بجای کہ نبودند  
زیں باغ گذشتند حریفان بندامت      ہر رنگ کہ گردید کفی بود کہ سودند  
افسوس کہ ایں قافلہا بعد فنا ہم      یک نقش قدم چشم جہمت نکشودند  
جس دن ہوں نے اقبال کے دروازے وا کئے، انجام کار سب ایسی جگہ رخصت ہو گئے کہ گویا

تے ہی نہیں، حریف حضرات اس باغ سے ندامت کے ساتھ رخصت ہو گئے، جو رنگ بھی ان کا رہا ہو وہ ایک ہتھیلی تھی جس کو وہ گھس گئے۔ افسوس کہ اس قافلے نے فنا کا منظر دیکھنے کے بعد بھی ایک نقش قدم کے برابر چشم عبرت و انہیں کی۔

بیدل تاجی کہ دیدی امروز فردا اینجا نشان ہا بود  
بیدل! آج جو تاج تھے نظر آ رہا ہے کل یہاں صرف اس کا نشان ہوگا۔

اے مغزی شکوہ سلطنت شد تنگ کناسی      بہ جای استخوان کہ خورده می گردد ہما اینجا  
سلطنت کی شان و شوکت اپنی تہی مغزی اور دناءت کی وجہ سے خاکروبی کے لئے بھی باعث نہ ہو گئی۔ ہما جیسا مبارک پرندہ ہڈی کے بجائے اب غلاظت کھانے پر اتر آیا ہے۔

نور انصاف گر این است کہ شاہان دارند      سایہ در بال ہما سوختہ ہا می سوزد  
بر نمی آید ز تشویش کسوف آفتاب کشور ایام ما  
ہمارے عہد میں ملک کا سورج اب گرہن کی گرفت سے نکلتا نہیں دکھائی دیتا ہے۔

مہ شد ہزار بار ہلال و ہلال بدر      دیدیم وضع عالم نقص و کمال را  
چاند ہزاروں دفعہ ہلال بنا اور ہلال نے بدر (پورے چاند) کی شکل اختیار کی۔ بس ہم نے اب دنیا کے عروج و زوال کا مشاہدہ کر لیا۔

کردیم تماشای ترقی و تنزل آئینہ ما ہر نفس از ما بتری داشت  
ہم نے ترقی و تنزل کے تماشے دیکھ لئے ہمارے آئینہ کو ہر لمحہ بد سے بدتر حالات سے سابقہ ہے۔  
انتخاب دہر دیدی گوشہ می باید گرفت      عبرت احوال گو ہر شورش دریا بس است  
زمانے کا انتخاب تم نے دیکھا اب گوشہ گیر ہو جاؤ، دریا کی شورش موتی کے حالات کی عبرت کے لئے کافی ہے۔

گرفتہ است حوادث جہات امکاں را      ز عافیت چہ زمیں و چہ آسماں خالیست  
حوادث نے ساری جہتوں کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے اب کیا زمین اور کیا آسمان کہیں بھی امن و امان نہیں ہے۔

از ورق گردانی وضع جہاں غافل مباش      صبح و شام این گلستان انقلاب رنگاہاست  
تاجی حالات:

ساجی قدریں ہمیشہ سیاسی اقدار کے تابع رہی ہیں۔ مرکزی حکومت جب کسی ملک کی مستحکم اور

چراغدار ہوتی ہے تو پورے ملک میں امن وامان رہتا ہے اور داخلی امن کے نتیجے میں سارے سماجی اقدار اپنے طبعی اور فطری دھارے میں رواں دواں رہتے ہیں۔

عام خیال کے مطابق، شاہجہاں کا شمار انصاف پسند، بہادر اور دیندار سلاطین کی صف میں ہوتا ہے۔ وہ منکرات سے بچتا تھا اور اکثر صوفیہ، علما اور صلحا کی صحبت میں بیٹھا کرتا تھا۔ امور مملکت پر اس کا پورا کنٹرول تھا۔ اسی وجہ سے اس کے زمانے میں ملک کی معاشی اور سماجی حالت اطمینان بخش تھی۔ سارے راجہ مہاراجہ، نواب اور فوجی سپہ سالار اس کے فرمانبردار اور مطیع تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اس نے پورے جاہ و جلال اور شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی۔ مغلیہ حکومت اس کے عہد میں اپنے نقطہ عروج کو پہنچ چکی تھی۔ ۱۰۷۶ ہجری ۱۶۶۵ عیسوی میں شاہ جہاں کی وفات کے موقع پر بیدل نے جو مرثیہ کہا ہے اور جس کے کچھ اشعار اس سے پہلے نقل کئے جا چکے ہیں، اس میں بیدل نے اس کے ان اوصاف کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کا ایک شعر یہاں لکھنا مناسب نہ ہوگا۔

دور سعدی بود و عہد امن و ایام شریف خلق در حمد خدا از عدل شاہ نیک ملی  
وہ ایک خوشگوار اور عمدہ عہد تھا، ہر طرف امن وامان کا دور دورہ تھا اور ایک نیک دل بادشاہ کے عدل و انصاف سے خوش ہو کر عوام خدا کی حمد و ثنا کرتی تھی۔ بہر حال عوام کی آسودہ حالی اور معاشی خوشحالی کی طرف سے اطمینان کے بعد ہی شاہجہاں نے اپنے ذوق جمال کی تسکین کی طرف توجہ دی۔ تاج محل، لال قلعہ تحت طاؤس اور مسجد شاہجہانی اس کے اسی ذوق جمال کی چار پر شکوہ یادگاریں ہیں۔ مشہور کہادت ہے الناس علی دین ملوکھم لوگ اپنے بادشاہ کے دین و مذہب پر چلتے ہیں اس لئے عجب نہیں کہ اس عہد کے لوگ خصوصاً شعر اجوڑی حد تک حساس اور جمال پسند ہوتے ہیں اس خصوصیت کے حامل رہے ہوں۔ (۲۵)

اورنگ زیب کا طبعی رجحان چونکہ دین اسلام کی ترقی اور فروغ کی طرف تھا حتیٰ کہ بعض مغرل مصنفین نے اسے مذہبی جنون کا حامل کے لقب سے یاد کیا ہے اس لئے اپنے عہد میں اس نے اسی ذوق کی نمائش کی طرف توجہ دی۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور اوروادو وظائف کی پابندی کے ساتھ رمضان کا اہتمام کرتا، حرمین شریفین کے خادموں کو ایک بڑی رقم بھیجا کرتا، مذہبی امور کے احتساب کے لئے اس نے کچھ محاسب اور شرعی مسائل کے حل و فصل کے لئے کچھ قاضی مختلف علاقوں میں مقرر کئے۔ مختلف مذہبی مسائل کے بارے میں تمام فقہاء اور محدثین کے اقوال ایک جگہ جمع کرنے کے لئے شیخ نظام کی صدارت میں اس نے اس عہد کے بڑے بڑے علماء کی ایک مجلس بنائی اور ایک خطیر رقم (لگ بھگ دو لاکھ روپے) کے صرفہ سے ”فتاویٰ عالمگیری“ نام کی ایک اہم مایہ ناز فقہی کتاب چھ جلدوں میں لکھوائی جس

کی خیر کسی بھی اسلامی ملک میں موجود نہیں ہے۔ اورنگ زیب کی اسلام دوستی کے نام سے یہ اس کا ایک کارنامہ شمار کیا جاتا ہے۔ ان ہی مذہبی رجحانات کی وجہ سے وہ اکثر کتب حدیث، تفسیر، فقہ اور تصوف کا مطالعہ بھی کرتا تھا، قرآن پاک حفظ کیا اور غیر مسلموں پر جزیہ عاید کیا۔ (۲۶)

یہ سارے امور اورنگ زیب کی اسلام دوستی کے مظاہر تھے۔ کچھ مغربی اور ہندوستانی مؤرخوں نے اس کی مذہبی سیاست کی پرزور الفاظ میں تکتہ چینی کی ہے۔ لیکن اورنگ زیب خود کو دین اسلام کا حامی و طرفدار کہتا تھا اور اکبر کی پالیسی کی کھلے بندوں تنقید کرتا تھا، اس لئے اس کے ہاتھوں جو کچھ بھی انجام پایا وہ ایک طبعی عمل تھا۔ یان ریپا نے اورنگ زیب کی مذہبی سیاست کو مغلیہ سلطنت کے زوال کا اصلی سبب قرار دیا ہے۔ (۲۷) لیکن یہ بھی ایک مسلم حقیقت ہے کہ اس نے اپنے عہد اقتدار میں کابل، کشمیر، دکن، گجرات، بنگال، مالوہ، آسام، اور پنجاب وغیرہ ہندوستان کے وسیع و عریض علاقے پر انتہائی آسان بان اور شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی (۲۸) اور ایک طرف اگر وہ حامی دین اسلام تھا تو دوسری جانب اس نے مذہبی رواداری کا نمونہ بھی پیش کیا اور بہت سے مندروں میں جائدادیں وقف کیں۔ جس کا زوال کا تعلق ہے ہمارے استاد محترم پروفیسر ولی الحق انصاری کے خیال میں بہت ہی دلچسپ اور توجہ طلب بات یہ ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے پچاس سالہ دور حکومت کے بعد تیوری حکومت کی بنیاد پر متحکم کر دی تھی کہ اس کے انتقال کے بعد عرصے تک کسی کو شاہی خاندان کے ختم کرنے کی ہمت نہ ہوگی۔ چنانچہ سادات بارہہ نے تمام امور سلطنت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے رکھی تھی مگر ان کو بھی یہ ہمت نہ ہوئی کہ شاہی خاندان کو راستے سے ہٹا کر خود تخت پر جا بیٹھیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلطنت کی بنیاد کتنی مستحکم تھی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اورنگ زیب کے جانشین اپنے کولایتی اور اہل خلف ثابت نہ کر سکے۔

بہر حال اورنگ زیب کے دینی ذوق اور رجحان کے نتیجے میں معاشرہ بھی اسی رنگ میں رنگ گیا۔ اسی وجہ سے سپہ سالار، امراء اور اراکین سلطنت زیادہ تر معاصر صوفیہ اور مشائخ کے حلقہ ارادت میں داخل یا کم از کم تصوف کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مجدد الف ثانی شیخ احمد رندی نے اکبر کی طہانہ سیاست کے مقابلے پر دینی اصلاح کی جو تحریک ریزی کی تھی، شاہجہاں کے عہد میں وہ شاخ و برگ سے بھر پور ایک پیڑ کی شکل میں پروان چڑھ چکا تھا اور اورنگ زیب کے عہد میں وہ عملی طور پر بار آور ہو گیا۔

اورنگ زیب کو خود اسلامی اصول و ضوابط کا پابند اور طرفدار تھا مگر اس ملک کی تمام اقوام کے ساتھ اپنے منصفانہ برتاؤ کا دامن اس نے کبھی ہاتھ سے نہیں دیا۔ دادخواہوں کی فریاد رسی کے لئے

ہوڑا نہ دو تین گھنٹے کھڑے ہو کر ان کی روداد سنتا اور ہر خاص و عام بے خوف و خطر اس کے دربار میں پہنچ کر اپنی عرضداشت پیش کرتا تھا۔ (۲۹)

شاہ عالم، جہاندار شاہ، فرخ سیر، رفیع الدرجات رفیع الدولہ اور محمد شاہ کا عہد مجموعی طور پر زبردست سیاسی بحران اور سماجی انقلاب کا دور ہے۔ بارہ سال کی مختصر مدت میں پانچ خونریز جنگیں ہوئیں جن کے نتیجے میں بہت سے شہزادے امراء اور بااثر شخصیتیں قلمہ اجل ہو گئیں اور تیوری سلطنت کی بنیادیں اس طرح ہل گئیں کہ اس کے بعد استحکام کی ہر کوشش نہ صرف یہ کہ ناکامی پر ختم ہوئی بلکہ اس کی سستی میں آئے دن اتنا اضافہ ہوتا گیا کہ آخر کار انگریزوں کے تسلط کے لئے راہ ہموار ہو گئی۔

سیاسی حالات جب زبردست بحران سے دوچار ہوں تو سماجی حالات ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جو آدمی کل تک بادشاہ کا منظور نظر تھا آج وہ راندہ درگاہ ہے، کل تک جن کا شمار بااثر اور مقتدر ہستیوں میں ہوتا تھا آج ان کا وجود دوسروں کے رحم و کرم پر ہے۔ کشمکش سے بھرے ایسے حالات میں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کل کیا صورت حال رہے گی۔ اس غیر یقینی صورت حال میں سماجی اقدار کا تعین بہت مشکل ہے۔

بیدل نے اپنی غزلیات، مثنویات، رباعیات اور قصائد میں مختلف مقام پر اپنے عہد کے سماجی حالات پر روشنی ڈالی ہے۔ اور معاشرہ کے مختلف طبقے سے براہ راست یا بالواسطہ اس کا ساائقہ پڑا ہے۔ اس نے عوام و خواص، شاہ و گدا، امرا و نواب، علماء و فضلا، ائمہ مساجد و قضاة، زاہد و شیخ، فوجی و غیر فوجی، اور اہل کمال و اہل حرفہ سب کے حالات پر بے لاگ تبصرہ کیا ہے۔ اس کے اشعار کی روشنی میں اس دور کی جو تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے وہ تاریخ نگاروں کی تصویر سے بہت مختلف نظر آتی ہے۔

اس عہد میں بیدل بھی دوسرے لوگوں کی طرح کشمکش حیات کے ایک عجیب دورا ہے پر کھڑا نظر آتا اور انتہائی حزم و احتیاط سے قدم پھونک پھونک کر اٹھاتا ہے۔

امروز نیست قابل تفریق و امتیاز انجام کار دشمن و آغاز آشنا  
 آج دشمن کے انجام اور دوست کے آغاز میں خط امتیاز کھینچنا ممکن نہیں ہے۔

از ہر چہ دم زنی بہ خموشی حوالہ کن  
 ایں انجمن پر است ز غماز آشنا  
 جو کچھ کہنا ہو خموشی کے حوالے کرو یہاں انجمن جانے پہچانے غمازوں اور پتلاخوروں سے پُر ہے۔

بشنوای نیک و بد از دور و دم مزن      فی ناله داشته است ز دمساز آشنا  
دور ہی سے اچھی بری باتیں سنو لیکن دم نہ مارو (خاموش رہو) نالے کو دمساز یعنی دوست سے

برسنگ زد زمانہ زبس ساز آشنا      در سرمہ گر دمی کند آواز آشنا  
زمانہ نے بہت سے جانے پہچانے ساز کو پتھر پہ دے مارا (بہت سے اخلاقی اور سماجی احوال کو  
دیا) حتیٰ کہ سرمے میں بھی دوست کی آواز پیوست کر گئی۔

گر صیقلی بکار برو سعی اتفاق دل می خراشد آئینہ پرداز آشنا  
 اتفاق سے دل کی قلعی کی کوشش بھی کی گئی تو قلعی گرد دوست آئینہ دل پر خراش لگاتا ہے۔  
 تا کی دریں بساط زافسون التفات بر روی شمع خندہ زند گاز آشنا  
 اس بساط پر آخر تک التفات اور توجہ کے بہانے دوست کی گل کترنے والی فیچھی شمع پر ہنستی  
 (اے کاٹتی چھانٹتی رہے گی)

داد کشاد کارِ تعظم کجا برد  
زد حلقہ بستگی بدر باز آشنا  
رفع مظلومی کے انصاف کے لئے اب کہاں جایا جائے دوست کے کھلے دروازے پر بستگی کا  
(یعنی بند ہے)

مرغ غای مرغ نفس آرمیدن است دامن و قفس خوش است ز پرواز آشنا  
مرغ نفس کا مقصد اگر آرام کرنا ہے تو جانی پہچانی پرواز سے دامن و قفس کہیں بہتر ہے۔  
پتہ قضا است دہرا مانگا خلق نیست کج شک را چہ سود ز شہباز آشنا  
زمانہ ایک بچہ قضا ہے، یہ مخلوق کی امان گاہ نہیں ہے۔ جانے پہچانے شہباز سے بھلا کج شک کو کیا  
سکتا ہے؟

منت کش تکلف اخلاق کس مباد بیگانہ ام ز خویش ہم از ناز آشنا  
خدا نہ کرے کوئی کسی کے بہ تکلف اخلاق کا احسان نہ ہو۔ خود آپ سے بیگانہ بھی ہوں اور ناز  
ہوں سے آشنا بھی۔

مکتوب عشق قابل انشا کی نیافت  
 بردیم سر بمہر عدم راز آشنا  
 کسی نے عشق نامہ کو قابل تحریر خط نہیں پایا۔ راز آشنا (محبوب کے راز عشق) کو ہم عدم کی  
 بل کر کے لے گئے۔

بہ حرف و صوت ہم آوارہ گشت خلق آہ از فسون غول باواز آشنا (۳۰)  
بیدل! مخلوق، باتوں اور صداؤں پر آوارہ ہو گئی ہے۔ دوست کی اس آواز پر افسوس ہے جس  
ت کا جادو پوشیدہ ہے۔

بازار نتوال بر دبی جنس فریب ای کہ سود اندیشہ ای، سرمایہ کن تزویر را

اس بازار سے دھوکہ دھڑی کے بغیر کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے یہاں فائدے کے فکر میں سرگرداں ہوتا مکر و فریب کو اپنا سرمایہ بناؤ۔

اس زمانہ میں ارباب جو ہر دام ترویند و بس می توان دانست آب زیر گاہ آئینہ اس زمانہ میں ارباب جو ہر (اہل اور لائق شخصیتیں) مکر و فریب کے دام میں گرفتار ہیں آئینہ آب زیر گاہ (تھکے کے نیچے کا پانی یعنی فریب) کہا جاسکتا ہے۔

دریں زمانہ سر نخوتی کشیدہ بہر سو ز نقش خانہ پا در ہوا ی چہر زہ اس زمانے میں کبر و نخوت نے ہر طرف سراٹھا رکھا ہے۔

یاراں دریں زمانہ نمائندہ است بوی مہر پیدا کنید بر فلک دیگر آفتاب دوستو! اس زمانے میں میل و محبت کی بوتک نہیں رہ گئی ہے۔ اب کسی اور آسمان پر آفتاب

سراغ لگاؤ۔

جز کج مزار امروز کس دادرس کس نیست انساں چہ کند با ایں خرس و سگ دیونہ

آج گوشہ مزار کے سوا کسی کا کوئی دادرس (انصاف دینے والا) نہیں رہ گیا ہے۔ ان رچھ،

اور بندر (صفت) لوگوں کے ساتھ انسان کس طرح نبھائے۔

از ترحم تا مروت و ز مدار تا وفا ہر چہ را کردم طلب دیدم ز عالم رفتہ است

ہمدردی سے لے کر انسانیت تک اور خاطر مدارات سے لے کر وفاداری تک، جس چیز کو

تلاش کیا پتہ چلا کہ یہ سب چیزیں دنیا سے رخصت ہو چکی ہیں۔

آدم گری از ریش بیاموز کہ امروز ہر پشم ز صد خرس و بز و میش گذشت

آج آدم گری سیکھنا ہو تو داڑھی سے سیکھو، کہ ہر داڑھی والا سیکڑوں بکری، بھیڑ اور بچھ

آگے نکل چکا ہے۔

روز و شب ناموراں در قفس سیم و زر اند بیچ زنداں بنکیں سخت تر از خاکم نیست

نامور لوگ رات دن سونے چاندی جمع کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں، گینہ میں کوئی قید خانہ

میری خاک سے زیادہ سخت نہیں ہے۔

بہر چہ می نگریم مست وہم پیمانیت فتادہ است دریں روزگار بنگ در آب

جدھر دیکھتا ہوں لوگ وہم پیاکی میں مبتلا ہیں اس زمانے میں شاید پانی میں بھگ مل گیا ہے۔

نے دل حضور دارد و نے دیدہ نور دارد سامان ایں شبستاں کوری و بے چراغیت

نہ دل میں حضور قلب ہے نہ آنکھوں میں نور۔ اس شبستاں کا سامان کوری (اندھا پن)

بے پانی ہے۔

بیدل امروز در مسلماناں ہمہ چیز است لیک ایماں نیست

مسلمانوں میں سب کچھ ہے مگر ایمان نہیں ہے۔

ایک رباعی میں بھی وہ ارباب اقتدار پر بہترین تبصرہ کرتا ہے۔ جو ہر زمانہ کے خصوصاً عہد

امریکہ، برطانیہ اور دوسرے یورپین ممالک کے سربراہوں پر بھی صادق آتا ہے۔

یک سوشور کرو فر و عزت و شال یک سوحسد و دعوی و حرص و بہتاں

بر ہنگامہ بیا راستہ اند ایں مسخرہ ہای چار سوی امکاں

ایک طرف شان و شوکت، آن بان اور کرو فر کا دور دورہ ہے۔ دوسری جانب حسد و کینہ،

دشمنی، جنگ و جدل، حرص و آرزو اور افترا و بہتان کا سلسلہ جاری ہے۔ ذرا دیکھئے دنیا کے یہ

کسی بے وقعت چیزوں پر یہ ہنگامہ کھڑا کئے ہوئے ہیں۔

روح بالا اشعار میں بیدل نے مکر و فریب، کبر و نخوت، کینہ و عداوت، درندگی و ہیبت، ہمدردی

اور ایقانے عہد کا فقدان، زروسم کے حرص، ظاہر پرستی، دل کی بے حضوری، آنکھ کی بے نوری،

معاذ کی بے ایمانی وغیرہ سے بھری سوسائٹی کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ اس عہد کے سماجی حالات پر روشنی

ان کے لئے کافی ہے۔

ایک سب سے بڑی سماجی برائی اس دور کی امرد پرستی اور اغلام بازی ہے جس میں سماج کا ہر

عہد پادے دیندار ہو یا دنیا دار مبتلا تھا۔ بیدل نے ایک پوری غزل میں ان کو آڑے ہاتھوں لیا ہے اور ان

کے ساتھ پرخت نکتہ چینی کی ہے۔

ایں دور دور چیز است وضع متیں کہ دارد باد برووت مردی غیر از سریں کہ دارد

یہ زنجوں کا دور ہے۔ وقار و متانت کی خصوصیت کس کے اندر ہے، مردانگی کی ساری شئی سرین

کے اندر ہے۔

آہ حق پرستی ختم است بر عنث غیر از دبر سرشتاں سر بر زمیں کہ دارد

حق پرستی کے سارے آثار زنجوں پر ختم ہو گئے، دبر سرشت لوگوں کے سوا کس میں ہمت ہے کہ

اٹھ کر کھڑے ہو سکے۔

نہ نہ پہلوی ریش پشینہ می فروشی بازار نورہ گرم است ایں پوتیش کہ دارد

نہ تو داڑھی کی آڑ میں پشینہ فروشی کرتا ہے۔ نورہ (چونا اور ہر تال سے ملی ہوئی ایک دوا جس

کے کانے سے بال گر جاتے ہیں) کا بازار گرم ہے۔ یہ پوتیش کس کے پاس ہے۔

ہنگ بنای طاعت بر خدمت سرین نہ امروز طرح محراب جز گنبدیں کہ دارد  
اپنی طاعت و عبادت کی اساس سرین کی خدمت پر استوار کر، آج محراب کا نقشہ گنبدیں (چتر  
والے) کے سوا کس کے پاس ہے۔

بر کیسہ کریمیاں چشم طبع نہ دوزی جز دست خردیں عصر در آستیں کہ دارد  
شریفوں کی تھیلی پر حریصانہ نظر مت ڈال۔ اس زمانہ میں آستیں کے اندر گدھے کے سوا کس کا  
ہاتھ ہوتا ہے۔

از منعمان گدرا دیگر چہ می توان خواست تن دادہ اند بر فحش، دادایں چنین کہ دارد  
دولتمندوں سے فقیروں کو کیا چاہیے۔ انہوں نے فحش اور بے حیائی کو قبول کر لیا ہے۔ اس کی  
فریاد کس سے کریں۔

خلق وسیع خفست است در تنگی سرینہا جز کام ایں حواصل دامن بہ چین کہ دارد  
عوام کی اکثریت سرینوں کی تنگی میں محو خواب ہے۔ ان پوٹوں کے مقصد کے سوا کس کے دامن  
میں شکن ہے۔

از بسکہ دور گردوں گرداند طور مردم تا پشت بر نتابد بر زن یقین کہ دارد  
دور فلک نے لوگوں کے طور طریقے بے انتہا بدل کر رکھ دیئے ہیں۔ عورت جب تک اپنی پیٹھ نہ  
پھیرے اس کے عورت ہونے کا یقین نہیں ہو سکتا ہے۔

ادبار مرد و زن را نکذاشت نام اقبال یک کاف و واؤ و نوں است تا کاف و سین کہ دارد  
مرد و عورت کی اخلاقی پستی نے اقبال کا نام ہی غائب کر دیا۔ لے دے کے ایک "کون"  
(چوڑ) کا ذکر ہے اور "کس" (عورت کی شرمگاہ) سے کسی کو کیا مطلب ہے۔

در چار سوی آفاق بالفعل ایں منادیست لعل خوشاب باکیست در شمیم کہ دارد  
ساری دنیا میں اس وقت یہ عام منادی ہے کہ چمکدار لعل (ہونٹ) کس کے پاس ہے اور در  
شمیں (قیمتی موتی) کس کے قبضے میں ہے۔

ایک دوسری غزل میں کہتا ہے:  
طفلی چہ ممکن است رود از مزاج شیخ ہر چند مو سفید کند پیر زادہ است  
شیخ کے مزاج سے بھلا بچہ نارخصت ہو جائے ممکن ہی نہیں۔ وہ اگر داڑھی سفید بھی کر لے پھر

بھی پیر زادہ ہے۔  
از علت مشائخ و اطوار شاں پیرس بالفعل طینت نر ایں قوم مادہ است

مشائخ کے طور طریقے ان کی علتوں کی بابت مت پوچھو۔ اس قوم کی مردانہ طبیعت اس وقت  
ناتاہ ہوئی ہے۔

جا مزینی است بحکم صلاح شرع در ریش محتسب بچہ اش را نہادہ است  
جہاں شریعت کی مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے تو داڑھی کی جگہ محتسب بچہ ریش رکھ لیتا ہے۔  
ایں جا خیال گنبد عمامہ پیچ نیست بار سرین بہ گردن واعظ فتادہ است  
واعظ کی گردن پر سرین کا بوجھ اتنا زیادہ ہے کہ گنبد عمامہ کا تصور بھی اس کے صفحہ ذہن پر نہیں ابھرتا۔

زادہ کجا و طاعت یزدانش از کجا از وضع سجدہ شیوہ خاصش ارادہ است  
زادہ کہ بھلا خدا پرستی اور طاعت الہی سے کیا واسطہ؟ جس انداز سے وہ سجدہ کرتا ہے اس سے بھی  
خبردار ادا کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔

رعنائی امام ندارد سر نماز می نازد از عصا کہ بدستش چہ دادہ است  
امام کی رعنائی اور خود آرائی کا مطلب بھی یہی ہے کہ نماز کی ادائیگی اس کے پیش نظر نہیں ہے  
اسے تو اس عصا پر فخر ہے جو اس کی شان بڑھاتی ہے۔

ہزار بار بانگشت ہای دخل تہہ کردہ درس و گرم تلاش اعادہ است  
ملانے ہزاروں دفعہ اپنی آمدنی کو گن کر کے درس و تدریس کا سلسلہ موقوف کیا اور اس کے  
اضافہ کی کوشش میں سرگرم ہو گیا۔

اقبال خلق بسکہ بادبار بستہ عہد پیش او فتادہ است و قفا ایستادہ است  
عوام کا اقبال بڑی حد تک ادبار (سرین) سے وابستہ ہو گیا گاڑی پڑی ہے اور پچھاڑی کھڑی ہے۔  
ہستی کشید دامن ایں حیز طینخاں چنداں کہ نام شاں بزبانہا فتادہ است  
ان زنجیر صفت لوگوں کے دامن کو پستی نے اس حد تک نیچے گرا دیا ہے کہ ان کے ناموں کا چرچہ

کون کی زبانوں پر ہونے لگا ہے۔  
اسی طرح علما و فضلا کا حال ہے۔

ایں علماء کہ جملہ تابع جہلائند پیچنگی اقبال طبع خام ندارد  
یہ علماء عموماً جاہلوں کے پیروکار ہیں جبکہ پیچنگی یا پختہ مزاجی عوام کے طبع خام کو قبول نہیں کرتی ہے۔  
ہر چند بہ عدل دین حق رہبر بود جہد علما پیرو حکم زر بود  
سلطان ہر گاہ ریخت خون پدرش گفتند: جہاد کردہ، او کافر بود

دین حق اگرچہ عدل و انصاف کی طرف رہنمائی کرتا ہے لیکن علما کی ساری کوشش حکم زر کے تابع

ہے۔ بادشاہ نے اگر اپنے باپ کا خون بہایا تو انہوں نے کہا: اس نے جہاد کیا ہے وہ کافر تھا۔

یہ اشارہ درپردہ اور نگ زیب کی طرف ہے جس نے والد کو تو نہیں بھائیوں کو اپنے راستے سے ہٹایا تھا۔ ممکن ہے بعض درباری علماء نے وہ بات بھی کہی ہو خصوصاً داراشکوہ کے بابت مشہور ہے کہ وہ ویدانت کی طرف مائل تھا۔ اس لئے ایک شعر میں اشارہ کرتا ہے کہ معاصر علماء درحقیقت دین فروشی پر اتر آئے ہیں۔

آتش ز چہرہ زریں اثر ز رندہد دین بدنیا مفروشید کہ دنیا دنیا ست

چہرہ زریں سے آگ زر کا اثر نہیں دیتی ہے۔ دین کو دنیا کے بدلے مت بیچو کہ دنیا بہر حال دنیا یعنی معمولی چیز ہے۔

یہ تو علما کا حال تھا آگے عقلا کا حال سنئے۔

وضع عقلای معاصر دیدم دیوانہ ما مودب آمد

معاصر عقلا کا حال دیکھا تو ہمارا دیوانہ مودب و مہذب نظر آیا۔

بیدل کے زمانہ میں دانشوروں اور عقلمندوں میں واجب اور ممکن، قدیم و حادث جو ہر و عرض، صورت و ہیولی وغیرہ کی گرما گرم فلسفیانہ بحث ہوتی تھی جو اس کے بعد بھی بہت دنوں تک قائم رہی ہے۔ ان بحثوں میں اکثر لوگوں کی گردن کی رگیں پھول جاتی تھیں اور ازراہ کبر و عناد ایک دوسرے پر کچڑا اچھالنے لگتے تھے اور کبھی کبھی دست و گریبان کی نوبت آجاتی تھی اس لئے بیدل نے اس پر طنز کرتے ہوئے کہا ہے:

تو بیچ باش و علم و عمل بطاق نہ گو خلق ہرزہ فکر حدوث و قدم کند

تو خاکسار اور متواضع رہ اور علم و عمل طاق پر رکھ، چاہے بیہودہ خیال لوگ حادث و قدیم کی

غیر ضروری بحث میں الجھے رہیں۔

علما و عقلا کی اس غیر ضروری بحث و مباحثہ اور اس پر انگلی باہمی چپقلش پر ایک پوری غزل 'بحث' کی ردیف میں لکھ ڈالی جو دلچسپی سے خالی نہیں ہے اس لئے ذیل میں اس کے بعض اشعار دیئے جاتے ہیں۔

خوار بست بہر کج منش از راست رواں بحث بر خاک فتد تیر چو گیرد بکماں بحث  
راست رولوگوں کی ہر کج منش (ٹیزھی سمجھ والوں) سے بحث کرنا ذلت و خواری کی بات ہے  
بحث جب کمان سنبھال لیتی ہے تو تیر خاک پر گرتا ہے۔

گویائی آئینہ بس است از لب حیرت حیف است شود جو ہر روشن گہراں بحث

لب حیرت سے آئینے کا گویا ہونا کافی ہے۔ روش گہر اور روشن خیال لوگوں کا جو ہر اگر بحث

کئے تو ان کے لئے یہ افسوس کی بات ہوگی۔

انصاف بخوں غوطہ زن و نوحہ کنان بحث  
علم شمر مدرسہ کا بیجا ست  
انصاف کا خوں ہو اور بحث مرثیہ خواں ہو  
علم کا ماتم کدہ وہ مدرسہ جس میں

غالباً اقبال نے ہمیں سے اخذ کیا ہے۔

کہاں سے آئے صدائے لا الہ الا اللہ  
تو گھونٹ دیا مل کے اہل مدرسہ نے ترا  
مر بخردی ساز کند ہرزہ زبانی  
بگذار کہ چوں شعلہ بمیرد بہماں بحث  
اگر غیر دانشمند آدمی بیہودہ گوئی سے کام لے تو شعلہ کی طرح اسے اس بحث میں مرنے دے۔

آن کیست کہ گردد طرف مولوی امروز  
یک تیغ زبان دارد و صد نوک سناں بحث  
آج کس میں جرأت ہے جو مولوی کے مقابل ٹھہرے۔ وہ مولوی جس کی بحث میں ایک تیغ  
زبان اور سو نوک سناں ہے (یعنی اس کی زبان تلوار کی طرح کاٹنے والی اور برچھے کی طرح سیکڑوں نوک  
سے چھانے والی ہے۔)

اور اہل کمال کے سلسلہ میں کہتا ہے:

دریں زمانہ ز بس طبع دوں رواج گرفت  
عناں کسب کمالات سوی ناں گردید  
اس زمانے میں انتہائی پست ذہنی اور دون طبعی کی وجہ سے کمال اس لئے حاصل کیا جاتا ہے کہ  
اس کے ذریعہ روزی روٹی کمائی جائے۔

ادبی حالات:

ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کے رواج اور اس کی ترقی پر ڈاکٹر علی اصغر حکمت نے بہت  
تفصیل سے بحث کی ہے ذیل میں اس کے کچھ مخصوص حصے کا خلاصہ پیش ہے:

”غزنوی اور تیموری سلاطین اور ترک تیموری امراء سب اپنے اپنے اصل مراکز میں فارسی  
زبان میں ہی بات کرتے تھے اس لئے انہوں نے اس زبان و ادب، رسم و رواج اور  
تہذیب و تمدن کو بھی اپنے ہمراہ ہندوستان لانے کی کوشش کی۔

مسلمانوں کی فتوحات کے ذریعہ فارسی زبان و ادب اور ایرانی فلسفہ و تمدن کی اشاعت  
پنجاب اور دہلی کے راستے گجرات، مالوہ، اور گنگا کی گھاٹی تک پورے ہندوستان میں ہوئی  
ناگزیر تھی۔ حملہ آور مسلمانوں کے دوش بدوش مقامی ہندو باشندے بھی ایرانی زبان سیکھنے



اور نظم و نثر میں انکی پیروی کرنے لگے، بالکل اسی طرح جیسے ادھر آخری صدیوں میں انگریزی دور حکومت میں اس ملک میں انگریزی زبان و ادب کو اس کے شایان شان مقام و مرتبہ حاصل ہوا اسی طرح مسلمانوں کے دور حکومت میں فارسی زبان کو بھی سرکاری، ادبی اور دینی زبان کا مرتبہ حاصل تھا۔ جہاں جہاں اسلامی سپاہی یا مسلمان تاجرانے قدم رکھا ان کے ہمراہ مشائخ طریقت اور ائمہ دین نے بھی تعلیم و ارشاد کا سلسلہ جاری رکھا۔ کشمیر، پنجاب، شمالی ہندستان بلکہ مشرقی بنگال کی سرحد تک بہت سے برہمنوں اور دانشوروں نے فارسی زبان و ادب کا مطالعہ کیا، اس میں تحریر و تقریر کی صلاحیت پیدا کی اور اس میں کمال حاصل کیا۔ بالفاظ دیگر ہندستانی مسلمانوں نے قرآن مجید اور احادیث نبوی کی شناخت فارسی زبان کے ذریعہ حاصل کی اور دینی علوم و ادب ان عالموں اور فقیہوں کی خدمت میں سیکھے جو ایران اور مادراء النہر سے یہاں آئے تھے۔“ (۳۱)

غرض کہ سلاطین خصوصاً تیموری سلاطین کی حمایت اور سرپرستی کے نتیجے میں ایرانی زبان و ادب کو ہندوستان میں غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔ خاص طور سے مشہور مغل بادشاہ شاہجہاں جس کے عہد میں ادبی سرگرمیاں نقطہ عروج کو پہنچ چکی تھیں، ایک طرف خود ہی اچھے کردار کا حامل اور مطالعہ کا شوقین تھا اور قلمی نسخوں پر حاشیے اور تعلیقات لکھا کرتا تھا تو دوسری طرف داخلی امن و امان اور درباری سرپرستی و حوصلہ افزائی کے نتیجے میں آسمان علم و دانش پر بہت سے ستارے اپنی تابانی دکھانے لگے۔ عبدالقادر کا بیان ہے:

”اپنے عہد حکومت میں شاہجہاں نے عالموں اور شاعروں کو سونے سے تولاد اور بے حساب جواہرات، انعامات اور صلے ان کو دیئے۔ چنانچہ حاجی محمد جان قدسی کا منہ سات دفعہ بیش بہا جواہرات سے بھر دیئے۔ کلیم، قدسی، باقیا اور سعید ای گیلانی وغیرہ کو شاعری میں کمال کی وجہ سے سونے سے وزن کر کے ان کے ہم وزن سونا ان کو دیا۔ مشہور عالم وقت مولوی عبدالکلیم سیالکوٹی کو دو دفعہ میزان عنایت پر تول کر ساڑھے چھ ہزار روپے ان کو عطا کئے۔ اسی طرح قاضی محمد اسلم کو ساڑھے چھ ہزار روپے دئے۔ مولف ”شاہ جہاں نامہ“ شیخ عبدالحمید لاہوری کو سونے سے تول کر ان کو ان کے ہم وزن رقم مبلغ تین ہزار روپے دئے۔ مشہور گلوکار جگن ناتھ مخاطب بہ ”مہاراج“ کو بادشاہ کی تعریف میں انوکھے معانی اور مختلف راگ پر مشتمل دھر پد تصنیف کرنے پر اس کے ہم وزن رقم ساڑھے چار ہزار روپے اس کو دیئے۔ رنگ خان موسیقار کو بھی اس کے ہم وزن رقم مبلغ سات ہزار روپے دیئے

..... غرض اس عالی مرتبہ بادشاہ کی اس طرح کی داد و ہش شمار سے باہر ہے اس کی تفصیلات ”شاہجہاں نامہ“ میں موجود ہے۔ بادشاہ خود بھی باذوق تھا اور تصوف و موسیقی کے علاوہ دوسرے علوم و فنون اور شجاعت و بسالت میں بھی یکتائے روزگار تھا۔“ (۳۲)

اورنگ زیب کے عہد میں عام خیال یہ ہے کہ مذہبی تعصب اور اسلامی احکام سے اس کے والہانہ تعلق اور دلچسپی کی وجہ سے شاعری کے بازار کی رونق رخصت ہو گئی حتیٰ کہ ملک الشعراء کا عہدہ جس کا اکبر کے وقت سے رواج چلا آ رہا تھا، اورنگ زیب نے بیک قلم موقوف کر دیا۔ اور شاعروں کے وظیفے منسوخ کر دیئے۔ اسی وجہ سے ایرانی شاعروں کی آمد کا سلسلہ جو عہد شاہجہاں تک جاری تھا بلکہ اس عہد میں کچھ بڑھ گیا تھا، موقوف ہو گیا۔ صرف ہندی نژاد شعرا یہاں تھے اور وہ بھی بہ قول شبلی نعمانی کچھ زیادہ اہمیت کے حامل نہ تھے۔

لیکن تلاش و جستجو سے پتہ چلتا ہے کہ شاعروں کے بارے میں اورنگ زیب کی بے اعتنائی اور سردمہری کے باوجود یہاں کی فضا شاعروں سے خالی نہ تھی۔ البتہ شاعری نے اپنی جگہ بدل دی تھی اور شاعری دربار سے نکل کر عوام کے گھروں میں داخل ہو گئی تھی۔ اس لئے لازمی طور پر اس کے محرکات، مضامین اور مواد اور ہیئت سب کچھ بدل گئے۔ عہد اورنگ زیب کے شاعروں کی تعداد سابق سلاطین کے عہد کے شاعروں کی تعداد سے کسی طرح کم نہیں تھی بلکہ کچھ زیادہ ہی تھی حتیٰ کہ شاہی محل میں بھی شاعری کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے محمد ساقی کا بیان ہے:

”نثر و انشاء کے مختلف اسالیب پر بادشاہ (اورنگ زیب) کو پورا عبور تھا اور نظم و نثر فارسی میں اسے مکمل مہارت حاصل تھی لیکن آیت کریمہ (”الشعراء یجبہم الغاوان“ شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں) سے تمسک کرتے ہوئے غیر مفید شعر سننے کی طرف ان کی طبیعت مائل نہیں تھی مدحیہ اشعار سننا تو دور کی بات ٹھہری۔ ہاں جس شعر میں کوئی نصیحت کی بات ہوتی اس سے ضرور محظوظ ہوتے تھے۔

مکرہ بہر رضا خدائے عز و جل نہ چشم سوی غزالاں و نہ گوش سوی غزل (۳۳) محمد ساقی کے بیان سے ظاہر ہے کہ شاعری کے بارے میں اورنگ زیب کی بے اعتنائی درحقیقت اس آیت کریمہ پر مبنی تھی جس میں شاعروں کی پیروی کو گمراہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود پند و نصیحت پر مشتمل موزوں اشعار سے وہ بھی متاثر ہوتا تھا۔ چنانچہ اس قسم کے بہت سے اشعار اس نے اپنے رفعت میں استعمال کئے ہیں جن کی تعداد تقریباً ۸۰ ہے ان میں حافظ، سعدی، رومی حتیٰ کہ بیدل کے بھی اشعار ہیں۔ اس کے علاوہ خود بھی شعر کہا کرتا تھا چنانچہ عبدالقادر خاں نے اس کا درج ذیل



نقل کیا ہے۔

غم عالم فراوان است و من یک غنچہ دل دارم چہاں در شیشہ ساعت کم رنگ تماشا را (۳۳)  
ایسے شواہد موجود ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مختلف مناسبات سے اور رنگ زیب بعض شاعروں کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ مرزا روش ضمیر کے بارے میں نقش علی رستم ”باغ معانی“ میں لکھتا ہے۔

”عالمگیر بادشاہ کو جب حفظ قرآن کی توفیق ہوئی تو مرزا نے یہ رباعی کہہ کر پیش کیا۔

محی الدینی و مصطفیٰ حافظ تو صاحب سیفی و مرتضیٰ حامی تو  
(تو دین اسلام) زندہ کرنے والا ہے اور محمد مصطفیٰ ﷺ تیرے محافظ ہیں۔ تو صاحب سیف ہے اور مرتضیٰ تیرے مددگار روحا ہی ہیں۔)

تو حامی شرع و حامی تو شارع تو حافظ قرآن و خدا حافظ تو  
تو شریعت کا حامی ہے اور شریعت تیرا محافظ ہے تو قرآن کا حافظ ہے خدا تیرا حافظ ہے۔  
شعر و شاعری سے دلچسپی نہ ہونے کے باوجود بادشاہ نے سات ہزار روپے اسے انعام میں دئے۔“ (۳۵)

علاوہ ازیں اورنگ زیب کی لڑکی زیب النساء، جس کا تخلص مخفی تھا، ایک خاتون شاعرہ کی حیثیت سے کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ اس کا استاد سعید اشرف ایرانی تھا۔ مرزا محمد شیرازی، جس کا تخلص عالی تھا اور جو نعمت خاں عالی کے نام سے مشہور ہے اورنگ زیب کے باورچی خانے کا داروغہ تھا۔ عالی ایک مشہور ادیب اور شاعر تھا۔ سید حسین خالص، رفیع خاں باؤل، شکر اللہ خاں خاکسار، عاقل خاں رازی، ایزد بخش رسا، مولانا عبدالعزیز عزت اور میر محمد زمان راسخ یہ سب وہ شعراء و امراء ہیں جو اورنگ زیب کی دستگاہ حکومت میں مختلف عہدوں پر فائز تھے اور امارت کے ساتھ ساتھ اچھے شاعر و ادیب تھے۔

عہد اورنگ زیب کے جن شاعروں کا تذکرہ میں نام ہے اور جن کے کلام کے نمونے یاد و اوین دستیاب ہیں ان کی تعداد سو سے اوپر ہے ان میں تقریباً ساٹھ تو ایسے شاعر ہیں جن کے دواوین اور نمونہ کلام موجود ہیں۔ اس میں سے ہر ایک کے متعلق ڈاکٹر نور الحسن انصاری مرحوم نے اپنی کتاب ”فارسی ادب بہ عہد اورنگ زیب“ میں تفصیلی بحث کی ہے۔ ان ہی شاعروں میں مرزا عبدالقادر بیدل، ناصر علی سرہندی، راسخ، عاقل خاں رازی، نعمت خاں عالی، عبد الجلیل واسطی بلگرامی، غنی کشمیری، غنیمت کنجاہی، اشرف مازندرانی، مرزا مبارک اللہ واضح، رفیع خاں باؤل، خالص اصفہانی، فطرت موسوی، بنیش کشمیری، عطا ٹھٹھوی وغیرہ وہ شعراء ہیں جن کا شمار اس عہد کے اساتذہ میں ہوتا ہے۔ (۳۶)

اعظم شاہ جو اپنی شاہزادگی کے زمانے میں مختلف صوبوں میں صوبے دار کے عہدے پر فائز رہا، اس کے ہمراہ بھی شاعروں کی ایک جماعت تھی۔ خوشگو کے مطابق حاجی اسلم سالم، شیخ حسین شہرت، میر محمد زمان راسخ اور مرزا بیدل اس کے درباری شاعروں میں تھے۔ اعظم شاہ انہیں بیش بہا خلعت اور نقد و انعام دیا کرتا تھا۔ وہ خود بھی اس فن کا قدردان اور ناقد اور ایک باذوق بادشاہ تھا۔ ہندی زبان میں نہایت اچھے اشعار کہا کرتا تھا خاص طور سے فنون لطیفہ موسیقی، رقص اور جواہرات کی شناخت میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ (۳۷)

شاہ عالم بہادر شاہ بھی علم و فضل سے بے بہرہ نہ تھا (۳۸)۔ جہاں تک شاعروں کی سرپرستی کا تعلق ہے، اس کے متعلق اگرچہ کچھ زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ تاہم بیدل سے مغلیہ سلاطین کا ”شاہنامہ“ لکھنے کی فرمائش جس کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے، یہ بتاتی ہے کہ وہ بھی بڑے اور ممتاز شاعروں کی سرپرستی کرتا تھا۔ اس کی مختصر مدت سلطنت کو ادبی سرگرمیوں سے بالکل خالی نہیں کہا جاسکتا۔ عہد بہادر شاہ کے نامور شاعروں میں سید حسین خالص اور مرزا ابوالحسن شیرازی کا نام لیا جاسکتا ہے۔

۱۱۲۳ھ بمطابق ۱۷۱۰ء میں شاہ عالم بہادر شاہ کی وفات کے بعد سات سال کے مختصر عرصے میں سیاسی اسٹیج پر زبردست انقلابات رونما ہوئے تاہم ملک کی فضا زبان و ادب کی ترقی کے لئے ناسازگار نہ تھی۔ بیدل کے دوستوں اور شاگردوں کی تفصیلی فہرست جس کا ہم مناسب جگہ پر آئندہ صفحات میں مطالعہ کریں گے، اس دعویٰ کی شاہد ہے۔ محمد احسن ایجاد، میر مقیمائی، میر عظمت اللہ بنجر، فضل علی خاں، میر محمد حسن ناٹی اور میر محمد ہاشم جرات کا شمار عہد فرخ سیر کے شاعروں میں ہوتا ہے۔ (۳۹)

صوبہ بہار کی علمی و ادبی حالت:

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بیدل کے جنم بھوم ”بہار“ کی اس وقت کی علمی و ادبی حالت پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔ کیونکہ بقول خود، اپنی زندگی کے ابتدائی اکیس سال اس نے بہار، بنگال اور آسیر کے مختلف مقامات کا دورہ کرنے اور وہاں قیام کرنے میں گزارے، وہاں کے مکاتیب میں تعلیم حاصل کی اور روحانی اساتذہ کی صحبت سے فیض اٹھایا۔

صوبہ بہار اس دور میں علم و دانش کے لحاظ سے کچھ کم اہمیت کا حامل نہیں تھا۔ کافی قدیم زمانے میں اس علاقے میں نالندہ (موجودہ ”بہار شریف“) میں ایک مشہور ترین درسگاہ علم و ادب کی اشاعت میں مشغول رہی ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کی علمی و ادبی سرگرمیاں علم دوست اور ادب نواز سلاطین کی بدولت بڑی حد تک قابل تعریف رہی ہیں۔ علی اصغر حکمت لکھتے ہیں:

”اسی صدی کے دور آخر میں جو پور میں خواجہ جہاں ملقب بہ ملک اشرف نے تغلق سلاطین کی طرف سے علم اقتدار بلند کیا۔ تیوری حملے کی وجہ سے دہلی کے تغلق سلاطین چونکہ کمزور ہو گئے اس لئے مذکورہ شخص نے مشرقی سلاطین، کے نام سے جو پور میں ایک مستقل حکومت کی بنیاد رکھی ان میں ابراہیم شاہ شرقی کی حکومت طویل اور پر شوکت رہی ہے۔

مشرقی سلاطین کے عہد میں جو پور میں زبان و ادب کو خاص فروغ حاصل ہوا۔ اسی طرح موسیقی اور شعر و شاعری کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ تا آنکہ جو پور ”شیراز ہند“ کے نام سے مشہور ہوا۔ وہاں کی بلند اور پر شکوہ مساجد اور مدارس ہنوز اس کے گواہ ہیں۔“ (۴۰)

علم و دانش کا یہ سلسلہ صوبہ بہار تک پھیلا۔ فارسی زبان و ادب کی بہار میں اشاعت اور ایرانی شاعروں کی آمد کے متعلق سید نجیب اشرف ندوی نے اپنے مقالہ ”عظیم آباد میں ایرانی شاعروں کی آمد“ میں مختصر جائزہ لیا ہے۔ ذیل میں اس کا اہم حصہ پیش ہے:

”اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ جس جگہ کسی چیز کی طلب اور مانگ ہوتی ہے وہ چیز متنوع صورتوں میں وہاں پہنچ جاتی ہے اور جس صوبہ یا شہر میں علم و فضل اور ہنر و کمال کا اعزاز و احترام اور اس کی قدر و ہمت افزائی کی جاتی ہے، وہی اصحاب علم و فضل اور ارباب کمال کا مرجع ہو جاتا ہے۔ تاریخ دوست اصحاب خوب جانتے ہیں کہ اس حیثیت سے پٹنہ ہمیشہ سے بیرونی علما و فضلا اور شعر و ادب کا ماویٰ و لجا رہا ہے، چنانچہ اس مضمون میں صرف ان چند ایرانی شاعر کا جو چار سال کے عرصہ قلیل میں یہاں آئے تذکرہ کیا جاتا ہے۔ ان میں سے بعض نے ہمیں توطن اختیار کر لیا، اور دراصل اس شے نمونہ از خردارے سے آپ اس جماعت کثیر اور گروہ عظیم کا اندازہ کر سکتے ہیں جو ۸ سو برسوں سے یہاں آتا اور یہاں کے ارباب ہم کے بذل و نوازش سے مستفید و مستفیض ہوتا رہا ہے۔“

مرزا محمد صادق بن مرزا محمد صالح الاصفہانی الاوانی عہد شاہجہاں کا ایک ممتاز مورخ، ادیب اور شاعر گذرا ہے، اس کا باپ عہد جہانگیر میں شہزادہ پرویز اور شہزادہ خرم کی ملازمت میں تھا، اور اسی سلسلہ میں اسے تین مرتبہ پٹنہ آنا پڑا ہے، ہر دفعہ اس کا لڑکا صادق اس کے ساتھ تھا۔ صادق نے ان تینوں سفروں کا مفصل حال اپنی مشہور تصنیف ”صبح صادق“ میں درج کیا ہے۔

صادق، تیسری شعبان ۱۰۱۸ھ (۱۶۰۹ء) کو اتوار کے دن گجرات کے مشہور شہر سورت میں پیدا ہوا اور ابھی گیارہ سال کا تھا کہ اس کے باپ کو ملازمت کے سلسلہ میں پٹنہ آنا پڑا، چونکہ لڑکے کی تعلیم و تربیت ضروری تھی اس لئے وہ بھی ساتھ آیا ۱۰۲۹ھ سے ۱۰۳۳ھ تک یہاں رہا۔ اس نے متعدد کتابیں

لکھی ہیں، جن میں صبح صادق، طبقات شاہجہانی شاہجہاں نامہ، شاہد صادق وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر تصنیف میں اس نے ان تمام علماء اور شعراء کا جن سے وہ ملا ہے اور جن سے اس نے استفادہ کیا ہے، حال لکھا ہے۔ چنانچہ اس چہار سالہ قیام کے سلسلہ میں جن لوگوں سے وہ ملا ہے، ان کے نام یہ ہیں۔

مولانا محمد معز الدین یزدی: یہ بزرگ یزد کے رہنے والے تھے، لیکن عرصہ سے پٹنہ میں مقیم تھے، معقولات میں خاص شہرت رکھتے تھے۔

مولانا عبدالشکور: یہ بھی ایک مشہور ایرانی عالم تھے اور کتب متداولہ کی تعلیم و تدریس کے لیے خاص طور سے مشہور تھے، ۱۰۳۵ھ میں ایک بد معاش کے ہاتھ سے قتل ہوئے، یہ شاعر بھی تھے ان کا ایک شعر یہ ہے۔

دے کہ جان دم بہدن نغمہ نے است آہے کہ خاک بر سر آتش کند می است  
مولانا محمد حسین کشمیری علم معقولات میں کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ عرصہ تک پٹنہ میں افتاء و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے اور ۱۰۳۵ھ ہجری میں یہیں پیوند خاک ہوئے۔

مولانا محمد حسین قزوینی مشہور خطاط تھے اور مرزا صادق نے ان سے فن کتابت میں تعلیم پائی تھی۔ سیرتی تخلص کرتے تھے عرصہ تک پٹنہ میں قیام رہا پھر وہاں سے حج کے ارادہ سے لاہور گئے تذکرہ معقولات میں ہے:

”متصف ہنکے آفرینی و طبعش مجبول بہ رنگین در خوش نویسی دست داشت و از وطن بہ ہندوستان قدم برداشت و از حضور شہزادہ پرویز بن جہانگیر بادشاہ بمبھی سرفرازی یافت و بعد وفات شاہزادہ مدتی در عظیم آباد و بنگالہ اقامت گزیدہ از انجا بزیارت حرمین شریفین شتافت۔“

نمونہ کلام یہ ہے:

زابل جہاں خاطر مگر یزان است بخانہ کہ سرے می کشم گریبان است

☆

گرد پاک از تہمت آلودہ دامانے مرا سخت چسپاں ست برتن دلق عریانی مرا

☆

بر آستان تو شبہا فتادہ ام چوں نقش پائے خویشین از پا فتادہ ام  
حکیم عارف لائچی۔ مرزا صادق کا بیان ہے کہ وہ اکثر میرے والد ماجد کے پاس آیا کرتے

تھے، وہ مشاہیر شعرائے زمانہ سے تھا اکبری عہد میں وطن مالوف سے ہند آیا تھا، کچھ دنوں تک جہانگیر کے پاس رہا، آخر پٹنہ میں سکونت پذیر ہو گیا تھا۔ میں نے ۱۰۳۱ ہجری میں دیکھا تھا، ۱۰۳۵ھ میں مرا، نواب علی خاں کا بیان ہے کہ:

”از پرگوایاں شاعر مشاعر است و بر طریقہ قدما مرامست، در عہد اکبری بہند آمدہ تمسک ذیل جہانگیر دست کشود و در عظیم آباد مسکن گرفتہ۔“

نمونہ کلام:

دوش در انداز زلف یار گرفتن بر من آساں نمود مار گرفتن  
جام بکف گیر و ز آفتاب بیا نور راہ سر تنج کو ہزار گرفتن

رباعی

ایں عمر کہ از پنج ہشتاد گذشت یادش چہ کنی کہ شاد و ناشاد گذشت  
در آب دو سالہ شستی انداز مگر در آب بیابی آنچہ بر باد گذشت  
حکیم مولانا نادم گیلانی اولاد وطن سے دکن آیا پھر وہاں سے پٹنہ پہنچا، مدت تک پٹنہ میں رہا۔

غلام علی آزاد سرو آزاد میں لکھتے ہیں:

”سرخوئی معرکہ شعراء است، اما از شکست نفس نادم تخلص می گزیند، و صدر آرائے مجلس نصحا است، لیکن از فروتنی در صف آخری نشیند، لکن طلق اللسان بود و اسبق از را کھان مضممار زبان آوری می ربودہ از دیار خود ہمالک دکن افتاد..... و از اں جا بہ عظیم آباد پٹنہ حرکت کرد۔“

انتخاب کلام یہ ہے:

در کعبہ اگر دل بسوی یار نباشد احرام کم از بستن ز ناز نباشد  
ہر گز ایں طفل مزاجی نرود از خاطر گر بتابوت روم شوخی گہوارہ کنم  
باعث جلوہ گل دیدہ بیدار من است بلبلان شور بر آرید کہ خواہم نبرد  
ہنوز رگ طفلی ہست گل چیدن نمی دارد بدامن آشیان بلبل از گلزار می آید  
مرزا قاسم امامی اصفہانی سراجی لطیف الطبع تھا۔ فن موسیقی میں مہارت تامہ رکھتا تھا، مرزا

صادق کے والد کے دوستوں میں تھا، اس کے دو شعر یہ ہیں:

بس در خم و بیج سر کشیدیم چو آب نالاں نالاں بے دودیدیم چو آب  
چوں از منزل نشان ندیدیم چو آب در آبلہ دل آرمیدیم چو آب  
میر یحییٰ بن ہاشم قتی اکابر سادات عراق سے تھا، اولاد وطن سے ہند میں وارد ہو کے کئی سال تک دکن میں رہا عہد جہانگیر میں اوڑیسہ کی دیوانی و بخشی گری پر مامور ہوا، وہاں سے معزول ہو کر پٹنہ آیا۔ اس کا صرف ایک شعر ہم تک پہنچا ہے:

آں خیال سیہ نبود بر گوشہ چشم تو افتادہ سیہ مستی در گوشہ میخانہ خلف او  
میر ہاشم مرزا صالح کے دوستوں میں تھا اور عرصہ تک پٹنہ میں مقیم رہا۔

ملا ایراہیم حسین کابلی لطیف المزاج و مجسم اخلاق تھا۔ ویری تخلص کرتا تھا، شاہزادہ پرویز کی خدمت میں زندگی بسر کرتا رہا، خوشخبر خاں خطاب پایا تھا، شاہزادے کی وفات کے بعد صاحب قراں کی خدمت میں آیا، مرحمت خاں کے خطاب سے سرفراز ہوا، ۱۰۴۰ھ میں فوت ہوا۔

پوشید ہمیشہ مصحف اور از چشم من زانساں کہ روز ابر ز بار اں کتاب را  
باقی۔ مرزا صادق اس کے متعلق لکھتا ہے:

”انہیں ایام میں باقی شاعر و مشاہیر شعراء سے ہے آیا، پھر پٹنہ سے جو پور گیا، شعر گوئی میں اچھا سلیقہ و ملکہ رکھتا تھا، اور فن موسیقی میں بھی لیاقت و مہارت سے موصوف تھا۔..... جب صاحب قراں پٹنہ میں پہنچا تو اس وقت دوبارہ بادشاہ کی خدمت میں آیا۔“

بسیار آمد و از محبت ماست رفت حیف چوں عمر یکہ در غم بگذرد از دست رفت  
محمد لطیف لطفی، ملا سلطان محمد التخلص بہ زاہدی کا لڑکا تھا، زاہدی بقول صاحب صادق، دیوانہ کی و خاقانی کا حافظ تھا، صبح گلشن نے اس کے دو شعر نقل کئے ہیں:

سوز سینہ فریاد از دل ناشاد بر خیزد بلے در خانہ آتش چوں فتد فریاد بر خیزد  
زلف و رخ و بالا بہر جا بگذری آنجا ہمہ سنبل دمد، گل بشکفت، شمشاد بر خیزد  
مرزا محمد طاہر میری سخداں صائب طبعان میں ہے ہیں، ابتدائی جوانی میں اپنے وطن طالقان سے منڈ آیا، اور سیر و سیاحت کے سلسلہ میں دو مرتبہ پٹنہ بھی آیا ہے، صاحب صبح گلشن کا بیان ہے۔

”شعلہ اواز گرمش منیر دل گرم طبعان در عہد جوانی بوطن خیر باد گفتہ روسوئے ہندوستان نہاد

در سیاحت ہند بر پٹنہ ولا ہو روا کبر آباد و ملک دکن گذارش افتاد۔ من اشعارہ

یاد گفت دلم تا بلب ز آہ تمام درون من شدہ چون دود کش سیاہ تمام  
یک نگاہ بمن لاف التفات مزین نکرد دعویٰ خود کش بیک گواہ تمام

مرزا عبدالقادر بیدل، حیات اور کارنامے (جلد اول)

بنائے صورتش ایزد با احتیاط نہاد چنانکہ ابروی او کرد در دوامہ تمام  
ان کے علاوہ مرزا صادق نے میر محمد سعید نفیسی، ضیا وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے لیکن طوالت کے  
خیال سے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ دراصل عظیم آباد کی ہی مرکزیت تھی جس نے تمام ارباب علم و ادب کو  
اپنی طرف کھینچ رکھا تھا اور یہی سبب تھا کہ عظیم آباد، رشک دہلی و اکبر آباد تھا اور اپنی شعراء کی صحبتوں کی  
برکت سے خود عظیم آباد میں فارسی کے بڑے بڑے شعراء پیدا ہوئے۔ (۳۱)

\*\*\*

## باب دوم

# بیدل کے حالات زندگی

سرگزشت من ز مطلب بے نیاز افتادہ است  
بر حریقاں گر نخوانم آنقدر ہا فرض نیست

[ہے سرگزشت میری مطلب سے بے نیاز  
لازم نہیں کہ ذکر کروں دوستوں سے میں]

بدامن می خرامد وحشی صحراے دل  
سرایے دل کا وحشی الجھا ہے دامنوں سے  
ای داریم و نحو پردہ گوش خودیم  
اک نالہ ہے سودہ بھی پردے میں گوش کے ہے  
مہم چون نکلے بیدل بجزرانی سرگزشت  
انسانی عمر حیرت میں سراسر میں نے اے بیدل  
آنچہ ما پیمودہ ایم از ملک طول و عرض نیست  
بتی کا ہے نہیں ربط دنیائے آب و گل سے  
شوق مارا بر کسی دیگر دماغ عرض نیست (۱)  
اک شوق ہے سودہ بھی قابو میں ہوش کے ہے  
گوہنے چشمی نہ شد پیدا کہ جا پیدا کنم (۲)  
کوئی گوشہ نہیں ایسا کہ جس کو آشیاں سمجھوں

بیدل کے والد کا نام مرزا عبدالخالق تھا۔ ان کا کس خاندان سے تعلق تھا اس سلسلے میں تذکرہ  
روں کے چار اقوال ہیں: ۱۔ ارلاس (شیر خاں لودھی، خوشگو، آزاد بلگرامی، قدرت اللہ گوپاموی (۶)  
۲۔ برلاس (حسین قلی خاں، احمد علی سندیلوی (۷) ۳۔ ارلات (ابراہیم خاں خلیل، عشرت (۸)  
۳۔ ادلائی (خاں آرزو) (۹)۔ جان رپکانے صدر الدین عینی کے حوالے سے لکھا ہے کہ ”ازبک“  
خاندان سے اس کا تعلق تھا۔ (۱۰)

ان میں سے کونسا قول زیادہ درست ہے؟ پٹنہ یونیورسٹی شعبہ تاریخ کے مشہور پروفیسر اور مؤرخ  
ڈاکٹر سید حسن عسکری صاحب مرحوم نے اس سوال کے جواب میں فرمایا:  
”برلاس زیادہ صحیح ہے۔ جاپان میں اس قبیلے پر ایک مقالہ بھی لکھا گیا ہے۔“

تاریخ پران کی گہری اور وسیع نظر کی وجہ سے ان کے قول پر اعتماد کیا جاسکتا ہے لیکن ایک  
تحقیق کو اتنے مختصر جواب سے تسلی نہیں ہوتی، خصوصاً اس لیے کہ بہت سے دانشوروں کا اس میں  
الفاظ ہیں۔

ڈاکٹر عبدالغنی نے اس موضوع پر اس طرح بحث کی ہے جس سے تحقیق کے ایک طالب علم کو  
بیک تک تسفی ہوتی ہے۔ ان کے خیال کا خلاصہ یہ ہے:

”جس بات پر زیادہ اعتماد کیا جاسکتا ہے وہ صاحب مرآۃ الخیال شیر خاں لودھی کا قول ہے۔  
انہوں نے اپنے تذکرے میں بیدل کا حال لکھنے کے بعد اسے بیدل کے پاس بھیجا اور  
بیدل نے اپنے بارے میں لکھی گئی باتوں پر اطمینان حاصل کر کے واپس کیا۔ اس میں  
ان کی نسبت قبیلہ ”ارلاس“ کی طرف کی گئی ہے۔ ارلاس مغلوں کا ایک قبیلہ تھا۔ لہذا قبیلہ  
ارلاس اگرچہ اس کی شہرت کم ہو مگر اسی سے بیدل کا تعلق تھا پھر یہ کہ خوشگو کے بیان سے بھی  
جس نے بیدل سے ایک ہزار سے زیادہ دفعہ ملاقات کی ہے، اس کی توثیق ہوتی ہے۔“ (۱۱)

لیکن فارسی فرہنگوں اور انسائیکلو پیڈیا کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ”ارلاس“ فلک عطار کی  
شعر کہتے ہیں (۱۲) ڈاکٹر عبدالغنی نے ایک ترکی لغت ”نور الابصار“ مصنفہ رائے دھن کے حوالے سے  
سے کوہ ایک مغل قبیلے کا نام تھا (۱۳) لیکن اس کے علاوہ کہیں بھی کسی قبیلے کے نام کی حیثیت سے  
کئی تذکرہ نہیں ملتا ہے اور نہ کسی قبیلے کے نام سے اس کی لغوی اور تاریخی مناسبت ہے خصوصاً  
تاریخ نويس سراج الدین علی خاں آرزو نے سارے تذکروں سے الگ بیدل کے قبیلے کا نام  
”ارلاس“ لکھا ہے، (مخطوطہ خدا بخش لاہوری پٹنہ، ڈاکٹر عبدالغنی نے پتہ نہیں کہاں کے قلمی نسخے سے  
”نقل کیا ہے) ہو سکتا ہے کہ ارلات ہی ہو ہو کہ تب سے ”ادلائی“ لکھ گیا ہو کیونکہ ”ادلائی“ کا

مرزا عبدالقادر بیدل کے حالات کے سلسلے میں تذکرہ نگاروں کے بیان میں اتنا اختلاف ہے  
کہ تہا ان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ مشہور معاصر ایرانی نقاد حسن حسینی کا خیال صحیح ہے کہ:  
”کار معرنی بیدل را یکسرہ بہ تذکرہ ہای گذشتہ گاہا واکذا در تذکرہ ہای کہ مترشح و مکلف  
آنها جزو جمع کردن کتاب و ابطال اوقات خوانندہ و سلب اعتماد او ثمرہ ای نداشته و  
نخواہداشت“ (۳)

بیدل کے تعارف کا کام صرف گزشتہ تذکرہ نگاروں کے بیان کی اساس پر نہ کیا جائے یہ  
تذکرے ایسے ہیں کہ کتاب کو ضخیم بنانے، قارئین کے وقت کو ضایع کرنے اور ان کے اعتماد کو سلب  
کرنے کے سوا کوئی اور حاصل اس کا رہا ہے اور نہ رہے گا۔

خوش قسمتی سے اس عظیم شاعر کی کچھ نثری تصانیف بھی ہیں جن میں اپنی زندگی کے مختلف  
(اگرچہ غیر مرتب) حالات کا ذکر کیا ہے یا کم از کم ان کی جانب کچھ اشارے کئے ہیں۔ یہ تصانیف  
ہمارے کام کو بڑی حد تک مستند اور قابل اعتماد بنادیتی ہیں۔ یہ ہیں چہار عنصر، رقعات، تاریخی قطعے اس  
کے علاوہ اپنی مثنویوں، غزلوں اور قصیدوں میں بھی جا بجا اس کی طرف اشارہ کئے ہیں چنانچہ ایک شعر  
میں کہتا ہے

گرہ کشای سخنور خن بود بیدل بناختی نقد کار لب کشودنہا (۴)  
کلام شاعر میں ہو گرہ گر، کھلے گی اس کے کلام ہی سے کہ لب کشائی نہیں ہے ممکن کرے کوئی ناخنوں سے

خاندان بیدل:

بیدل اگرچہ حسب و نسب کی اہمیت کے قائل نہیں تھے۔ ان کا خیال ہے،  
عدم گفتن کفایت می کند تا آدم و حوا دگر ای ہرزہ! درس وہم طومار نسب مکتفا (۵)  
[عدم کی گفتگو تا آدم و حوا پہنچتی ہے پھر اے بیہودہ طومار نسب کا ذکر ہے کیا  
تا ہم علمائے نفسیات کا خیال ہے کہ زندگی کی راہ و روش کی تعیین میں نسلی خصوصیات کا بھی  
اہم رول ہوتا ہے، چنانچہ پیشہ ”سپہ گری“ کو اپناتے وقت خود بیدل نے اعتراف کیا ہے کہ میں نے ا  
آبا کی روایت کی پیروی کی ہے۔

کسی فرہنگ میں کوئی ذکر نہیں ملتا ہے۔ البتہ ”ارلات“ کے بارے میں ڈاکٹر عبدالغنی نے ”Institute of Timur By Davy“ کے حوالے سے لکھا ہے:

”کہتے ہیں کہ چنگیز خاں کے باپ کی وفات کے بعد اس کی ماں منگھک ایز کہ نامی ایک شخص سے شادی کر لی منگھک ایز کہ کے دوسرے لڑکے کا نام ”ارلات“ تھا اور اس کی اولاد بھی اسی نام سے یاد کی جانے لگی۔“ (۱۳)

”ادلای“ کا جہاں تک تعلق ہے کسی بھی فرہنگ یا لغت کی کتاب میں نہیں ملا۔ پانچواں قول یہ ہے کہ بیدل کا تعلق ”ازبک“ قبیلے سے ہے اس کا تذکرہ جان رپکا Jan Rypka نے تاریخ ادبیات ایران میں خواجہ صدرالدین عینی کے حوالے سے کیا ہے۔ صدرالدین عینی ایک مشہور تاجیکی ادیب ہیں اور پہلے آدمی ہیں جنہوں نے روس میں بیدل کا مطالعہ کیا اور اس پر اپنی مستقل کتاب بہ نام ”بیدل“ لکھی ہے۔ ان کا تاخذ کیا رہا ہے معلوم نہیں جہاں تک راقم السطور نے اس کی تحقیق کی کسی بھی تذکرے میں اس کا تذکرہ نہیں ملا۔ ممکن ہے ان کو غلط فہمی ہوئی ہو جیسا کہ بیدل کی مادری زبان کے بارے میں انہوں نے ”بگالی“ لکھا ہے۔

تذکرہ نگاروں میں سات لوگ ایسے ہیں جن کا بیدل سے براہ راست تعلق رہا ہے اور اس سے ان کی ملاقات ثابت ہے۔ شیرخان لودی کو اس لحاظ سے کہ اس نے اپنی تحریر بیدل کی نظر سے گزار کر اس پر مہر تصدیق ثبت کرا دی ہے، فوقیت حاصل ہے۔ دوسرا بند رابن داس خوشگو ہے جو بیدل کا شاگرد اور سفینہ خوشگو کا مؤلف ہے۔ اور بہ قول خود ایک ہزار سے زیادہ دفعہ بیدل کی صحبت میں حاضری دی اور اس سے استفادہ کیا ہے۔ ان دونوں نے بیدل کے قبیلے کا نام ”ارلاس“ لکھا ہے۔ تیسرے خان آرزو ہیں جو اپنی تصریح کے مطابق دو دفعہ بیدل کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ انہوں نے بیدل کے قبیلے کا نام ”ادلای“ لکھا ہے۔ چوتھے شاہ محمد شفیع وارد طہرانی ہیں جو اپنے بیان کے مطابق جو کچھ بیدل سے سنا من وعن اسی طرح اپنے تذکرے ”مرآت واردات“ میں لکھ دیا۔ وہ لکھتا ہے: ”بیدل کے اجداد سلسلہ منصور بن مظفر، بادشاہ فارس اور مدوح خواجہ حافظ شیرازی تک پہنچتا ہے“ ان کے علاوہ اس سرخوش صاحب کلمات الشعراء، عظمت اللہ بیخبر صاحب ”سفینہ بیخبر“ اور سید محمد بن عبد الجلیل صاحب ”تہذیب الناظرین“ میں جو بیدل کے معاصر اور اس کی صحبت یافتہ ہیں اور مؤخر الذکر تو شاگرد ہیں، ان لوگوں نے اس سلسلے میں سکوت اختیار کیا ہے۔

جہاں تک لفظ ”برلاس“ کا تعلق ہے ناظم الاطباء صاحب ”فرہنگ نفیسی“ لکھتے ہیں:

”مرد لاوار و بہادر و پاک نژاد“ (۱۷) بہادر و دلیر اور پاک نسل کا آدمی۔“

فضل اللہ ”لغت ترکی بفارسی“ میں لکھتے ہیں:

”برلاس“ بفتح با و سکون رای مہملہ و فتح لام با الف و سکون یعنی قومی از الوس چغتائی جوان و شجاع“ (۳)

”برلاس“ با پر فتح را پر سکون اور لام پر فتح کے ساتھ الوس چغتائی کی ایک جوان اور بہادر قوم کا نام ہے۔ اس قبیلے کی تاریخ اور اصل وابتداء کے سلسلے مرزا عبدالقادر خان قراچا مصنف ”ادیماق مغل“ لکھتے ہیں:

”ایرودجی برلاس کی وفات کے بعد اس کا لڑکا تخت پر بیٹھا اور اسے برلاس یعنی جونسلی طور پر بہادر ہو، کا لقب ملا اس کے ۲۹ لڑکے تھے۔ اس کی ساری اولاد کو برلاس کہتے تھے اور یہی نام اس قوم کا طے پایا۔ یہ برلاسی قوم ایرودجی سے چلی۔ اسے ایرودجی اور ارودجی دونوں کہتے ہیں۔ ایرودجی کی وفات کے بعد اس کا لڑکا اس کا جانشین ہوا۔“ (۱۹)

تیموریوں کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بہت سے فوجی منصب دار ”برلاس“ سے تعلق رکھتے تھے مثلاً سلطان جنید برلاس اور سلطان سنجر برلاس جو سلطان حسین بامقرا کے امراء تھے۔ امیر شیخ عبداللہ برلاس اور امیر محمود برلاس شاہزادہ سلطان محمد کے امراء میں تھے۔ امیر ایم اور سلطان محمد برلاس سلطان محمد بدیع الزماں کے امراء میں تھے۔ سلطان جنید برلاس امیر ظہیر الدین محمد بابر شاہ غنیمت ہندوستان کے امراء میں تھا۔ بابر بادشاہ نے ان کو جو پور کا علاقہ بخشا تھا۔ امیر دولت خواجہ برلاس اور شاہ حسین برلاس بابر بادشاہ کے امراء میں تھے۔ محمد قلی برلاس اکبر کے عظیم امراء میں تھا، اس کا لڑکا فرید خان برلاس جہانگیر کے امراء میں تھا۔ پھر اس کا لڑکا مہر علی برلاس باپ کے منصب پر فائز ہوا۔ مرزا بیگ برلاس حاکم غور۔ (۲۱)

لفظ ”برلاس“ کے ان لغوی اور تاریخی حقائق کو پیش نظر رکھ کر اگر ملازمت کے سلسلے میں بیدل کے بیان ”ناچار متبع سنت آباء گردید و طریقہ سپاہ گزید“ (۲۲) کہ مجبوراً آبائی روایت کی پیروی کرنی پڑی اور یہ گری اختیار کی، پر غور کریں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ بیدل کا تعلق اسی خاندان سے تھا۔ کیونکہ ان کے والد مرزا عبدالخالق نے بھی کچھ دنوں تک سپہ گری کی لیکن تصوف کی طرف اپنے فطری میلان کی وجہ سے ترک کر دیا (۲۳) چچا مرزا قلندر بھی شاہ شجاع کی فوج میں ملازم تھے (۲۴) مرزا قلندر کے ایک عزیز مرزا عبداللطیف شاہ شجاع کے ایک فوجی دستے کے سردار تھے اور خود بیدل نے بھی ان کے ساتھ تھے مہینے ان کے فوجی دستے میں شریک ہو کر داد شجاعت دی تھی۔ (۲۵)

ہذا شیرخان لودی اور خوشگو کے بیان پر بیدل سے ان کے نسبتہ قریب ہونے کی وجہ سے اعتماد ”ارلاس“ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے جبکہ لغوی اور تاریخی حقائق سے بیدل کے بیان کی کامل

ہم انہی کے لحاظ سے لفظ ”برلاس“ کو ترجیح دیا جاسکتا ہے اور اس لئے پروفیسر حسن عسکری کا بیان دل سے لگتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ رہی یہ بات کہ بیدل کے آبا و اجداد، جنہوں نے کبھی تو ران اور ماوراء النہر میں زندگی گزاری تھی، کب ہندوستان آئے اور یہاں آکر کہاں بود و باش اختیار کی، اس سلسلے میں شاہ محمد شفیع صاحب تذکرہ ”مرآت و ادرات“ کے حوالے سے کچھ نرائن شفیق لکھتا ہے:

”سلسلہ اجداد میرزا فتہی بہ شاہ منصور بن مظفر بادشاہ فارسی مدوح خواجہ حافظ شیرازی می گرد۔ ہنگامیکہ شاہ منصور با میر تیمور صف آرائی نمودہ کشتہ شد، اولادش و اتحادش رو بصوب بخارا آوردند۔ چندین پشت میرزا در ماوراء النہر اقامت داشتند۔ بزرگوار میرزا ازان مکان مفارقت ورزیدہ در مملکت بنگالہ رحل اقامت آگند بعد انقضای یک پشت آفتاب وجود میرزا از مطلع صبح سعادت طالع گشت۔ (۲۶)

مرزا کے اجداد کا سلسلہ فارس کے حکمران اور خواجہ حافظ شیرازی کے مدوح شاہ منصور بن مظفر تک پہنچتا ہے۔ میر تیمور سے معرکہ آرائی میں جب شاہ منصور مارا گیا تو اس کی اولاد نے بخارا کا رخ کیا۔ مرزا کی کئی پشتیں ماوراء النہر میں گزریں پھر مرزا کے بزرگوں نے وہاں سے رخصت ہو کر بنگال میں بود و باش اختیار کی۔ ایک پشت گزرنے کے بعد مرزا کا آفتاب وجود مطلع صبح سعادت سے نمودار ہوا۔ شاہ محمد شفیع وارد کا بیان ہے کہ ۱۰۹۶ ہجری میں نواب شکر اللہ خاں سے وابستگی اور ان کی مکمل سرپرستی سے پہلے بیدل ڈیڑھ سال تک میرے گھر میں پوری فراغت کے ساتھ رہے تا آنکہ شکر اللہ خاں کا قاصد نارنول (میوات) سے آیا اور خط اور زری ان کے حوالے کیا تب وہ میرے والد سے رخصت ہو کر دوسرے مکان میں منتقل ہوئے۔ اور نسب کے سلسلے میں مرزا نے بارہا جس امر کا تذکرہ مجھ سے کیا وہ یہ ہے۔ (جو اوپر ذکر ہوا) (۲۷)

اگر واقعہ یہی صورت حال ہے تو اس سے معتبر اور مستند کوئی بات نہیں ہو سکتی لیکن خود بیدل کے بیان سے ”وارد کے گھر بیدل کے ڈیڑھ سالہ قیام“ کی تردید ہوتی ہے۔ ۱۰۹۶ء میں بیدل متھر اسے دہلی آئے اور فوراً شکر اللہ خاں کو لکھا کہ دریاے جمنہ کے کنارے کوئی گھریا تکیہ فراہم کریں (۲۸) اور یہ قول خوشگن نواب موصوف نے دورِ پوپہ پوپہ وظیفہ کے علاوہ پانچ ہزار روپے میں ایک مکان خرید کر ان کے حوالے کیا (۲۹)۔ نواب موصوف کا ۱۱۰۸ء میں انتقال ہوا تو ان کے بڑے بیٹے شکر اللہ خاں ثانی کے نام ایک تعزیتی خط میں نواب کی بارہ سالہ غیر معمولی حمایت دسر پرستی کا تذکرہ کر کے ان کی وفات پر بیدل نے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا (۳۰) اب اگر ۱۱۰۸ء میں بارہ سال گھٹائیں تو ۱۰۹۶ء نکلے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ متھر اسے آکر وہ براہ راست شکر اللہ خاں کے خرید کردہ مکان میں ٹھہرے اور ان کے

وظیفہ پر زندگی گزارنے لگے۔ اصولی طور پر جب مصنف اور تذکرہ نگار کے بیان میں اختلاف ہو تو مصنف کے بیان ہی کو ترجیح دی جاتی ہے۔ پھر یہ کہ وارد اور ان کے والد سے اگر بیدل کے اتنے ہی مہرے تعلقات تھے تو چار عنصر یا قطعات در قعات میں کہیں تو اس کا تذکرہ کیا ہوتا کیونکہ بیدل کی روش ہے کہ اپنے محسنوں کا تذکرہ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی عنوان سے ضرور کرتا ہے یہ دعویٰ چار عنصر اور قعات و قطعات کے مطالعہ کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔ ابھی حال میں ٹونک کے ایک کتب خانے میں بیدل کی ایک مثنوی بہ نام مثنوی ”سادہ و پرکار“ کا انکشاف ہوا ہے اس میں آخر میں ایسے اشعار ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے شاہ محمد شفیع سے بیدل کا دوستانہ تعلق تھا۔ یہ مثنوی در حقیقت ۳۱ اشعار پر مشتمل ایک قصیدہ شکل میں ہے جس کا عنوان ہے ”در تعریف سید عالی نسب والا حسب میر محمد شفیع سلمہ اللہ تعالیٰ“۔ اس میں محمد شفیع کے علم و فن، عرفان و حکمت اور فہم و فراست کی تعریف کرتے ہوئے محمد شفیع کو شاعر و ادیب بمنزلہ انوری و خجندی و ابوالفرج بتایا ہے جیسے

پایہ عرفاں ز وجودش رفیع      میر صفا کیش محمد شفیع  
تصوف کا پایہ میر صفا کیش محمد شفیع کے وجود سے بلند ہے۔

چوں رہ دشوار پسندی زند      طعنہ بر اشعار خجندی زند  
جب وہ شاعری میں دشوار پسند راہ اختیار کرتا ہے تو خجندی کے کلام کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔  
می رسدش دست سخن گستری      مہر بہ لب ابوالفرج و انوری (۳۱)  
شعری میں اسے یدِ طولی حاصل ہے کہ ابوالفرج اور انوری بھی اس کے سامنے مہرِ بلب ہیں۔

البتہ ہندوستان کی تاریخ کو پیش نظر رکھ کر، جیسا کہ پچھلے صفحات میں گزرا، یہ کہا جاسکتا ہے کہ مغل بادشاہ بابر (۱۴۸۱-۱۵۳۰ء) یا دوسرے مغل سلاطین کے ہمراہ جو برلاسی امراء ہندوستان آئے جن میں سے ایک سلطان چند برلاس بھی تھا اور جس کو بابر نے جو پور کا علاقہ بخشا تھا انہیں لوگوں میں بیدل کے آبا و اجداد بھی آئے ہوں گے اور ان کو بہار یا بنگال میں جاگیریں دی گئی ہوں گی۔

نام، تخلص اور تاریخ ولادت:

عبدالقادر نام، بیدل تخلص اور ابوالمعانی کنیت ہے۔ بیدل ۱۰۵۲ ہجری ۳۵-۱۶۳۳ء میں پیدا ہوئے۔ سال ولادت کے بارے میں خود اس کا ایک قطعہ ہے:

لیکہ بیدل بملک ظہور      ز فیض ازل تافت چوں آفتاب  
بزرگی خبر داد از مولدش      کہ ہم فیض قدس است و ہم ”انتخاب“ (۳۲)



پیدا ہوا جس سال جہاں میں بیدل دی اس کی خبر اک ولی نے کامل ہے ”فیض قدس“ ناموں میں اک نام اس کا اور دوسرا نام ہے لفظ ”انتخاب“ سے پیدا چہار عنصر اور خوشگو کے حوالے سے اس قطع کی وضاحت یوں ہے کہ شاہ قاسم ترمذی نام کے ایک بزرگ اس علاقے میں سکونت پذیر تھے جہاں بیدل پیدا ہوا۔ انہوں نے بیدل کی ولادت کے بعد ان کے لئے دو تاریخی نام ”فیض قدس“ اور ”انتخاب“ نکالے ان دونوں سے ۱۰۵۴ ہجری (۱۶۴۳ء) نکلتا ہے۔ (۳۳)

بیدل کی جائے پیدائش:

بیدل کی جائے پیدائش کے متعلق تذکرہ نگاروں میں زبردست اختلاف ہے۔ افسوس کہ بیدل نے اپنی خود نوشت سوانح عمری ”چہار عنصر“ میں بھی چند مبہم اور غیر واضح اشاروں پر اکتفا کیا ہے، لہذا تذکرہ نگاروں اور بیدل کے بیانات کا تقابلی مطالعہ نیز ان کی تحلیل و تجزیہ سے ایک صحیح نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

تذکرہ نگاروں کے اقوال کا نقشہ:

نام تذکرہ	مصنف	سن تصنیف	حیثیت	بیانات	حوالہ
مرآۃ الحیال	شیر خان لودھی	۱۱۰۲ ہجری	معاصر اور دوست	ہندوستان میں ان کی نشوونما ہوئی	(۳۳)
سفینہ پیچر	عظمت اللہ پیچر	۱۱۴۱ھ	ان کی جائے پیدائش پٹنہ ہے		(۳۵)
نسخہ مخطوطہ علی گڑھ		معاصر			
مرآۃ واردات	شاہ محمد شفیع	۱۱۴۲ھ	معاصر	اکبر گرجہ عرف راج محل بنگال میں پیدا ہوا	(۳۶)
سفینہ خوشگو	بندار بن داس	۱۱۴۷ھ	معاصر اور شاگرد	بیدل کا وطن	دفتر ثالث (۳۷)
ید بیضا	غلام علی آزاد	۱۱۴۸ھ	وفات بیدل کے عظیم آباد میں	اکبر آباد ہے	(۳۷)
			وقت ۱۷ سال پیدا ہوئے		(۳۸)
			کے تھے		

سراج الدین علی	۱۱۶۳ھ	معاصر اور دوست	ان کی اصل توران ہے اور بنگال میں زندگی بسر کی	(۳۹)
خزانہ عامرہ غلام علی آزاد	۱۱۶۶ھ	معاصر آخری دور کے	عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔	(۴۰)
سر آزاد	”	”	”	(۴۱)
عبدالوہاب	۱۱۷۲ھ	غیر معاصر	مرزا عبدالقادر عظیم آبادی	(۴۲)
بھگوان داس	۱۲۹۱ھ	”	پٹنہ میں پیدا ہوئے۔	(۴۳)
آقا حسین خان	۱۲۲۳ھ	”	عظیم آباد پٹنہ میں عرصہ وجود میں قدم رکھا۔	(۴۴)
قدرت اللہ	۱۲۵۷ھ	”	ان کی ولادت عظیم آباد میں ہوئی	(۴۵)

ان بارہ اقوال میں کون زیادہ صحیح ہے؟ پٹنہ کے بعض اہم محققوں کے سامنے یہ سوال رکھا۔ مشہور محقق قاضی عبدالودود مرحوم نے فرمایا:

”اس سلسلے میں ہم کو روایت سے زیادہ اپنی درایت پر اعتبار کرنا چاہئے۔ یہ ایک عام حقیقت ہے کہ کوئی ایک ہی تذکرہ نگار براہ راست بیدل سے نقل کرتا ہے باقی سب بالواسطہ نقل کرتے ہیں۔ یہاں بھی دیکھنا ہوگا کہ براہ راست نقل کرنے والا کون تذکرہ نگار ہے۔ اس لحاظ سے خوشگو واحد تذکرہ نگار نظر آتا ہے جس نے بقول خود ایک جزر سے زیادہ دفعہ بیدل سے ملاقات کی اور اس کی صحبت سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے بیدل کو ”اکبر آبادی“ لکھا ہے جبکہ غلام علی آزاد اور دوسرے وہ تذکرہ نگار جنہوں نے بیدل کو ”عظیم آبادی“ لکھا ہے ایک بار بھی اس سے ملاقات نہیں کی۔ لہذا کس کی بات زیادہ قابل اعتماد ہو سکتی ہے آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں جہاں تک شاد عظیم آبادی کا تعلق ہے جس نے محلے تک کی تعیین کر دی ہے جھوٹا ہے۔ اس نے بہت سی جگہ غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ یہاں وطن پرستی



یا صوبہ پرستی کا جذبہ کافی نہیں ہے بلکہ ہر ایک تذکرہ نگار کے بیان کو عقل و درایت کے ترازو میں تولنا چاہئے۔“

پانچ سال بعد جب دوبارہ ان سے ملاقات کی تو شاہ محمد شفیع وار و طہرانی صاحب ”مرآۃ واردات“ کے بیان کی بنیاد پر انہوں نے اپنا بیان بدل دیا۔ انہوں نے کہا کہ بیدل ”اکبر نگر“ عرف راج محل میں پیدا ہوا۔ یہی اکبر نگر کتاب کے سہو یا خوشگو کی غلط فہمی سے سفینہ خوشگو میں اکبر آباد ہو گیا۔ لیکن جیسا کہ پچھلے صفحات میں لکھا گیا وارد کے بیان کی ساری بنیاد اس کے اس دعوے پر قائم ہے کہ بیدل بقول خود اس کے ۱۰۹۶ ہجری میں متھرا سے آکر اس کے یہاں ڈیڑھ سال ٹھہرا۔ اور یہ دعویٰ بیدل کے خود اپنے بیان سے ہم آہنگ نہیں ہے اس لئے وارد کا بیان مشتبہ ٹھہرتا ہے۔

قاضی عبدالودود کے بعد پروفیسر عطاء الرحمن عطا کا کوئی مرحوم سے ملاقات کی جو پٹنہ یونیورسٹی شعبہ فارسی کے ریٹائرڈ پروفیسر تھے اور جنہوں نے سفینہ خوشگو کو ایڈٹ کر کے چھپوایا۔ بیدل ان کا خاص موضوع رہا ہے۔ انہوں نے فرمایا:

”جس شاعر کو اکثر تذکرہ نگاروں نے ”عظیم آبادی“ لکھا ہے، اگر کبھی وہ اکبر آباد چلا گیا تو اسے اکبر آبادی یا دہلوی نہیں کہہ سکتے ٹھیک جس طرح اگر کوئی اکبر آبادی ہوا اگر کبھی عظیم آباد آجائے تو اسے عظیم آبادی نہیں کہہ سکتے۔ آزاد نے اپنے تئیں تذکروں میں اس کو عظیم آبادی لکھا ہے۔ اس کے علاوہ خوشگو نے آزاد کے حسب ہدایت اپنا تذکرہ لکھنا شروع کیا تھا پس باوجودیکہ آزاد خوشگو کے قول سے واقف تھے کیوں اسے عظیم آبادی لکھ گئے۔“

بیدل کی جائے پیدائش سے متعلق تذکرہ نگاروں کے بیانات کے نقشے سے واضح ہے کہ خوشگو سے پہلے عظمت اللہ بیخبر نے اپنا تذکرہ ۱۱۴۱ ہجری ۱۷۲۸ عیسوی میں لکھا۔ انہوں نے بھی بہ بقول خود بارہا بیدل سے ملاقات کی اس لئے قاضی صاحب مرحوم کی دلیل کی اساس درست نہیں معلوم ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں چار عشر میں کافی تلاش و جستجو کے بعد چار مقامات ایسے ملے جہاں بیدل نے اکبر آباد کا نام لیا ہے۔

۱۔ در بلدہ اکبر آباد منظور ابرار میر کا مگار، بدلیل سعادت ازلی، اوقات گرامی مصروف خدمت فقرا داشت۔“ (۴۷)

۲۔ تابستان در گوشہ ای از زوایای اکبر آباد، گرمیہای صحبت تنہا نیم، بساط عافیتی پر داختم بود۔“ (۴۸)

۳۔ سعادت حصول از منہ کہ در بلدہ اکبر آباد، بساط فرصت توقف می گسترانید۔ و فردوس آئین

اوقاتیکہ، بسیر آن گلز میں سپری شد۔“ (۴۹)

۴۔ فرصت شماری مدت انفاس، چندی در سواد بلدہ اکبر آباد رونق صبح خیزی داشت۔“ (۵۰)

ان میں سے کسی بھی فقرے سے یہ نہیں نکلتا ہے کہ اکبر آباد بیدل کی جائے پیدائش رہا ہے۔ محمد شفیع وارد کا بیان کہ بیدل اکبر نگر عرف راج محل میں پیدا ہوا اور جس کی اساس پر قاضی صاحب مرحوم، ڈاکٹر عبدالغنی مرحوم اور پروفیسر سید حسن مرحوم نے آخری فیصلہ سنا دیا، تو جیسا کہ پچھلے صفحات میں عرض کیا گیا وہ شاخ ہی نہ رہی جس پر آشیا نہ تھا کا مصداق ہے۔

آئیے اب خود بیدل کے مبہم اشارات پر غور کریں کیونکہ اس کا خیال ہے ع

گرہ کشای سخنور سخن بود بیدل (۵۱)

شاعر کے کلام میں اگر کوئی گرہ پڑی ہوئی ہے تو اس کے دوسرے کلام سے وہ گرہ کھلے گی۔ چار عشر، رقعات اور مثنویوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بیدل آخر دم تک ہندوستان ہی میں رہا۔ وہ بالترتیب بہار، بنگال، اڑیسہ، شمالی ہند، دہلی، متھرا، اکبر آباد، دکن، حسن ابدال، لاہور وغیرہ کا دورہ کرنے کے بعد آخر ۲۷ جمادی الاول ۱۰۹۶ ہجری ۲۶ اپریل ۱۶۸۵ء میں دہلی میں مستقل طور پر فروغ ہو گیا۔

بیدل جب عمر کی پانچویں منزل میں تھا تو اس کے والد مرزا عبدالخالق اللہ کو پیارے بے۔ والد کے بعد اس نے چچا مرزا قلندر کی سرپرستی میں زندگی گزاری شروع کی جس کا سلسلہ ۱۰۷۱ ہجری ۱۶۶۰ء تک قائم رہا۔ لکھتا ہے:

”ترتیب فقیر بیدل بعد از رحلت والد مرحوم تا ادراک خدمہ بلوغ بعہدہ التفات خود داشت۔“ (۵۲)

والد مرحوم کے انتقال کے بعد بلوغ تک فقیر کی تعلیم و تربیت اپنے ذمے لی۔ پھر ایک جگہ لکھتا ہے:

”بہ استفادہ انوارش چہ خورشید نگاہاں کہ لعلہ توجہ شاہ بریں شبنم ضعیف نتافت۔“ (۵۳)

ان کی تربیت میں رہ کر چند خورشید نگاہ بزرگوں کی توجہ کی کرنیں اس کزور شبنم پر پڑیں۔ پھر ان بزرگوں سے ملاقات اور ان کی صحبت سے استفادے کی تفصیلات پیش کرتا ہے۔ سب سے پہلے مولانا کمال قادری، جو اس کے خاندانی پیرومرشد کی حیثیت رکھتے تھے، کے بارے میں لکھتا ہے:

”میرزا قلندر را چندی در قصبہ ”رانی ساگر“ کہ بہ یمن توطن مولانا شیخ کمال افتخار ”مدنیہ

الاولیاء“ داشت، اتفاق اقامت بود۔“ (۵۴)

”سایہ شاہ شجاع بن شاہجہان، بیماری پدید آئی اور اسے مضمون سلطنت اندیشہ..... از خطہ بنگال تا سرحد ممالک بہار بمگرد آوری خزائن فتوح فوجہای گماشتہ..... از آنجملہ تسخیر نواح تربت، کہ شمالی حدود ہندوستانہ ملکیت عظیم و کوہستانی مشتمل بر چندین عقبات ہراس و بیم و میرزا عبداللطیف را کہ بامیرزا قلندر مراتب خویشی داشت بہر لشکری بر آوردہ، اقتضای زمان وفاق فقیر را کہ تماشای عرصہ کا حوادث دلیل عبرت پیاپیست، بہمعتانی میرزا تعلیم فرمود باختیار رفاقت ایشان راہ تسلیم نمود..... مدت سہ ماہ راجہ ہای غرور آثار فرمان شای گردنی داشتہ شکستہ اوضاع سجدہ کاری۔“ (۵۷)

شاہ شجاع نے جس سال باپ کی بیماری کو مضمون سلطنت کے لئے سکتہ تصور کیا (اسے مفلوج بنگال سے لے کر بہار کی سرحد تک مفتوحہ علاقے کے خزانے کی وصولیابی کے لئے اس نے فوجی دستے بکے مقرر کردئے تھے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی خطہ ”ترہت“ کی تسخیر کا مسئلہ تھا جو پٹنہ کے شمال میں واقع ایک بڑا علاقہ ہے اور جہاں چند خوفناک گھاٹیوں پر مشتمل ایک پہاڑی کا سلسلہ ہے۔ مرزا قلندر کے ایک عزیز مرزا عبداللطیف کو شاہ شجاع نے اک فوجی دستے کا کمانڈر بنا کر بھیجا تھا۔ عرصہ کاہ حادث کا تماشاً چونکہ حصول عبرت کا ایک ذریعہ ہوتا ہے اس لئے مرزا قلندر نے خاکسار کو بھی مرزا عبداللطیف کی رفاقت کی ہدایت کی۔ تین مہینے تک باغی راجہ مہاراجاؤں کو اس طرح زک پہونچائی کہ ان کو گردن تسلیم جھکاتے ہی نہ تھے۔

اس سے درج ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں: یہ کہ ۱۔ ۱۰۶۸ ہجری ۵۸-۱۶۵۷ء میں بیدل تربت میں اپنے چچا کے ہمراہ مرزا عبداللطیف کے گھر قیام پذیر تھا۔ ۲۔ چچا کے حسب ہدایت اس کے ایک عزیز مرزا عبداللطیف کے فوجی دستے میں شریک ہوا۔ ۳۔ باغیوں کی سرکوبی میں تین مہینے تک دوشاخہ دست دی۔ ۴۔ الدآباد کے پاس اورنگ زیب کی فوج سے آویزش میں شاہ شجاع کی فوج کی شکست کی خبر نے تربت میں عبداللطیف کے فوجی دستے میں خوف و ہراس کی لہر دوڑادی۔ ۵۔ سپاہیوں کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کی مرزا کی ساری کوششیں رائگاں گئیں اور دس روزہ وحشت ناک دوڑ بھاگ میں بیدل پہلے ”چاند چوریا (یا چاند پور)“ اور اس کے بعد پٹنہ پہونچا۔ (۵۸)

پھر ۱۰۷۰ ہجری ۱۶۶۹ عیسوی میں اورنگ زیب نے جب اقتدار کی باگ ڈور پوری طرح اپنے ہاتھ میں لے لی اور شجاع کا ستارہ غروب ہو گیا۔ مرزا قلندر نے، جو اس وقت ”مہسی“ ضلع چمپارن میں تھا، بنگال کا رخ کیا۔ مہسی ضلع مظفر پور اور موتیہاری کے بیچ میں ایک قصبہ ہے۔ مرزا قلندر نے اپنے گھر یلو سامان مہسی میں چھوڑ دیئے تھے۔ مرزا بیدل نے چچا کے حسب حکم ایک نوکر کے ساتھ وہاں رہائش اختیار کی ہو۔ لکھتا ہے:

مرزا قلندر کو کچھ دنوں قصبہ ”رانی ساگر“ میں جو مولانا شیخ کمال کے وطن ہونے کی بدولت، ”مدتہ الاولیا“ کا مرتبہ رکھتا تھا۔ قیام کا اتفاق ہوا۔

بیدل کو اپنے ساتھ رکھ کر ان کی صحبت سے استفادے کی غرض سے مرزا قلندر نے رانی ساگر میں قیام کیا جو ضلع بھوجپور صوبہ بہار کا ایک قصبہ ہے اور پٹنہ سے..... فاصلے پر واقع ہے۔ پھر اسی علاقے کے ایک مجذوب شاہ ملوک کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

”مدتی چون سایہ، پیایہ درخت واکشیدہ۔ (۵۵)

”کچھ دنوں سایہ کی طرح ایک درخت کے تلے پڑے رہتے تھے۔“

اور شاہ ملوک کی صحبت سے استفادہ کے لئے مرزا قلندر سرائے بنارس تک، جو رانی ساگر سے ایک فرسخ (چار میل) کے فاصلے پر واقع ہے، آمد و رفت رکھتا تھا۔ پھر ایک اور بزرگ شاہ یکہ آزاد کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

”در ایامیکہ قصبہ ”آرہ“ اقامتکدہ سیر اتفاقی بود، ادیم انفرزین بسہیل نقش قدمش، رایجہ

سعادت می اندوخت۔ (۵۶)

جن دنوں قصبہ ”آرہ“ ان کی سیر و سیاحت کی اتفاقی قیامگاہ تھی ان کے نقش قدم کے بسہیل۔ انفرزین سعادت کی خوشبو سے معطر تھا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ یکہ آزاد ہمیشہ سیر و سیاحت میں وقت گزارتے تھے۔ اس سلسلے میں کچھ دنوں ان کا قیام آرہ میں رہا۔ آرہ بہار کا ایک ضلع اور پٹنہ سے چالیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ بیدل نے، جو اپنے چچا کے ہمراہ سیر و سیاحت میں رہا کرتے تھے، وہاں شاہ صاحب موصوف سے ملاقات کر کے ان کی صحبت سے فائدہ اٹھایا۔

شاہجہاں کی بیماری کے دوران اس کے لڑکے شاہ شجاع نے، جو بنگال اور بہار کا صوبہ دار تھا، ۱۰۶۸ ہجری ۱۶۵۸ء میں بنگال سے بہار تک خزانے کی وصولیابی کے لئے فوجی دستے مقرر کئے تھے۔ اپنے دعویٰ حکومت کا علم بلند کر کے اس نے دارالخلافت دہلی کا رخ کیا۔ بیدل اس وقت تربت (موجودہ مظفر پور) میں تھا۔ ملک میں ہر طرف بد امنی پھیلی ہوئی تھی، راجہ مہاراجہ اور زمیندار آپس میں ایک دوسرے سے دست و گریباں تھے، انہوں نے شاہ شجاع کی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا تھا۔ یہاں بیدل نے بہار اور پٹنہ کے حالات اس انداز سے بیان کئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس صوبہ کے بہت سے شہروں اور دیہاتوں کا اس نے دورہ کیا ہو اور تھوڑے تھوڑے عرصے تک وہاں رہائش اختیار کی ہو۔ لکھتا ہے:

بیدل کے ماموں ہیں تقدیر نے اڑیسہ کے سفر کی رہنمائی کی۔ اس تسلیم سرشت حقیقی بیدل کو نے اپنی رفاقت اور مرزا قلندر کی مفارقت پر مجبور کیا۔

درج بالا اقتباسات سے درج ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

صوبہ بہار میں بیدل نے اپنے خاندان کے ساتھ کوئی ۱۶ سال تک زندگی گزاری۔

۱۰۵۹ ہجری ۱۶۳۹ء کے آس پاس والد کے انتقال اور ۱۰۶۱ ہجری کے ارد گرد والدہ کے انتقال کے بعد چچا مرزا قلندر کے زیر کفالت زندگی گزارنی شروع کی۔

مرزا قلندر کا آبائی مکان ”مہسی“ ضلع چپارن میں تھا اور شاہ کمال قادری سے استفادے کے لئے اس نے کچھ دنوں رانی ساگر میں قیام کیا۔

چچا کی سرپرستی میں بیدل نے دس سال کی عمر تک باقاعدہ مکتب میں تعلیم حاصل کی۔

اسی کے ساتھ چچا کے ہمراہ رانی ساگر میں شاہ کمال، سرائے بنارس میں شاہ ملوک، آره میں شاہ یکہ آزاد اور شاہ فاضل کی صحبت سے استفادہ کیا۔

۱۰۶۹ ہجری میں ۱۶۵۸ء میں ترہت (مظفر پور) مرزا عبداللطیف کے حوالہ ہوا جن کے فوجی دستے میں شامل ہو کر تین مہینے تک داد شجاعت دیتا رہا۔

الہ آباد سے شاہ شجاع کی شکست کی خبر پاتے ہی ترہت میں مرزا عبداللطیف کا دستہ انتشار کا شکار ہوا۔ دس دن تک صحرا نوردی کے بعد بیدل چاند چوراس کے بعد پٹنہ پہنچا۔

پٹنہ میں اپنے ماموں مرزا ظریف کے پاس رہا۔ مرزا ظریف کا وطن پٹنہ تھا۔

۱۰۷۱ ہجری میں مرزا ظریف کے ہمراہ بیدل اڑیسہ روانہ ہوا اور مرزا قلندر سے مکمل طور پر الگ ہو گیا۔

اس طرح اس امر میں کہ مرزا قلندر کا وطن ”مہسی“ اور مرزا ظریف کا وطن پٹنہ تھا کوئی شبہ نہیں

لئے یہ بات قرین قیاس ہے کہ مرزا عبدالخالق کا وطن بھی ”مہسی“ رہا ہو اور بیدل یا تو ”مہسی“ کے چچا اور باپ کا وطن تھا پیدا ہوا ہے یا پٹنہ میں جو اس کے ماموں اور ماں کا وطن تھا جیسا کہ

بہار کے مختلف علاقوں میں یہ رسم ہے کہ پہلا بچہ عموماً اپنے نانیہال میں پیدا ہوتا ہے۔ شاید

بیدل کو مہو بہ بہار سے موروثی تعلق تھا اور اگر اس کو عظیم آبادی کہتے ہیں تاہل ہو تو بہاری

جانے کا پروگرام بنایا اس سفر میں اسے بہت سی صعوبتوں سے دوچار ہونا پڑا، آخر ”جمناپور“ پہنچا وہاں اس کی ملاقات گھوڑی پر سوار ایک ضعیف آدمی سے ہوئی جس نے اس طرح اپنا تعارف کرایا:

”من جان محمد از تابعان خواجہ شاہ محمد کہ در مہسی با میرزا قلندر ش نسبت ہمسائیگی دیوار

بدیوار است۔“ (۵۹)

میر انام جان محمد ہے، میں خواجہ محمد شاہ کامرید ہوں، جن کا مکان ”مہسی“ میں مرزا قلندر مکان کے انتہا پڑوس میں واقع ہے کہ دونوں کی دیواریں ایک جگہ ملتی ہیں۔

بیدل اس بوڑھے آدمی کے اصرار پر گھوڑی پر سوار ہو کر عصر کے وقت مہسی پہنچا۔ وہاں لوگوں کو جب بیدل کی آمد کی خبر ہوئی تو بہت خوش ہوئے خصوصاً شاہ محمد کے صاحبزادوں نے نہایت

مجوشی سے اس کا استقبال کیا۔

”فردای آن روز کہ پسران خواجہ برسم قدیم صحبت فقیر در یافتند۔“ (۶۰)

دوسرے دن خواجہ کے صاحبزادوں نے اپنی دیرینہ روایت کے مطابق مزاج پرسی کی۔

مثنوی عرفان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بیدل نے بنگال میں ”کالوطاق“ کے مقام پر وقت گزارا ہے جہاں کے ایک دو تہند کا قصہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

مردی از افغیا ”بنگالہ“ مفلسی کشش از قضا ہالہ

آخر آوارگی جنون انگشت چون غبارش ز خانہ بیرون ریخت

در سواد مقام ”کالو طاق“ بست ناچار با جلا میثاق (۶۱)

بنگال کا ایک رئیس بد قسمتی سے مفلس ہو گیا۔ آوارگی نے اسے وہاں غبار کی طرح گھرے بے گھر کر دیا۔ ”کالوطاق“ سے اس نے مجبوراً جلا وطنی کا عہد کیا۔ اس لئے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ

سے واپسی پر بیدل بھی اپنے چچا مرزا قلندر کے پاس سامان پہنچانے کالوطاق گیا ہو، پھر پٹنہ آیا اور

۱۰۷۱ ہجری ۱۶۶۰ عیسوی میں وہ اپنے ماموں مرزا ظریف کے ہمراہ پٹنہ سے اڑیسہ کے لئے روانہ ہوا اور

چچا مرزا قلندر سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا۔ لکھتا ہے:

”در بلد پٹنہ، وثاق معارف اتفاق میرزا ظریف۔ در سنہ یکہزار و ہشتاد و یک (۱۰۷۱ھ)

میرزا ظریف را کہ..... و چہرہ اعتبار بیدل خاکسار بہ نسبت آرای خال مزین داشت، خامہ

نقدیر بسفر ملک اور یہ جادہ ہدایت گردید و ”تسلیم سرشت حقیقی“ را با اختیار رفاقت خود و جدائی

میرزا قلندر مجبور گردانید۔ (۶۲)

شہر پٹنہ میں معارف اتفاق و وثاق مرزا ظریف رہتے تھے ۱۰۷۱ ہجری ۱۶۶۰ء مرزا ظریف کو

کہنے میں مطلق تامل نہیں اور اکثر قصباتی لوگ بہاری کے بجائے عظیم آبادی کہلاتے ہیں“ (۶۳)

### ایک بزرگ کی پیشین گوئی:

بیدل نے جب آنکھ کھولی تو اس کے والد ماجد مرزا عبدالخالق جو خود بھی ایک صوفی مشرب اور پرہیزگار قسم کے آدمی تھے، اسے ایک بزرگ کے پاس لے گئے جن کا نام ابوالقاسم ترمذی تھا اور جو بہ قول خوشگو ریاضی اور نجوم میں ید طولی رکھتے تھے۔ (۶۴) انہوں نے بیدل کے روشن مستقبل کی پیشین گوئی کرتے ہوئے دو تاریخی نام ”فیض قدس“ اور ”انتخاب“ نکالے جو ایک یادگار ہے۔ بیدل کے ان شاعرانہ کمالات کو دیکھتے ہوئے جو بعد کے سالوں میں ظاہر ہوئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ شہ ابوالقاسم ترمذی کی پیشین گوئی حرف بہ حرف صادق آئی اور اپنے ہم عصر شاعروں میں بیدل واقعی ایک منتخب شاعر کی حیثیت سے ابھرے خوشگو نے بجا لکھا ہے:

”اس سراپا انتخاب کی تاریخ ولادت کے لئے لفظ ”انتخاب“ زمانے کا ایک جز قرار پایا“ (۶۵)

### وجہ تسمیہ:

بیدل کے والد مرزا عبدالخالق نے جیسا کہ پچھلے صفحات میں گزرا، کچھ دنوں پہ گری کا پیش اختیار کیا، لیکن جلد ہی اس سے دست بردار ہو کر گوشہ نشین ہو گئے۔ قادری سلسلے کے ایک بزرگ مولانا کمال قادری کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے اور ان کی خدمت میں تصوف کا درس لینے لگے۔ مولانا کے شجرہ بیعت کا سلسلہ قطب دوران حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی تک پہنچتا تھا اس لئے کوئی تعجب نہیں اگر مرزا عبدالخالق کی شیخ سے ارادت و عقیدت نے ان کو اپنے بیٹے کا نام بھی عبدالقادر رکھنے پر آمادہ ہوتا کہ سرسلسلہ سے ایک طرح کی نسبت برقرار رہے۔ یہ باتیں بیدل کے درج ذیل بیان سے متر ہوتی ہیں۔

”تلقین والد شریف فقیر از روح حضرت غوث الاعظم رضی اللہ عنہ بوساطت آن ذات

تقدس آیات بود“ (۶۶)

فقیر کے والد کی حضرت غوث الاعظم کی روح سے تلقین اسی ذات تقدس آیات مولانا کمال

بدولت تھی۔

### مرزا عبدالخالق کی وفات:

شیر خوارگی کا زمانہ ختم ہونے کے بعد بیدل نے جب زندگی کی چھٹی منزل میں قدم رکھا تو مرزا

عبدالخالق اسے داغ مفارقت دے گئے اور اس درہم اور گوہر یکتا کو سو گوار چھوڑ گئے لکھتا ہے:

”بائیک تحریر کی از نیم فرصت، والد مجازی بے رگلشن حقیقت شنافت۔ (۶۷)

والد مجازی نیم فرصت کی ادنیٰ سی حرکت پر گلشن حقیقت کی سیاحت کو روانہ ہو گئے۔

کیونکہ باپ کی وفات کے بعد بیدل نے بہ قول خود ”زمانی چند“ کچھ وقت کیف مالتفق

کر لیا۔ پھر ساڑھے پانچ سال کی عمر میں والدہ نے اسے حروف تہجی کی شناخت کرائی۔ اس ”زمانی

چند“ میں چھ مہینے سے کم کا عرصہ مان سکتے ہیں لیکن خوشگو نے اسے واضح طور پر متعین کر دیا ”اسی سال

۱۱۷۸ھ میں (یعنی بیدل جب ساڑھے چار سال کا تھا) مرزا عبدالخالق نے رخت سفر باندھا“۔ (۶۸)

بیدل کے بیان سے اس کی تعین نہیں ہوتی ہے اس لئے خوشگو کی تعین کو تقریبی کہہ سکتے

ہیں۔ بیدل اس جانکاہ حادثے کی تلخی کو ۲۱ سال کی عمر میں بھی اسی طرح محسوس کرتا ہے کیونکہ اس واقعہ کو

اس میں قلم بند کرنا شروع کیا۔

”آشوب گردیتی جو ہر آئینہ اشتہار یافت و پریشانی غبار و بیکسی دامن جمعیت اعتبار

پچید۔ (۶۹)

گردیتی کا آشوب آئینہ اشتہار کا جو ہر قرار پایا اور غبار بیکسی کی پریشانی نے سکون کا دامن سمیٹا۔

نیز ایک قطعہ کے ذریعہ بھی اس نے اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔

خرامید و فر و غی بہ نظر ماند دریا بکنار درگ افتاد و گہر ماند

آتشہ رفت و گرہ ریخت شراری دل آب شد و قطرہ خونی ز جگر ماند

آن سایہ گزشت از اثر دست نوازش ایں نقش قدم داغ شد و خاک بر ماند (۶۹)

[سورج غروب ہوا اس کی صرف ایک چمک نظروں میں رہ گئی۔ دریا ساحل کے دوسرے

سے جاگا اور موتی یکدہن ہوا گیا۔ آتشکدہ بجھ گیا صرف ایک چنگاری اس کی باقی رہ گئی۔ دل

نی کا روپ اختیار کر گیا اور جگر صرف ایک قطرہ خون کی شکل میں رہ گیا۔ دست نوازی کے اثر سے وہ

سایہ گزشت بڑھ گیا یہ نقش قدم داغ اور سرخاک آلود ہو کر رہ گیا۔]

بیدل کے بعض ارادتمندوں کا خیال ہے کہ اس نے یہ قطعہ ایام کودکی میں کہا ہے لیکن کلام کی

انداز بیان کی برجستگی اس خیال کی تردید کرتی ہے۔ علاوہ ازیں بیدل چہار عشر کے شروع میں

لکھتا ہے:

”از آن ہنگام تا حال نفس شماری مقارن سال چہل و یکم است۔“ (۷۰)  
”اس وقت عمر کی نفس شماری اکتالیسویں سال سے ہم آہنگ ہے“

اس سے ظاہر ہے کہ اکتالیس سال کی عمر میں بیدل نے اپنی رونماد زندگی کو قلم بند کرنا شروع کیا اس لئے یہ قطعہ یقینی طور پر اسی زمانے کا ہے۔  
نیا فتنہ پوری لکھتے ہیں:

”ہم یہ بات ماننے کیلئے تیار نہیں کہ یہ شعر ان کی کسنی کا ہے البتہ یہ ممکن ہے کہ جب سن شعور کو پہنچ کر انہوں نے اپنے مختلف جذبات کو منظوم کئے تو اس سلسلے میں اس حادثے کا بھی ذکر ان الفاظ میں کیا“ (۷۱)

### آغوش مادر میں بیدل کی تربیت:

والد کی وفات کے بعد بیدل نے کچھ دنوں جیوں تیوں لا ابالی پن میں زندگی گزاری پھر تقریباً ساڑھے پانچ سال کی عمر میں ان کی ماں نے ان کو اپنے پاس بٹھا کر حروف تہجی کی شناخت کرائی اور اسی سال کے ختم پر چند مہینوں میں قرآن پاک ناظرہ مکمل کر لیا۔ ماں کی تربیت کل سات مہینے جاری رہی اس مختصر مدت میں انہوں نے اسے اس لائق بنادیا کہ اساتذہ کی خدمت سے استفادہ کر سکیں لکھتے ہیں:

باندک تحریر کی از نیم فرصت والد مجازی بر سیر گلشن حقیقت شتافت۔ زمانی چند بہ وضع بی سروپائی گذشت۔ در مبادی شہر سادسہ از سال سادس والدہ مشفقہ..... باستفادہ خدمت اساتذہ سروش معنوی گردید، و باستفہام ابجد تہجی عنان توجہ معطوف گردانید..... بامداد تربیتش ہفت ماہ تردد انفاس توام ورق گردانی بود..... در نہایت حول مسطور معیت فضل واہب العطیات زبان عجز بیان را باہتمام قرآن مجید فائز گردانید۔ (۷۲)

کچھ وقت تو لا ابالی پن میں گزرا۔ چھٹے سال کے چھٹے مہینے کے اوائل میں اساتذہ کی خدمت سے استفادہ کے لئے مادر مہربان سروش معنی ثابت ہوئیں اور حروف تہجی کی شناخت پر انہوں نے اپنا توجہ مرکوز کیا۔ ان کی تربیت کے سہارے نفس کی آمد و شد سات مہینے ورق گردانی سے ہم آہنگ رہا خدا کے فضل سے سال مذکور کے آخر میں زبان عجز بیان کو قرآن پاک کو مکمل کرانے کا شرف بخشا اور دیدہ حیرت عنوان میں آشنائی نقوش کا سرمہ لگایا۔

یہاں پروفیسر غلام حسن مجددی کو سہو ہوا۔ انہوں نے لکھ دیا کہ ناظرہ قرآن پاک کی تعلیم بیدل نے ساڑھے چھ سال کی عمر میں شروع کی اور سات مہینے کی مدت میں مکمل کیا۔ (۷۳) اس سہو یا غلطی

کی وجہ بیدل کی عربی آمیز عبارت ”در مبادی شہر سادسہ از سال سادس“ پر مناسب توجہ کا فقدان ہے۔ اس مقولے کا ترجمہ یوں ہے ”چھٹے سال کے چھٹے مہینے کے اوائل میں“ جس کا مطلب ظاہر ہے پانچ سال پانچ مہینے اور چند روز کی عمر میں بیدل نے اپنی ماں کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا۔ سید سلیمان ندوی نے اس زمانے کو ماہ رجب کے مطابق قرار دیا (۷۴) لیکن زمانے کی اتنی واضح تعیین اس بات پر موقوف ہے کہ بیدل ماہ محرم ۱۰۵۴ ہجری میں پیدا ہوئے ہوں اور یہ واضح نہیں ہے۔ بیدل کے بیانات پر کافی غور و خوض نہ کرنے کی وجہ سے خوشگو کو بھی بہت سے مقامات پر غلط فہمی ہوئی ہے۔ چنانچہ اس مقام پر وہ لکھتے ہیں:

”چون از رضاع برآمد، و قدم بہ بیخ ساگی داشت، زبان را کہ از اعضاء رئیسہ انساں است، بختم کلام مجید شادابی بخشید۔ و در اواسط ہما سال میرزا عبدالخالق رخت ہستی بر بست و گرد تہی بر چہرہ حاش نشست..... در سال ششم از حد عمر از خدمت والدہ ماجدہ حروف تہجی آموخت۔“ (۷۵)

شیر خوارگی کے دور سے بیدل جب باہر آئے اور عمر کی پانچویں منزل میں قدم رکھا تو اپنی زبان کو جسکا شمار انسان کے اعضاء رئیسہ میں ہوتا ہے ختم کلام مجید سے شادابی بخشی۔ اسی سال کے آخر میں مرزا عبدالخالق نے داعی اجل کو لبیک کہا اور اس کے چہرہ حال پر گرد تہی جم گئی۔ چھٹے سال اپنی والدہ سے حروف تہجی سیکھی۔

خوشگو کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ:

۱۔ پانچ سال کی عمر میں بیدل نے ناظرہ قرآن مکمل کیا۔

۲۔ باپ کی وفات کے وقت بیدل کی عمر ساڑھے چار سال تھی۔

۳۔ چھ سال کی عمر میں اس نے والدہ کی خدمت میں حروف تہجی کی شناخت حاصل کی۔

بیدل کے بیان سے موازنہ کرنے پر خوشگو کے پیشتر بیانات غلط نظر آئے ہیں۔ اس لئے خوشگو کے بیان کو بیدل سے قربت کی وجہ سے آنکھ بند کر کے قبول کرنا صحیح نہ ہوگا۔ اسی طرح خواجہ عباد اللہ نے ”بیدل“ اسی قسم کی ایک غلط فہمی کے شکار ہوئے ہیں لکھتے ہیں۔

”چھ سال چھ ماہ کی عمر تھی کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ یہ درتیم والدہ کی آغوش تربیت میں تعلیم پاتا رہا۔ دس سال کی عمر میں قرآن مجید ختم کیا اس کے بعد صرف نحو عربی پڑھی“ (۷۶)

رہی یہ بات کہ خرد ساگی کے باوجود بیدل نے کس طرح قرآن مجید ناظرہ چھ مہینے کی مختصر سی

مذمت میں مکمل کر لیا تو اس کی اس فطری ذہانت کی بنا پر جس کا ظہور بعد کی زندگی میں بارہا ہوا ہے کوئی تعجب خیز بات نہیں معلوم ہوتی ہے۔

بیدل کے بیانات سے یہ واضح نہیں ہوتا ہے کہ اس کی ماں اس دنیا سے کب رخصت ہوئی کیونکہ ان کی سات ماہہ تربیت کے ذکر کے بعد بیدل نے سکوت اختیار کیا ہے۔ لیکن خوشگو کا بیان ہے۔  
”در ہماں نزدیکی آن مریم مکان نیز رہ نور عالم بالا گشت“ (۷۷)

یعنی اسی (ختم قرآن مجید کے زمانے) کے آس پاس وہ مریم مرتبہ خاتون بھی عالم بالا کو سدھاریں۔ چونکہ بیدل نے چھ سال کی عمر میں قرآن پاک ناظرہ ختم کیا اس لئے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کے فوراً ہی بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ یہاں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ ڈاکٹر عبدالغنی صاحب نے خوشگو کے اس بیان کی بنا پر بیدل کی والدہ کا نام ”مریم“ لکھ دیا (۷۸) ”جبکہ مریم مکان“ کی ترکیب واضح کرتی ہے کہ وہ ایک پارسا اور عبادت گزار عورت تھیں اور اسی لحاظ سے وہ حضرت مریم کا درجہ اور پایہ رکھتی تھیں جو محض تیمنا ہے ورنہ ظاہر ہے حضرت مریم سے کسی کا کیا مقابلہ؟

### مرزا قلندر کی زیر کفالت بیدل کی مدرسہ میں تعلیم و تربیت:

از مدرسہ یک عمر سبقہا خواندیم از ہر بد و نیک و زشت و زیبا خواندیم  
ایک مدت تک مدرسہ میں تعلیم حاصل کرتا رہا اور ہر نیک و بد اور بھلے برے کی تمیز حاصل کی۔  
والد کی وفات کے بعد بیدل کی تعلیم و تربیت کا بوجھ چچا مرزا قلندر نے اپنے کاندھوں پر اٹھایا جس کا سلسلہ سن بلوغ تک جاری رہا۔ لکھتے ہیں۔

”تر بیت فقیر بعد از رحلت والد مرحوم تا ادراک ندر بلوغ بعہدہ التفات خود داشت و با

شفاق ربو بیت در تعلیم مراتب آداب و تدریس معانی اخلاق توجہ کمال می گماشت۔“ (۷۹)

والد مرحوم کی رحلت کے بعد فقیر بیدل کی تعلیم و تربیت انہوں نے سن بلوغ تک اپنے ذمے لے لی اور انتہائی شفقت و محبت کے ساتھ زندگی کے آداب و سلیقے کی تربیت اور اخلاق کی تعلیم پر پوری توجہ صرف کی۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی ماں کی تربیت کا سلسلہ کچھ زیادہ دنوں تک جاری نہیں رہا۔  
سال یعنی تقریباً ۱۰۶۵ھ تا ۱۲۵۳ھ تک مرزا قلندر نے بیدل کو عربی صرف و نحو اور فارسی نظم و نثر کی باقاعدہ تعلیم کے لئے پابندی سے مکتب بھیجا۔ لکھتے ہیں:

”بعد از اس تا سال عاشق توجہ صرف و نحو قواعد عربیت داشت و آئینہ ہوش با تیار

نظم و نثر مراتب فارسی می گماشت“ (۸۰)

اس کے بعد عمر کی دسویں منزل تک عربی صرف و نحو کی تعلیم پر انہوں نے متوجہ کیا اور فارسی نظم و نثر کے مختلف اسالیب کے مابین فرق سے روشناس کرایا۔

### بیدل کی ذہانت کا ایک واقعہ:

بیدل کے ایام طالب علمی کا ایک مشہور واقعہ جو مکتب میں پیش آیا اور جس کو اس کی ذہانت اور افتاد طبع کی ایک علامت کی حیثیت سے اس کی زندگی کا اہم واقعہ کہا جاسکتا ہے یہ ہے کہ جب وہ مکتب میں علم بدیع و بیان کی تعلیم حاصل کر رہا تھا اور گلستان سعدی اس کے زیر مطالعہ تھی، اس کا ایک مدرس لونگ چبانے کا عادی تھا جب کبھی وہ ہنسنے یا بولنے کے لئے منہ کھولتا تو ساری فضا خوشبو سے مملو جاتی۔ اس خوشبو نے بیدل کی قوت تخیل اور مخفی شاعرانہ صلاحیت کو ایسا مہمیز کیا کہ درج ذیل بے ساختہ اس کی زبان سے نکل پڑی:

یارم ہر گاہ در سخن می آید بوی عجبش از دہن می آید  
این بوی قریفل است یا نکبت گل یا رائحہ مشک ختن می آید  
[جب کبھی یار مرا گرم سخن ہوتا ہے اور عطر اس کا زیب دہن ہوتا ہے  
ہے یہ بوئے گل، یا قریفل کی بو یا کہیں یہ کہ وہ مشک ختن ہوتا ہے]

بیدل کا بیان ہے کہ اس واقعہ کے بعد عرصے تک میں قدیم اساتذہ کے طرز میں شاعری کرتا رہا۔  
جن دنوں کے خوف سے ان کو زبان پر لانے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ تاہم اس رباعی کو میں نے اپنی

مثنوی صبح کی ایک علامت تصور کیا اور اس سے مجھے اپنے رجحان طبع کا اندازہ ہو گیا:

”این رباعی را از کار بنای موزونی خودی داند و از ہمیں چہار مصرع عنصر مزاج شعلہ افسوں

می خواند“ (۸۱)

اس رباعی کو اپنی طبیعت کی موزونی کی اساس کا سمجھا اور ان چار مصرعوں سے عنصر مزاج شعلہ افسوں کا مطالعہ کیا۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیدل ایک جو ہر قابل تھا اور اس میں استعداد کامل تھی جو مسلسل رہنمائی سے مشغول ہو سکتی۔ اس کی باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ اگر جاری رہتا تو اس کی پیشرفت کی

کے ترک کا ناخوشگوار واقعہ پیش آیا۔ یہ عربی گرامر میں آخری درجے کی کتاب ہے چونکہ بیدل نے ”صرف و نحو قواعد عربیت“ کے الفاظ استعمال کئے ہیں اس لئے اسے خارج از امکان نہیں کہہ سکتے اس طرح ”نظم و نثر مراتب فارسی“ کے الفاظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ خاصی فارسی کتابیں اس کی نظر سے گز چکی تھیں۔ پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اس کی باقاعدہ مکتبی تعلیم کا سلسلہ ختم کر دیا۔

### ترک کتب کا واقعہ:

عمر کی دسویں منزل میں بیدل جب اپنی تعلیم میں مشغول تھا، ایک دن دو مولوی (۸۲) عربی گرامر میں افعال کی تعریف پر بحث کر رہے تھے۔ یہ بحث آخر کار علمی اور سنجیدہ تبادلہ خیال کے دائرے سے نکل کر مجادلے اور ہاتھ پائی کے دائرے میں داخل ہو گئی۔ ان کے گلے کی رگیں پھول گئیں، آنکھیں سرخ ہو گئیں اور ان کے چہرے بشرے سے کبر و نخوت کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ اتفاقاً مرزا قلندر اس وقت وہاں موجود تھے۔ اس افسوسناک صورت حال کو دیکھ کر بے حد کبیدہ خاطر ہوئے۔ ان کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ زندگی کے جو بیش بہا لمحات عربی زبان و ادب کی تعلیم میں صرف ہو رہے ہیں۔ کا نتیجہ اگر بھی غرور و نخوت اور انسانی خصائل و شمائل سے بے تعلقی ہے تو پھر علم و جہالت میں فرق ہی کیا رہ گیا۔ اسی دن اپنے بچے کو مزید تعلیم جاری رکھنے سے منع کرتے ہوئے کہا:

”اگر آج اس علم میں غلغلہ در بنای جہل میکن تا عاقبت حال پشیمان نشوی“ (۸۳)

علم و دانش کے آثار اگر یہی ہیں تو جہالت و بی سوادی کی بنیاد میں غلغلہ مت ڈال تا کہ انجام شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ بیدل نے غزل کے درج ذیل چند اشعار میں بھی جن کا قافیہ ”بحث“ ہے اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

از مدرسه دم نازده بگریز و گر نہ بر خاست رگ گردن و آمد بمیان بحث  
مدرسہ سے دم لئے بغیر بھاگ لے نہیں تو رگ گردن پھول جائے گی اور بحث کا سلسلہ شردن ہو جائے گا۔

ماتم کده علم شمر مدرسه کا نجاست انصاف بخون غوطہ زن و نوحہ کنان بحث  
اس مدرسہ کو علم و دانش کا ماتم کده سمجھو جہاں انصاف کا خون ہوتا ہو اور جہاں بحث مرثیہ خواں۔

آں کیست کہ گردد طرف مولوی امروز یک تیغ زبان دارد و صد نوک سناں بحث  
آج کس میں جرأت ہے جو مولوی کے مقابل ٹھہرے جس کی بحث میں ایک تیغ زبان اور

نوک سناں ہے۔

مگر بیدل کو اس کا بے حد قلق ہوا جو اس کے الفاظ سے ظاہر ہے۔

”ہنوز با دراک معنی بلوغ نرسیدہ، ناتوانائی بازوی استعداد کمان کوشش از رہ انداخت،

و نارسائی دستگاہ قدرت رشتہ املا محکوم گرہ ساخت۔ بی اختیاری نگراشت تا دیگر جہد توان

بست ناچار بمقتضای ”رب المساکن فضل اللہ“ تسلیم جزو حیثیت گردید۔“ (۸۴)

ابھی تو سن بلوغ کا مفہوم بھی واضح نہیں ہوا تھا کہ بازوے استعداد کی ناتوانی نے کوشش کی

کمان تیرے گرہ کر رکھ دی اور دستگاہ قدرت کی نارسائی نے رشتہ امید کو محکوم گرہ بنا دیا۔ بے اختیاری نے

ممت باندھنے کا موقعہ نہیں دیا۔ مجبوراً رب المساکین فضل اللہ شیوہ تسلیم و رضا جزو شخصیت قرار

پا لیا۔ دس سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ عام طور سے بچے اس عمر میں مختلف قسم کے کھیلوں میں

لگے رہتے ہیں اور اگر کبھی علم و دانش کی طرف ان کا میلان ہوا بھی تو ذہن رسا اور طبع بلند کے حامل نہیں

ہوتے جو حقائق اشیاء کا درک کر سکیں اور اسرار و رموز سے پردہ اٹھا سکیں لیکن بیدل کے سلسلے میں ہم دیکھتے

ہیں کہ اس کی نگاہ رفتہ رفتہ حقائق کا درک کرتی ہے اور ان کو اپنے مشاعر میں محسوس کرتی ہے لکھتا ہے۔

”پس ہر جمعیکہ نظر باز کرد، دبستان تکمیل خود دید۔ و ہر حرفیکہ گوش انداخت، معنی ہدایت

خود فہمید۔ انتقال طبیعت خداداد از ہر نکتہ اسرار کتابی دریافت۔ و دقت ادراک موہبی از ہر

نقطہ رموز دفتری و اشکاف ت۔“ (۸۵)

پس جس مجمع پر میری نظر پڑی اسے اپنی تکمیل (علوم) کا ایک مدرسہ پایا اور جس بات پر

میرا خیال اس سے اپنی رہنمائی کا مفہوم ملا۔ میری خداداد طبیعت نے ہر نکتے پر غور کر کے اسے اسرار کی

کتاب پایا اور عطائی قوت ادراک نے ہر نقطے سے رموز کا ایک دفتر و اشکاف کیا۔

چشم واکردن زمین تا آسمان فہمید نیست

انسان میں اگر عقل و ہوش ہو تو اسے کتاب کا پی کی ضرورت نہیں چشم و انہیں کی کہ زمین سے

آسمان تک ساری چیزیں سمجھنے کی موجود ہیں:

ورنہ ہر چیزیکہ می بینی ہماں فہمید نیست

قوت ”واہمہ“ کی آوارہ گردی اور کرشمہ سازی تجھے خود اپنی ذات سے پرے لیجاتی ہے ورنہ

تجھے نظر ڈالے گا وہی قابل فہم نظر آئے گی۔

اس میں شک نہیں کہ بیدل خود بھی اسی اصول کی پابندی کر کے ایک خود ساختہ نابغہ عصر بنا تھا

جس کی برکات اور خدائی عنایات نازل ہوئیں۔

ہر حال تعلیم کی اہمیت سے چونکہ انکار نہیں کیا جاسکتا تھا اور مرزا قلندر کا ہرگز یہ منشا نہ تھا کہ



حصولِ تعلیم سے بیدل کو باز رکھے اس لئے دوسرے انداز سے اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے کی ہدایت کی۔ ”بہماری فہم معنی کوش و از پست و بلند رف و جرجشم پوش۔ جہدی کن کہ غبار بحث و انکار را بکنی از راه طبیعت بر خیزد و حضور کیفیت افزائی در باطن رنگ جمعیت ریزد۔ اگر گوش کر نباشد افسانہ بسیار است و اگر چشم رمدی ندارد تماشا بیشمار۔ ہمت اعتماد بر فضل حقیقی نگارتابی تکلف نقوش و خطوط پردہ از حقایق بر رویت کشاید۔ نسخ اعتبار قیل و قال بر طاق نسیاں گذارتا ز در سگاہ بی حرف و صوت رمزی ارشادات نمایند۔ علم دبستان تحقیق مقید سبق کتاب مدان۔ و معمای نسخہ یقین از دفاتر دلیل و حجت بخوان“ (۸۶)

بتدریج مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کر اور زیر و زبر کی پستی و بلندی سے چشم پوشی کر۔ ایسی محنت کر کہ بحث و انکار کا غبار تیری طبیعت سے پوری طرح چھٹ جائے۔ اور کیف پر حضور تیرے دل میں سکون و جمعیت کا رنگ بھر دے۔ کان اگر بہرے نہ ہوں تو افسانے بہت ہیں اور آنکھ میں اگر رمد کی بیماری (آشوب چشم) نہ ہو تو تماشے بہت ہیں۔ پروردگار عالم کے فضل و کرم پر اعتماد کرتا کہ نقوش و خطوط کی تیرے کے بغیر تیرے سامنے وہ حقایق سے پردہ ہٹائے اور قیل و قال کے نسخوں (کتابوں) کو طاق نسیاں کے حوالے کرتا کہ ”درسگاہ بی حرف و صوت“ سے رمز و اسرار کی طرف وہ تیری رہنمائی کرے۔ اسے اپنی طرح سمجھ لے کہ دبستان تحقیق کا علم کچھ درسی کتابوں کے مطالعہ پر موقوف نہیں ہے اور نسخہ یقین کا معرہ کچھ دلیل و برہاں کی کتابوں سے وابستہ نہیں ہے۔ غالباً اسی لئے بیدل ایک شعر میں کہتا ہے۔

مکتب آفاق از بس درسگاہ عبرت است گوشائی بود ہر حرفی کز استادم رسید  
اس کے بعد ابوالقاسم ترمذی نے بیدل کے جو دو تاریخی نام ”انتخاب“ اور ”فیض قدس“ نکالے تھے اس کی طرف بیدل کو متوجہ کر کے تسلی دیتے ہوئے کہا:

”بہمیت بی سانشیہای تاریخ تولدت کہ زبان الہام بیان سرچشمہ زلال سعادت محیط  
آبروی سیادت میر ابوالقاسم ترمذی قدس سرہ بر شحات بشارت ”فیض قدس“ منجر حال تقدس  
مال اوست، و بروانی عبارت ”انتخاب“، مشعر زبان فضل اشتمال او، پیکر استعداد را بیولای  
صور کمال دریا فہام۔ و معمای موزونی طبیعت و اشکافہ۔“ (۸۷)

تیری بے ساختہ تاریخ پیدائش کی برکت سے، جس کو سرچشمہ زلال سعادت اور محیط آبرو سے سیادت میر ابوالقاسم ترمذی قدس سرہ کی زبان الہام بیان نے ”فیض قدس“ کی بشارت سے ترے مال تقدس مال کی خبر دی ہے اور لفظ ”انتخاب“ کی روانی سے جو ان کی زبان فضل اشتمال نے اطلاع دی

نے تیرے پیکر استعداد کو صورت کمال کا پہولی اور موزونی طبع کا معرہ تصور کیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خود مرزا قلیندر کو بیدل کے ناصیہ سے اس کے تابناک مستقبل کا اندازہ دیا تھا اور اسے یہ یقین ہو چلا تھا کہ یہ ذرہ بی مقدار ایک دن آفتاب عالم تاب بن کر چمکے گا۔ اس کے مطالعہ اور یومیہ پیشرفت کی آزمائش کے طریقے کی وضاحت کرتے ہوئے نصیحت کی ہے:

”یہ انداز امتحان درجہ استعداد، از مطالعہ کلام فوائد انتظام سلف، کہ حقایق را در آن لباس عرض رنگینہای تازند کیست و معانی در آن کسوت و سنگاہ کمال برازندگی، غافل مباش۔ و از بس بہارستان ہر گل ظلمیکہ استعصام کفیتش نہ دماغ شوق رساند، یا رانجہ نثری گلاب اثر، بر مشام ذوق افشاند، دستہ بندی اقسام آراستہ جہد خود شمار۔ و فراہم آوردہ دامن استعداد بر من عرضہ می دار۔ تا مہر ہن گرد کہ عند لب فطرت از ساز چہ گل رغبت آہنگ سرودست و غنچہ تماثل از روی کدام رنگ مایل نقاب کشود۔ امید کہ اختیار این درس مایہ امتیازت بلند گرداند و الزام این کوشش سررشتہ کارت بجائی رساند۔“ (۸۸)

حسب استعداد سلف کے کلام فوائد انتظام کے مطالعہ سے غافل مت رہ، جن کے لباس میں اپنی پوری رنگینی کے ساتھ جلوہ گر ہے اور جن کے جامے میں معانی اپنی پوری توانائی کے ساتھ پھیلے۔ اس بہارستان کے ہر گل نظم کی، جس کی کیف آگیاں بوتیرے دماغ شوق نے سونگھی یا شب ثنثر کی، جس کا راجحہ تیرے مشام ذوق تک پہنچا، اس کے تمام انواع و اصناف کی دستہ بندی کرنا ”درس“ تصور کر اور دامن استعداد کے فراہم آوردہ حصے کو میرے سامنے رکھ تاکہ یہ امر واضح ہو کہ تیری عند لب فطرت کس گل کے ساز سے نغمہ سرائی پسند کرتی ہے اور تیرا غنچہ تامل کس رنگ سے نقاب کشائی کی طرف مائل ہے۔ امید کہ اس انداز مطالعہ سے کلام میں تیرے خط امتیاز کا پایہ بلند ہو اور اس کوشش کی پابندی سے تیرے کام کا سررشتہ کسی مناسب مقام تک پہنچے گا۔

اس طویل اقتباس کے نقل سے مقصد قارئین کی توجہ اس نکتے کی طرف مبذول کرانا ہے کہ جس طرح اپنی پوشیدہ صلاحیت اور جوہر کو بروئے کار لاس کا اور خدا کی دی ہوئی استعداد و لیاقت کی حقیقت یہ ہے کہ مرزا قلیندر نے تعلیمی نقصانات کے تدارک کی جو تجویز بیدل کے سامنے کی وہ صرف اس لئے بلکہ ان تمام لوگوں کے لئے اسی طرح سودمند ہے جو اپنی صلاحیت کی کھجور کے کسی بلند وبالا مقام تک رسائی کا ارادہ رکھتے ہیں۔

غرض مرزا قلیندر کے حسب ہدایت بیدل نے اب گھر ہی میں مشہور شاعروں کے کلام اور نثر کی شاہکاروں کا مطالعہ اس انداز سے شروع کیا کہ اس میں سے عمدہ اور نفیس حصہ انتخاب کر کے

چچا کے سامنے پیش کیا کرتا۔ ظاہر ہے متقدمین کے کلام کا ایک نفیس انتخاب کرنے کے لئے ذوق سلیم و طبع مستقیم، عرق ریزی و دماغ سوزی اور محنت و مشقت کی ضرورت ہے یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس ہدایت کے ذریعے مرزا قلندر نے دراصل ایک بہت ہی اہم ذمے داری بیدل کے سپرد کر دی جو اسے پوری توجہ، انہماک اور تحقیق کے ساتھ فارسی زبان و ادب کے گرانقدر سرمایہ کے مطالعہ پر کرتی تھی۔ اس کدو کاوش نے بالآخر اسے ایک نابغہ روزگار بنا کر چھوڑا۔

اس اہم اور غیر معمولی ذمے داری سے بیدل بہ خوبی عہدہ برآ ہوا۔ گلستان شعر و ادب کا جو مجموعہ بھی وہ انتخاب کرتا روزانہ اسے اپنے چچا کو سناتا۔ مرزا قلندر اس کی حوصلہ افزائی کرتے اور کبھی کبھار بعض انتخاب کردہ اشعار اسے اتنا متاثر کرتے کہ اس پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی اور اس کی زبان سے بے ساختہ موزوں مصرع نکلنے لگتے۔ شعر و ادب کے میدان میں بیدل کو جو کچھ کامیابی حاصل ہوئی اسے بڑی حد تک وہ اپنے چچا مرزا قلندر کی تربیت کا نتیجہ قرار دیتا ہے:

”لمحہ تلمیکہ امر و رونق افزای کا نون تخیل است از پر تو آفتابہای خداداد دوست“ (۸۹)  
شاعری کی جو چمک آج آتش دان تخیل کی رونق بڑھائے ہوئے ہے وہ انہیں کے آثار خداداد (طبیعت) کے پر تو کی بدولت ہے۔

ڈاکٹر ریو (RIEW) کا بیان ہے کہ بیدل کے انتخاب کردہ اشعار کا مجموعہ جو ”بیاض بیدل“ کے نام سے مشہور ہے ہنوز برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ہے۔ اس میں رودکی سے لے کر جانی تک تمام شاعروں کے کلام کا انتخاب موجود ہے۔ اس کے ایک صفحے کا عکس جس کو راقم السطور کی درخواست میوزیم نے بھیجا ہے اور اس مقالے کے صفحہ نمبر ۵۲۶ پر منسلک ہے، اس کے حسن انتخاب، خوبی ذوق و وسیع و دقیق مطالعے کا شاہد عدل ہے۔ مزید معلومات اپنی جگہ پرفراہم کی گئی ہیں۔

بہر حال اس واقعہ کے بعد بیدل نے مخصوص انداز سے اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا، رشتہ کے لئے صرف خدائے تعالیٰ سے لو لگایا اور ظاہری اسباب کے طور پر شوق کو اپنا راہبر بنایا۔ کہتا ہے۔  
شوق در بیدست و پائی نیست مایوس طلب  
چون قلم سعی قدم می بالدا ز مرغان  
(عالم بیکسی میں شوق کو طلب علم سے کبھی مایوسی نہیں ہوتی ہے جس طرح قلم پلک کے چلتا ہے، ہمارے قدم بھی پلکوں کے بل آگے بڑھنے لگتے ہیں)۔

بیدل کے روحانی اساتذہ:  
اب بیدل مقامی اور ظاہری کتب سے نکل کر چلتے پھرتے اور باطنی کتب میں داخل ہوتا ہے۔

مرزا قلندر نے ناخواندگی کی توجیہ کرتے ہوئے بیدل لکھتا ہے کہ وہ طبعی رشادت اور فطری طاقت سے اس قدر بہرہ مند تھا کہ کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذتہ کرنا دونہمتی اور پست حوصلگی کی علامت تھی۔

مرزا قلندر نے درحقیقت بیدل کے وہ روحانی اساتذہ ہیں جن کی خدمت اور صحبت سے وہ مرزا قلندر کی مختلف مقامات کی سیروسیاحت کرتا ہوا استفادہ کرتا رہا۔  
اس سلسلے میں اس نے سب سے پہلے اپنے چچا مرزا قلندر کا ذکر کیا ہے۔ مرزا قلندر اگرچہ اس کے روحانی استاد نہ تھے تاہم روحانی اساتذہ سے بیدل کے تعارف اور ان کی صحبتوں سے اس کا ذریعہ ثابت ہوئے اس لئے اس کا مختصر تذکرہ یہاں بے محل نہ ہوگا۔

مرزا قلندر نے درحقیقت بیدل کے وہ روحانی اساتذہ ہیں جن کی خدمت اور صحبت سے وہ مرزا قلندر کی مختلف مقامات کی سیروسیاحت کرتا ہوا استفادہ کرتا رہا۔  
اس سلسلے میں اس نے سب سے پہلے اپنے چچا مرزا قلندر کا ذکر کیا ہے۔ مرزا قلندر اگرچہ اس کے روحانی استاد نہ تھے تاہم روحانی اساتذہ سے بیدل کے تعارف اور ان کی صحبتوں سے اس کا ذریعہ ثابت ہوئے اس لئے اس کا مختصر تذکرہ یہاں بے محل نہ ہوگا۔

مرزا قلندر کا تذکرہ بیدل نے چند اوراق میں کیا ہے لیکن شروع میں چند سطور میں ان کا خلاصہ نقل دلاوری شرم، مصحف آیہ ظفر، گلشن الہی بہار، قلم معرفت گہر، نوید اقبال جنود مردانگی، مرثیہ رنگینی بہار فرزانگی، نغمہ مروت، جوہر فتوت، شجاعت صفدر، مرزا قلندر۔“ (۹۰)  
ان تراکیب کا اردو میں ترجمہ کرنا ایک تو آسان نہیں دوسرے اگر کیا جائے تو اس کا حسن اور حسن کی بخشی قائم نہیں رہ سکتی۔

بیدل کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان پڑھ اور جاہل ہونے کے باوجود مرزا قلندر مختلف مقامات پر باطنی خصوصیات کے حامل تھے۔ خصوصاً اس کی شجاعت کی تعریف کرتے ہوئے بیدل نے ”ستم ثانی“ کا لقب دیا ہے۔

”پایہ زبر دستیابیش، از عروج تخیل بر راست بیان عاجز خرام تا کجا بر آید و کارنامہ ستانش ہزار استقامت داستان دارد، خامہ لغزیدن احرام تا چہ حد ستاید..... بی تکلف اگر ستم درین ہنگام عرض تہمتی می داد دیدہ امتیاز از کوچک او الان این قلندر ش وانمود“ (۹۱)  
ان کی جسمانی توانائی کا پایہ پرواز خیال سے پرے ہونے کی وجہ سے بیان عاجز خرام کے بس کی بات نہیں ہے اور ان کی بہادری کے کارنامے استقامت اور پامردی کی ہزاروں داستانیں ہیں۔ عرصہ احرام کہاں تک اٹکی تو صیغہ کرے..... حقیقت یہ ہے کہ ستم اگر اس وقت اپنی پہلوانی کی نشان دہی کرتا تو امتیاز کھینچنے والی نگاہیں اس قلندر کو دیکھ کر اس کی پستی کا اندازہ کر لیتیں۔

مرزا قلندر کی ناخواندگی کی توجیہ کرتے ہوئے بیدل لکھتا ہے کہ وہ طبعی رشادت اور فطری طاقت سے اس قدر بہرہ مند تھا کہ کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذتہ کرنا دونہمتی اور پست حوصلگی کی علامت تھی۔

مرزا قلندر نے درحقیقت بیدل کے وہ روحانی اساتذہ ہیں جن کی خدمت اور صحبت سے وہ مرزا قلندر کی مختلف مقامات کی سیروسیاحت کرتا ہوا استفادہ کرتا رہا۔  
اس سلسلے میں اس نے سب سے پہلے اپنے چچا مرزا قلندر کا ذکر کیا ہے۔ مرزا قلندر اگرچہ اس کے روحانی استاد نہ تھے تاہم روحانی اساتذہ سے بیدل کے تعارف اور ان کی صحبتوں سے اس کا ذریعہ ثابت ہوئے اس لئے اس کا مختصر تذکرہ یہاں بے محل نہ ہوگا۔

”در صغرش بزرگبہای ہمت دوچار معلمش نہ پسندید تا سنگ طفلی رنگ جمیش بر مگرداند“ (۹۲)  
لیکن ان پڑھ ہونے کے باوجود وہ طبع موزوں کا حامل تھا۔ اس کی موزونی طبع اور شوق

ذوق کے ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے بیدل لکھتا ہے کہ دروچشم کی وجہ سے ایک دن انہوں نے آنکھوں پر پیپے ریشمی کپڑے کی پٹی باندھ رکھی تھی۔ کسی نے اس کا سبب دریافت کیا تو مرزا قنندر برجستہ شعر میں اس کا جواب دیا۔

محرومی دیدار تو خون در جگر انداخت چشمم جہ کند چشم تو اش از نظر انداخت  
اس کے علاوہ، اکثر بزرگوں کی صحبت سے فیض و برکات حاصل کر کے مرزا قنندر نے سلسلہ بعض منزلیں بھی طے کی تھیں۔

”از صحبت اکثر ارباب طریقت اشفاق فواید معنوی برداشت“ (۹۳)

اپنی فطری ہوش و گوش اور بزرگوں کی صحبت میں نشست و برخاست کی وجہ سے مرزا قنندر اس حد تک ترقی کی کہ بیدل کے الفاظ میں:

کمالات بی سعی کسبش حصول حقایق ہماں بی بیانش وصول  
کسی کوششوں کے بغیر ہی اسے کمالات حاصل تھے اور تقریر و بیان کے بغیر اسے حقایق معلوم تھے۔  
نگر دیدہ بر حرفی انگشت سا بمعنی چو معنی بہ حرف آشنا  
کسی حرف پر انگلی رکھے بغیر ہی وہ اس کے معنی سے معنی کی طرح واقف تھا۔

خن محو نیرنگ موزونیش معانی اسیر فلاطونیش  
خن اس کی موزونی طبع کی رنگینیوں میں محاور معانی اس کے افلاطون ذہن کے اسیر تھے۔  
بہ فیض ازل محرم ہر کلام ولی امی از کسب فضل عوام  
ازل کے فیض سے وہ ہر کلام کا محرم اور اس سے واقف تھا لیکن عوام کے کسب علم و فضل کے

سے ان پڑھ تھا۔

فضائل زادراک او خوشہ چین زہی امت خاتم المرسلین (۹۴)

فضائل اس کی عقل و ادراک کی خوشہ چین ہے آخر خاتم المرسلین کی امت میں ہے اس کا کیا پوچھتا۔  
بیدل نے مرزا قنندر کے دو حیرت انگیز اوصاف بیان کئے ہیں اول یہ کہ مرزا قنندر کے ساتھ کچھ نہیں تک سکتا تھا اور اسے فرار کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا تھا اور اگر کبھی تک گیا تو قہر اجل ہو جاتا۔  
دوسرے اس کے انگوٹھے کے اشارہ سے آہنیں تالے کھل جاتے تھے۔

مرزا قنندر کی مقدار خوراک اگرچہ خاصی تھی لیکن کبھی ہفتوں آب و دانہ منہ لگانے کی نوبت نہ

”حصول نعت کمال بی وساطت گرنگی محال، و سیراب زلال جمعیت بی وسیلہ تشنہ لبی سراب  
ہلال تا از خود تہی مگردیدہ بہ آئینہ داری آفتاب نرسید و صدف تا خشکی سفال بر نیامد  
شش از موج گوہر نہ چید..... گر اینہای جسم اگر بہ پایہ سبکوچی رسد از استعانت ریاضت  
ست۔ و کدورتہای دل اگر آئینہ دار صفا گردد بھیکل کاری خراش محنت..... خلای معدہ در

محال مستند جرات کمالست و امتلاء در جمیع اوقات مادہ غصیان و انفعال۔“ (۹۵)

نعت ”کمال“ کی دستیابی گرنگی کے بغیر خواب و خیال ہے۔ چاند جب تک اپنی ذات سے  
آفتاب کی آئینہ داری کا مرتبہ اسے نہیں ملا۔ اور سیپ نے جب تک کوزے کی خشکی اپنے اندر  
موج گوہر کی آشفتگی سے اسے نجات نہیں ملی۔ جسمانی گرانی اگر سبکوچی کے مقام تک پہنچ  
تو ریاضت ہی کی بدولت اور دل کی کدورتیں اگر آئینہ دار صفا ہو سکتی ہیں تو وہ صرف محنت کی  
نتیجہ ہے۔ خلوت معدہ بہر حال حصول کمال کے لئے آمادگی کا سبب ہے۔ اور شکم سیری ہمیشہ گرانی  
کا سبب بنتی ہے۔

مرزا قنندر کے ان حکیمانہ ملفوظات کے ذکر سے مقصد یہ ہے کہ ان کے جذبات و احساسات  
کی نیت کس قسم کے تھے واضح ہو جائے، شاید انہی وجوہ سے بیدل نے اس کو ”اتمی دارای  
کمال“ کا لقب دیا ہے۔

”ازیں، بیدل کے ابتدائی حالات زندگی کے ضمن میں ترک مکتب کا واقعہ، کلام سلف کا  
انتخاب تیار کر کے روزانہ سنانے کا ماجرا مرزا قنندر ہی کے حسب ہدایت عمل میں  
آیا ہے۔ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ان کی نگاہ کتنی عین و فکر کتنی رسا اور ذوق کتنا بلند تھا۔ ظاہر ہے جو آدمی  
انہی حالات میں اور جس کی طبیعت موزوں نہ ہو وہ کسی کے انتخاب کردہ کلام کی داد کیا دے سکتا ہے یا اس  
کی تعریف کرتا ہے۔ اس لئے مرزا قنندر اگرچہ ان پڑھ تھے مگر سخن شناس اور سخن سنج بھی تھے۔ بیدل نے  
ان کی ہدایت پر عمل کر کے لکھا ہے:

”بسماع اشعار حال وجد سمری کرو۔ و بذوق مضامین عالی از جادری آمد۔ در آں  
حالت بان برق آہنکش، با نماز بدیہ بیائی، آتش در قصور خرمن می ریخت۔ و بیان سراپا  
نیک، با یامی مناسب ادای حیرت از پردہ اندیشی ریخت۔ با قبول قدرت رسائی فکر،  
بلند فطرتان از مضامین پیش پا افتادہ اش بود۔ و با کمال نسبت آشنائی معنی بیگانہ خیال

شہرستان مسخر طبع آزادہ اش۔ از صفای جوہر فطرش مشکف المل تحقیق کہ فہم معنی وجدانی است نہ منحصر تکرار بیانی۔ و نشان ادراک ذاتیت نہ موقوف ساغورق گردانی۔ (۹۶)

اکثر اشعار سن کر ان پر وجد طاری ہو جاتا اور مضامین عالی کا مزہ پاتے ہی وہ بخود ہو جاتے۔ ایسی حالت میں ان کی زبان برق آہنگ خرم تصور میں آتش زنی کرتی۔ بیان سراپا فرمایا۔ مناسب اشارہ سے حیرت ادا ہوتا۔ ان کے جوہر فطرت کی صفائی و پاکیزگی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ فہم معنی ایک وجدانی چیز ہے کچھ تکرار بیان پر منحصر نہیں ہے۔ اور نہ ادراک ایک ذاتی امر ہے۔ ساغورق گردانی پر موقوف نہیں۔

اس کے علاوہ بہت سے دوسرے اہم نکات مثلاً تحقیق و تقلید وغیرہ جس کی بحث اپنی جگہ پر آگئی، بیدل نے مرزا قلندر ہی کی صحبت میں سیکھے۔ آخر میں چچا کے احسانات کی شکرگزاری ان میں کی ہے۔

”ہر چند عمر یست شمع انجمن حضورش غلوت افروز عالم نیرنگ است، قانون عجز آہنگ بیدل ہمان مرہون زمرہ تہنیت اوست۔ ورشتہ ساز انفاس بچیان شکر نوای حقوق تربیت او۔ باستفاضہ انوار خدمتش چہ خورشید نگاہاں کہ لمحہ توجہ شان برین شبنم ضعیف نافت۔ وباستفادہ آثار محبتش چہ عالی ہمتاں کہ نظر التفات ایشان این مشیت خاک را در نیافت۔ تارہتمہ تنخیل در جنگ کشاکش زندگیت، نفسی نیست کہ چاک گریبان اندیشہ لب بغاقت یا دشاں نکشاید۔ وزمانی نمی گزرد کہ داغہای حسرت بہ سراغ نقش پای ایشان جبہ سجود بر نیارد“ (۹۷)

ان کے حضور کی شمع انجمن کو عالم نیرنگ میں غلوت افروز ہوئے (انتقال ہوئے) اگر چہ ایک عرصہ ہو گیا تاہم قانون عجز آہنگ انہیں کے زمرہ تہنیت کی رہین منت ہے اور ساز انفاس کا رشتہ کے حق تربیت کا شکر گزار ہے۔ ان کی خدمت فیض درجت میں بہت سے خورشید نگاہ اولیا کی خدمت اس کمزور شبنم پر چمکی اور بہت سے عالی ہمت حضرات کی نظر التفات اس مشیت خاک پر پڑی۔ رشتہ نگاہ جب تک کشاکش زندگی سے برسر پیکار ہے کوئی سانس ایسا نہیں نکلتا جب اندیشہ لب چاک گریبان ان کے فاتحہ کے لئے لب کشائی نہ کرتا ہو۔

چچا مرزا قلندر کی صحبت اور رفاقت میں بیدل کو کئی ”خورشید نگاہ“ اور ”عالی ہمت“ (۹۸) بزرگوں کا تعارف اور ان کی توجہات کریمانہ حاصل ہوئیں لہذا اب ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے جن کے لمحہ توجہ نے بیدل کے شبنم ضعیف کو تابانی عطا کی اور جن کی نگاہ کرم آشنائے بیدل کی مشیت خاک کو کیما بنایا۔

یہاں اس امر کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تاجیکی ادیب صدر الدین عینی نے ان خورشید منیرات کے کرامات کے واقعات کو عام معمولی واقعات قرار دیا ہے اور جہاں اس کی واقعیت سے انکار نہیں ہے وہاں اسے گول کر جاتے ہیں اس کے بعد تاکید کے ساتھ کہتے ہیں کہ بیدل نے اپنے علمی ہونے کے زمانے میں ان افکار و خیالات سے بے تعلقی کر لی تھی۔ (مجلد ادب کا بل دورہ ۲۱ ش ۱۹۷۰ء) ۳۱ سال کی پختہ عمر میں اسے لکھنا شروع کیا اور ۱۱۱۶ھ میں ۶۳ سال کی عمر میں مکمل کیا۔ بیدل کی اس کا جواب دیتا ہے۔

بیدل کی خراشد وحشت صحرائی دل آنچہ ما پیوودہ ایم از ملک طول و عرض نیست مولانا شیخ کمال قادری:

بیدل کے والد مرزا عبدالخالق کے تذکرے میں مولانا کمال قادری کا نام ضمنی طور پر آچکا ہے۔ ان کی شخصیت سازی اور آدم گری کی خصوصیت پر روشنی ڈالیں گے۔

مولانا کمال کو بیدل کا خاندانی پیرو مرشد سمجھنا چاہئے کیونکہ والد کی طرح اس کے چچا بھی ان کے اخلاق میں داخل تھے اور خود بیدل نے بھی ان کی صحبت سے فیوض و برکات حاصل کئے تھے۔ ان سے عقیدت رکھتا تھا لکھتا ہے:

”تقیی والد شریف فقیر از روح مقدس غوث الاعظم بہ وساطت آن ذات تقدس آیات بود۔ مرزا قلندر ہم رہی از نسبت ہم حرکیش، کلاہ مہبات بر عرش عزت می سود“ (۹۹)

خاکسار کے والد ماجد کی حضرت غوث الاعظم (شیخ عبدالقادر جیلانی) کی روح سے تلقین و تقسیم ذات تقدس آیات کے توسط سے جاری تھی اور خاکسار کے چچا مرزا قلندر تو ان سے ہم کلامی و فخر و مہبات کی ٹوپی عرش عزت پر گھسا کرتے تھے۔

مولانا کمال قصبہ ”رائی ساگر“ کے رہنے والے تھے جو صوبہ بہار کے موجودہ ضلع بھوپور میں ہے۔ ان کے صدر مقام پٹنہ سے تقریباً ۲۰ میل کے فاصلے پر مغربی جانب واقع ہے اور سرائے بنارس کے ایک فرخ کی دوری پر ہے۔

بیدل کے مطابق مولانا کمال کا شمار اُس دور کی سربراہ آئندہ شخصیتوں میں ہوتا تھا۔ وہ اگر علوم و فنون میں ”نق زمانہ“ تھے تو علوم باطن میں ”استاد یگانہ“۔ یہ الفاظ دیگر، تمام ظاہری اور باطنی علوم کے اشراف و جوانب میں مرشد قادری المشرّب کے نام سے مشہور تھے اور عوام ان سے بڑی حیرت و ارادت رکھتے تھے۔ لکھتا ہے:

”آواز سلسلہ قادریہ، از رسائی قدرتش شتہ گردون کند، و پایہ مدارج سلوک باستقامت ہمیش مفتخر سر بلندی۔ ہم در آداب قواعد شریعت ”نسق زمانہ“ وہم در علوم ارشاد طریقت ”استاد یگانہ“۔ باوجود تقیدات جسمانی، چون نفس و ارتگی بنیاد و با کمال تعلقات امکانی چون نگاہ از خانماں آزاد۔“ (۱۰۰)

اس اقتباس میں ان کی ایک اور خصوصیت کی طرف بیدل نے اشارہ کیا ہے کہ جس تمام تقاضوں سے وابستگی کے باوجود وہ سانس کی طرح وارستہ اور کمال تعلقات امکانی کے باوصف تھے۔ طرح گھربار سے آزاد رہتے تھے۔ ڈاکٹر غلیل اللہ خلیلی نے اس آخری جملے سے یہ اخذ کیا کہ مولانا کمال قادریہ مادر زاد برہنہ مجذوب“ تھے (۱۰۱) لیکن راقم السطور اس خیال سے اتفاق نہیں کرتا کیونکہ آگے بیدل نے خود تصریح کی ہے کہ شاہ ملوک برہنہ مجذوب قسم کے آدمی تھے جبکہ مولانا کمال لباس پہن رہا کرتے تھے۔ البتہ دنیوی علاقے سے وابستگی کے باوجود وہ اس معنی میں آزاد تھے کہ دنیا داروں کی طرح دنیاوی دکھ سکھ سے متاثر نہیں ہوتے تھے۔

اس بزرگ سے بیدل کی غیر معمولی ارادت کا سبب ان کی اثر انگیز شخصیت تھی۔ جو بھی ان خدمت میں حاضر ہوتا وہ کم از کم منکرات سے ضرور توبہ کر لیتا الا یہ کہ جس کی قسمت میں ازل سے عروہ اور فسق و فجور کے دریا میں غرقابی لکھی ہوتی وہ ان کے قریب پہنکنے سے بھی گریز کرتا۔ مولانا کمال لوگو خصوصاً ارادتمندوں کو مختلف قسم کے اوراد و وظائف کی تلقین کرتے تھے۔ اسی ضمن میں وہ مرزا قلندر جو کچھ بتاتے بیدل انہیں پوری توجہ سے سنا کرتا اور غلوت میں انہیں قلم بند کر لیتا۔ بیدل کا ابتداء رہی سے بیماروں کی جھاڑ پھونک کی طرف فطری میلان تھا۔ عزیزوں اور پڑوسیوں کی عیادت کے وقت وہ انہیں دم بھی کیا کرتا تھا اور خوش قسمتی سے وہ صحت یاب بھی ہو جاتے تھے۔ جب وہ کچھ پڑھ لکھ لے اسے ادبیہ اور خواص اسمائے الہی کی معلومات فراہم کرنے کا شوق ہوا۔ کچھ کا تعلق جنوں کو جلانے انہیں نیست و نابود کرنے سے تھا۔

”از آنجہ در حرق و استیصال عزیزیکہ تر جانش زبان قدرت بیان حضرت مولانا بود، و فریب سماعش آنکہ بامیرزا قلندر حکایت بیان می فرمودند، از معتمات حصول آرزو دانستہ مدتی چوں پری در شیشہ خانہ ادراک محفوظ داشت و بر نگین اعتقاد نقش خاتم سلیمانی پنداشت۔“ (۱۰۲)

مجملہ ان کے اجنہ کو جلانے اور ان کا صفایا کرنے سے وابستہ ایک تعویذ تھا جسے مولانا کمال قدرت بیان نے بتایا تھا۔ لطف کی بات یہ کہ مولانا اُسے مرزا قلندر سے بیان فرما رہے تھے اور

یہ آرزو کی تکمیل کے موقع کو غنیمت سمجھ کر عرصے تک اپنے خانہ ادراک کے شیشے میں پری کی طرح محفوظ رکھتا رہا اور اپنے اعتقاد کے ٹکینے پر اسے خاتم سلیمانی کا نقش تصور کرتا رہا۔ یہاں اسی قسم کا ایک واقعہ لکھنا ہے محل نہ ہوگا۔ کیونکہ اس واقعہ سے بیدل کا رجحان طبع تو معلوم ہے اس کی تابناک قسمت اور پوشیدہ جوہر کا بھی پتہ لگتا ہے جو قدرت نے اس کے اندر چھپا رکھا تھا۔ ایک دن وہ اپنے ہم جولیوں کے ساتھ ایک گھر میں کھیل رہا تھا، اچانک اسے خبر ملی کہ جب خانہ کی بیوی پر آسیب کا اثر ہے۔ دودن سے بیہوش پڑی ہے اور موت کے لگار پر پہنچ چکی ہے۔ اس نے حضرات آئے، جھاڑ پھونک کر کے گئے مگر لا حاصل۔ اس کے دل میں آیا کہ میں بھی تجربہ کر دوں۔ اس کے ایک محرم کو بلا کر اس کی انگلی پر اسم اعظم دم کیا اور کہا کہ عورت کے کان میں اس نے حسب ہدایت یہ کام انجام دیا۔ انگلی کان میں پڑتے ہی وہ مردود جن اسے چھوڑ کر اس بجاء جیسے کالائٹ آگ پر رکھتے ہی ایک آواز کے ساتھ کود جاتا ہے۔ وہاں پر موجود حضرات کو بڑی حیرت ہوئی اور زبان حال سے کہنے لگے۔

”شوقی رعد، از طنین پشہ دام حیرتست۔ ذرہ وانظہار خورشیدی مقام حیرتست۔“ (۱۰۳)

چھڑکی نحیف آواز سے بجلی اور کڑک کی سی شوقی ظاہر ہو حیرت ہے، ذرہ سے سورج جیسی اظہار ہو مقام تعجب ہے۔ جب کسی نے مولانا کو اس واقعہ کی خبر دی تو انہوں نے اپنے پاس نہائی لطف اور عنایت کے انداز میں پوچھا یہ کیسے انجام دیا؟

”بسیطی، مشت خاکت، بکدام کسب لطافت صورت یافت و محیطی، نم آبت، از چہ طوفان راہ شمت شکافت۔“ (۱۰۴)

تیری مشت خاک کی بساطت کس لطافت سے آئینہ ہو کر صورت پزید ہوئی ہے اور تیری کس سمندر نے کس طوفان سے شہرت کی راہ ڈھونڈ نکالی ہے۔

بیدل نے جواب دیا:

”دانہ از خوش چینی اسرار شریف ریشہ این قدرت دو انیدہ است۔ و نقطہ از رموز فہمی زبان حقایق تعنیف نسخہ این تصرف بہ ترتیب رسانیدہ۔ و گر نہ بنفس راہ لب تمہیدہ چہ تاخیر توان ندوخت۔“ (۱۰۵)

دانہ (بیدل) نے (حضرت ہی کے) اسرار شریف سے خوشہ چینی کر کے اس درجہ ریشہ دوانی حقایق تعنیف نسخہ این تصرف بہ ترتیب رسانیدہ۔ و گر نہ بنفس راہ لب تمہیدہ چہ تاخیر توان ندوخت۔

اس واقعہ کے بعد مولانا، بیدل کے حال پر پہلے سے کہیں زیادہ توجہ دینے لگے اور ان عنایتیں اتنی بڑھ گئیں کہ باقاعدہ عملیات کی ایک کتاب اسے عطا فرمائی جس میں دوسرے عجیب و غریب اعمال بھی شامل تھے اور فرمایا کہ اب تک جتنی عملیات اور تعویذات میں نے لکھے یا میرے تجربے میں آئے ہیں سب اس میں اکٹھے کر دیئے ہیں۔ اس کے بعد پیشین گوئی کے طور پر فرمایا۔

”باخبر باش کہ طالعیت سلیمان نظیر است و نفست عیسوی اثر۔ ازین اعمال ہرچہ مشغول آن شوی مبارکت باد و ازین اعمال ہرچہ دست زنی بفضل حقیق یارت کناد (۱۰۶)

واضح رہے کہ تیری قسمت حضرت سلیمان علیہ السلام جیسی اور تیری پھونک میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسی پھونک کا اثر ہے۔ ان عملیات میں سے جو بھی تو انجام دے گا یا جس پر بھی تجربہ کرے تجھے مبارک ہو اور خدا کا فضل تیرا معاون و مددگار ہو۔

بیدل خود کو مولانا کی توجہات کریمانہ کا ممنون قرار دیتا ہوا لکھتا ہے کہ اس کے بعد جو عمل میں نے کیا اس میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی جبکہ بہت سے عامل حضرات عرصے تک ریاضت شاذ و چلہ کشی کے بعد بھی اس میں کامیاب نہیں ہوتے ہیں۔

”آن نگاہ توجہ بنای فطرتم بر شہود معانی گزاشت۔ وہاں رحمہ استغنا، تخم بہتم در زمیں بی

نیازی کاشت“ (۱۰۷)

اس واقعہ سے مولانا کمال کارو حانی مقام کتنا بلند تھا واضح ہوتا ہے جن کی چند روزہ صحبت کت سے بیدل کو عملیات کے میدان میں وہ کامیابی حاصل ہوئی جو لوگوں کو عام طور سے چند ریاضت کے بعد بھی نصیب نہیں ہوتی ہے۔ اسی کے ساتھ بیدل کی پوشیدہ صلاحیتوں اور وہی لیاقت بھی اندازہ ہوتا ہے۔ بیدل نے اس اثر انگیزی کا درج ذیل سبب قرار دیا ہے۔

فانوس شمعہا اثر قابلیت است بی رنگ هیچ جلوہ مصور نمی شود

از شعلہ کسب نور چراغ فسرده را بی روغن و فیتلہ میسر نمی شود (۱۰۸)

فانوش شمع میں اثر پذیری کی صلاحیت ہوتی ہے۔ پر بغیر رنگ کے کسی جلوے کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ چراغ اگر گل ہو گیا ہے تو شعلے سے اسی وقت اسے روشن کیا جاسکتا ہے جب اس میں تیل اور جتنی موجود ہو۔ گویا بیدل یہ بتانا چاہتا ہے کہ قدرت نے اس کے چراغ عقل میں روغن جو ہر اور خیر استعداد و ولایت رکھی تھی جو خدا شناس عارفوں کے شعلہ صحبت سے جلا پا کر روشن ہو گیا۔ اس طرح دیکھتے ہیں کہ بیدل کی فکری بالیدگی اور روحانی ارتقا نیز شخصیت کی تعمیر میں مولانا کمال کا بڑا حصہ ہے۔ علاوہ ازین، خوشگو کے مطابق، شعر گوئی میں بھی بیدل نے ان سے استفادہ کیا۔ اس وقت

تھیں وہ رمزی رکھتا تھا، ایک دن گلستاں کے دیباچہ کا مطالعہ کر رہا تھا کہ اچانک درج ذیل شعر اس کی نظر سے گذرا:

گر کسی وصف او پرسد بیدل از بی نشاناں چہ گوید باز  
یہ مصرع بیدل کو اتنا بھلا لگا کہ فوراً اپنا تخلص بدل کر بیدل اختیار کر لیا۔ اور قبلہ شیراز کی روح پر  
نظم سے فال لیا۔ (۱۰۹)

ک۔ ن۔ پنڈتا نے لکھا ہے کہ بیدل نے چہار عنصر میں سمرات کے ساتھ لکھا ہے کہ شاعری میں وہ مولانا کمال سے اصلاح لیتا تھا۔ (۱۱۰)

لیکن راقم السطور نے مولانا کمال سے متعلق بیدل کے بیانات کا بار بار مطالعہ کیا۔ ایسی کوئی بہت نظر نہیں آئی۔ خوشگو کے اس سلسلے میں آخری جملہ ”از روح پُر فتوح قبلہ شیراز استمداد جستہ“ سے جب غلام حسن مجددی نے یہ استنباط کیا ہے کہ بیدل نے حافظ کی روح سے استمداد کر کے اپنا تخلص ”بی“ سے بدل کر بیدل اختیار کیا تھا۔ (۱۱۱) جناب سید علی محمد سجادی نے حافظ کی اس غزل کی اس طرح تفسیر کی ہے۔

باز منزل جانناں گذر در بخت مدار و زو بعاشق ”بیدل“ خبر در بخت مدار (۱۱۲)  
بیدل نے اپنے تخلص کے بابت درج ذیل چند اشعار کہے ہیں جن سے اس تخلص کے پیچھے کیا

تخلص اس کے پیش نظر تھا معلوم ہوتا ہے۔  
فی من زین قلم حیرت جبابی گل نہ کرد عالمی صاحب دل است اما کسی بیدل نہ شد  
این صدفہا یک قلم بی گوہر اند عالمی دل دارد اما دل کجا ست  
بے دلم بیدل مرا جز بچ بودن ساز کو از عدم می جو شتم انجام چہ و آغاز کو  
جہاں تک بیدل کا تعلق ہے اس نے مولانا موصوف سے استفادے کا تذکرہ کرتے ہوئے  
نظم میں ان کی شاگردی کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ بلکہ حاصل استفادہ کچھ تو ”وحدت و کثرت“ سے  
تخلص اہم نکات ہیں اور کچھ عزائم و تعویذات سے متعلق۔

شاہ ملوک:

واقعات کی درمیانی کڑی اور ربط کی بنیاد پر مولانا کمال کے بعد بیدل کے جس دوسرے روحانی  
تذکرہ ہونا چاہئے وہ شاہ ملوک ہیں۔ ان کا اصلی نام کیا تھا بیدل کے بیان سے واضح نہیں ہوتا۔  
اور جن دیگر بزرگوں کے نام آئندہ صفحات میں آئیں گے ان کے متعلق شیخ اکرام کا خیال ہے



کہ ان کے اصلی نام نہ تھے بلکہ ان ناموں سے وہ معاشرے میں مشہور تھے۔ ان کو پکارنا نام کے زمرے میں شمار کیا جاسکتا ہے کیونکہ ہندستان کے اکثر مجذوب اسی عرفی نام سے پکارے یا جانے جاتے ہیں۔ (۱۱۳) شاہ ملوک کا قیام ایک گاؤں ”سراے بنارس“ میں ایک درخت کے سایہ تلے تھا جو رانی ساگر سے ایک فرسخ کے فاصلے پر واقع تھا:

”سراے بنارس موضعی است از نواح ممالک بہار۔ مدتی چون سایہ بہ پای درختی واکشیدہ بود“ (۱۱۴)

دوسری جگہ صرف لفظ ”بنارس“ استعمال کیا ہے مگر سیاق و سباق بتاتا ہے کہ مراد سراے بنارس ہی ہے۔ ”از بنارس تارانی ساگر فرخی بیش بود“ (۱۱۵)

رانی ساگر ہنوز موجود ہے جو بہار کے ضلع بھوجپور (پٹنہ سے پچھتم) میں واقع ہے مگر سراے بنارس کا پتہ نہیں چلتا جیسا کہ سید سلیمان ندویؒ کی تحقیق ہے۔ (۱۱۶)

بیدل نے شاہ ملوک کے سراپا کا نقشہ جس طرح کھینچا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس علاقہ کے ایک مجذوب تھے جو زندگی کی تمام قیود و رسوم سے آزاد تھے مگر ہر اندر کبھی پوشاک میں نظر آتے تھے۔ خوراک کی خود انہیں کوئی خواہش نہیں ہوتی تھی دوسرے لوگ بھلے ہی اس پر دھیان دیتے تھے اور وہ بھی کبھی چند دانوں اور ایک گھونٹ پانی پر اکتفا کرتے تھے۔ اپنی تمام تر وارفتگی کے باوجود وہ ایک لحو کے لئے بھی حاضرین کے حال سے غافل نہیں رہتے تھے۔ بات کرتے وقت ان کے منہ سے جھاگ نکلتا جیسے سمندر جوش میں آنے کے بعد اپنا قیمتی جوہر ساحل پر پھینک دیتا ہو۔ اس اثنا میں سامعین نے اگر ان کی مجذوبانہ گفتگو پر دھیان دیا تو دنیاے آفاق و انفس کا کوئی نہ کوئی راز ان کے پلے پڑ جاتا۔ بیدل نے دو جملوں میں ان کی تعریف کا خلاصہ پیش کیا ہے:

”بی تکلف آئینہ ای داشت صورت نمای احوال عالم۔ وہی شائبہ چراغی بود ظلمت زدای اشکال سرانہ ہم“ (۱۱۷)

ان کی شخصیت بلا تکلف ایک آئینہ کی حیثیت رکھتی تھی جس میں احوال عالم کی جھلک نمایاں تھی اور بلاشبہ وہ ایک چراغ تھے جو پوشیدہ اسرار و رموز کی شکلوں کی تاریکی کو چھانٹ کر رکھ دیتا ہے۔ ان دونوں بزرگوں (مولانا کمال اور شاہ ملوک) کی صحبت سے بیدل کے استفادہ اور ان کے متضا و نظریوں کے درمیان مطابقت و ہمابہنگی کی کوشش نے بیدل کو کس منزل پر پہنچایا اور اس کی شخصیت اور فکری ارتقا میں انہوں نے کیا رول ادا کیا اس کی وضاحت کے لئے ضروری ہے کہ ان دونوں کے درمیان آمد و رفت کے دوران پیش آنے والے بعض واقعات کا یہاں تذکرہ کیا جائے۔

یہ دونوں بزرگ بظاہر دو متضاد نقطہ ہائی نظر کے حامل تھے۔ ایک ظاہر شریعت کو دیگر تمام امور پر ترجیح دیتے تھے تو دوسرے زندگی کی تمام قیود و بند سے آزاد پاگلوں اور مجنوں کی طرح زندگی بسر کرتے اور منائے باطن کو دیگر تمام امور پر فوقیت دیتے تھے۔

ایک دن مولانا کمال اپنے بعض ارادتمندوں کو منازل سلوک کی تلقین فرما رہے تھے کہ انشاء گفتگو میں بول کی صحبت میں نشست و برخاست رکھنے کا ذکر آیا۔ مولانا نے نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کی صحبت سے حتی الامکان بچنا چاہئے کیونکہ ان مجنوں کی قربت شعلہ آتش میں قدم رکھنے کے مترادف ہے۔ یہ مجنوں صفت انسان (شاہ ملوک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) جنہوں نے عریانی اور اپنا اصول زندگی بنا رکھا ہے، اگر انسانیت کا ملہ کا تقاضا یہی برہنگی ہے تو ریچھ، بندر اور تمام ان حیوانات کو جو مادر زائید رنگے زندگی گزارتے ہیں، ارباب فضل و کمال کے زمرے میں شامل کرنا چاہئے۔ یہ نہیں ہے۔ اسی طرح بات کرتے وقت منہ سے جھاگ نکالنا اگر فصاحت و بلاغت کی علامت ہے تو انٹ کو جو اس کام کے لئے مشہور ہے، فصیح و بلیغ انسانوں کی صف میں جگہ دینی چاہئے۔ لہذا جس کو احسن تقویم کی شرافت سے نوازا ہے اس کو برہنگی کی ذلت آمیز صورت نہیں اختیار کرنی چاہئے۔

انبیا صاحب دعوت بودند صورت و معنی الفت بودند

انبیا صاحب دعوت تھے، وہ الفت کی پیروی اور باطنی شکل تھے۔

عمرہ از اثر سعی وفاق عرضہ دادند طریق اخلاق

ایک مدت تک لگا تار کادشوں کے بعد انہوں نے لوگوں کو اخلاق کے اصول و ضوابط بتائے۔

تا تو زان شیوہ مکرم گشتی غولیت محو شد و آدم گشتی

یہاں تک کہ تم اس اصول کو اپنا کر معاشرہ میں معزز ہوئے، شیطیت تم سے رخصت ہوئی اور آدم بنے۔

گرجنوں رسم ہدایت می داشت جذبہ در خلق سرایت می داشت

جنون اور پاگل پن اگر ہدایت اور رہبری کی رسم ہوتی تو یہ جذبہ لوگوں میں ضرور سرایت کرتا۔

ہر کجا بی ادبی عریانیت بہر این بیخردان دکانیت

جہاں بھی کوئی بے ادب عریاں اور بنگا نظر آئے تو سمجھ لو کہ بے عقلوں کے واسطے وہ ایک دکان ہے۔

بیدل کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا کمال اور شاہ ملوک کا جب کبھی آئنا سنا ہوتا تو شاہ

پہن کر خاموش ہو جاتے اور جونہی ایک دوسرے سے جدا ہوتے تو حسب سابق برہنہ

ہوتے۔ اس وقت جبکہ مولانا کمال اپنے ارادتمندوں کی تعلیم و ارشاد میں مشغول تھے شاہ ملوک سے



ان کا مقابلہ ہوا۔ شاہ صاحب نے حسب معمول فوراً کپڑے زیب تن کر لئے اور جب الگ ہوا۔ لباس عریانی پہن کر بہ آواز بلند کہنا شروع کیا کہ:

”ساز حقیقت از دست مجاز تراشان بی اصول کمین گاہ صد معشر فریاد است۔ و حسن معنی از نگاہ آشنایان بی ادراک، غبار آلود یلعالم بیداد..... اگر آسمان را برہنہ پنداشتہ، در ساز جباب می کوشند۔ غشاوہ غفلت است نہ دانائی۔ و اگر آفتاب را عریان انگاشتہ چشم انصاف می پوشند، اثر خفاشی ست نہ بینائی۔“ (۱۱۹)

شاہ ملوک کی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ حقیقت و مجاز دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ جن کی نگاہ میں الجھ کر رہ گئی ہیں انہیں حق نہیں پہنچتا ہے کہ حقیقت آشنائوں کے حق میں لب کشائی کی جرأت کرے ورنہ ظالموں کی صف میں ان کا شمار ہوگا۔ اور جس کو حقیقت کا سراغ مل گیا وہ مختلف اشیاء کے درمیان تمیز کا قائل نہیں ہوتا۔ ساری چیزوں میں اسے شاہد حقیقی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ زمین و آسمان، پند و سورج، حیوانات و نباتات، دریا و صحرا غرض تمام فطری مظاہر و مناظر کو وہ جلوہ گاہ احدیت تصور کرتا ہے لہذا آسمان کو برہنہ تصور کر کے اگر کوئی لباس زیب تن کرنے کی کوشش کرے تو اسے حق بجانب سمجھا رہا نہیں کہا جاسکتا کیونکہ ہر چیز اپنی موجودہ اور مخلوقہ شکل میں جلوہ گاہ احدیت ہے لہذا برہنہ ستر پوشی بے معنی الفاظ ہیں۔ البتہ جو لوگ زہد و تقویٰ کے دعویدار ہیں انہیں اس نکتے پر دھیان دینا چاہئے کہ ”تقویٰ“ اصل میں ماسوی اللہ کے دوسو سے باز رہنے کا نام ہے۔ دوسروں کے عیب و اور خوبی و خامی کی تفتیش کا نام نہیں ہے اور ”زہد“ زور و قوت کے نگوںکدہ سے نکل کر معجز و بے چارگی کا ہمیش آباد کا رخ کرنے کا نام ہے، ٹوٹے ہوئے دلوں کے درپے آزار ہونے کا نہیں۔ اس لئے ”زہد و تقویٰ“ کا مطالبہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اپنی ذات کو مختلف قسم کے اوصاف حمیدہ سے آراستہ جائے اور دوسروں کے عیوب و نقائص کی ٹوہ میں نہ رہا جائے۔ جو لوگ زہد و تقویٰ کے دعویدار تھے ان کا ظاہر اس کے تقاضوں سے خالی تھا شاہ ملوک ان کو ”کور“ (اندھا) کہتے تھے اور ان ”کوروں“ کی صحبت سے گریز کی نصیحت کرتے۔

مخور از پاکی دامان زاہد فریب نور بی ایمان زاہد  
دامن زاہد کی (ظاہری) پاکی و صفائی سے اس کے نور سے خالی ایمان کے فریب میں نہ آئے۔  
ز مکر ساد گہبائش بہ پرہیز کتان واری ازیں مہتاب بگریز  
اس کی سادگی میں جو مکر و فریب پوشیدہ ہے اس سے پرہیز کرو اور کتان کی طرح اس کے

سے بھاگو۔

سنا در جبہ و عمامہ است صرف طلسم قیر ز و اندودہ برف (۱۲۰)  
ساری صفائی و پاکی جنبہ و عمامہ میں سمٹ کر رہ گئی ہے تاکرول کا ایک طلسم ہے جس پر برف جمی ہے۔  
یہ لکایا ہے جس زمانے میں ان دونوں کے درمیان یہ بحث ایک دوسرے کے بالمقابل  
ہو رہی تھی میرے بعض اعزہ، جو مولانا کمال کی صحبت سے استفادے کی غرض سے ان کے  
ساتھ تھے ان کو مخاطب کر کے مولانا نے فرمایا:

”ہر کرا گیت شہود و حقیقت از دست بردہ باشد، گفتگویش بہ زبان اصطلاح مجاز راست  
نیہ۔ و تاریشہ عبارت، سامان نشو و نما دارد، قابل راہمنشی معنی تحقیق نہ شاید، مجنوں را  
تہ زنگ دگل ننگ نسبت دیوانگیست ایل“ (۱۲۱)

مولانا کی گفتگو کا حاصل یہ تھا کہ پاگلوں کی دو قسمیں ہیں ایک تو حقیقی پاگل ہوتے ہیں اور  
دوسری تو خود ساختہ پاگل۔ مجنوں کی ان دو قسموں کے درمیان جو باہمی فرق ہے یہاں اس کے  
تعمیل کی ضرورت نہیں۔ جو لوگ واقعی پاگل ہوتے ہیں وہ شیشہ و سنگ اور دُر و صاف میں تمیز نہیں  
کرتے۔ بڑی تعداد خود ساختہ مجنوں کی ہوتی ہے یعنی ان کا مقصد چونکہ تن آسانی اور سہولت پسندی  
ہے ہوش و گوش کے باوجود وہ زندگی کی تمام قید و بند سے آزاد بنے پھرتے ہیں اور اس حقیقت سے  
غافل ہیں کہ شریعت مطہرہ انسان کو جب تک اس کے ہوش و حواس درست ہیں اپنے احکام و  
مقتضات مجتہد ہے اس لئے ان بیکاروں کی صحبت سے بچنا ضروری ہے کیونکہ کارخانہ عالم کا کمال اگر  
میں باری اور وقت گذاری ہوتا تو ان کے منہ شہود پر قدم نہ رکھنے سے کوئی نقصان نہ پہنچتا۔ اس قسم  
کے مجنوں و دانش کے تقاضوں سے آزاد ایک مسلک کے حامل ہوتے ہیں اور اس کے مجتہدین جیسا  
کہ مذکور کرتے ہیں، خون حیض میں غوطہ خوری کو اگر وضو تصور کر لیں تو کوئی حیرت اور تعجب کی بات نہیں۔  
ان دونوں کے نقطہ ہای نظر پر غور کریں تو اس بات کا امکان ہے کہ پیچیدگی میں گرفتار ہو کر  
کچھ نیچے پر نہ پہنچ سکیں کیونکہ ہر ایک اپنے دعویٰ کو دلائل کے ساتھ اس طرح بیان کرتا ہے کہ اس کا  
دعویٰ بالکل معلوم ہوتا ہے۔

ان کے متضاد بیانات سے پیدا ہونے والی پیچیدگی سے دامن بچاتے ہوئے ان کے درمیان  
کیوں نہ بیدل نے جس طرح نکالی ہے اس سے اس کے ذہن رسا اور ذوق سلیم کی داد دیئے بغیر  
ممکن نہیں کہتے:

مطلب شاہ نفی اوہام تعین بود در مشاہدہ جلال وحدت و مقصود مولانا اثبات ذات  
ہو در عین انتظام کثرت۔“ (۱۲۲)

یعنی جلال وحدت کے مشاہدہ میں شاہ ملوک نے خود کو اس طرح فنا کر دیا تھا کہ ”میر“ کے تہ کی بھی ان کے صفحہ ذہن پر گنجائش نہیں رہ گئی تھی یعنی جس چیز پر نظر پڑتی تھی ان کو واجب الوجود کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ الفاظ دیگر وہ ”وحدۃ الوجود“ کے قائل تھے جبکہ مولانا کمال عین کثرت میں وحدت مشاہدہ کر رہے تھے یعنی اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد کہ یہ عالم عالم کثرت ہے اس عالم کثرت کی چیز ذات بحث کے پر تو کی جلوہ گاہ ہے اس لئے ”کثرت“ میں ”وحدت“ نمایاں ہے۔ یہ الفاظ ”وحدت الشہود“ کے قائل تھے۔ اس فرق کو بیدل ایک مثال کے ذریعہ واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”خواہ گرمی را طبیعت آتش داند، خواہ آتش را لباس گرمی پوشاند، چوں حاصل بر مژدن دو دست یک صدا است و نتیجہ تحریک دو لب یک مدعا۔“

حرارت کو چاہے آگ کی طبیعت کہہ لیجئے یا آگ کو حرارت کا لباس پہنا دیجئے دونوں باتوں سے تالی بجانے کا حاصل ایک ہی آواز ہے اور دونوں ہونٹوں کی جنبش کا نتیجہ ایک ہی مدعا۔ گویا ان دونوں بزرگوں کے خیالات میں کوئی تصادم نہیں۔ البتہ نقطہ ہای نظر کے شیوہ انہ میں فرق ہے ایک حرارت کو آگ کی طبیعت قرار دیتا ہے تو دوسرا آگ کو حرارت کا لباس پہناتا ہے۔ آگ کا تعارف ہر حال میں حاصل ہے۔ ان دو بزرگوں کی صحبت سے بیدل نے جو کچھ استفادہ کیا اسے انتہائی فخر کے ساتھ بیان کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:

”دماغ معنی سراغ بیدل از گردش این دو ساغر یک نعل دو بالا گردید و طبیعت تحقیق مایل بر مطالعہ این دو نسخہ یک سبق تکرار رسانید۔“ (۱۲۳)

یعنی بیدل کے تجسس دماغ کا نشہ ان دونوں جاموں کی گردش سے دو بالا ہو گیا اور تحقیق طبیعت کو ان دونوں کے مطالعہ سے ایک ہی سبق کا تکرار حاصل ہوا۔

یہ پہلا موقع تھا جب بیدل کو ”وحدۃ الوجود“ اور ”وحدۃ الشہود“ کی صوفیانہ اصطلاحوں سے سابقہ پڑا اور جس نے اس کے افکار و خیالات کے دھارے کو ایک خاص جہت بخشی۔ اس موضوع الگ سے بحث ”بیدل کے افکار و خیالات“ کے تحت آئندہ صفحات میں ہوگی۔ شاہ ملوک کے باب میں بیدل کا یہ آخری جملہ نہایت غور طلب ہے:

”الحاصل ذات بی نیازش با ہمہ عریاں تئی گنجہ در آستین داشت“ (۱۲۴)

غرض کہ ان کی بے نیاز ذات نے تمام تر عریانی و برہنگی کے باوجود اپنی آستین میں خزانہ رکھے تھے۔

بیدل نے ایک واقعہ ایسا بیان کیا ہے جس سے شاہ ملوک کے بلند روحانی مقام کا اندازہ ہوتا ہے۔ دن خدا شناسی سے بیگانہ کچھ قلندروں کی ایک جماعت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ انہوں نے بڑی گستاخی اور بے ادبی سے شاہ صاحب سے بات کرنی شروع کی اور زبانی گفتگو کرتے کرتے بڑھ کر ہاتھ پائی پر آتر آئے۔ بیدل کے الفاظ میں ”اپنے سگ صفت ناخن اور دانت سے ان کی عریاں کوتا رتا کر کے رکھ دیا اور افسردگی کے گمان میں شعلے پر ہاتھ رکھ دیا“ اچانک شاہ ملوک ان سے برق غیرت عنوان کوندی اور یوں فرمایا:

”ای-گاں! دریں خرقہ پیچ نیست، بہ پوست خود ہا در اختیارید۔“ (۱۲۵)

اے کوتا! اس گدڑی میں کچھ نہیں رکھا ہے خود اپنی کھالوں میں الجھو۔ یہ سننا تھا کہ وہ سب کے تہ میں ہی لڑ پڑے اور ایک دوسرے پر اس طرح حملہ آور ہوئے کہ آخر کار اپنے خرقہ ہستی کو ڈالا۔ اس چشم دید واقعہ سے متاثر ہو کر بیدل کہتا ہے:

غافل از چشم بخود پیچیدگاں ای بسا کشتی کہ در طوفاں ایں گرداب رفت  
اے غافل اور بے خبر انسان! ”چشم بخود پیچیدگان“ سے ہشیار رہو۔ کتنی کشتیاں اس بھنور کے گرد گھومتی ہیں۔

بیانی دانشی گر کر وہ ای کسب ادب نیست جز اکسیر چوں بیتابی از سیماب رفت  
آگرم نے ادب اور سلیقہ سیکھا ہے تو علم و دانش کے لئے کیمیا ہو۔ پارہ میں اگر بیکلی اور بے تابی کسیر کے سوا کچھ نہیں ہے۔

ان ز ادب الفت پرست پیکر است آبروی زندگی ہم رفت چوں آداب رفت (۱۲۶)  
ادب اور سلیقہ ہی سے جان الفت پرست پیکر کی حیثیت اختیار کرتی ہے ادب جب رخصت ہوئے تو زندگی کی آبرو بھی سمجھئے خاک میں مل گئی۔

بیدل کا بیان ہے کہ ابتدائی ملاقات میں سدا اس فکر میں رہا کرتا تھا کہ وہ ”محکمہ عالم اسرار“ میں غفلت غفلت جوش میں گنگنا تار ہوتا ہے۔ آخر ایک دن خود شاہ صاحب نے انتہائی محبت اور شفقت سے اس کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا:

”ای ہوس انتظار رموز حقائق! از دبستان اعتبار وجود، بحرف و صوت پرانگندہ قانع مباش

بیش موزونی خانہ، جہدی بر تراش کہ ہیئت انسان در کمال موزونی مصور است و بیکل بشری

صفت بنفیدگی تمام جلوہ گر۔“ (۱۲۷)

اسرار و رموز کے چشم براہ! اعتبار ”وجود“ کے مکتب سے چند پرانگندہ حروف و آواز پر قناعت

جھٹ کر۔ موزونی خامہ (موزوں بیانی یا نویسی) کی ریاضت کر کیونکہ انسانی ہیئت کا کمال موزونی ہی تصور کیا جاسکتا ہے۔

شاہ صاحب نے ایک دن بیدل سے کہا: جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے قلم بند کر لو۔ بیدل مستقل تین دن رات تک لکھتا رہا۔ تقریباً چالیس اشعار اس طرح ضبط کئے کہ شاہ صاحب ہر شعر پڑھ کر پہلے اس کی شرح کرتے، اس کے بعد بہت سے ایسے حقائق و معارف بیان کرتے کہ بیدل کے بقول ”مدرکہ در آں سرا سیمہ گردید“ قوت ادراک اس کے سمجھنے میں حیران تھی۔ ان کی تقریر کیا تھی؟ ایک ”کتاب“ تھی لیکن چونکہ ہندوستانی (شاید ویدانت) کی اصطلاحوں کے علاوہ مقامی بولیوں کے الفاظ بھی اس میں شامل تھے اس لئے اس کتاب ”چار عنصر“ میں انہیں شامل نہیں کیا گیا۔ (۱۲۸)

ای بسا معنی کہ ازنا محرمیہای زبان باہمہ شوخی مقیم نسخہ ہای راز مانہ زبان سے نا آشنائی کی بدولت بہت سے نکتے اپنی تمام تر شوخیوں کے باوجود نسخہ ہای راز کی زینت بن کر رہ جاتے ہیں۔

نغمہ ہا بسیار بود اما ز جہل مستمع ہر قدر بی پردہ شد در پردہ ہای راز نغمے بے شمار تھے پر سامعین کی جہالت و لاعلمی کے سبب جس قدر ان سے پردہ ہٹا تھا وہ پردہ راز میں چھپتے چلے گئے۔

حسن در اظہار شوخی رنگ تقصیری نداشت چشمہ غفلت نگہ شد، جلوہ محونا ز ماند حسن نے اپنی شوخیوں کے اظہار میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی، آنکھیں ہی غفلت شعاری اس لئے جلوے محونا ہو کر رہ گئے۔

اس نوع کے واقعات کی تردید کی جاسکتی ہے اور نہ ان کے لئے دیگر عوامل کو موثر قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ حدیث پاک کا مفہوم ہے کہ بہت سے پھٹے حال لوگ اس طرح زندگی گزارتے ہیں کہ ان کی قسم پوری کرتا ہے۔ آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں۔ شیخ اکرام نے اسی قسم کے واقعات کی بنا پر ہے کہ بیدل کی پرورش تعویذ گنڈے کے ماحول میں ہوئی ہے۔ (۱۳۰)

شاہ ملوک سے اپنی نیاز مندی اور ممنونیت کا تذکرہ بیدل اس انداز سے کرتا ہے:

بیدل پھد بر تو نفس سوختہ اند  
ای شمع! ز پر تو تو اندیشہ گداخت

کان شعلہ بیاں کلامت آموختہ  
گویا بگداخت دولت افروختہ

بیدل! اس شعلہ بیاں (شاہ ملوک) نے تیری کلام آموزی کے لئے کیا کچھ تکلیف نہیں اٹائی۔

تیرے پر تو سے قوت فکر یہ کھل گئی جیسے تیری دل گدازی ہی کے لئے اسے روشن کیا گیا ہو۔

شاہ یکہ آزاد:

مرزا قلندر کی وساطت اور رفاقت میں بیدل کو جن بزرگوں کا تعارف حاصل ہوا ان میں ایک شاہ آزاد بھی تھے۔ شاہ صاحب اس وقت جہاں قیام پذیر تھے اس علاقے کے لوگ ان کی صحبت فیض یابی کے لئے خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے، خصوصاً مرزا قلندر کو ان سے بڑی عقیدت تھی۔ اپنے بچپن کے روبرو ان کی بڑی تعریف کیا کرتے تھے۔ بیدل لکھتا ہے:

”خلقی مشتاق صحبت ہوش تغیرش بود۔ در ہر جا ذکر چہستان استفادہ اش، نسخہ بلاغت می کشود عند لیاں انصاف نوار از ترنم زحرمہ توصیف چارہ نبود، خصوصاً مرزا قلندر کہ در ہر بن موی زبانی داشت مرہون ستائش کماش، و در ہر جنبش، بیانی مصروف تذکرہ احوال۔“ (۱۳۱)

شاہ صاحب کا اصلی وطن کہاں تھا یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا۔ چار عنصر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ بہار میں کوئی مخصوص قیام گاہ ان کی نہ تھی ہمیشہ سیر و سیاحت میں رہتے اسی سیاحت کے دوران ان کی ”آرہ“ میں ان کا قیام تھا۔ جو صوبہ بہار کا ایک ضلع اور پٹنہ سے پچھتم کی طرف چالیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ بیدل لکھتا ہے:

”در ایامی کہ قصبہ ”آرہ“ اقامتکندہ سیر اتفاقی بود، ادیم افرزین بسہیل نقش قدش را سحر سعادتی اندوخت۔“ (۱۳۲)

جن دنوں قصبہ آرہ شاہ صاحب کا ”سیاحتی اور اتفاقی قیام گاہ“ تھا وہاں کی ادیم افرزین ان کے سہیل (ستارہ) کی بدولت خوش نصیبی کی خوشبو سے بسی ہوئی تھی۔

ان سے ملاقات کے بعد ان کی پرکشش اور با اثر شخصیت کا بیدل پر کتنا اثر ہوا اس کا اندازہ اس کے ذیل بیان سے لگایا جاسکتا ہے:

”عندلیب گلشن اقوالش، مدرکہ را چون بوی گل در گوش فشاندی، و رنگ آمیزی خامہ احوالش، باصرہ را چون حیرت در دیدہ تصور خواہاندی۔ ہم دیدہ ہا حیرتگاہ احوال عجیبش بود، دم گوشہا چونکندہ آہنگ غریبش۔“ (۱۳۳)

ان کے باغ ارشادات کا بلبل بوی گل کی طرح قوت اندیشہ کے کان میں نغمہ سرائی کرتا اور ان کے حوالہ کی رنگ آمیزی قوت باصرہ کو حیرت کی طرح دیدہ تصور میں محو خواب کر دیتی۔ آنکھیں عجیب و غریب حالات دیکھ کر حیرت کا پتلا بنی ہوئی تھیں اور کان ان کے عجیب و غریب آہنگ سن کر ہلکے ہلکے ہوتے تھے۔

بیدل نے شاہ صاحب کا ایک ایسا واقعہ بیان کیا ہے جس سے ان کے روحانی مقام کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک دن شاہ صاحب بیدل کے ہاں ایسی حالت میں تشریف لائے کہ گرمی نقطہ عروج پر پہنچی ہوئی تھی اور ان کا جسم پیپے سے شرابور تھا۔ بیدل کو ان سے خلوص اور ارادت تو تھی ہی جھٹ پھٹ اٹھا کر جھلنے لگا۔ شاہ صاحب کو جب کچھ سکون ہوا اور اپنی طبعی حالت میں آئے تو ان کا دل اتنا خوش ہوا کہ مسکرا کر مہر سکوت توڑی:

”ای نشہ مینای اخلاص! عنقریب اندیشہ فطرت، نہالی قامت آراید۔ و از ہیولای استعدادت، پیکری بظہور آید کہ ہمت عالی نگاہان، از فہم کیفیتش استمداد رسائی نماید۔ و آئینہ معنی نگاہان، بر محیط آبرو آغوش کشاید۔“ (۱۳۳)

اے نشہ مینای اخلاص! تیرے ریشہ فطرت سے جلد ہی ایک ایسا پودا اُگے گا اور تیرے ہیولائے استعداد سے ایک ایسا پیکر ظہور پذیر ہوگا کہ بلند نگاہ حضرات کی ہمت بھی اس کی کیفیت کو سمجھنے کے لئے قوت اندیشہ سے مدد مانگے گی۔

اس کے بعد مخصوص وصیت کرتے ہوئے فرمایا:

”از تعلیمات و صایای من مفید احوالات اینست کہ جہدی برین ابیات تحقیق آیات، تامل گماری۔ و فہم لطائفش، جہدی بلغ لازم فکر شاری۔ امید کہ معلم فیض حقیقی، بر درس معنی عرفانت افزاید۔ و ابواب علوم یقین، بر روی دانست، مفتوح نماید۔ باری باین وسیلہ یاد فراموشان در سگاہ اعتبار، از غنائم تحصیلات شعور است۔ و باین بہانہ، ذکر خاموشان پرودہ عدم سنت مشاہدہ حضور۔“

”میرے تعلیمی و صایا میں سے تیرے حسب حال ایک وصیت یہ ہے کہ ان ابیات تحقیق آیات پر غور کر اور انکی باریکیوں کے سمجھنے کی انتہائی کوشش کر۔ مجھے امید ہے کہ معلم فیض حقیقی تیری خدا شناسی اور معرفت میں اضافہ فرمائے گا اور علوم یقین کے دروازے تیری فہم پر کھول دے گا۔“

یہ اشعار شہنوی معنوی کے ہیں:

ایں توئی ظاہر کہ پنداری توئی نیست اندر توئی تو از بی تو  
یہ بظاہر تو ہے یا لگتا ہے کہ تو ہے۔ بے ”توئی“ سے تیرے ”تو“ میں ”تو“ نہیں ہے۔  
او ”تو“ است امانہ ایں تو کہ من است آں توئی کاں بر تر از ما و من است  
”وہ“ تو ہے پر یہ تو نہیں جسے ”من“ کہتے ہیں تو وہ ”تو“ ہے جو ما و من سے بالاتر ہے۔

تو تو در دیگری آید دہیں من غلام مرد خود ہیں چنین (۱۳۵)  
تیرا ”تو“ دوسرے میں دُھن ہو جاتا ہے میں ایسے خود ہیں آدمی کا غلام ہوں۔

شاہ صاحب کے ذریعے بیدل کے لئے ایک تابناک مستقبل کی پیشین گوئی اور ان کی حوصلہ دہائی اور مولانا رومی کے درج بالا اشعار پر غور کی ہدایت سے بیدل کو اس بات کا جیسے یقین ہو چلا تھا کہ کسی نہ کسی دن اسے منزل ضرور ملے گی۔ درحقیقت ان بزرگوں کی صحبت نے بیدل کی شخصیت سازی، دینی بالیدگی میں اہم رول ادا کیا ہے چنانچہ بیدل کا اعتراف ہے۔

”ترحم آں خضر وادی توفیق بنوید ایں غنائم طریق ہدایت پیمود، و توجہ آن سروش عالم فضل، بمودہ ایں کرامت درس نوازش فرمود۔“ (۱۳۶)

وادی توفیق کے اس خضر کی عنایتوں نے ان غنائم کی نوید دے کر ہدایت کا راستہ دکھایا اور عالم فضل کے اس فرشتے کی توجہ نے اس کرامت کی خوشخبری دے کر مجھے نوازشوں کا درس دیا۔  
درج بالا اشعار پر غور و فکر کے بعد جو حقائق و معارف بیدل کے پلے پڑے ان کا اقرار کرتے ہیں۔ بیدل لکھتا ہے:

”بمواظبت حضور معینش، مشق حیرتی بکمال رسانیدم و بحفاظت اسرار حقیتش ورق نفس بہ خاموشی گرداندم۔“ (۱۳۷)

ان کے معانی پر پابندی سے غور کر کے ”حیرت“ کی ریاضت کو بہ درجہ کمال پہنچایا اور ان کے حقائق کی نگہداشت کر کے سانس کے اوراق کو خاموشی سے پلانا۔  
غلام حسن مجددی کا خیال ہے کہ یہ اشعار درحقیقت بیدل کی منزل ”خودی“ تک رسائی کے ثبوت ثابت ہوئے۔ (۱۳۸)

بیدل کے تابناک مستقبل کی پیشین گوئی پر مشتمل اس واقعے کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ کافی دھمتوں کے بعد بیدل کو آخر اپنے مقصد میں اس حد تک کامیابی ہوئی کہ بڑے بڑے شاعروں اور نقادوں نے اس کی شاعرانہ عظمت اور فنکارانہ لیاقت کا نہ صرف لوہا مان لیا بلکہ اس پر کتابیں اور مضامین لکھے (۱۳۸)۔ راقم السطور نے اپنے ایک مقالے میں جو ایران شناسی ۲۰۰۰-۲۰۰۵ء میں شائع ہوا ہے بیدل شناسوں کی پوری تفصیل فراہم کی ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور واقعہ سے شاہ صاحب کے بلند روحانی مقام کا ثبوت ملتا ہے۔ بیدل کا یہ کہ ایک دن شاہ صاحب دریائے گنگا پار کرنے کے لئے ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ کشتی میں تیس بھی سوار تھیں جب کشتی بچ دریا میں پہنچی تو ملاحوں نے دست سوال دراز کیا، جس کو

جو میسر ہوا دیا۔ شاہ صاحب کے پاس جب پہنچے تو وہاں کیا تھا جو ملتا۔ انہوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا: بھئی! میں ایک فقیر آدمی ہوں دوسروں کی خیرات کا محتاج ہوں۔ لیکن ملاح سوال کرنے سے باز نہ آئے اور جب یوں ملتا نظر نہ آیا تو ایذا رسانی پر اتر آئے۔ بیدل نے صبح لکھا ہے: ”عذر افلاں در عالم غرض مسومع نبود“۔ جہاں غرض کی کار فرمائی ہو وہاں افلاس کا عذر قابل قبول نہیں۔ شاہ صاحب ان کی ایذا رسانی سے تنگ آ کر اٹھے اور بے دھڑک دریا میں کود پڑے لوگوں نے جب شور و اویلا مچایا تو شاہ صاحب نے ان سے متوجہ ہو کر فرمایا:

”ای بے خبر! یہ بمن نا توانی آنقدر نہ شکستہ ایم کہ دوش موج، رخت مانتواند کشید۔ و بقیض

سبکساری چندان از خود نکند شہ ایم کہ پشت چشم حباب پل نتواند گردید۔ (۱۳۹)

اے غافل انسانو! نقاہت اور کمزوری کی وجہ سے اتنا شکستہ حال نہیں ہوں کہ لہریں میرا اپنے دوش پر نہ اٹھا سکیں۔

یہ کہہ کر وہ چشم زدن میں لوگوں کی نظروں سے غائب ہو گئے۔ مقام کی مناسبت سے بیدل نے نہایت عمدہ اشعار کہے ہیں جن کا ماحصل یہ ہے کہ بہت سے روشن ضمیر بزرگ اس طرح زندگی گزارتے ہیں کہ ان کے روحانی مقام کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔ عوام اپنی غفلت سے ان کے ساتھ نازیبا برتاؤ کر کے اپنی عاقبت خراب کرتے ہیں۔

ای بسا روشن دلی کز بی نیاز یہای شوق چون فروغ مہر بر خاک سیہ افتادہ است  
معنی اقبال فقر از غافلان پوشیدہ اند ورنہ در ہر خاک، چندیں دستگاہ افتادہ است  
شاہ صاحب کی صحبت سے بیدل نے جو کچھ استفادہ کیا ان سب کا احاطہ کرنا یہاں مقصود نہیں۔  
ان میں سے کچھ فقر و غنا اور قیام قیامت سے وابستہ ہے۔ آخر میں اپنی ممنونیت کا اظہار کرتے ہوئے بیدل لکھتا ہے:

”بریں خوشہ چیں خرمن ارادت، شفقت معنوی بیش از آن بود کہ کم آزار بہ پیشیامی توان

ستود۔ اما زبان شکر نوای خامہ را با ہمہ عجز انداز صریحست۔ و عندلیب سپاس آہنگ بیان را

بہر نارسانی پرواز صغیری۔“ (۱۴۰)

خرمن ارادت کے اس خوشہ چیں پر ان کی معنوی شفقت اور عنایت اس سے کہیں زیادہ

ان کی تعریف کی جاسکے۔

افسوس کہ اس پاکباز عارف کی عمر نے زیادہ وفا نہیں کی۔ جن دنوں بیدل کے گھر ان کا قیام

اسی ہفتے وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

شاہ فاضل:

جن بزرگوں سے بیدل اپنے چچا کے توسط سے متعارف ہوئے ان میں ایک شاہ فاضل بھی تھے۔ شاہ فاضل کہاں کے رہنے والے تھے اور مرزا قلندر کی کس طرح ان سے آشنائی ہوئی، بیدل کے ذہن سے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ چہاں عنصر سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ہم خیالی و ہم مشربی کی وجہ سے ان کا اکثر ایک جگہ بیٹھ کر باتیں کرتے تھے۔ مرزا قلندر نے چونکہ بیدل کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری سنبھالی تھی اس لئے وہ اسے اپنے ہمراہ ان کے پاس لے جایا کرتے تھے۔ ایسی ہی ایک مجلس میں بیدل صاحب کی تحریر بیانی سے متاثر ہوتا ہے:

”فقیر از شکستگیهای بیانش رنگینی مشاہدہ می کرد کہ بصد جوش بہار آئینہ تصورش نتوان چید۔

واذ کیفیت تکلیش نشہ ای اندوخت کہ بہ ہزار دور ساغر گردتا مملش نتوان گردید۔ درایام باریابی

حضور سراپا ہوش می بودم تالاب اسرار طرازش چہ طراز دو ہمہ تن گوش گردیدم تا زبان حقایق

آغازش چہ آغاز د۔“ (۱۴۱)

یہ خاکساران کے گفتگوئی بیانات میں ایسی رنگینی کا مشاہدہ کرتا تھا کہ سیکڑوں جوش بہار کے آئینہ تصور میں اس کا خیال نہیں کیا جاسکتا اور ان کے انداز گفتگو سے وہ نشہ حاصل ہوتا کہ ساغر می گردید۔ اس گردش سے اس کا تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ان کی صحبت میں باریابی کے وقت سراپا ہوش بن کر ان کے اسرار و اہونٹ کیا کیا بیان کرتے ہیں اور ہمہ تن گوش ہو جاتا کہ ان کی زباں حقائق بیان کر رہی ہے۔

پنے زور بیان کے کیمرے سے بیدل نے شاہ فاضل کی شخصیت کی تصویر کشی کرنے کی کوشش کی ہے لیکن استعارات و کنایات اور تشبیہات و اشارات کے مفرطانہ استعمال کے نتیجے میں اس وقت ابہام کی اتنی مولیٰ تہ اس پر جم جاتی ہے کہ مقصد کا پتہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے۔

نثر یہ کہ شاہ فاضل روحانیات، اسرار و حکم، حقایق و معارف، انداز بیان اور طلاقت لسان، ہندیدہ نظم کے لئے مشہور تھے لیکن ان کی اہم ترین خصوصیت غیروں پر ان کی غیر معمولی یعنی ریاضت و مجاہدہ اور تحقیق و مطالعہ کے بعد ان میں وہ وصف پیدا ہو گیا تھا کہ اپنی سماعت کو محسوس کر دیتے تھے لکھتے ہیں:

”پرتو آفتاب حضور شمع معنی بردلہای تافت کہ در غیبت لمحہ ای ازان متصور عالم

نمود و از صفای آئینہ محبتش تمثال حقیقی بر طبالع مکشوف می گردید کہ در اوقات دیگر

عجب تو ہم نیز نقاب نمی کشود۔“ (۱۴۲)

بیدل کے ذوق تحقیق طلب نے اس نمایاں اور با اثر شخصیت کی صحبت سے استفادے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ وہ ہمہ تن گوش ہو کر ان کی دلاویز گفتگو کو سنتا اور بیش بہا جواہرات اکٹھے کرتا۔ درج ذیل اشعار سے شاہ فاضل سے بیدل کے والہانہ تعلق کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

یاد ایامیکہ جان مشتاق و دل مدہوش بود ہر مژہ واکردنی تمہید صد آغوش بود  
تاچہ پرداز و تغافل، مو بہویم داشت چشم تاچہ فرماید تبسم، عضو عضوم گوش بود (۱۳۲)  
وہ بھی کیا زمانہ تھا جب جاں ان کی گفتگو کی مشتاق اور دل ان کے کلام سے مدہوش رہتا تھا۔  
پلک واہونے میں سیکڑوں آغوش کی تمہید تھی۔ میرا بال بال اس فکر میں سراپا چشم بن جاتا کہ شاہ صاحب  
کیا کہنا چاہتے ہیں اور میرا ایک ایک عضو اس خیال میں سراپا کان بن جاتا کہ شاہ صاحب کی مسکراہٹوں  
سے کیسے موتی جھڑتے ہیں۔

ایک بڑے اور اچھے مقرر کی قدر اس کے سوا کچھ نہیں کہ سامعین اس کی باتوں کو ہمہ تن گوش  
ہو کر سنیں۔ اسی وجہ سے بیدل کو ایک عمدہ سامع اور طالب صادق پا کر شاہ صاحب بے حد خوش ہو  
اور فرمایا:

”کاش مثل تو سامع بہ حرف ما توجہ نماید تا از قید خاموشی برآیم و چون تو طالبی ناخن کاوش  
آراید تا عقدہ دل واکشایم۔“ (۱۳۳)

کاش تیرا جیسا سامع میری باتوں پر دھیان دیتا کہ قید خاموشی سے نکلتا اور تیرا جیسا طالب  
ناخن کاوش سجاتا کہ دل کی گرہ کھول دیتا۔ طبعی غفیتوں کی وجہ سے دنیا ایک کوہ سار (پہاڑ) کے مانند  
جو کچھ لب پر آتا ہے پھر دل کی طرف لوٹ جاتا ہے اور جو کچھ شوق کہنا چاہتا ہے وہ ندامت و شرم کی  
طرف عود کر آتا ہے۔

شاہ صاحب کے ارشاد سے جہاں ایک طرف بیدل کے حسن استماع کا اعتراف معلوم  
ہے جو ایک لائق شاگرد کے لئے ضروری ہے وہیں ایک اہم اخلاقی ضابطہ بھی مستطب ہوتا ہے کہ خاموشی  
گوپائی پر اور عزت کو صحت پر اس لئے ترجیح ہے کہ انسانوں کی بڑی تعداد کج فہمی اور کوتاہ فہمی کی وجہ سے  
کلام کی اہمیت کا اندازہ نہیں لگا سکتی۔ شاہ فاضل کی صحبت میں بیدل کے جو کچھ ہاتھ لگا اے اس نے  
دوسرے غنصر میں بیان کیا ہے۔ شاہ موصوف سے اس کے گہرے تاثر کا اندازہ اس کے درج ذیل  
سے کیا جاسکتا ہے:

”در ضمن اشعار یکہ موقوف بذیل غنصر دوم است خواہد نگاشت تا مشکف گردد کہ حضور ایں طایفہ  
چہ مقدار کلید بستگیای دست ونگاہ این قوم در چہ درجہ صیقل آلود گیہای آب وگل۔“ (۱۳۵)

ان اشعار کے ضمن میں جو غنصر چہارم کے مضامین سے متعلق ہونے کی وجہ سے وہاں ضبط تحریر  
نہیں گئے، یہ واضح ہوگا کہ اس گروہ کی صحبت قلبی بستگی کے لئے کتنی بڑی کلید ہے اور اس قوم کی نگاہ  
آب وگل کی کس درجے میں صقل کرتی ہے۔

شاہ صاحب کے علمی اور روحانی مقام کی تشخیص و تعین کے لئے ان کے بعض افادات کا تذکرہ  
کیا جاتا ہے۔ بیدل کہتا ہے کہ ایک دن فقراء کی ایک جماعت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر  
ہوئے۔ سوال کیا:

”آدی را کہ ظہور جامع اسرار و نور لامع انجمن شہود، ہر چند شایستہ جمیع کمالات کو  
فی والہی است و قابل کل تعینات جہاں نامتناہی، منتخب گوہر یکہ زیب افر کمال باشد کلام  
است۔“ (۱۳۶)

یعنی آدی، جو کہ اسرار و وجود کا ایک ظہور جامع اور انجمن شہود کا ایک نور لامع ہے، گو تمام دنیاوی  
کمالات اور جہاں نامتناہی کے جملہ تعینات کا اہل ہے پر وہ جو ہر جو تاج کمال کے لئے زیب و  
است کیا ہے؟

شاہ صاحب کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ حدیث شریف میں آیا ہے ”ماعر فساک حق  
معرفة“ خدا یا! جس طرح چاہئے ہم نے آپ کو نہیں پہچانا اور دوسری جگہ ارشاد ہے ”من عرف  
معرفة عرف ربہ“ جس نے اپنی ذات کی معرفت حاصل کر لی اس نے خدا کی معرفت حاصل  
کر لی۔ انسان انسان ہونے کے لحاظ سے خدا کی کنہ تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا اس کے باوجود وہ  
خدا کی معرفت حاصل کرنے کے لئے حکم ہوا کہ پہلے خود شناسی پیدا کرے۔ اسے ”جہاں انفس“  
ہوتے ہیں ”جہاں انفس“ پر غور و فکر اسے خدا شناسی کی منزل تک پہنچا دے گا۔ اس لئے خود شناسی  
اور معرفت ہے اور جس نے یہ معرفت حاصل کر لی وہ کمال کی چوٹی پر پہنچ گیا اور اس کے ذریعے وہ  
جہنم جنس میں ممتاز ہے۔ (۱۳۷)

ی طرح ایک اور سوال شاہ صاحب سے کیا گیا کہ اس دنیا میں جو قول یا عمل کسی کا معرض وجود  
کے لئے حقیقی محرک خدائے تعالیٰ ہے کیونکہ اس کے ارادے کے بغیر ایک ذرہ بھی حرکت نہیں  
کرتا۔ حلاج کے نعرہ انسا الحق اور فرعون کے دعویٰ انسا ربکم الاعلیٰ (میں تمہارا رب تروبالا  
ہوں) کے درمیان کیوں فرق کیا جاتا ہے؟ لوگ ایک کی تعریف اور دوسرے کی تنقیص کرتے ہیں  
بیدل نے ایک ہی صدا لگائی ہے؟

شاہ صاحب نے جواب دیا کہ جہاں تک انسان کی ذات کا تعلق ہے وہ ہر قسم کی خوبی اور خا



سے عاری ہے۔ ہمارے کثرت ہم کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتے ہیں۔ انہی کثرت کی بدولت ہم اوج عزت پر پہنچ جاتے ہیں یا بھیض ذلت میں گر جاتے ہیں، یہاں دو نکتے الگ الگ ہیں۔ انقلاب اور پائیداری جس کے ذریعہ ہم یا مردود ہوتے ہیں یا مقبول۔ انقلاب کا سرچشمہ کثرت ہے اور پائیداری کا سرچشمہ وحدت۔ مطلب یہ ہے کہ جس کی نظر ساز و سامان اور حشمت و خدم کی کثرت پر اور اپنی بزرگی کو ان سے مربوط سمجھتا ہو وہ ہر حالت میں مستقل مزاج اور ثابت قدم نہیں رہ سکتا بلکہ خود حالات کے مطابق ڈھالتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس جو آدمی اپنی ہستی کو فانی اللہ کر دیتا ہے اور جس پر اس کی نظر پڑتی ہے جمال مطلق کا مشاہدہ کرتا ہے وہ ہر حالت میں ثابت قدم رہتا ہے۔ ان باتوں پیش نظر رکھ کر منصور علاج اور فرعون کے حالات پر غور کیجئے۔ منصور نے فانی اللہ ہو کر انسا الحق بن بلند کیا۔ (۱۳۸) ساری چیزوں حتیٰ کہ خود اپنی ہستی کو فراموش کر کے انہوں نے جام وحدت نوش کیا۔ اس جام میں ”غیر“ نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ نعرہ انسا الحق کا سرچشمہ یہی جام تھا اور یہ نعرہ شروع سے تک ایک ہی رنگ میں برقرار رہا۔ لوگوں کے ہاتھوں جب انہیں کوئی اذیت نہیں پہنچتی تھی تب بھی صد اٹھی اور جب ان کے ہاتھوں اذیت پہنچتی تھی کہ ان کی بوٹی بوٹی الگ کر دی گئی تب بھی وہی صد اٹھا الحق ان کے ہر قطرہ خون سے آتی رہی۔ لہذا ان کی یک رنگی کا سرچشمہ وحدت ہے جو پورے وجود میں از ابتدا تا انتہا برقرار نظر آتی ہے۔ اب ذرا فرعون کے حال پر غور کیجئے۔ فرعون نے بھی انسا الحق (الاعلیٰ) (میں تمہارا برتر والا رب ہوں) کا نعرہ بلند کیا۔ اس دعویٰ کے پیچھے کثرت کا فرما تھی۔ اپنے جاہ و جلال، شان و شکوہ، حشمت و خدم، سلطنت و حکومت، دولت و ثروت غرض اپنی خوشحال زندگی تمام ساز و سامان اور لاؤ لشکر پر اعتماد کرتے ہوئے یہ نعرہ بلند کیا تھا اسے یقین تھا کہ ہمیشہ اسی طرح گزرے گی اور اس کے حالات کبھی پلٹا نہیں کھائیں گے اس لئے جب ناسازگار حالات سے دوچار ہوا اور تمام اسباب فخر و مباہات ایک ایک کر کے ہاتھ سے چھوٹنے لگے تو ”انا ربکم“ کے دعویٰ سے باز رہا اور صدائے آمنت بوب موسیٰ و ہرون (موسیٰ و ہارون کے رب پر ایمان لایا) بلند کیا۔ اس کا سرچشمہ ”کثرت“ ہے اور ”کثرت“ ”عالم انقلاب“ کا نام ہے۔ کثرت جب ہاتھ سے جاتی ہے اس دعویٰ کے تانے بانے بھی بکھر گئے۔ شاہ صاحب کے مضمون کو انتہائی جامع الفاظ میں بیدل نے اس طرح بیان کیا ہے۔

”چوں ”وحدت“ جہان ثبوت است و ”کثرت“ جہاں انقلاب۔ ”وحدت آگاہاں“ ناچا

مقیم صراط مستقیم اندو ”کثرت نگاہاں“ بے اختیار ہرزہ تاز امید و بیم۔“ (۱۳۹)

یعنی وحدت، جب ”عالم ثبوت“ ہے اور ”کثرت“ عالم انقلاب تو ”وحدت آگاہ حضرت

تین صراط مستقیم پر چمے ہوئے ہیں اور ”کثرت نگاہ حضرات“ بے تکلف خوف ورجا اور امید و بیم کی کشمکش میں بڑے دوڑ رہے ہیں۔ اور اس واقعہ سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ”در محفل وحدت شمع شہود، جز کی تحقیق نیست، پر تو اختلاف از کجا بظہور پیوند، در بہار کثرت کہ غیریت آئینہ پرداز نشو نماست ناچار ہر برگ ہزار رنگ می خندد۔ پس کذب لازم کثرت نمائی است، وصدق دلیل وحدت آشنائی۔“ (۱۵۰)

شمع شہود کی وحدت کی محفل میں جب ایک کے سوا کسی کا تحقیق نہیں تو اختلافات کا عکس کہاں سے رونما ہو سکتا ہے اور ”بہار کثرت“ میں جہاں ”غیریت“ آئینہ پرداز نشو و نما ہے ہر برگ ہزاروں رنگوں سے خندہ زن ہے لہذا ”دروغ گوئی“ کثرت نمائی کے لئے لازم ہے اور ”درست گوئی“ وحدت نمائی کی دلیل ہے۔

بیدل نے شاہ صاحب کا ایک اور واقعہ لکھا ہے جس سے بڑی حد تک اس کمسنی میں اس کی ذہانت و ذہانت اور بدیہہ گوئی و نفز گوئی کا ثبوت ملتا ہے۔ ایک دن شاہ صاحب کے ایک مرید نے ذیل شعر کے ذریعے شاہ صاحب کو اپنے گھر قدم رنجہ ہونے کی دعوت دی۔

”تاں در کلبہ ما ہم شمی را روز کر بوریا گر نیست نقش بوریا افتادہ است یعنی ہماری جھوپڑی میں بھی ایک رات بتائی جاسکتی ہے گو بوریا نہیں ہے پر نقش بوریا تو موجود ہے۔“

شاہ صاحب نے بیدل سے فرمایا:

”مارا از تصدیق عبارت آرائی بر آرد۔ وہی تکلفانہ جوابی در خود مدعای سائل بر نگار بمضمون آنکہ تو ہم نقش ”بوریا“، خواب تحمل راحت کیشان۔ وخیل ”کلبہ“ کا شانہ نذر عشرت عمارت اندیشان۔ اینجا ساد گہی نقوش امتیاز نگار خانہ ہادر بردارو۔ وغبار ویرانی وہم وطن از عمارتی دیگر سر بری آرد۔ حضور ”بخودی“ مارا میری بساطی دعوت نمودہ کہ بتکلف ہوش رنج دعای باید کشید۔ و شہود ”حیرت“ بتماشای گلشنی از خود نیردہ کہ تشویش جنبش مرثکان از آنجا تواند گردید۔“ (۱۵۱)

عبارت آرائی کی زحمت سے مجھے نجات دو اور سائل کے حسب حال اس مضمون کا سیدھا سا جواب اس طرح دیدو کہ ”نقش بوریا“ کا وہم بھی آرام طلب لوگوں کا خواب تحمل کا ہے اور جھوپڑی کا شہود بھی عمارت اندیشوں کا کا شانہ عشرت ہے۔ شاہ صاحب نے مزید فرمایا کہ میں خودی اور حیرت میں یہ سمجھوں کہ بوریا اور نقش بوریا اسی طرح جھوپڑی اور دوسری جگہ میں کوئی تمیز نہیں کر سکتا۔ میں ہر طرح کے تشویش سے بے نیاز ہوں۔ نقوش کی سادگی ہی میرا طرہ امتیاز ہے۔ بیدل نے ان مضامین کو



برجستہ شعری قالب میں اس طرح ڈھالا:

خود بیا و حال ما بنگر کہ در ملک فنا روزگار ما ز روز و شب جدا افتاده است  
خود آ کر میرے حال کا جائزہ لو کہ مملکت عدم میں ہماری شب و روز عام شب و روز سے الگ  
واقع ہوئی ہے۔

کلبہ وسواس است و نقش بوریا ز نگار طبع کار ما با شیوہ صدق و صفا افتاده است  
”جھوپڑی“ ایک وہم ہے ”نقش بوریا“ زنگ طبیعت ہے۔ ہمیں تو صرف خلوص و ارادت  
صدق و صفا سے سروکار ہے۔

بوریا و کلبہ را در عالم ما بار نیست ہر کجا ما نیم نقش مدعا افتاده است  
”بوریا“ اور ”جھوپڑی“ کو ہمارے ملک ”بیخودی“ میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں ہم  
رہ رہے ہیں وہاں نقش مدعا موجود ہے۔

کلبہ آتش زن و نقش بوریا را محو کن در بساط فقر ما بنی چہا افتاده است  
جھوپڑی کو نذر آتش کر دو اور نقش بوریا کو محو کر دو تب تم ہماری بساط فقر میں دیکھو گے کہ کیا  
موجود ہے۔

تا نخواہد سوخت از ما برخواید داشت دست نیستی ما را چو آتش در قفا افتاده است  
”عدم“ آگ کی طرح ہمارے پیچھے پڑا ہے جب تک وہ ہمیں جلا نہیں دیتا ہم سے دست  
نہیں ہوگا۔ (۱۵۰)

مجلس میں اس وقت جو لوگ موجود تھے اس منظوم جواب سے اتنا محظوظ ہوئے کہ ان پر وہ  
کیفیت طاری ہو گئی۔ شاہ صاحب کو بھی یہ جواب اتنا پسند آیا کہ فوراً بیدل کی مزید کامیابی کیلئے  
بدعا ہو گئے۔ شاہ صاحب سے اپنی ممنونیت کا اظہار کرتے ہوئے بیدل کہتا ہے:

”الحاصل امواج محیط کرامتش را تلاطم بیکران بود۔ حباب فطرتی بیدل، بقطرہ داری  
قناعت نمود۔ صبح بہار ہدایتش شکستگیہای بی پایان داشت۔ بمقتضای کم فرصتی نفس پیش  
از ورق، گلی کا شت۔“ (۱۵۳)

غرض ان کی عنایات کے ساگر کی لہروں کے تلاطم کا کوئی تھما نہ تھا۔ حباب فطرت بیدل  
صرف ایک قطرے پر قناعت کیا۔ اور ان کی ہدایت کی صبح بہار بے انتہا شکستگیوں کی حامل تھی کم  
کے سبب نفس نے پتہ کے نکلنے سے پہلے ایک پھول کے پودے کو بوایا۔

مشہور تاجیکی ادیب صدر الدین عینی اپنی کتاب میرزا عبدالقادر بیدل میں شیخ

شاہ یکہ آزاد اور شاہ فاضل کی صحبتوں سے استفادہ کے بابت لکھتے ہیں کہ حقیقت میں بیدل  
زندگی کے یہ دو دور الگ الگ ہیں۔ انہوں نے بیدل کی زندگی کو درج ذیل مختلف ادوار میں تقسیم  
کیا ہے۔

۱۔ طفولیت اور جوانی کا دور جو شیخ کمال کے زیر اثر گذرا۔ شیخ کمال کو اسلامی احکام اور شریعہ پر  
پختہ عقیدہ تھا اور وہ سختی سے اس کے پابند تھے۔

۲۔ دورہ مجذوبیت اور مجذوبوں کی پیروی اور ترک دنیا کا تصور۔  
۳۔ وحدت الوجود کی طرف اس کے تمایل ور حجان کا دور اسلامی تصوف سے اس کی دلچسپی کا دور۔

بیدل کے تفصیلی حالات و کیفیات کو مد نظر رکھ کر اور ان بزرگوں کی صحبت سے ایک ہی وقت  
میں استفادے سے جس کا تذکرہ اوپر ہوا مکمل طور پر واضح ہے کہ جناب عینی کو غلط فہمی ہوئی ہے اور ان  
کے خیال کا سرچشمہ یہ ہے کہ انہوں نے چار عنصر کا بہ غور مطالعہ نہیں کیا ہے۔

یہی حال عبدالغنی مرزا ایف، میرزا دہ و اسلام شاہ محمد اوصاف اور الیاس نظام الدین اوف کی  
کتابوں کا نظر آتا ہے جنہوں نے بیدل کے حالات لکھنے میں عینی اور اس کی کتاب سے فائدہ اٹھایا ہے۔

### بیدل کی فوج میں شرکت:

بیدل نے، جیسا کہ پچھلے صفحات میں گذرا، عمر کی دسویں منزل تک تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اس  
کے بعد میرزا قلندر کے حسب ہدایت گھر ہی میں فارسی نثر نگاروں اور شاعروں کی تصانیف کا بہ غور  
مطالعہ شروع کیا۔ ضمناً ان کی رفاقت میں چند بزرگوں سے ملاقاتیں کیں اور ان کی صحبتوں سے  
مکمل طور پر روحانی فیوض و برکات بھی حاصل کئے۔ ایسا لگتا ہے رانی ساگر، سرانے بنارس اور آ رہ کے  
گزران کی سیاحت کا سلسلہ ۱۰۶ ہجری مطابق ۱۶۵۵ عیسوی تک جاری رہا۔ اسی سال شاہجہاں  
شہنشاہ کی ہمت کی باگ ڈور اپنے بڑے لڑکے داراشکوہ کو سونپ دی تھی جو انجام کار اس کے بھائیوں کے  
بین اختلاف کا سبب ثابت ہوا، اور ہر بھائی تخت سلطنت ہتھیانے کی فکر میں سرگرداں رہنے لگا۔  
اس وقت پٹنہ کے شمالی علاقہ ”ترہت“ میں جسے آج مظفر پور کہتے ہیں، نظر آتا ہے۔ اس وقت  
میں سے میرزا نے سیاسی حالات کا نقشہ بیدل نے اس طرح کھینچا ہے:

”شاہ شجاع بن شاہجہان، بیماری پدیرا سکتہ مضمون سلطنت اندیشید ..... از خطہ  
کابل تا سرحد ممالک بہار آمد و آوری خزان فوج جہاں گماشتہ و گنجای بے شمار بہ تحصیل زر  
و آرمہ ہجری اپناشتہ۔ (۱۵۵)

جس سال شاہ شجاع بن شاہجہاں نے باپ کی بیماری کی خبر کو مضمون سلطنت کے لئے سیکرٹری کیا (حکومت کی باگ ڈور کو معطل سمجھا) بے سوچے سمجھے اسے جنوں کا رخ دار الخلافہ دہلی کی طرف دیا تاکہ منبر ہوس کا پایہ بلند کرے۔ شاہی افسروں نے بنگال سے لے کر بہار تک خزانے کی وصولی کے لئے فوجی دستے بٹھائے تھے اور بے شمار خزانے وصول کئے۔

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیدل جنگ جانشینی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ اس خیال تھا کہ ملک میں امن و امان کے لئے ضروری ہے کہ جو آدمی بھی تخت سلطنت پر براجمان ہو دوسرے لوگ اس کا احترام کریں حتیٰ کہ بھائیوں کو بھی اگرچہ حکومت کی اہلیت زیادہ رکھتے ہوں تا مگر دلیہ کے خلاف انہیں علم بغاوت بلند نہیں کرنا چاہئے۔ اسی وجہ سے شجاع کی حرکت کو اس نے اپنے تیر و شہ نشانہ بنایا۔ اس وقت بیدل ترہت میں اپنے چچا مرزا قلندر کے ہمراہ ان کے ایک عزیز مرزا عبداللطیف کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ ترہت کے بارے میں لکھتا ہے:

”از آنجملہ تخیر نواح ترہت، کہ شمالی حدود پٹنہ، ملکی است عظیم و کوہستانی مشتمل بر عقبات ہراس و بیم، فوجی تعین کردہ بودند۔ و میرزا عبداللطیف را کہ با میرزا قلندر مراتب خویشی داشت بر لشکری بر آوردہ۔ اقتضای زمان وفاق فقیر را، کہ تماشاگر عرصہ حوادث دلیل عبرت پیانیت و سیر ہنگامہ انقلاب، سر مشق حیرت فرسائی، بہ معنائی میرزا تعلیم ہدایت فرمود و باختیار ایشان راہ تسلیم نمود۔ مدت سہ ماہ راجہ ہای غرور آثار بافتیاد فرماشاہی گردونی داشتند شکستہ اوضاع سجدہ کاری۔“ (۱۵۶)

انہیں مسائل میں ترہت کی فتح کا مسئلہ بھی تھا جو پٹنہ سے شمال کی جانب ایک عظیم پہاڑی علاقہ ہے جس میں خوفناک گھاٹیاں تھیں۔ وہاں انہوں (شاہی افسروں) نے ایک فوجی دستہ بیٹھا دیا تھا۔ مرزا عبداللطیف کو جن کی مرزا قلندر سے رشتے داری تھی اس دستے کی قیادت سپرد کی تھی۔ حسب اقتضای زمانہ چچا نے فقیر کو بھی یہ کہہ کر کہ عرصہ حواث کے تماشا سے عبرت حاصل ہوتی ہے، مرزا عبداللطیف کی رفاقت کی ہدایت فرمائی۔ مغرور باغی راجہ مہاراجاؤں سے تین مہینے برسر پیکار رہنے کے بعد ان کو ان کی اطاعت پر مجبور کر دیا۔

شاہ شجاع اس وقت بنگال کا صوبیدار تھا۔ شاہجہاں کی بیماری اور داراشکوہ کی تخت نشینی کی خبر پاتے ہی وہ وہاں سے دہلی روانہ ہوا اور بنگال سے بہار تک اپنے آدمی لگا کر باغی راجاؤں زمینداروں سے لڑ کر علاقے کو فتح کرنا اور خزانے وصول کرنا شروع کیا۔ اس مقصد کے لئے اس مختلف مقامات پر فوجی دستے لگا دئے تھے۔ ان میں سے ایک جگہ ترہت بھی تھا۔ جو پٹنہ سے

پرتر کی جانب واقع ایک پہاڑی علاقہ ہے جس میں اوپنی نیچی خطرناک قسم کی گھاٹیاں تھیں۔ شجاع کی طرف سے جو فوجی دستہ وہاں مامور تھا۔ مرزا عبداللطیف کو اس کی قیادت سونپی گئی تھی۔ مرزا عبداللطیف مرزا قلندر کے عزیز تھے۔ بیدل کے بیانات کو پیش نظر رکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مرزا قلندر کے ہمراہ اس کے گھر پر قیام پذیر تھا۔ مرزا قلندر نے آبائی پیشے کی روایت کو مد نظر رکھ کر بیدل کو ہدایت کی کہ مرزا عبداللطیف کے ہمراہ فوجی خدمت انجام دے۔ فوج میں شرکت کی اہمیت سے متعلق مرزا قلندر نے ذیل قول اس نے نقل کیا ہے۔

”تماشاہی عرصہ گاہ حوادث دلیل عبرت پیانیت، و سیر ہنگامہ انقلاب سر مشق حیرت

فرسائی۔“ (۱۵۷)

گویا فوجی خدمت سے وابستہ ہو کر انسان ان واقعات و حالات سے جن سے دوران جنگ اس کا ساق پڑتا ہے سبق حاصل کرتا ہے اور بہت سے بیچ و خم، پستی و بلندی اور اونچ نیچ سے گزرنے کے بعد اس کی زندگی میں چنگلی آتی ہے۔

بیدل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جس فوجی دستے کی قیادت مرزا عبداللطیف کے حوالے ہوئی بیدل اس میں ایک سپاہی کی حیثیت سے شامل ہوا تھا لگاتار تین مہینے تک اس علاقے کے باغیوں سے برسر پیکار رہا۔ اور آخر کار اس کو ان پر غلبہ حاصل ہوا۔ یہاں بیدل اپنے دستے کی دلیری و شہادت کا تذکرہ اس طرح کرتا ہے کہ اس سے مبالغہ کی بول آتی ہے۔

”ہر پیادہ را کہ می دیدیم، داد مقابلہ صد سوار می داد۔ و ہر سوار یکہ می سنجیدیم، با فوجہای جرار

گران سنگ می افتاد۔“ (۱۵۸)

جس پیادہ فوجی پر نظر پڑتی وہ سواروں کے مقابلے کی داد دے رہا تھا اور جس سوار کا وزن عظیم کرنا وہ گویا ایک لشکر جرار کے ساتھ نبرد آزما تھا۔

ادھر اورنگ زیب دھولپور میں داراشکوہ کو شکست دے کر اس کے تعاقب میں دہلی اور وہاں سے پنجاب روانہ ہوا۔ پنجاب سے واپس لوٹ کر وہ شاہ شجاع سے جوالہ آباد کے پاس ایک مقام کچھوہ میں بارادہ جنگ رکھا ہوا تھا پٹنہ کی طرف متوجہ ہوا۔ ۱۹ ربیع الآخر ۱۰۶۹ ہجری ۴ جنوری ۱۶۵۹ء کو اورنگ زیب نے اسے شکست دی۔ اس واقعہ کا حوالہ دیتے ہوئے بیدل لکھتا ہے کہ ہم لوگ یہاں ترہت میں داد شجاع دیر ہے تھے کہ کچھ جاسوسوں نے یہ خبر اڑائی کہ الہ آباد کے پاس دونوں بھائیوں نے فوجیں آپس میں لڑ پڑیں اور یہ اورنگ زیب کی جیت اور شجاع کی ہار پر منتہی ہوئی۔ اس جنگ میں شجاع کی بہت سے آدمی کام آگئے اور کچھ لوگ تیرنا نہ جانتے تو شاید کوئی بھی بچ کر نہیں نکل سکتا تھا۔ خود

شجاع کی حالت ایسی تھی کہ اگر بہت سے سپاہیوں نے اس کی جان کی حفاظت کے لئے اپنی جانیں قربان نہ کی ہوتیں تو وہ اس واقعہ سے جانبر نہیں ہو سکتا تھا۔ بیدل کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

”جاسوسان کمینگاہ عبرت خبر آوردند کہ در سواد عرصہ الہ آباد، دو دریای بیکران باہم در افتادند۔ با مواج بی زہار، شوق تیغ و تفنگ داد تلام داد۔ یعنی اورنگ زیب عالمگیر، بر عزم فرمانروائی دہلی سبقت کردہ۔ و حقوق خدمت پدر پیش از دیگران بجا آورده۔ با مواکب اقبال طوفان طرز انگیخت و سیل ادبار بر بنای شوکت شجاع ریخت۔“ (۱۵۹)

کمینگاہ عبرت کے جاسوسوں نے یہ اطلاع دی کہ الہ آباد کے پاس دو دریائے ناپید اکٹرا رہے۔ ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ تیغ و تفنگ کے شوق نے لہروں کے ساتھ داد تلام دیا۔ یعنی اورنگ زیب نے دہلی کی حکومت پر قبضہ کرنے میں پہل کی اور اپنے باپ کے حقوق دوسروں سے پہلے بجالائے۔ عروج و اقبال کی سوار یوں کے ساتھ اس نے ایک طوفان برپا کیا اور زوال و ادبار کے سیلاب نے شجاع کی شان و شوکت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔

یہاں اورنگ زیب کے بارے میں بیدل کے لہجے کی تلخی بتاتی ہے کہ وہ اس حرکت سے نفرت

نہ تھا۔

بہر حال اس وحشت انگیز خبر کو سن کر مرزا عبداللطیف کے فوجی دستے میں خوف و ہراس کی زبردست لہر دوڑ گئی بیدل کے الفاظ میں:

”بجز دسماع، میناء و سنگا غرور، سنگ نامیدی خورد و موج صہبای قدرت چوں خط جام برجا فشر، و زلزله ای در بنیاد حاضران افتاد و انقلابی بتاراج ہوشہا دست کشاد کہ ہول مشعر، خلائی را آنقدر نعل در آتش بنشاند۔ و جوش طوفان، طبایع را بان بیدست و پای در آب براند۔ گداز زہرہ از صفحات سیما نقوش رنگ نشستن داد۔ و لرزہ اعضا بر مغز اتخوان، در ہای بیرون ریختن کشاد۔ نفسہا، بفراہم آوردن لب کمین گر پناہ دیوار پر داغخن گردید۔ و نظربا، بہ بستن مرغان مایل سر از دوش انداختن۔ صورتی بفریاد کرنا، بہزار سعی دمیدن، نفس جز در آستین نمی کشید۔ و نفخ شکم کوس و دہل، بصد پای دوال غیر از باد فراز نمی زلید۔ زبان لاف سرانہا، چون انگشت ملوم یکلعم سرگون خط بر زمین کشیدن۔ و باد بردت پر چہما، چون اجزاء جاروب، یکدست پرانگندہ علم در خاک خوابانیدن۔ زہرہ پوشان رادر خانہ زہور، بہزار حلقہ دام گرفتاری وحشت۔ و مغفرداران را، در زیر طشت آتش بصد اضطراب پسند توجہ بہریمت۔ خدنگہا از بی پرواہی، جرأت پرواز در آشیان ریخت۔ و تفنگہا، از قہمی قابلی کو چہ امید سلامت گریخت۔“ (۱۶۰)

..... بساط راحت و سکون میں کسی کو کوئی جگہ نہ ملی۔ غبار وحشت نے اس قدر بال زنی کی کہ دل کے نقوش تک برقرار نہ رہے۔ سچی حیات کی جولانگہ طبایع انسانی پر اتنی تک ہو گئی کہ پلکیں بھی پڑنے لگ گئیں۔ مایوسی کی تلوار نے ایک عالم کو اس طرح ایک دوسرے سے بے تعلق کر دیا کہ چہرے پر تک ہونٹوں پر بات اور اعضا میں ربط تک برقرار نہیں رہا۔ حیرت کی آگ فرو ہو گئی۔ اور اس کا جو ہر آب ہو گیا ان سب حالات کا دل پر عجب قائم ہونے کے سوا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

اس پوری عبارت آرائی کا ماحصل یہ ہے کہ الہ آباد کے پاس شاہ شجاع کی فوج کی شکست کی خبر پہنچی تو بہت میں مرزا عبداللطیف کے فوجی دستے کا رنگ اڑ گیا، اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین ٹھک گئی، سب کے ہوش و حواس گم ہو گئے اور افراتفری کے عالم میں ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ بیدل نے زور بیان کا کرشمہ دیکھتے کہ جب اس فوجی دستے کی دلیری کا نقشہ کھینچنا چاہا تو اسے اوج فلک پر نہ دیا اور جب اس کی وحشت و سراسیمگی کی تصویر کھینچی تو اسے تحت اثری میں پہونچا دیا۔

شخص را در بساط آرمیدن جا نماند گرد وحشت بال زد چندانکہ نقش پا نماند  
طبایع تک شد جولانگہ سعی حیات آنقدر میدان کہ کس مرغان کند بالا نماند  
نمیدی جہانی را ز یکدیگر ہتر بد رنگ بر رو، حرف در لب، ربط در اعضا نماند  
ش حیرت فرد و جوہر حیرت گداخت زان ہمہ حالت بغیر از رعب در دلہا نماند  
مرزا عبداللطیف نے ان سراسیمہ لوگوں بلکہ ساتھیوں کی تسکین خاطر کی ہر ممکن کوشش کی لیکن ان کی ساری کوششیں رائیگاں گئیں اور بیدل کے الفاظ میں ”پریشانی اوراق دلہا، بیرازہ نہ رسید۔“ (دل کے اوراق پریشانی کی شیرازہ بندی نہ ہو سکی) اور آخر کار ”عنان ہزار طبع بہ قوت یکدست کشیدن ناممکن تھا۔“ (ایک ہاتھ سے ہزاروں آدمی کی باگ تھامنا کسی پہلوان کے بس کی بات نہ تھی) لہذا اس باختہ ہو کر جس کو جدھر عافیت نظر آئی وہ بے دھڑک ادھر نکل بھاگا۔ بیدل نے اس منظر کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے:

”بیکر ہای بیجان بصورت گرد باد ہر طرف گرد و وحشت اچھینتہ بود۔ و پر ہای شکستہ برنگ غبار صبح بر جانب سلسلہ پرواز گزینتہ۔ سجدہ دار از بیچارگی، قدم بر سر و دوش ہم می افشردند۔ و ہر جاسر رشتہ رفتار کم می گردید بہ پہلو کار غلطیدن پیشی بردند۔“ (۱۶۲)

غرض صحرا نور دی اور باد یہ پیائی کا یہ سلسلہ دس دن تک جاری رہا۔ بیدل بھی عبداللطیف اور ساتھیوں خصوصاً سرمست خاں اور مبارز خاں وغیرہ کے ساتھ ایک طرف کوروانہ ہوا۔ لگا تار دس دن ان کی صحرا نور دی کے بعد وہ پہلے چاند چور (یا چاند پور) پھر پٹنہ پہونچا۔ راستے میں ایک واقعہ

حیرت انگیز قسم کا پیش آیا جس کا تذکرہ بعد میں ہوگا۔

اس صحرا نوردی میں بیدل کی مرزا عبداللطیف کے کارواں سے جدائی کا وقفہ اتنا طویل ہوا کہ مرزا کو اس کی بیابان مرگی کا شبہ ہونے لگا۔ اس نے اپنے بعض ساتھیوں کو اس کا سراغ لگانے کو بھیج دیا۔ آخر ایک رات دن کی تلاش کے بعد ان لوگوں کا سراغ ملا۔

اس فوجی دستے میں بیدل کی شرکت خود اس کے بیان کے مطابق تین مہینے رہی۔ اس کے علاوہ دس دن بیابان گردی میں گزرے۔ شاہ شجاع کی فوجی شکست کی تاریخ ۲۰ ربیع الاول ۱۰۶۹ھ ۶ دسمبر ۱۶۵۸ء عیسوی ہے اس حساب سے بیدل لگ بھگ ۲۰ ربیع الاول ۱۰۶۹ھ ۸ دسمبر ۱۶۵۸ء آس پاس مرزا عبداللطیف کے دستے میں شامل ہوا اور دس دن کی بیابان گردی کے بعد تقریباً یکم جمادی الاول ۱۰۶۹ھ ۱۵ جنوری ۱۶۵۹ء کو پہلے چاند پور پھر پٹنہ پہونچا۔

بیدل نے ایک اور واقعے کا ذکر کیا ہے جو ۱۰۷۰ھ ۱۶۵۹ء سے وابستہ ہے۔ اس واقعہ کے بعض حصے چونکہ ملک خصوصاً صوبہ بہار کے سیاسی اور سماجی حالات پر روشنی ڈالتے ہیں اس لئے اس کا تذکرہ یہاں بے محل نہ ہوگا۔

عبارت کے سیاق و سباق سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا قلندر کا قیام اس وقت قصبہ ”مہسی“ میں تھا۔ مہسی میں مرزا قلندر کا قیام، واقعات کی ترتیب کے پیش نظر، اس وقت کا ہے جب اس نے حسب ہدایت بیدل مرزا عبداللطیف کے فوجی دستے سے وابستہ ہوا ہے تین مہینے کی معرکہ آرائی اور دس روزہ در بدری کے بعد جب بیدل پٹنہ پہونچا تو ایسا لگتا ہے کہ اپنے ماموں مرزا ظریف کے ساتھ جو وہاں سکونت پذیر تھے زندگی گزارنی شروع کی۔ ادھر مرزا قلندر نے اس علاقے کی بدامنی کی وجہ سے مہسی سے بنگال کا رخ کیا۔ بنگال میں کسی مقام پر پہنچ کر بیدل کو ہدایت کی کہ مہسی جا کر وہاں سے اسباب اٹھالائیں۔ بیدل ایک خادم کے ساتھ پٹنہ سے مہسی کے لئے روانہ ہوا تاکہ جو اسباب خانہ دار چھوٹ گئے تھے انہیں اپنے ساتھ لے آئے۔ لکھتے ہیں:

”درس یکہزار و ہشتاد و ہجری، میرزا قلندر بسفر سیاق بنگالہ توجہ گماشتہ بود و اسباب علاقہ در قصبہ ”مہسی“ کہ پست کردہ از پٹنہ آن طرف دریای گنگ واقع است، گذاشتہ فقیر را حکم ضرورتی، بہرم قصبہ مذکور ہم ناگزیری ساخت و نعل جمعیت در آتش می بی اختیار انداخت۔ رفاقت یک خادم بعلم کشی لشکر تدبیر کفایت دیدہ۔ و اختیار پیادگی از سواران عرصہ مصلحت اندیشیدہ، عنان جہد بحکم تقدیر و گذشتہ“ (۱۶۳)

۱۰۷۰ھ ۱۶۵۹ء میں مرزا قلندر بنگال کے سفر پر روانہ ہوئے اور اسباب خانہ قصبہ مہسی

میں تھے جو پٹنہ سے گنگا کے پار بیس کروہ (کوس) کے فاصلے پر واقع ہے۔ انہوں نے فقیر کو ایک (سامان لانے) کی خاطر قصبہ جانے کا عزم بالجبرم کرنے کو کہا اور نعل جمعیت کو بے سابقہ طور پر ڈلوادیا۔ تدبیر کشی علم کشی کے ساتھ کے ساتھ ایک خادم کی رفاقت کافی تصور کی اور سواری کے پیادہ جانے کو تقاضائے مصلحت سمجھا۔ جدوجہد کی باگ ڈور تقدیر کے حوالے کیا۔

اس وقت اطراف و اکناف کے سیاسی اور سماجی حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے بیدل آگے

”این همان ایامیست کہ بنای شوکت شاہ شجاع، با دار گیہای عالم ادبار رسید۔ و اقتدار بادشاہ عالمگیر بر جہات ممالک ہند صف اقبال کشید۔ شوارع اطراف و اکناف، جنگی دلہای حزمین خراش آفتی دار کردہ حرکت پیشہای عالم اسباب جزیشہ بر پای تر دوزن، شعبہ آثار سلامت نمی شمرند۔ و جمعیت احوال خلائق، مضر قہ دماغ مجنون، گرد و شستی انپاشت کہ تدبیر اندیشگان طرق معاش، غیر از قدم درد امن تعطل شکستن، صرفہ عافیت پیش نمی بردند خاصہ راہ عبور دہات، بآن صوبت کہ شاہبازان نشین قدرت، در آن فضا ہا بہلا حظہ غارت کمینی زارغ و زغن، متاع بال و پر، از آشیان بیرون نمی آرند۔ و شیر وان کنام غیرت، از ہراس غالب آہنگی سگ و خوک، جش ناخن و دندان، جز در چنگال و دہان محفوظ نمی دارند۔“ (۱۶۳)

یہ وہ زمانہ ہے جب شاہ شجاع کی اساس شوکت و سطوت زوال آماہ تھی اور عالمگیر کے اقتدار نے ہندوستان کے تمام علاقوں پر اپنی صف اقبال بچھا دی تھی۔ اطراف و نواحی کے راستے گھاٹ غمگین و فہرہ دلوں کی تنگی کی طرح ایسی آفات اور بلاؤں کے حامل تھے کہ عالم اسباب کی متحرک چیزیں یا انبیات کو اپنے پاؤں پر کھپا ڈھکی مارنے کے سوا انہیں اپنی خیر و سلامتی کے آثار نظر نہیں آتے اور عوام کا دل دماغ مجنوں کی طرح ایسی وحشت کی گردوغبار سے اٹ گیا تھا کہ مختلف دھندل کرنے والے تاجر و صنعت کار کو دامن تعطل میں قدم شکنی کے سوا خیر و عافیت کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی تھی۔ خصوصاً دیہی علاقوں کے راستے گھاٹ کی صورت حال اور زیادہ سنگین تھی۔

ان علاقوں کی بدامنی کی جو تصویر بیدل نے ان عبارتوں میں کھینچی ہے وہ اندرونی بغاوتوں کو جنم دیتی ہے۔ شاہ شجاع کی شکست اور اورنگ زیب کی تخت نشینی کے بعد اندرونی ملک شورشوں کا ایک فوفن کھڑا ہو گیا اور لوگ کھلے عام کشت و خون اور لوٹ مار کا بازار گرم کئے ہوئے تھے خصوصاً

اس سفر میں بیدل کو بڑی زحمتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی تفصیلات نہایت طویل ہیں۔ غلام یہ کہ ایک خادم کی رفاقت میں بیدل گھر سے نکلنے کو تو نکل گیا پر پیادہ چلنے کی نوبت اب تک نہیں آئی تھی اس لئے تھوڑی مسافت طے کرنے کے بعد اس قدر تھک گیا کہ آگے قدم بڑھانا مشکل ہو گیا۔ خادم کہا جتنی جلد ہو سکے یہاں سے روانہ ہو جانا بہتر ہے ورنہ جو ہوا اس وقت یہاں چل رہی ہے اس دوش پر بلا بھی گرم رفتار ہے۔ کافی مکان کے باوجود بیدل دوبارہ ہمت کر کے اٹھا مگر ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا سکا اور سواری کی فکر کرنے لگا مگر اس کا حال یہ تھا کہ وہ بھی ممکن نہ تھا لکھتے ہیں:

”بعلت خطر راہ کرایہ کشان اقبال نہ نمودند، بہ عذر ہای لنگ زبان مبالغہ کشوند بلکہ ہر یکی بتا کید فسخ عزیمت رسم موعظت بجای آورد۔ و بہ تعلیم اختیار رفاقت، دفتر ارشاد وای کرد۔ (۱۶۵)

خطرہ کے سبب کوئی بھی کرائے پر لیجانے کو تیار نہ ہوا اور بڑی شد و مد سے عذر لنگ کرنے بلکہ سفر ملتوی کرنے کی نصیحت کرنے لگے۔

بیدل کے اس بیان سے عام طور پر پھیلی ہوئی بد امنی کی شدت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ غرض کہ تھوڑی مسافت طے کرنے کے بعد بیدل ایک درخت کے پاس پہنچ کر سائے میں تھوڑی دیر سٹایا۔ وہ اتنا تھک چکا تھا کہ اب کسی طرح آگے چلنا اس کے بس میں نہ تھا اچانک دیکھتا کیا ہے کہ ایک خم ضعیف آدمی ایک بچے اور گھوڑی کے ساتھ سامنے آیا اور بیدل کو سلام کر کے بولا:

”در چنین اوقات پیادہ سفر اختیار کردن بر مستعدان دستگاه شعور حیف می آید و بہ تنہائی دریں راہ قدم گذشتن از فکر صائب دوری نماید۔ حصول پیچ مرادی بقبول این مقدار تعب نمی ارزد و وصول پیچ مقصدی بہ التزام اینہمہ زحمت کرایہ نمی کند۔“ (۱۶۶)

ایسے وقت میں پیادہ سفر کرنا اہل فہم و شعور کے لئے افسوسناک بات ہے اور پھر اکیلے راستے پر چلنا فکر صائب سے دور معلوم ہوتا ہے چاہے جو مراد ہو اس کے حصول کے لئے اتنی مشقت برداشت کرنا کسی طرح زیب نہیں دیتا اور چاہے جو مقصد ہو اس کی خاطر اتنی زحمت اٹھانا چنداں نہیں ہے۔ یہ اقتباس بھی انہی حالات کی عکاسی کرتا ہے۔ بیدل اپنی یادداشت پر زور دینے کے باوجود اس کو نہیں پہچان سکا تو انہوں نے خود ہی اپنا تعارف اس طرح کرایا:

”من جان محمد از تابعان خواجہ شاہ محمد، کہ در ”مہسی“ بامیرزا قلندر ش نسبت ہمایگی دیوار بدیوار است۔ و مقابلہ آئینہ اتحادش، بی شائبہ ہمین و یسار۔ بامر خواجہ مامور بودم تا بکنار دریای گنگ مشایعت آشنائی بجا آرم۔ الحال معاودت نمودہ ام و عزم حضور خواجہ

دارم۔“ (۱۶۷)

میرا نام جان محمد ہے، میں خواجہ شاہ محمد کا مرید ہوں جن کا مکان ”مہسی“ میں مرزا قلندر کے مکان کے بالکل پڑوس میں واقع ہے صرف دیوار کا فرق ہے۔ خواجہ صاحب کے حسب حکم اپنے ایک دوست کی مشایعت کرنے دریا ئے گنگا کے کنارے آیا تھا اب واپس لوٹ رہا ہوں اور خواجہ موصوف کی خدمت میں حاضری کا ارادہ ہے۔

اس بیان سے واضح ہے کہ خواجہ شاہ محمد ایک بزرگ تھے جن کا مکان مہسی میں مرزا قلندر کے مکان کے بالکل پڑوس میں واقع تھا اور ان دونوں کے بیچ خلصانہ روابط قائم تھے۔ جان محمد خواجہ صاحب موصوف کے ایک مرید تھے۔ بہر حال کچھ سوال و جواب کے بعد ان کے اصرار پر بیدل گھوڑی پر سوار ہو کر مہسی روانہ ہوا۔ نماز عصر کے وقت وہاں پہونچا تو دیکھتا ہے کہ:

”پیر رافت تخمیر برد روازہ خواجہ شاہ محمد ایستادہ بود و چشم در انتظار ما نہادہ اسپ حوالہ کو دک کر دم در راہ آوردہ مراتب نیاز پیش آوردم چندا نکہ زبان شکر می کشودم، بعرض انکساری افزود..... آخر الامر، طبیعت معذور را مرہون منت ابدی وا گذاشتم۔ و باستر ضای اشارہ و داعش راہ خانہ برداشتم۔ فردای آل، کہ پسران خواجہ، برسم قدیم صحبت فقیر دریاختند، بافشای احسان طومار ہای ستالیں وا کردم و بتوصیف اخلاق آن آفتاب ضمیر، بقدر خطوط شعاع زبا نہا برآورد۔ مگر دسماع قسم یاد کردند کہ باین نام کسی از رفقای مانیت، تا معمای یقین باید شکافت۔ و پیمان دیروز آمدن ہچکس از پیچ جا بجا نہ صورت نہ بستہ است، تا سراغ تحقیق توان یافت۔ (۱۶۸)

وہ سراپا مہربان بوڑھا شخص خواجہ شاہ محمد کے دروازے پر کھڑا میری راہ تک رہا تھا۔ میں نے گھوڑی بچے کے حوالے کیا اور نیاز مند کی کا اظہار کیا۔ میں جس قدر اس کا شکر یہ بجالاتا وہ اسی قدر تواضع سے کام لیتا..... آخر اپنی معذور طبیعت کو ان کے احسان کا مرہون قرار دیا۔ ان کی طرف سے نصیحت ہونے کا اشارہ پا کر میں گھر کی طرف روانہ ہوا۔ دوسرے دن جب خواجہ صاحب کے صاحبزادے حسب دستور فقیر کے پاس آئے تو ان کے احسان کا اظہار کر کے ان کی تعریف کی۔ انہوں نے تمکھائی کہ اس نام کا ہمارا کوئی رفیق نہیں ہے کہ یقین کا معرہ حل ہونے کی نوبت آئے اسی طرح کسی سے کسی کے آنے کی بھی اطلاع نہیں ہے کہ اس کا سراغ لگانے کی ضرورت پڑے۔

ایسا لگتا ہے کہ اس لبق و دق میدان میں بیدل کی ملاقات حضرت خضر علیہ السلام سے ہوئی تھی۔ مشہور ہے کہ حضرت خضر کا کام بھولے بھگون کو راستہ بتانا، ان کی رہبری کرنا اور مدد کرنا ہے۔

خود بھی حیرت کا مجسمہ نظر آتا ہے۔

”جنون این نوا، از ہر بن مویم، خوش حیرت انگشت۔ درنگ این ساز، بر سر پایم زمزمہ  
بیخودی ریخت۔ اگر تقدیر شاید سبکی شکر این فضل می داشت تا ابد گرد زبان می گردیم۔ و اگر  
بیان قائل سپاس این عطیہ بود، تا قیامت غیر از عبارت نمی پرستیدم۔“

اس آواز کا جنون میرے ہر بن موسے حیرت کی صدا لگا رہا تھا اور اس کا ساز میرے پیکر کے  
سامنے بیخودی کے نغمے الاپ رہا تھا۔ اگر تقدیر اس عنایت کا شکر یہ بجالانے کی اہل ہوتی تو وہ سدا زبان  
کے گرد طواف کرتی اور اگر قوت میان اس سپاسگزاری کے لائق ہوتی تو قیامت تک عبارت پرداز  
سوا کوئی مشغلہ نہ اختیار کرتی۔

تصور جو ہر آگاہی قدرت کجا دارد بہار فضل، آنسوی تعقل رکھا دارد  
تصور میں کہاں یہ صلاحیت کہ خدا کی قدرت کا اندازہ لگاس کے، فضل الہی کی بہار کے اندر  
مختلف ہوتے ہیں جو دائرہ فہم سے پرے ہیں۔

نہال آید برون تخمیکہ بنشانند در خاکش درین وادی ز پا افتادن ایجاد عصا دارد  
جو تخم زمین میں دفن کر دیتے ہیں اس سے پودا نکلتا ہے اسی طرح اس وادی میں جو شخص پاؤں  
سے معذور ہو جاتا ہے اسے عصا مل جاتی ہے۔

ندید از آبلہ ریگ روان منع جنون تازی بنومیدی ز پامنشین کہ ہر واماندہ پا دارد  
ریگز اوروں کی جنوں تازی میں آبلوں سے کوئی رکاوٹ نہیں آتی، مایوسی میں ہاتھ پیرو توڑ کر نہ بیٹھ  
جا کیونکہ ہر تھکا ہارا آدمی کو چلنے کے لئے آخر توانائی مل جاتی ہے۔

بگردون می برد نظارہ واماندگان مژگان مشو غافل ز پروازیکہ بال نارسا دارد  
پلک مجبور انسان کو آسمان تک کا نظارہ کرا دیتی ہے اس لئے اس پرواز سے غافل مت رہ جو بال  
نارسا کے اندر ہوتی ہے۔

اس واقعے سے دو باتیں سامنے آتی ہیں: اول یہ کہ ملک میں عام طور پر بد امنی پھیلی ہوئی تھی  
جس کا سلسلہ شہر سے آگے بڑھ کر دیہاتوں تک پہنچ چکا تھا دوسرے یہ کہ انتہائی مایوسی کے عالم میں  
انسان کو امید کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہئے۔ کیا خوب کہا ہے

بہ نومیدی ز پامنشین کہ ہر واماندہ پا دارد  
خوشگو نے ان تمام واقعات کو اس دور سے وابستہ مانا ہے جب بیدل اعظم شاہ کی خدمت سے  
استعفا دے کر مشرقی علاقے کی سیاحت کرتا ہوا اڑیسہ پہونچا لکھتا ہے:

”پس آنحضرت بطریق سیاحی رو بمشرق نہاد عزیمت فرمودہ، مدتی در ممالک حدود بنگ و

بہار و اوریسہ باز ادگی و بی تعیین بسر بردہ و دشت و بیابانہا پیمودہ عجائب قدرت الہی تماشا  
نمودہ اکثر از خصوصیات آئینہ نگام در چہار عنصر نگاشتہ۔“ (۱۶۹)

اس (استغنی) کے بعد بیدل نے سیاحت کے طور پر مشرقی علاقوں کا رخ کیا، کچھ عرصہ بنگال،  
اور اڑیسہ میں آزادی سے زندگی گزاری اور دشت نور دی اور بادیہ پینائی کی اور قدرت الہی کے  
نہایت دیکھے۔ اس وقت کی اکثر و بیشتر خصوصیات کا تذکرہ چہار عنصر میں کیا ہے۔

لیکن بیدل کے حالات اور مسافروں کی ترتیب جس کی تفصیل آئندہ اوراق میں ناظرین کی  
توجہ سے گزرے گی، خوشگو کے خیالات کی تائید نہیں کرتی ہے۔ بہر حال اس کے بعد بیدل کہاں گیا  
میں طور پر کہنا مشکل ہے مثنوی ”عرفان“ سے معلوم ہوتا ہے کہ بیدل نے بنگال کے ایک مقام ”کالا  
تھن“ میں کچھ وقت گزارا ہے اور وہاں کے ایک مالدار آدمی کا جو گردش زمانہ سے مفلس ہو گیا تھا واقعہ  
یہ ہے:

مردی از اغنیاء بنگالہ مفلسی گشت از قضا ہالہ  
آخر آوارگی جنون انگشت چوں غبارش ز خانہ بیرون ریخت  
در سواد مقام کا لا طاق بست ناچار با جلا میثاق  
(بنگال کا ایک مالدار آدمی بد قسمتی سے مفلس ہو گیا۔ آوارگی جنون نے اسے آخر گھر سے بے گھر  
کر دیا۔ مقام کا لا طاق سے اس نے جلا وطنی کا عہد کیا)۔ اس لئے قیاس ہوتا ہے کہ مہسی سے واپسی کے  
بہرہ مرزا قلندر کے ہمراہ بیدل نے کچھ وقت وہاں گزارا۔ بیدل نے ایک شعر میں ان زہمتوں کی طرف  
اشارہ کیا ہے جو بنگال کے علاقے میں سیلاب کی وجہ سے لوگوں کو پیش آیا کرتی ہیں اور خود اس کو بھی ان  
سے پہنچا ہے۔

ماسیہ بختاں حباب گریہ نومیدی ایم خانہ بر آبست یکسر مردم بنگالہ را  
ہم بد نصیب لوگ نومیدی سے حباب کی طرح روتے ہیں۔ بنگال کے باشندوں کا گھر پانی پر  
ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ دو اشعار میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے۔

بہ بختی خود ناز دو عالم داریم سایہ دارد مژہ ات بر سر بنگالہ ما  
مردم در وطن ایجاد غربت می کند گرز چینی مود مد چیش ہمان بنگالہ است  
سراج الدین علی خاں آرزو اور بندر ابن داس خوشگو دونوں نے اپنے تذکروں میں اس امر کی

تائید کی ہے کہ بیدل نے کچھ عرصہ بنگال میں بھی گزارا ہے (۱۷۰)۔ خلیل اللہ غلیبی نے قطعیت کے  
ساتھ یہ فیصلہ کر دیا کہ



”اختصاص ہمیں شکست موجب مہاجرت ترکان برلاس چغتائی بہ نقاط مختلف گردید۔ میرزا عبداللطیف و مرزا قلندر (۱۰۷۴ھ) باقاعدہ خویش بہ کالا طاق رهند کہ مقام البعد بنگالی باشد۔“ (۱۷۱)

ترہت میں فوجی شکست کی رسوائی نے چغتائی برلاس ترکوں کو مختلف علاقوں کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا۔ مرزا عبداللطیف اور مرزا قلندر اپنے عزیز واقارب کے ساتھ کالا طاق روانہ ہو جو بنگال کا سب سے دور ترین علاقہ ہے۔

لیکن چہار عنصر جس میں بیدل نے اپنی اکثر و بیشتر مسافرتوں بلکہ ان کی جزئیات تک کا تذکرہ کیا ہے اس سے قطعیت کے ساتھ پتہ نہیں چلتا ہے کہ وہ کبھی بنگال میں بھی رہا ہے۔ اس سے پہلے بعد کے حالات بتاتے ہیں کہ اگر بنگال میں اس کا قیام رہا ہے تو اسی زمانے میں رہا ہے۔

اس کے بعد ایسا لگتا ہے کہ پٹنہ میں اپنے ماموں مرزا ظریف کے پاس آیا اور ۱۰۷۱ھ تا ۱۰۷۲ھ تک پٹنہ میں مرزا ظریف اور بنگال میں چچا مرزا قلندر کے پاس آمد و رفت کا سلسلہ اس نے جاری رکھا۔

### مرزا ظریف:

بیدل کا اپنے ماموں مرزا ظریف سے رابطہ کہاں قائم ہوا اس سلسلے میں بعض معاصر دانشوروں کا اختلاف ہے۔ پروفیسر میر حسن شاہ لکھتے ہیں:

”بیدل بسال ۱۰۷۰ھ تا ۱۰۷۹ھ میں با اتفاق میرزا قلندر، از بہار بہ بنگال رفت۔ و سال بعد با اتفاق عموی دیگرش میرزا ظریف بہ کٹک (اوریسہ) سفر نمود۔“ (۱۷۲)

۱۰۷۰ھ ہجری میں بیدل مرزا قلندر کے ساتھ بہار سے بنگال گیا اور ایک سال بعد اپنے دوسرے چچا مرزا ظریف کی رفاقت میں کٹک (اڑیسہ) کے سفر پر روانہ ہوا۔

پروفیسر غلام حسن مجددی لکھتے ہیں:

”چون میرزا قلندر بہ بنگال رفت، بیدل در پٹنہ با مامای خویش میرزا ظریف کہ در حدیث و فقہ ید طولانی داشت، بسر می برد۔“ (۱۷۳)

مرزا قلندر جب بنگال کے لئے روانہ ہوا تو بیدل پٹنہ میں اپنے ماموں مرزا ظریف کے گھر ٹھہر گیا۔

لیکن واقعات کی کڑی نیز بیدل کا بیان یہ واضح کرتا ہے کہ بنگال پہنچ کر مرزا قلندر نے کسی چھوٹے ہوئے اسباب خانہ کو لانے کے لئے بیدل کو ایک خادم کے ساتھ وہاں بھیجا۔ چچا

مدایت بیدل بڑی زحمتوں کے بعد بھی پہونچا اور فطری طور پر سارا اسباب خانہ بنگال پہونچانے کے بعد وہ غالباً چچا کے اشارے پر مرزا ظریف کی صحبت سے استفادہ کے لئے پٹنہ واپس آیا۔ مرزا ظریف سکونت پذیر تھے وہ ایک عالم و فاضل آدمی تھے اور ان کا گھر ایک اکیڈمی کی حیثیت رکھتا تھا جہاں بہت سے دانشورا کٹھے ہو کر علمی اور ادبی مسائل پر بحث کرتے تھے۔ بیدل لکھتا ہے:

”در بلدہ پٹنہ وثاق معارف اتفاق میرزا ظریف، کہ آب و گل تعمیرش جو ہر نزول ارباب فضل و کمال بود، و پست و بلند و دوش و بامش زیر و بم نعمہ و جدو حال سر رشته طناب معمارش بشر ازہ نسخہ منتہی، و حضور سایہ دیوارش، روشن سواد کی کتاب آگہی۔ گاہی از عبور بالغ کلامان چون بیت بلند معنی شوق انشا۔ و گاہی بہ ورود عالی نگاہان، چون خانہ چشم، شمع افروز انوار تماشا۔“ (۱۷۴)

شیر پٹنہ میں مرزا ظریف کا گھر علوم و معارف کا ایک مرکز ہے جس کے آب و گل میں ارباب فضل کے درود کا جو ہر شامل تھا اور جس کے درو بام کی پستی و بلندی میں جدو حال کے نغموں کے پھول بنے جاتے تھے۔ اس کے معمار (مرزا ظریف) کے طناب کی رسی نسخہ حقائق کے شیرازہ پر منتہی تھی اور اس کے سایہ دیوار میں حاضری ”کتاب آگہی“ کی چمکدار سیاہی اور روشنائی تھی۔ کبھی بالغ کلام کے سر سے پار کر جانے والا بلند اور معیاری شعر کہتے اور کبھی بلند نگاہوں کی آمد پر خانہ چشم کی نور تماشا کی شمع روشن کرتے تھے (دوسروں کے کلام سنتے)۔

بیدل کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا ظریف ایک نمایاں علمی مقام رکھتے تھے۔ علوم ظاہری و باطنی کے کمال کے مرجع شمار کئے جاتے تھے، علم دوست حضرات ان کے گھر پر علمی محافل کی مجلسیں کرتے تھے، چہار عنصر میں مختلف مقامات پر بیدل نے مرزا ظریف کی شخصیت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کے پیش نظر ایسا لگتا ہے کہ وہ ایک تاجر پیشہ آدمی تھے، اس سلسلے میں مختلف جگہ ان کی آمد و رفت ملتی ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ وہ ایک بڑے عالم و فاضل آدمی بھی تھے خصوصاً تفسیر، حدیث اور فقه کی معلومات بڑی وسیع تھیں۔ لکھتا ہے:

”میرزا ظریف کہ بہ عرصہ علوم فقہ و احادیث علم فطرت نعمانی می فراشت۔“ (۱۷۵)

مرزا ظریف علم فقہ و حدیث کے میدان میں فطری صلاحیت کا علم بلند کرتے تھے۔

مرزا بیدل ان کے قول کو نقل کرتا ہوا لکھتا ہے:

”چہل سال متبع ثقات مدرسہ فضل کردہ ام و از تفسیر چندیں سند تحقیق بدست ورده۔“ (۱۷۶)



کہ چالیس سال اہل علم و فضل کے مستند اداروں میں تعلیم و تحقیق کا سلسلہ جاری رکھا اور خصوصاً تفسیر میں کئی سندیں حاصل کیں۔

زہرہ الخواطر میں مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب نے ”علامہ ظریف الحسنی العظیم آبادی“ زیر عنوان لکھا ہے:

”الشیخ الفاضل العلامة ظریف الحسنی العظیم آبادی احد العلماء المبرزين في الفقه والاصول والكلام وغيرها اخذ عن الشيخ نظام الدين بن قطب الدين الانصاري السهالوي ثم ولي التدريس بمدرسة سيف خان

بمدينة عظيم آباد.“ (۱۷۷)

شیخ فاضل علامہ ظریف الحسنی العظیم آبادی فقہ، اصول اور کلام وغیرہ کے ایک نمایاں عالم تھے انہوں نے شیخ نظام الدین بن قطب الدین السہالوی سے تعلیم حاصل کی پھر شہر عظیم آباد کے سیف خاں میں تدریسی خدمات پر مامور ہوئے۔ ظریف کی کئی تصنیفات بھی ہیں۔ مولانا جہنڈا انگری اور بہت سے دوسرے علماء نے ان سے استفادہ کیا۔

ممکن ہے یہ وہی مرزا ظریف ہوں کیونکہ بیدل اور حکیم صاحب کے بیان میں بڑی محنت نظر آتی ہے اس لئے ممکن ہے ان ہی وجہ سے مرزا قلندر نے اس کو مرزا ظریف کی خدمت میں تربیت کے لئے چھوڑ دیا ہو۔ بیدل نے غالباً دیگر علوم و فنون بھی مرزا ظریف سے سیکھے ہوں۔ خصوصیت سے تفسیر میں استفادے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

”روزی در خدمت میرزا ظریف مطالعہ تفسیر قرآن داشت و قلم طاقت فہم سطر استفادہ می

نکاشت.“ (۱۷۸)

ایک دن مرزا ظریف کی خدمت میں تفسیر قرآن کا مطالعہ کر رہا تھا اور حسب لیاقت

افادات نقل کر رہا تھا۔

پٹنہ میں مرزا ظریف کے ساتھ بیدل کا قیام تقریباً سال بھر رہا۔ بیدل کے بیانات سے ہوتا ہے کہ ماموں کے ساتھ اپنے ایک سالہ دوران قیام میں مرزا قلندر سے وہ مکمل طور پر جدا ہوا تھا، بلکہ اس علاقے میں حالات کے معمول پر آنے کے بعد کبھی کبھی بنگال سے پٹنہ رانی ساگر گیا تھا۔ مقام پر ان کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ ایسے ہی کسی موقع پر بیدل مرزا قلندر کے ساتھ ساگر میں ایک مجلس رقص و سرود میں شریک نظر آتا ہے کیونکہ اس واقعے کو بیدل نے اس موقع واقعات کے ضمن میں لکھا ہے۔ ۱۰۷۱ ہجری ۱۶۶۰ عیسوی میں بیدل جب مرزا ظریف کی وفات

”ازبہ“ روانہ ہوا تب وہ چچا سے مکمل طور پر علیحدہ ہوا لکھتا ہے:

”درسہ یکہزار و ہفتاد و یک ہجری میرزا ظریف را کہ چہرہ اعتبار بیدل بہ نسبت آرای خال مرین داشت خامہ تقدیر بسفر ملک اودیہ جادہ ہدایت گردید و تسلیم سرشت حقیقی را بہ اختیار وقت خود جدائی مرزا قلندر مجبور گردانید.“ (۱۷۹)

۱۰۷۱ ہجری میں تقدیر کے قلم نے مرزا ظریف کو جو بیدل کے چہرہ اعتبار کو نسبت خال سے آراستہ کئے ہوئے تھے صوبہ اڑیسہ کے سفر پر روانہ کیا اور اس تسلیم سرشت حقیقی کو اپنی اختیار اور مرزا قلندر کی جدائی پر مجبور کیا۔

بیدل کی مجلس رقص و سرود میں شرکت:

اس واقعہ کے سلسلے میں ڈاکٹر عبدالغنی کا خیال ہے:

”میں یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ اس واقعے کا کہاں سے تعلق ہے۔ رانی ساگر کا حوالہ یہ واضح کرتا ہے کہ اسے مرزا قلندر کی مولانا کمال سے ملاقات کیلئے وہاں بار بار کی آمد و رفت سے البتہ مانا جائے لیکن اس سفر کا مقصد ہمیں اس خیال سے باز رکھتا ہے۔ اشعار کے جملے نیز کلام کا کلام یہ بتاتا ہے کہ یہ واقعہ تب پیش آیا جب بیدل کو فارسی زبان پر پوری قدرت حاصل ہو چکی تھی لیکن چونکہ مرزا قلندر کے بنگال جانے کے بعد بیدل سے اس کی ملاقات کا کوئی اشارہ نہیں ملتا ہے اس لئے کہنا چاہئے کہ یہ واقعہ جنگ جانشینی کے ختم ہونے کے بعد پیش آیا۔“

جیسا کہ پچھلے صفحات میں لکھا گیا مرزا قلندر کے بنگال جانے کے بعد کم از کم ایک سال بیدل سے ان کا تعلق بالکل ختم نہیں ہوا تھا اس لئے یہ اشارہ خود بیدل کی تحریر میں موجود ہے کہ یہ واقعہ ان کے بعد پیش آیا۔

بہر حال واقعہ یوں ہے کہ مرزا قلندر نے ایک دفعہ رانی ساگر میں ایک حوض کے کنارے ایک مجلس سرود و منعقد کی جس میں گانے بجانے اور رقص کرنے والی عورتوں کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ بیدل کی خوش گلوئی اور شیریں آوازی کا تذکرہ اس انداز سے کیا ہے:

”کونکے ادا یاں بساط زمین را در لطافت خواب گل خوابانیدہ، و غلغل نغمہ سرا یاں فضای

مستفیضی منقار بلبل پوشانیدہ.“ (۱۸۱)

یعنی زمین اداؤں کے ہجوم نے بساط زمین کو خواب گل کی لطافت میں محو خواب کر دیا تھا اور

نغمہ سراؤں کے شور نے فضا کو بلبل کی چونچ کی شوخی کا لباس پہنا دیا تھا۔

غرض یہ مجلس اتنی ہی دلکش اور رنگین تھی کہ جملہ حاضرین اس سے متاثر نظر آ رہے تھے۔ ان سے ایک رقاصہ کا رقص جبکہ شباب پر پہنچ چکا تھا، ساقی کے ہاتھ سے جام شراب پھل کر زمین پر گر گیا۔ اس کے نتیجے میں عین عالم نشاط میں غلغلہ مچ گیا۔ رقاصہ نے غضب آلود نگاہوں سے اسے دیکھ کر کہا: ”آداب محفل کا بھی تمہیں کوئی پاس و لحاظ نہیں ہے۔“

بیدل نے فوراً ساقی کی طرف سے ایک منظوم معذرت پیش کی:

ز دست ساقی اگر جرعد ای چکید بہ خاک در ابروی تو چرا موج ناز چین انداخت  
ساقی کے ہاتھ سے اگر ایک جرعد زمین پر گر گیا تو تیری ابرو پر کیوں بل پڑ گیا۔  
نہ رعشہ در کف ساقی، نہ لغزشی در جام کہ گویم از کفش انداخت آن و این انداخت  
ساقی کے ہاتھ میں رعشہ ہے نہ جام میں لغزش کہ ان میں سے کسی کو مورد الزام ٹھہرایا جائے۔  
دمیکہ چشم تو سوی پیالہ کرد نگاہ قدح ز دست شد و بادہ بر زمین انداخت  
جس لمحہ تیری نگاہ پیالے پر پڑی پیالہ ہاتھ سے پھسلا اور شراب زمین پر گر گئی۔

پیالہ چسٹ کہ در بزم شوخی نازت ہزار آئینہ آب رخ این چنین انداخت  
پیالہ کی کیا حقیقت ہے تیری شوخی ناز کی بزم میں ہزاروں آئینے کی آب و تاب اور چمک دم  
اس طرح رخصت ہو گئی۔

یہ منظوم معذرت حاضرین کو اتنی پسند آئی کہ انہوں نے نعرہ ہای تحسین بلند کئے۔ بیدل نے الفاظ میں:

”زبان موج می از لب ساغر شور تحسینا و گلوی مینا بجزہ قلقل زمرمہ ہای آفرین  
انداخت۔“ (۱۸۲)

موج سے کی زبان نے لب ساغر سے نعرہ ہای تحسین بلند کئے اور گلوائے مینا نے بجزہ قلقل آفرین کے ترانے گائے۔

یہ واقعہ مرزا قلیندر کی شخصیت خصوصاً تقدس کا جو لبادہ بیدل نے ان کو پہنا رکھا ہے اس کے تصور قارئین کو شک و تردید میں ڈال دیتا ہے کیونکہ یہ قول بیدل وہ صوفیوں اور وہ بھی وحدۃ الوجودی صوفیوں کے حلقہ بگوش تھے۔ مربی کے افکار و خیالات میں یہ تضاد خود بیدل کی طرف بھی منتقل ہوا جیسا کہ ان تفصیلی حالات میں پڑھیں گے۔

شاہ ابو الفیض معانی:

پن میں مرزا ظریف کا گھر، جیسا کہ ذکر کیا گیا، درحقیقت ایک طرح کی اکیڈمی تھی جس میں شاعرانہ و ادبیات اکٹھے ہو کر مختلف علمی موضوعات پر تبادلہ خیال کرتے تھے۔ ان دانشوروں میں شاہ ابو الفیض معانی کی تھی جن سے بیدل بہت زیادہ متاثر نظر آتا ہے۔ بیدل نے ان کا خاصہ میں ان کا تعارف کرایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

”حسن لطایف اسرار، بصافی طبعش می نازید و نشہ دماغ افکار در سایہ علوفہ قرش می بالید ہم  
زبان قصر ارشاد را، جذبہ بہت سلوکش، مانع پستی نزول و ہم پایہ منظر اخلاق را، تہذیب  
مہر و اطوارش، معراج حقیقت قبول..... سخن از ہر دشت، عرض مراتب بلندی داشت،  
مستی از ہر رنگ، علم بہار رنگینی می افراشت۔ روش گفتگو ہا، نفسی چند، بسیر مراتب عالم مثال  
کند۔ و عنان افلاس، بہ جادہ پینائی این وادی لطافت، معطوف گردید۔ گاہی آفتاب،  
بہ ذرہ چون نگاہ خانہ می کرد، و غبار تنگیش نمی افتد، گاہی در سوافار سوزن، رقص جمل  
اشت در شہ داری پہلوی دقت نمی خورد۔“ (۱۸۳)

بہار عبارت آرائی کا حاصل یہ ہے کہ شاہ ابو الفیض ایک جید عالم تھے اور اسرار و رموز اور معارف کو نہایت دلنشیں انداز میں بیان کرنے پر ان کو بڑی قدرت تھی۔

ان کی صحبت سے بیدل نے جو کچھ استفادہ کیا ان کو اس نے ”نکات“ کے عنوان سے بیان کیا ہے۔ نکات عام طور سے خواب و بیداری، غیب مطلق، غیب اضافی، غیب مشمل اور غیب مصور کے مسائل سے وابستہ ہیں۔ ان کے روحانی مقام کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے ان کے بعض ارشادات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ ایک دن بیدل نے عرض کیا:

”شاہ از لطیف و بساطت کا رگاہ مثال بیان نمودہ اند پرده حضورش بی شایہ بر روی ما علم  
شیدہ عمریت کہ ناظر پروگیاں این خلوتخانہ خیالم، و مشرف تماشا می این انجمن مال،  
”سحر ای حیرتی“ بمشاہدہ ام رسیدہ است، و قضای قدرتی بہ مکاشفہ انجامیدہ کہ بی نہایتی  
فی اہام را، نقد رسائی بدامن ہدایتش ریختن است۔ و بی پایانی جہد افکار و سنگاہ اختتام بہ  
نکات آغازش آوینختن غبار این وادی، یکسر آسمان تازا است۔ و نیم این سواد، یکقلم لامکان  
”در آئینہ تحقیق روشن است کہ ”لذت افکار“ چندیں درجہ بر ”لذت اذکار“ تفوق  
”ویر گریبان“ بر فرق ہزار باغ و بہار قدم می گزارد۔ معنی غامض این کتاب ناگفتنی  
است۔ و گوہر دقت این معما تا سفتی۔“ (۱۸۴)

”سیرگریاں“ کہتے ہیں ”خود اپنی ذات پر غور و فکر کرنے کو“ ”تامل“ نام ہے ”حقیقت کی یہ تک پہنچنے کا“ اور ”تفکر“ کہتے ہیں ”اشیاء کی حقیقت تک رسائی کا۔“

جب یہ تین خصوصیات کسی کے اندر جمع ہوتی ہیں تو وہ اوج کمال پر پہنچ جاتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی اپنے اپنے دائرے میں اہمیت ہے خصوصاً ”تفکر“ کی اس لحاظ سے بڑی اہمیت ہے کہ اس کی طرف توجہ نہیں کرتے ہیں جبکہ آیت شریفہ بتفکرون فی خلق السموات والارض (آل عمران ۱۹۱) کے مطابق وہ اس کے مامور اور مکلف ہیں۔ اسی وجہ سے اس عمل کو خاص طور پر غور و فکر کی بحث قرار دے کر وہ بیان کرتے ہیں کہ مظاہر قدرت اس دنیا میں بہ سہولت نظر آتے ہیں۔ دنیا میں، یہ چاند و سورج، یہ دریا و صحرا، یہ باغ و راغ، حیوان و انسان، نباتات و جمادات، کو ہزاروں رنگ و بھیر میں دیکھ کر اس کی عظمت دیتے ہیں۔ ان کے چہروں پر کسی قسم کا نقاب نہیں ہے اس لئے اس نقاب پر تفکر کر کے اس کے اسرار و رموز کا سراغ لگانا چاہئے۔ صرف قوت تخیل سے ان کا مشاہدہ نہیں کیا جاسکتا ہے ورنہ نگاہ کی تازگی ہم سے رخصت ہو جائے گی۔ شاہراہ معرفت کے بیشتر ہر و حضرات کے مفہوم کو صحیح طریقے سے نہیں سمجھ سکے یا اسے کوئی اہمیت نہ دے کر محو خواب ہو گئے۔ صاحب کے جواب کا ماحصل یہ ہے کہ ”سیرگریاں“ یا ”بہ فکر خود افتادن“ کی اپنی جگہ اہمیت ہے یعنی ”غور و حقیقت اشیا“ کا بھی کچھ کم درجہ نہیں ہے اور سیرگریاں کو سیر باغ و راغ پر ترجیح دینا یا ”بیدل“ اس کے قائل ہو ایک غلط رجحان اور ناصواب رائے ہے۔ کمال عرفان تک پہنچنے کے لئے دونوں کا جمع کرنا ضروری ہے۔

ظاہر آفاق نباید بودن آخرای بیخبر! ایں بزم طلسم صورت است (۱۸۶)  
الم آفاق (کائنات) کے بیرونی مناظر سے صرف نظر نہ کرنا چاہئے۔ اے بے خبر! آخر یہ بھی بزم طلسم صورت ہے۔

کی مجلس میں ”خواب و بیداری“ کی حقیقت پر بھی بحث ہوئی۔ اس موضوع پر شاہ صاحب سے واقعات بیان کئے جن کی بیدل نے اپنے الفاظ میں ترجمانی کی ہے۔

اس موضوع پر شاہ صاحب کے خیالات کا ماحصل یہ ہے کہ ”خواب“ اگر ”مرگ“ ہے تو ”زندگی“۔ خواب اگر ”افسردگی“ کا نام ہے تو بیداری ”بلند پروازی“ کا۔ جو لوگ ذوقِ حقیقی سے بہرہ مند ہیں وہ اپنی آنکھیں بند نہیں رکھ سکتے کیونکہ یہ سارے فطری مناظر اور جلوے کی طرف متوجہ رہتے ہیں اور قدرت کی بوقلمونی کا تماشا ہم سے نگاہیں وار کھنے کا مطالبہ کرتا ہے۔

بہت سے عمر، ای دیدہ ترک سرگرائی کن نگہ را اند کی روشن سواد جلوہ خوانی کن

اس سوال کا ماحصل یہ ہے کہ چند سالہ تجربہ اور ایک عرصے کی تحقیق و تفتیش کے بعد ہم اس پر پہنچے ہیں کہ ”لذت اذکار“ کو ”لذت انکار“ پر کئی درجے فوقیت حاصل ہے۔ ”افکار“ سے ”مراقبہ“ ہے۔ بیدل نے اس کے لئے ”سیرگریاں“ کی اصطلاح اپنائی ہے۔ کسی ایک موضوع پر غور و فکر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی پہلے اپنی تمام تر توجہات ایک نقطہ پر مرکوز کرے اور یہ ”سیرگریاں“ سے اچھی طرح حاصل ہوتا ہے۔

اس کے بعد بیدل کا خیال ہے کہ مراقبہ میں جو لطف مجھے آتا ہے اور اسرار و حقایق کے جوہر میری نگاہوں کے سامنے کھلتے ہیں وہ ہزاروں بہار کی سیر و سیاحت پر فوقیت رکھتے ہیں۔ شاہ ابو نے مسکرا کر اس کا جواب دیا:

”وقتی ماہم بہ لذت افکار یکہ خاصہ اولیای سلسلہ شاست رسیدہ بودیم و چاشنی از آں مانکہ حلاوت فایده چشیدہ یعنی مواظبت چشم بستن، در ستر حقیقت حال می پوشیدیم۔ و در قباب وضع مراقبہ، اسرار غامض حیرت پوشیدیم۔ چون مشکشف گردید کہ لذت از نسبت این افکار، از لذت تمحیب بکلی مستغنی ساختہ، بہ یقین انجا مید کہ طبعیت از لذت انکار البتہ در گذشتہ است۔ تا بایں نعمت موصول گشتہ، درین صورت، سیرگریاں، سر مارانیز نہایت دامان می رساند اما نامساعدی مرور زمان، از نیم راہ کرو زانو باز گردانید۔۔۔۔۔ مقصود از ”سیرگریاں“ بفکر تحقیق خود افتادنست نہ از سرگرائیہا بی حس در دوسر زانو زدن۔ و مدعای ”تامل“ بکنہ معنی وار سیدن، نہ غبار معنی برفرق بینش پوشیدن معنی ”تفکر“ غور و حقیقت اشیاست۔ و حقیقت اشیا بقدر عرض صور چہرہ کشا۔ درین تماشا کدہ، بقسون ”تخیل“ خواب بر طبعیت نباید گذاشت۔ و بفریب ”تفکر“ دامن از چنگ فرضہ نباید گذاشت۔ جلوہ بی نقاب را بخیال مشاہدہ نمودن، از تازگیہای محرومی نگاہ است۔ و از معانی مشکوف معما تراشیدن، دلیل وقعیہای فطرت کوتاہ۔“ (۱۸۵)

شاہ ابوالفیض کے درج بالا طویل جواب سے واضح ہوتا ہے کہ وہ بھی قادری سلسلے کے تھے جس سے بیدل اور ان کے خاندان کا تعلق تھا، مراقبہ اور سیرگریاں کے ذریعہ فکر کی لذت سے تھے۔ اس لئے بیدل کے افکار و خیالات سے اپنے افکار و خیالات کی ہما ہنگی کا اظہار کرتے انہوں نے مزید کہا: ”سیرگریاں“ سے انسان کو اگرچہ روحانی عروج حاصل ہوتا ہے تاہم جب یہ سازگار نہیں ہوتے ہیں وہ منزل سے پرے ہی رہ جاتا ہے۔ اس کے بعد ”سیرگریاں“ ”تامل“ اور ہر ایک اصطلاح کی جس کا تصوف میں چرچا رہتا ہے وضاحت کرتے ہیں:

عمر تیزی سے رواں دواں ہے اے آنکھ اپنی سرگرانی کا سلسلہ ترک کر۔ نگاہ کو تھوڑی دیر پہلے  
خوانی کی سیاہی سے روشن کر۔

کندتا کی فسوں خواب پیش از مرگ درگورت بہ بیداری علاج چشم زخم زندگانی  
”خواب“ کا جادو آخر تک تمہیں موت سے پہلے ”زندہ درگور“ کی پوزیشن میں رکھے۔  
زندگی کے چشم زخم کا علاج بیداری سے کرو۔

دروں بیضہ جز افسردگی دیگر چہ می باشد مہمنہا وقف پرواز است سعی پر فشان  
انڈے کے اندر افسردگی کے سوا کیا رکھا ہے۔ سارا چمن وقف پرواز ہے تو بھی پر فشان کر۔  
اس کے بعد شاہ صاحب کے ارشادات کی توضیح کرتا ہوا بیدل لکھتا ہے:

”چشم پوشیدہ ہر چند فردوس در قفس دارد، آئینہ دار کوریست۔ و مژگان خوابیدہ اگر ہمہ  
آفتابش چراغ زیر دامن باشد، دلیل بی نوری بہمہ حال اگر بخیمہ ہای مژگان، از ہم نتوان  
سکینت، نمک گریہ برین زخمہا باید ریخت۔ و اگر باین پنیہ افسردہ، شمع نگاہی نتوان  
افروخت، بہ لعلکی زاغ وزغن باید فروخت۔“ (۱۸۷)

یعنی چشم بستہ اگر چہ ”فردوس در قفس“ کی حیثیت رکھتی ہے پروہ اندھے پن کی آئینہ دار نہ  
مخواب پلکیں اگر چہ سراپا آفتاب ہوں پر چراغ زیر دامن کی طرح بے نوری کی دلیل ہیں۔ ہمہ  
پلکوں کے بخیمے کو اگر ادھیڑا نہیں جاسکتا تو ان زخموں پر نمک گریہ چھڑکنا چاہئے۔

ہمیں معلوم ہے کہ بیدل پر صوفیاء کے افکار و خیالات کی کتنی گہری چھاپ ہے۔ جن  
صفحات میں ہم پڑھیں گے کہ بیدل کا تصوف را کد اور جامہ قسم کا نہیں ہے۔ وہ ایک رواں دواں  
قائل ہے۔ چنانچہ فلسفہ حرکت کا ذکر اکثر مواقع پر اس کے کلام میں ملتا ہے۔ اس کا سرچشمہ در حقیقت  
ابوالفیض کے خیالات ہی ہیں۔ شاہ صاحب کی صحبت سے اپنے استفادے کا خلاصہ بیدل ان  
میں پیش کرتا ہے:

”الحاصل از در فیض معانی رنگین ششجہت آغوش کیفیت بہار کشودہ بود۔ و شور عبارات نمکین

بر در و بام چاشنی تبسم سحر اندودہ“ (۱۸۸)

غرض آستانہ فیض سے معانی رنگین چاروں طرف سے آغوش کیفیت بہار کھولے تھے  
عبارات نمکین کا شور و بام پر تبسم سحر کی چاشنی اکھٹا کئے۔

مجلس کے اختتام پر طے پایا کہ اس کے شرکاء حضرات ”وارستگی“ پر اپنے اپنے خیال کا  
کریں۔ بیدل کا بیان ہے کہ حاضرین میں سے ہر شخص اس موضوع پر اپنے خیال کا اظہار کر رہا تھا

کے بارے میں اظہار خیال کا شوق دامنگیر ہوا۔ شاید یہ پہلا موقع تھا جب بیدل نے  
اس کی اس محفل میں اظہار خیال کی جرأت کی تھی اور وہ حجاب جو عام طور سے بزرگوں کی محفل میں  
ہوا کرتا ہے، اس کو اس نے بالائے طاق رکھ کر یہ رباعی کہی:

بیدل! زغم و نشاط دوراں بگذر و زبیش و کم و مشکل و آسان بگذر  
در گلشن دہر، چون نسیم دم صبح آزادہ درآ و دامن افشاں بگذر

بیدل! دنیا کے غم و خوشی، کمی بیشی اور دشواری و آسانی سے (متاثر ہوئے بغیر) آگے نکل جا۔  
بیدل باد نسیم کی طرح آزادی سے آ اور دامن جھاڑتے ہوئے نکل جا۔

بیدل نے اصلاح کی غرض سے شاہ صاحب کی خدمت میں اسے پیش کیا۔ لیکن شاہ صاحب  
فی البدیہہ رباعی گوئی سے سے اتنا متاثر ہوئے کہ حاضرین کی طرف رخ کر کے بولے:

”از فحوانی ایں کلام بوی صہبای کمال می آید۔ و صفای ایں الفاظ آئینہ حسن متانت می  
زداید۔ از جادہ انصاف در نباید گذشت کہ با ز ایں صغرن، مایہ سخن بمذاق گیر اسانند ان آثار  
بہائی ندرت است۔ و بمرتبه رفیعی پہلوی نموبہ نکلہای بلند زدن، دلیل آبیاری قدرت۔

بریں شعلہ خاموش غافل منکرید، و ازین طوفان حیرت خروش بیخبر مکلرید۔“ (۱۸۹)

اس کلام کے انداز سے صہبای کمال کی بو آتی ہے اور ان الفاظ کی صفائی اور سلاست  
محنت کے آئینے کو دور کرتی ہے۔ راہ انصاف سے قدم آگے نہیں بڑھانا چاہئے۔ اس صغرنی کے  
بہائی ندرت است۔ اس شعلہ خاموش سے غفلت مت بر تو اور اس  
”خوش“ سے لا پرواہی مت کرو۔

اس وقت بیدل کی عمر سولہ سال تھی۔ ظاہر ہے ایک علمی محفل میں شریک بزرگوں کے مقابلے پر  
اس کی تھیں اس کم سنی کے باوجود نہایت شستہ اور سلیس انداز میں رباعی کہتا اور اس پر طرہ یہ کہ اس  
پہلے رباعی گوئی کا کبھی کوئی تجربہ بھی اس کو نہیں تھا۔ بیدل کے طبع روان اور ذوق لطیف کی نشاندہی  
کرتا ہے۔ شاہ ابوالفیض کا اس کی محنتی اور پوشیدہ صلاحیت کو ”شعلہ خاموش“ اور ”طوفان حیرت خروش“

تجربہ کرنا ہرگز بے محل نہ تھا۔ لگتا ہے بیدل فطری طور پر ایک شاعر اند ذوق اور رجحان طبع لے کر پیدا  
ہوا۔ بزرگوں اور دانشوروں کی صحبت نے جلا بخشی۔ ان کی حوصلہ افزائیوں نے اس کی صلاحیت  
کھلنے اور اس کی شخصیت سازی میں اہم رول ادا کیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ ان ہستیوں سے  
بہت متاثر ہوا۔ اظہار اس طرح کرتا ہے جیسے ان لوگوں نے بیدل پر بڑا احسان کیا ہو۔ بیدل شاہ

کا دعا کو نقل کرتا ہوا لکھتا ہے:

”بعد ازاں محیط فیض بامواج تحسین زبان ترجم کشود بہ عبارت این دعا صلہ دوام شوقم عطا فرمود: یارب دماغی کامل اثر برفع نقصان حوادث، مریح دعوت کمال باد۔ و شخص فطرت بہ سپرداری این چار آئینہ آفت چشم زخم مہینا د۔ (۱۹۰)

### بیدل اڑیسہ میں:

جیسا کہ عرض کیا گیا پٹنہ میں بیدل کے ساتھ اپنے ایک سالہ قیام کے بعد ۱۰۷۱ ہجری میں مرزا ظریف کلک (اڑیسہ) کے لئے روانہ ہوئے۔ کلک صوبہ اڑیسہ کا مرکز تھا اور ابھی کچھ دنوں تک اس کی یہ حیثیت برقرار تھی۔ ادھر چند سال سے بھونیشور اس کا صدر مقام ہو گیا ہے۔ چارغھر معلوم ہوتا ہے کہ مرزا ظریف اگرچہ ایک عالم آدمی تھے مگر تجارت کو ذریعہ معاش بنایا تھا۔ اس سلسلے کلک کو اپنا مرکز قرار دے کر اکثر اس کے اطراف کا دورہ کیا کرتے تھے۔ منجملہ اس کے ایک ”کساری“ تھا جو اس علاقے کے بازار کی حیثیت سے ایک اہم جگہ تھی۔ اور کلک سے اس کی سرن چھ دن کی راہ کی تھی۔ بیدل نے وہاں پانچ مہینے مرزا ظریف کے ساتھ گزارے۔ لکھتا ہے:

”موضع کساری از دہکدہ کلک مسافت شش روزہ راہ است و برای تجارت پیشگان عالم اسباب معیشہ گاہ۔ بسو دای ضرورتی بیخ ماہ اتفاق اقامت روی داد و فقیر را نیز التزام رفاقت واجب افتاد۔“ (۱۹۱)

اسی طرح ایک اور مقام ’بالیسر‘ ہے جس کا تذکرہ بیدل نے مثنوی عرفان میں کیا ہے مفلسی در نواح بالیسر دست بیکار داشت وقف کمر بیدل از محرمان رازش بود چندی آنجا ز سوز و سازش بود (۱۹۲)

(بالیسر کے علاقے میں ایک مفلس اور نادار آدمی بے روزگار تھا، بیدل اس کے محرم راز دوستوں میں تھا اور کچھ دنوں اس کے غم و خوشی میں شریک رہا۔) کلک دریائے مہاندی کے کنارے آباد ایک مشہور تاریخی شہر ہے جس کی بنیاد کیسری سلسلے بادشاہ مکار نے رکھی تھی اور اکبر بادشاہ کے دور میں صوبہ اڑیسہ کا مرکزی مقام قرار پایا تھا۔ (۱۹۳) یہ پودوں کی کثرت اور وسیع و عریض میدانوں اور پہاڑوں کے سبب اپنے مناسب جائے وقوع کے سے دلکش فطری مناظر کا حامل ہے اور ایک حساس شاعر کے دل کے تاروں کو چھیڑنے کی صلاحیت ہے اس لئے کچھ عجیب نہیں کہ بیدل کے شاعرانہ ذوق کی پرورش میں اس کا بھی ہاتھ رہا ہو۔ بیدل الفاظ میں:

”چوں بہ بلدہ کلک کہ پائے تخت ممالک اوڑیسہ است اتفاقاً عبور افتاد و برب دریائے کہ کنار آن شہر واقع است صورت اقامت روی داد۔“ (۱۹۴)

دوسری جگہوں میں کلک کے لئے ”گلزمیں“ اور ”مرغزار“ (۱۹۵) کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ بیدل نے یہاں دریائے کنارے واقع ایک مکان میں بود و بوش اختیار کی۔

بیدل جس زمانے میں اپنے ماموں کے ہمراہ اس شہر میں داخل ہوا۔ خان دوران سید محمود وہاں جو مولانا یعقوب چرخنی کی اولاد میں تھا۔ (۱۹۴)

بیدل کا بیان ہے کہ یہاں تین سال قیام کیا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ ۱۰۷۱ ہجری کے آخری میں آیا اور ۱۰۷۵ ہجری کے اوائل میں وہ وہاں سے دہلی کے لئے روانہ ہوا۔ اس طرح ۱۰۷۲، ۱۰۷۳ اور ۱۰۷۴ ہجری کا زمانہ اس کا اڑیسہ میں گزرا۔ اس کا یہ تین سالہ قیام اس کی شخصیت کی تعمیر، فنی ارتقا اور فکری و ذہنی بالیدگی کے لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ایک بلند پایہ بزرگ کی دست میں حاضری اور ان کی صحبت سے استفادے کی کیت و کیفیت کے پیش نظر اسے بیدل کی کتاب میں ایک جداگانہ باب کہنا چاہئے۔ اس وقت بیدل کی عمر سترہ سال تھی۔ اس کی جسمانی اور ذہنی نشو و نما اس کے ساتھ اس مرحلے پر پہنچی تھی کہ ہر قسم کے علمی دقائق کو سمجھنے اور انہیں ہضم کرنے کی صلاحیت اس میں یہ ہو گئی تھی اس زمانے میں اس کے قلب و دماغ کی سطح پر کس قسم کے خیالات ابھر رہے تھے اس کے ذیل بیان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

”فقیر بیدل را آغاز بنای شعور بے امتیاز نہہ، بجز و غرور بر توجہ جناب نیرنگی بود۔ و شوق نسبت آں حضور ہر نفس زدن بر حیرت آئینہ احوال می افزود۔ نمی دانست محرک سلسلہ نفس کیست و باعث اضطراب طبیعت چیست؟ ہر جانیسی در تصویر می وزید، بوی بیخودی دماغ ہوش می افروزد۔ و ہر گاہ صدائی بہ تخیل میرسید پیغام و داع شعور بگوش می خورد۔ و مطلع صبح توام طوفان آہ در نظری بالید۔ و سواد شام بچشم چراغان اشک بساط انجمی چید۔ پیوستہ چون ابر، تہہ آراہ گریدہ بود، اما بچشم خلق عرض چکیدنی نداشت۔ و چون نبض تپ زدہ، ہمہ وقت بال نعلی زد۔ اما گردنالہ نمی افراشت۔ روز و شب چون روز و شب باد و غبار عالم بی اختیاری ساختہ بود۔ و سال و ماہ چوں سال و ماہ با گردش رنگ تحریر پرداختہ۔

بحکم ارشاد ذوقا سنی با مصروف مراتب اخفا داشت بمعرض احوال اظہار ہزار رنگ علم بہانہ می افراشت۔ گاہی طبیعت را بہ عوارض صداغ و امثال آن مہتمم می ساخت، و خود را از جرگہ مجلسیاں بیرون می انداخت۔ و گاہی با ہمسافان عذر ضعف دلی پیش می برد و تنہائی را از غنائم

حصول جمعیت می شرد۔ شیوہ تسلی، بمعنائ نالہ بلبل سراسر چمنستان گردیدن۔ وطریق عافیت  
ہمدوش وحشت گرد باد سر بہ ہوائ صحرا پیچیدن۔ واقف حقیقت کار علم حق، ومحرم کیفیت اسرار  
ہاں دانای مطلق۔“ (۱۹۷)

فقیر بیدل کی توجہ آغاز شعور سے جبکہ عجز وغرور کے نشے میں خط امتیاز نہیں کھینچ سکتا تھا،  
نیرنگی (خدائے تعالیٰ) پر تھی۔ اور آس حضور (باری تعالیٰ) سے منسوب ہونے کا شوق سانس کی آمد  
کے ساتھ آئینہ احوال کی حیرت میں اضافہ کر رہا تھا۔ پر پتہ نہیں چلتا تھا کہ سلسلہ نفس کا محرک کون ہے؟  
اضطراب کا سبب کیا ہے؟ عالم تصور میں جہاں باد نسیم گرم رفتار ہوتی ہوئے بیخودی دماغ ہوش  
دبوج لیتی اور جب کبھی کوئی صدا قوت تخیل سے آگتی وداع شعور کا پیغام کان سے ٹکرانے لگتا۔  
طوفان آہ کے ہمراہ بڑھتا دکھائی دیتا اور سیاہی شام چراغان اشک سے آنکھیں ملا کر ستاروں کے  
بچھاتی۔ بادل کی طرح سدا آمادہ گریہ رہتا لیکن عوام کی نگاہوں کے سامنے وہ چپکنا نہیں چاہتے تھے۔  
کا بازو لگا تار پھڑ پھڑا رہا تھا پر نالے کی گرد پرواز نہیں کرتی تھی۔ شب و روز کی طرح اپنے شب  
عالم بے اختیاری کے دو دربار سے ہم آہنگ کئے ہوئے تھے اور سال و مہینے کی طرح اپنے سال و  
رشتہ تحریر میں لائے ہوئے تھے۔

حسب اقتضای ”وفا“ ہماری ساری جتن اخفاء حال میں مصروف تھی اور عرض حال کے  
ہزاروں رنگ کا اظہار کسی بہانے کا پرچم لہرا رہا تھا۔ کبھی درد سر وغیرہ بیماریوں کا بہانہ کر کے اہل  
جماعت سے خود کو الگ تھلگ کر لیتا اور کبھی دوستوں کے سامنے ضعف قلب کا عذر کر کے تنہائی کو  
جمعیت کے لئے غنیمت تصور کرتا۔ نالہ بلبل کی ہم عنانی میں پورے چمنستان کی سیاحت کو اپنی  
خاطر“ کا ایک انداز قرار دیتا اور وحشت گرد باد کی ہمدوشی میں ہوائ صحرا میں سرپچی کرنے کو ”عافیت  
کی راہ سمجھتا۔ حقیقت حال سے واقف تو صرف خدا کا علم ہے اور کیفیت اسرار کا محرم بھی وہی ہے۔  
مطلق ہے۔

یہ تھے وہ جذبات و احساسات جن میں بیدل کا دماغ الجھا ہوا تھا۔ کافی غور و خوض کے  
باتیں ہمارے پلے پڑتی ہیں ان کا خلاصہ درج ذیل نکات میں پیش کیا جاتا ہے۔  
بیدل نے اس وقت زندگی کے مختلف ادوار جس ماحول میں گزاریے تھے اس میں  
اور نمایاں شخصیتیں نظر آتی ہیں جنہوں نے اس کی ذہنی اور روحانی بالیدگی میں غیر فانی نقوش  
ہیں۔ اس ماحول میں جب وہ اپنے گرد و پیش کے مختلف حالات سے متاثر ہوا اور ان کا احساس کرنے  
تو ابتدائے ہوش سے لے کر اس وقت ۷۰ سال کی عمر تک جس چیز نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول

ادوار میں اسے سدا یکساں طور پر نظر آتی تھی وہ باری تعالیٰ پر اس کی توجہ اور اس کا دھیان و گمان  
نہری مناظر پر غور و فکر کر کے جن کا اپنی سیاحتوں کے دوران اس نے مشاہدہ کیا تھا، وہ وحدت  
حق کی کثرت تک پہنچنا چاہتا تھا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ وہ جس قدر زیادہ اس پر محنت کرتا اس کی حیرت  
میں آئے دن اسی قدر اضافہ ہوتا جاتا۔ اس راز سر بستہ کا سرا حاصل کرنے کی لگاتار کوشش نے اسے  
بشراب سے دوچار کر رکھا تھا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ اس کا سراغ اسے نہیں مل رہا ہے ٹھیک اس بچے کی  
طرح جو گہوارے میں لیٹا ہوا ہاتھ پیر مارتا ہو کہ کسی طرح لٹکی ہوئی گڑیا اس کے ہاتھ لگ جائے پر اس کی  
ساری توجہ و دریاہنگاں جاری تھی۔ بیدل بھی اپنی جگہ حیرت و استعجاب کا پتلا بنا ہوا تھا۔ ہجوم جذبات میں  
بیدل کی طرح رونچاہتا تھا لیکن عوام کی نظر میں اس راز کا افشا بھی اسے منظور نہیں تھا اور ایک بخار میں  
جوش کی طرح اندر رہی اندر تاب کھاتا تھا پر نالہ و شیون کے ذریعہ وہ انہیں دوسروں کو بتا بھی نہیں سکتا  
تھا۔ جس درد کا وہ احساس کر رہا تھا اس کا کوئی چارہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وفاداری کے حسب اقتضا  
کی محبت و اشت میں لگا ہوا تھا۔ اس حالت میں کبھی درد سر کی شکایت کے بہانے دوستوں اور ساتھیوں  
کے سامنے سے خود کو دور رکھتا اور اگر کبھی اس میں شرکت کرتا تو ضعف قلب کے بہانے غفلت کو جلوت پر  
توجہ دیتا اور تنہائی کو سلوک کا وسیلہ قرار دیتا

گزل درد عشق بوئی بردہ ای در صبر کوش شوق را رسوا مکن از اشک گرم و آہ سرد  
(درد عشق کی اگر کچھ بھی بو تھیں ملی ہو تو صبر سے کام لو، شوق کو اشک گرم اور آہ سرد سے رسوا  
کر دے۔)

شوق قاسم ہوا للہی:

بان اگر بالہ ہمیں شاہیست اوج عبرتش از کمال فقر باش آگم، ہو للہی گزریں  
ز میں جب پیاسی ہوتی ہے تو باران رحمت جوش میں آتی ہے۔ درد عشق جب بیدل کے دل  
میں بام عروج کو پہنچا تو غیب سے ایک آدمی ظاہر ہوا اور اس نے اس کا علاج کیا۔

یہ غیبی شخصیت شاہ قاسم ہوا للہی کی تھی۔ شاہ صاحب کہاں سے تشریف لائے اور کہاں کے  
تھے کچھ واضح نہیں ہوتا۔ بیدل کے بیان سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کے  
مغربی انواح کی سیاحت کرتے ہوئے اسی سال کلکتہ تشریف لائے جس سال بیدل اپنے ماموں  
کا محلہ ہاں پہنچا تھا۔ چہار عشر میں لفظ ”ہندوستان“ جہاں کہیں بھی استعمال ہوا ہے سیاق و سباق  
معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد دہلی اور اس کے اطراف و نواحی کا علاقہ ہے جیسے پتھرا، اکبر آباد اور



میوات وغیرہ اس لئے ہو سکتا ہے اس علاقے سے وابستہ ہوں۔ بہر حال ان کی صحبت میں بیدل کی زندگی  
نشر کا سلسلہ تین سال تک جاری رہا اور مرزا ظریف اور بیدل دونوں یکساں طور پر ان کی خدمت سے  
استفادہ کرتے تھے۔ چنانچہ بیدل لکھتا ہے:

”بہ حسب اتفاق ہمارا سال مقدم بہار حضرت شاہ از گلگشت نواح ہندوستان چمن پیرایہ  
آن گلز میں فرمودہ بود۔ وسایہ التفات انوار برات بر آن شبتان مال خورشیدی کشودہ۔  
مدت سہ سال، مرزائی کمالات ایما، چراغ محفل استعداد بامداد پرتو صحبتش می افروخت، و  
این زلہ پرست ماندہ اخلاص، طفیلی نصیبہ، ازان خوان کرامت می اندوخت۔ (۱۹۸)

اتفاق سے اسی سال (۱۲۶۰ھ/۱۸۷۰ء) حضرت شاہ صاحب کی بہار صفت آمد اطراف دہلی  
ہندوستان کا دورہ کرتے ہوئے اس گل زمین (اڑیسہ) میں چمن پیرا ہوئی تھی اور آپ کے انوار قسم  
سایہ التفات اس شبتان مال (کنک) پر ضیا پاشی کرنے لگا تھا۔ مرزائے کمالات ایما (مرزا ظریف) نے  
تین سال تک محفل استعداد کا چراغ ان کی پرتو صحبت سے روشن کرتا رہا اور ماندہ اخلاص کا یہ زلہ  
(جھوٹا کھانے والا بیدل) اس خوان کرامت عنوان سے طفیلی کی طرح اپنا حصہ بنوڑتا رہا۔

بیدل اور مرزا ظریف کی ان سے آشنائی کا واقعہ بھی بڑا دلچسپ اور اہم ہے اس لئے بہتر  
پہلے اس واقعہ کا تذکرہ کیا جائے۔ بیدل کا بیان ہے کہ کنک میں قیام کے بعد ایک دن مرزا ظریف  
خدمت میں تفسیر قرآن کا درس لے رہا تھا کہ شاہ صاحب کے ایک ارادتمند نے آکر بتایا۔

”بزرگی بتاؤ گی این سرزمین را آسانی عز و رود بخشدہ۔ و عنان التفاتش بدین شامعطفوف  
گردیدہ۔ اجازت شوق درکار است، و ارادت ذوق فرصت شمار۔“ (۱۹۹)

حال ہی میں ایک بزرگ نے اس سرزمین کو اپنی تشریف آوری کا اعزاز بخشا ہے اور اپنی  
توجہ آپ حضرات سے ملاقات کی طرف پھیری ہے۔ اجازت شوق درکار ہے اور ارادت ذوق فرصت  
شمار ہے۔

اس طبقے سے جو خلوص و ارادت ہم لوگوں کو ہے اس کی بنیاد پر فوراً ہم اپنی جگہ سے اٹھیں، ان  
پر تپاک استقبال کیا اور اپنے گھر میں بٹھایا۔ پہلا جملہ جوان کی زبان مبارک سے نکلا یہ تھا:  
”الحمد للہ ما دشمار شہر با ہم رسیدہ ایم۔ فرصت مفت شوق و محبت بجا غنیمت ذوق۔“ (۲۰۰)  
”الحمد للہ ہم اور تم دونوں اس شہر میں ایک ساتھ وارد ہوئے۔“

اس کے بعد بعض آیت کریمہ کی جو اس وقت مجلس کا موضوع تھی تفسیر کرنی شروع کی اور  
کے اسرار و رموز اس طرح بیان کرنے لگے کہ بیدل لکھتا ہے:

”بعد ازاں آیت کریمہ کہ سبق محفل حال بود، نقاب نکرار از جمال اسرار بر انداخت، معنی چند  
از زبان تقدس بیان، سامعہ نواز گردید کہ خیال مفسرین، بسر اداق بزمش، بار نسبتی نداشت،  
و تفسیر مشکلمین بعروج بیانش، غیر از مرغان تحیر نمی افراشت۔ ہوشیا، پیش از مرتبہ ادراک،  
بہالم بخودی ساختہ بود، و زبا نہا، از پردہ گوش بساز خوشی پرداختہ۔ میرزا بابا۔ ہمہ بحر و جوش  
محیط قدرت، بمعبد وری قطرہ اعتراف نمود۔ و مقابل آن آفتاب معرفت، بہو ہوی ذرہ بال  
عجزی کشود۔ از فرط تحیر، سرپای مبارکش نہاد۔ و زباں قصور مراتب نارسائی عرضہ می داد کہ  
چہل سال تتبع ثقات مدرسہ فضل کردہ ام۔ و از تقاسیر چندین سند تحقیق، بدست آورده۔ اگر  
علم نیست، آہ از اوقاتیکہ بہ کسب بی تمیزی گزشت۔ و حیف عمریکہ بہرہ مشقیہای غفلت  
مصرف گشت۔“ (۲۰۱)

بیدل کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ مرزا ظریف نے چالیس سال تک ثقہ اساتذہ کی  
خدمت میں تفسیر قرآن کا مطالعہ کیا تھا۔ اس مدت میں جو اہم معلومات انہیں حاصل ہوئی تھیں ان پر وہ  
کرتے تھے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ اسی آیت کریمہ کی، جس پر وہ اظہار خیال کر رہے تھے  
شاہ صاحب نے تفسیر کرنی شروع کی اور ایسے حقائق و معارف بیان کئے جن کو کہیں دیکھا تھا نہ سنا تھا تو  
شاہ صاحب کے سامنے خود کو دریا کے مقابلے پر ایک قطرہ اور آفتاب کے مقابلے پر ایک ذرہ تصور کیا اور  
یہ زندگی سے ان کے قدموں پر سر رکھ دیا۔

یہ واقعہ شاہ قاسم ہوالہی کے علمی مقام کو واضح کرتا ہے۔ اپنے تمام تر دعویٰ تبحر علمی کے باوجود  
شاہ ظریف نے اپنے چالیس سالہ حاصل مطالعہ و تحقیق کو شاہ صاحب کی توضیحات کے مقابلے پر بیچ  
دیا۔ وقت دیکھا تو اپنی تعلیم اور مطالعہ پر صرف ہونے والے اوقات پر افسوس کرنے لگے۔ شاہ  
صاحب نے جواب دیا:

”ہمیں اس دیستان اگر مختصر یک ضل اصطلاحی بود، زبان اعیان، بمشق اختلاف عبارتہا  
نی فرسود۔ اینجا ہر لفظی، بر جمال معنی تحقیق، غازہ ایست موضوع جلوہ خود فروشی۔ و  
سازی، شوخی آہنگ مطلق، انجمنی مخصوص آثار قدرت خروشی۔ خاصہ قرآن، کہ ساز حقیقت  
قدرت است و قانون اسرار عزت، منزہ از تصنع عبارتہا کہ باہنگ نقصانش سرایند و مقدس  
از تکلف اشارتی کہ بمضرب کماش وواستانید۔ بی پردگی لغتاش، غرض استعداد سازندہ  
است۔ و بی نقابی مقاماتش، شونہای فطرت نوازندہ یعنی آہنگ مجردی، بچندین حجرہ، رنگ  
خیالی گرداند و لواہی، مطلق، بہزار زمرہ، ہال شوق می افشانند۔ و باوجود زیر و بم جہل و



شعور، ہچکچاہٹ، آن خارجی نمی نواز، و با کمال کیف و کم غفلت و آگاہی بیچ یکی غلط نمی پردازد..... تقریر و تحریر مراتب اسرار، اکثری موافق عوام فطرت، نہ مطابق بہت خواص۔ معنی مقام کہ خواص را بی تکلف الفاظ معنیها منظور است۔ و عوام با وجود البیاض بیان، در فہم عبارت نیز معذور، رتبہ کلام تا بخصیض نقصان نمی رسد، طبع عوام از جہل مطلق نہ باند و پرتو آفتاب، تا جہہ بر خاک نہ مالد، رنگ از سایہ طبیعت مرتفع نگردد۔ اگر حسن تحقیق، بکمال ذاتی جلوہ نماید، بر ضعیف نگاہان انجمن تصور ظلم است۔ و اگر جمال معنی، از کیفیت اصلی، رنگ نگردد۔ بر لفظ آشنایان عالم صورت ستم۔ علم دبستان مدرسہ حال، از ایجاد دبستان قبل و قال، منزہ باید فہمید۔ و رموز خلوتکدہ یقین از حرف و صوت محفل وہم و گمان مبرا باید اندیشید۔“ (۲۰۲)

شاہ صاحب کے جواب کو بیدل جیسے قادر الکلام ادیب نے استعارات و کنایات سے اپنے مخصوص اسلوب میں اس انداز سے پیش کیا ہے کہ اس سے بہتر طریقے پر پیش کرنا ممکن نہیں۔ عہد حاضر کی سادہ نگاری کے رجحان کے تحت آسان انداز سے اس کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

شاہ صاحب کا مقصد یہ ہے کہ یہ جہاں رنگ و بو ایک قسم کی تجربہ گاہ ہے جہاں کے علم کی مخصوص تعبیر نہیں ہوتی۔ جس کے صفحہ ذہن پر جو خیال ابھرتا ہے اس کا اظہار کر دیتا ہے اور جس انداز سے چاہتا ہے ادا کرتا ہے۔ لوگوں میں نظریے کا اختلاف اس بات کی واضح دلیل ہے کہ دنیا کی بیکرنگی پر قائم نہیں۔ خصوصاً قرآن مجید جس میں انواع و اقسام کے حقائق و معارف کے پھول کھلے ہیں اور چونکہ یہ خدا کا کلام ہے اس لئے ہر قسم کے تصنع و تکلف اور عیوب و نقائص سے خالی ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے حسب استعداد اس سے استفادہ کرتا ہے اور جس قدر اس کی گہرائی میں اترتا ہے اسی قدر اس کی گرائندری اور وسعت و پہنائی کا اندازہ اسے ہوتا جاتا ہے اور اپنی اپنی فہم کی سطح کے مطابق اس کے حقائق کے گہرے گہرائی کو نکالتا ہے۔ خدا کے مخصوص اور برگزیدہ بندوں نے اگر اس دریا میں غوطہ کھانے کے اپنے دامن میں موتی اکٹھے کئے ہیں تو ان کے اظہار کے لئے وہ مناسب اور موزوں موقع تلاش و انتظار کرتے ہیں۔ یہ لوگ عوام کو دو طبقوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ عوام الناس جو سیدی سادی عبارت بھی آسانی سے نہیں سمجھ سکتے ہیں اور ان کے بالمقابل خواص کا طبقہ ہے جو کسی زحمت اور پریشانی کے بغیر باریک اور دقیق مضامین کو بھی سمجھ لیتا ہے۔ اس وجہ سے ارشاد ہے کلموا الناس علی قدر عقولہم۔ لوگوں سے ان کی سوجھ بوجھ کے مطابق بات چیت کرو۔ انسانوں کی بڑی تعداد عوام الناس سے بنتی رہتی ہے اس لئے ضروری ہے کہ ہم ان کی سطح تک اتر کر بات کریں تاکہ وہ تبلیغ کا فائدہ اٹھاسکیں۔

مرزا صاحب نے ”مرزا صاحب“ اور ”مدرسہ حال“ میں جو علم و دانش ہم حاصل کرتے ہیں وہ اس علم سے کہیں بلند و بالا ہے۔ حصول کے لئے ہم ”مدرسہ قبل و قال“ اور ”بحث و مباحثہ“ میں اپنی زندگی کے قیمتی لمحات گزارتے ہیں۔ اول منزل ”یقین“ ہے اور دوسرا مرحلہ ”ظن“ ہے جو اسرار و رموز منزل یقین میں چھلکتے ہیں انہیں اتنی لطافت ہوتی ہے جو مرحلہ ظن کے قیود حرف و صوت سے مکمل طور پر آزاد ہے۔ اس لئے پالیس سالہ مطالعہ و تحقیق کے بعد جو معلومات حاصل ہوئی ہیں ان پر کف افسوس ملنے کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ اپنی معلومات کا دائرہ وسیع کرتے رہنا چاہئے گویا شاہ صاحب نے ”مرزا صاحب“ کے حصول کی طرف اشارہ کیا۔

”شوق پیدا کن تماشاہا تماشا کن دو عالم جلوہ است ولی بصر دشواری بیند  
شوق پیدا کر پھر چاروں طرف تجھے تماشا ہی تماشا دکھائی دیں گے۔ دونوں جہاں ایک جلوہ  
ہے۔ نہ تو اس کا دیدار مشکل سے حاصل ہوتا ہے۔“

بیدل کہتے ہیں کہ اسی مجلس میں ہمارے ان کے بیچ خلوص و محبت کا رشتہ قائم ہو گیا۔ مجلس کے ختم ہونے پر شاہ صاحب نے رخصت ہونا چاہا تو مرزا ظریف نے چند قدم چل کر ان کو رخصت کیا لیکن میں نے ایک طرف ان کے پیچھے لگا رہا آخر ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر فرمایا:

”بہ بیدر یہاں شارسیدہ ایم و نقب نخستیں بہ نہا نخانہ خیال رسانیدہ۔ می باید مارا شریک  
اموال و اشغال خود پندارد۔..... ساقی این بزم در خور حوصلہ مستان نشہ می پیاید و شاہد این محفل  
بانداز طاقت مشاقان نقاب می کشاید۔“ (۲۰۳)

یعنی ہم تو خاص تمہارے درد کا درمان بن کر آئے ہیں ہمیں اپنے حالات و کوائف میں شریک ہو کر ساقی مستوں کے حسب حوصلہ نشہ پیائی کرتا ہے اور اس محفل کا شاہد عاشقوں کے حسب طاقت شہ کشتی کرتا ہے۔

بیدل کے متعلق شاہ صاحب کے ان خیالات کا اگر بغور جائزہ لیجئے تو شاہ صاحب کے ابتدائی خیالات میں جس امر کا دعویٰ کیا گیا تھا وہ پایہ ثبوت کو پہنچتا ہے۔ شاہ صاحب موصوف کی شخصیت کے درد کا درمان تھا جس کو بیدل اندرون قلب محسوس کرتا تھا پر اس کے اسباب کا سراغ اسے نہ تھا۔ دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ اپنے اس بیان ”ساقی این بزم الخ“ کے ذریعے وہ ہماری توجہ بیدل کی طرف مبذول کراتے ہیں کہ بیدل ایک پاکیزہ اور شستہ ادبی ذوق اور ایک غیر معمولی لیاقت کے حامل ہے اس لئے دانشوروں اور عالموں کی صحبت سے وہ دوسروں کی بہ نسبت کہیں زیادہ فائدہ اٹھاتا ہے حتیٰ کہ اس کے ماموں مرزا ظریف بھی بیدل کی فطری استعداد کے مقابلے پر ایک

عام آدمی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے ہیں۔ اس کے بعد خدائے تعالیٰ سے اس کی سعادت کی دعا کرتے ہوئے فرمایا:

”ظرف بخش حوصلہ فطر تھا بکمال مشرب استعدادت رسا ناد، وسعت آغوش آگاہی محیط  
بساط کلی گردانا۔“ (۲۰۳)

یعنی فطری حوصلوں کے ظرف کا عطا کرنے والا خدا تجھے کمال استعداد سے نوازے۔

بیدل کا بیان ہے کہ خاکسار نے بہت سے بزرگوں کی خدمت میں حاضری دی اور بلا تردید ایک کی صحبت سے کچھ نہ کچھ استفادہ کیا اور ہر ایک کی شخصیت نمایاں مقام و مرتبے کی حامل تھی۔ اس باوصف دل میں ایک اضطراب، ایک بیہوشی سی رہتی تھی جو کسی طرح ختم ہونے کو نہیں آتی تھی۔

تمام شوقم لیک غافل کہ دل براہ کہ می خرامد جگر بدایغ کہ می نشید، نفس باہیکہ فی فہم  
[بن کے سراپا شوق نہیں جانتے ہیں ہم جاتا ہے دل کدھر کو نہیں جانتے ہیں ہم  
ہے داغ کیا جگر میں نہیں جانتے ہم لیتے ہیں سانس، آہ نہیں جانتے ہیں ہم  
ہم سراپا شوق بنے بیٹھے ہیں پر معلوم نہیں کہ دل کس کے راستے پر گامزن ہے جگر کس  
محبت میں داغدار اور سانس کس کی آہ میں گرم رفتار ہے۔

شاہ صاحب سے ملاقات کے بعد دل کی وہ گتھی جو سالوں سے الجھی پڑی تھی، سلجھی اور نکل  
معارف میں سرگردان طبیعت کو آسودگی نصیب ہوئی۔

مجلہ ”دانش“ اسلام آباد شمارہ ۵۰ و ۵۱ میں ”میکدہ محبت“ کے نام سے ایک قلمی رسالہ شائع  
ہے۔ اس کے مصنف محمد قاسم ساکن اوڈیسہ کلک ہیں اور محمد حسین تسبیح کی تصحیح و اہتمام سے چھاپا۔  
رسالے کے آخری کلمات درج ذیل ہیں:

”این چند کلمہ حسب الارشاد نواب معلی القاب خاندوران غفر اللہ ذنوبہ در اسولہ خلوت در  
انجمن، سفر در وطن، ہوش در دم، نظر بر قدم نوشتہ شد در ملک ادیسہ شہر کلک۔ کترین اہل اللہ  
محمد قاسم نامہ سیاہ۔ نام ایں اجزاء ”میکدہ محبت“ نہادہ شد۔ تحریر فی التاریخ غرہ ذی الحجہ  
۱۰۷۷ھ۔“ (۲۰۵)

یعنی نواب معلی القاب (محمود) خاندوران کے حسب فرمایش ”خلوت در انجمن، سفر در وطن، ہوش در دم، نظر بر قدم“ کے بارے میں پوچھے گئے سوالات کے جواب کے طور پر ملک اوڈیسہ  
کلک میں یہ چند الفاظ لکھے گئے۔ کترین اہل اللہ محمد قاسم اس رسالے کا نام ”میکدہ محبت“ رکھا ہے۔  
غرہ ذی الحجہ ۱۰۷۷ھ۔

محمد خان دوران سے تعلق اور شہر کلک میں ۱۰۷۷ھ ہجری میں قیام یہ دو باتیں ایسی ہیں جن  
سے واضح ہوتا ہے کہ یہ محمد قاسم وہی ہیں جن کو بیدل ”شاہ قاسم ہوالہی“ سے تعبیر کرتا ہے کیونکہ بیدل  
۱۰۷۷ھ ہجری میں کلک کو خیر باد کہا ہے اور ۱۰۷۷ھ تا ۱۰۷۸ھ اپنے تین سالہ قیام کے دوران اس کی  
مستفادہ کے دوران محمود خان دوران کی شاہ صاحب سے ارادت کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

اس رسالے کا موضوع عشق الہی اور عرفان و سلوک ہے۔ شاہ صاحب نے قرآن و احادیث  
میں سے مولوی اور عراقی وغیرہ بہت سے مشہور اور غیر مشہور شاعروں کے کلام سے اس موضوع پر  
کئی کئی اشعار جمع کیے ہیں جو ان کے وسعت معلومات کے ساتھ سادہ اور شیریں انداز بیان پر غیر معمولی قدرت کی  
شہادت ہے۔ خصوصاً قرآنی آیات کا اپنے دعاوی کی تائید میں دھڑلے سے استعمال کرنا قرآن پاک  
کے بار کی نشاندہی کرتا ہے اور اس جگہ ہمیں بیدل کے بیان سے اتفاق کرنا پڑتا ہے۔

شاہ صاحب کی نثر کا کچھ نمونہ برکت کے لئے لکھا جاتا ہے:

”اے خلاصہ آفرینش! امت بلند را کار فرما، و سکہ طلب را در توبہ عشق و محبت بہ آتش  
”العشق نار بحرق ما سوی اللہ“ بگذاز و خالص کن تا شاید ”مہر“ یحیہم  
”بحبہ“ گردد، و در بازار ”ان اللہ اشتري من المومنین“ کہ حق تعالیٰ خرید  
”بشہ“ اور ارزشی قیمتی بہ ہم رسد و بدان سرمایہ توانی کہ بضاعت دین خالص کہ ”الا للہ  
”البن الخالص“ را شاید شوی، شاید کہ مرزی از عاشقان و عارفان و سونچگان و جان  
”انگن و شیران و مبارزان راہ محبت کہ“ ”والمخلصون علی خطر عظیم“ طفرای  
”این است بر تو بکشاید و از لوازم“ ”اللہ نور السموات والارض“ ویتجلی ربنا  
”ما حک“، ”و نحن اقرب الیہ من حبل الوريد“ ”وان رحمة اللہ قریب من  
”المحبین“ ”و عینا یشرّب بہا المقربون“ ”فاذکرونی اذکرکم“ ”واللہ  
”بدعوا الی دار السلام“ ”اللہ لطیف بعبادہ“ ”وان اللہ لغنی عن العلمین“ ”و  
”اللہ غفور رحیم“ ”واللہ یحب التوابین، و تعز من تشاء، فکشفنا عنک  
”خطائک“ ”واللہ بکل شئی مُحیط، ان اللہ خلق آدم علی صورته“، ”انسان  
”سبحان ربہ، و فی انفسکم افلا تبصرون، فانما تلو افنم وجہ اللہ، و هو معکم  
”ایستکنتم، قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحبکم اللہ، قد جاء الحق  
”واللہ الباطل، ولقد کرمنا بنی آدم کہ اشارت، و در حق انسان است بہرہ مند گردی  
”اعمال بہا بنی“

اس غیر معمولی تعلق کے پیش نظر جو ایک کو دوسرے کے ساتھ تھا، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ صاحب کی صحبت سے بیدل کے استفادے کا تفصیلی ذکر کیا جائے تاکہ بیدل کی شخصیت کی بہ قول "غمدی" پوری طرح واضح ہو جائے لیکن اس سے پہلے دوائے واقعات کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جن میں سے ہر ایک بیدل کی مخفی صلاحیت کو اجاگر کرتا ہے نیز اس کی مستقبل کی تعین اور وقت کی تشخیص کرتا ہے۔

بیدل کا بیان ہے کہ ایک دن ہم لوگ شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر تھے کہ اُن کے بھائی صاحب نے شاہ صاحب سے عرض کیا۔

"اگر اس قسم قابل، یہ صحبت ارشاد منقبت بار قبولیت یابد، بعید نیست کہ ہلال فطرتش بہ کثر  
نہی عروج کمال گیرد"۔ (۲۰۹)

اس قسم کا جو ہر قابل اگر جناب عالی کی صحبت ارشاد منقبت میں باریاب ہوتا رہے تو کچھ بعید نہیں کہ ہلال فطرت کم سے کم وقت میں اوج کمال پر پہنچ جائے۔ شاہ صاحب نے جواب دیا:

"و از آن طایفہ ایست کہ از لا با فضل حقیقی جو شیدہ اند و ابد احوالشان در تنق انوار غیب  
پوشیدہ۔ تربیت مائل لہما باطن اسرار نبویست، و اعانت شامل ایشان حقیقت انوار ولایت،  
و عارف علیہم از آئینہ ظہور شان جلوہ فرما۔ و ہم لایحزون از سیمای طینت شان  
چشم کشا۔ بار بار استفادہ طرفین و دلیعت ہم ہم سپردست و بہ استعانت یکدیگر سعی استکمال  
پیش بردن"۔ (۲۱۰)

یعنی بیدل کا تعلق ایسے لوگوں سے ہے فضل حقیقی جن کا روز ازل سے معاون رہا ہے اور آئندہ اس سے کیا کیا ہوش و عقل کی باتیں نمایاں ہو گئیں ہنوز پردہ غیب میں ہیں۔ اس کا ذاتی رجحان نبوی ہے۔ صاحب کی طرف ہے اس لئے امید ہے کہ ایک دن وہ اپنی مخصوص منزل پر پہنچے گا۔ انہیں اس کی بنا پر ہم دونوں ایک دوسرے سے استفادہ کریں گے اور جو امانت ہمارے پاس ہے ایک دوسرے کو سپرد کریں گے خصوصاً اس کی تجسس طبعیت اور حقیقت جو ذوق اس قدر قابل تعریف ہے کہ ایک ایک امر اسے منزل تک پہنچا کر دم لے لے گا۔

ہر کرا کہ شوق باشد رہبری درکار نیست

(ہو شوق جسے بے حد حاجت نہیں رہبری کی)

اس واقعہ یہ ہے کہ ایک دن مرزا ظریف نے ازراہ شفقت شاہ صاحب سے بیدل کی خدمت میں شکوہ کرتے ہوئے عرض کیا۔

چو آدم را فرستادیم بیرون جمال خویش بر صحرا نہادیم  
نہ مسجود ملائیک آدم آمد کہ نور پاک در وی بود مدغم (۲۰۶)  
اس بنا پر بے جا نہ ہوگا اگر بیدل اپنی روحانی اور علمی پیشرفت کو شاہ صاحب موصوف کی توجہ اور توجہ کامرہوں قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے:

در عالمی کہ با خود رنگی نبود مارا بودیم انچہ بودیم او و نمود مارا  
(ایسی صورت میں جبکہ ہمارا اپنا کوئی رنگ نہیں تھا (ہمارے قلب و دماغ پر کوئی چھاپ نہ تھی) ہم جو کچھ بھی رہے ہوں انہوں نے ہماری شخصیت کو نکھارا۔

مرآت معنی ماچوں سایہ داشت رنگی خورشید التفاتش از ما ز دود مارا  
ہمارا آئینہ معنی سایے کی طرح سیاہ رنگ تھا ان کے آفتاب توجہ نے ہم سے ہمارے رنگ کو دور  
پرواز فطرت ما در دام بال می زد آزاد کرد فطرتش از ہر قیود مارا (۲۰۷)  
ہماری پرواز فطرت پھندے میں گرفتار ہو کر پر پھڑ پھڑا رہی تھی ان کی عنایتوں اور مہربانیوں نے ہمیں ہر قسم کے قید و بند سے آزاد کر دیا۔

ان اشعار خصوصاً مصرع "بودیم آنچہ بودیم او و نمود مارا" کی اساس پر کہا جاسکتا ہے کہ بیدل کی شخصیت کی تعمیر، اس کی فکری و روحانی ارتقاء کے سفر میں بلکہ کہنا چاہئے بیدل کو بیدل بنانے میں شاہ قاسم ہوا لہجی کا بڑا اہم رول رہا ہے۔ اس اعتراف کے باوجود کہ ہر ایک بزرگ جن سے اس کی ملاقات ہوئی اُس کی شخصیت کی تعمیر اور اس کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں غیر فانی رول رہا ہے، شاہ قاسم صاحب کا رول سب سے زیادہ اہم رہا ہے۔ اسی وجہ سے وہ شاہ صاحب سے زیادہ نیاز مندی اور احسان شناسی سے بھرے جذبات کا اظہار اس طرح کرتا ہے:

"ہر گاہ زبان بنامش کشودہ ام، صیت شہیر جبرئیل مقیم پردہ گوش است و ہر جافلس بیادش کشیدہ  
ام، نسیم وادی ایمن، عطر دماغ ہوش۔ تسلیم حقوق آستانش را، با سر نوشت اعتقاد بیدل بستی  
است کہ نشانان جہہ باقی است، چون سجدہ حق از واجبات فرض شمارد۔ و تسبیح تہیہ شائش را، بر  
زبان شکر بیان نرود یعنی کہ تافلس نقد کیسہ زندگیت، بلوازم ادای فرض سر بر نیارڈ"۔ (۲۰۸)

جب بھی زبان پر ان کا نام نامی آیا شہیر جبرئیل کی آہٹ بھی پردہ گوش میں سمٹ کر رہ گئی۔ جب بھی ان کی یاد میں سانس لیا وادی ایمن کی بانسیم دماغ ہوش کا عطر بنی۔ ان کے حقوق آستانہ۔ آداب و تسلیم کو بیدل کی ارادت کے ساتھ ایک خاص نسبت ہے کہ پیشانی کا نشان جب تک بال۔ سجدہ حق کی طرح اسے مجملہ فرائض زندگی تصور کرتا ہے۔

”این زیانکار نقد آگهی نامکن است بانی معرفتی چند که متلبس فرقه تقلید اند، می جوشد و یکمان سودی که جز خسران متصور نیست، در تفضیع اوقات می کوشد بآنکه اینجا عرفای محفل یقین، از سطرنگاهی، درس معنی بکمال می رساند۔ و کملائی مدرسه تحقیق، به نقطه اشارتی، از سبق ماسوی ورق می گرداند۔ کم وقتی است که کسب این سعادتش اتفاق افتد۔ و یا مطالعه این فیض بتالی بکشد۔ اگر بهره از شعور داشته باشد، می باید دامن فرصت از دست نکند۔ و بی حضور این دولت عظمی، نفسی بر نیارد۔ در خانه آفتاب، به پرتو چراغ پرداختن چند رنجت نور نیست۔ و در کنار محیط، بخال سراب، چشم بافتن، چه مقدار انفعال۔ از بصیرت دوری۔ تفسیر التزام این شیوه، بجز نوحه محرومی چه خواهد بود و شرح اقدام این عمل، غیر از شکوه بی نصیبی چه می توان نمود۔“ (۲۱۱)

یعنی نقد علم و آگهی کا یہ زیانکار خریدار چند بے علم اور جاہلوں کی رفاقت میں جو فرقہ تقلید لباس سے آراستہ ہیں (بھیس فقیروں کا بنائے ہوئے ہیں) ممکن نہیں کچھ حاصل کر سکے جہاں فائدہ کے گمان میں گھائے کے سوا کوئی چیز اس کے ہاتھ نہیں لگ سکتی اور اس طرح اوقات عزیز کو رائی کر رہا ہے حالانکہ یہاں محفل یقین کے ایسے عرفا موجود ہیں جو اپنی ایک نگاہ سے معنی کمال کا درس دیتے ہیں اور مدرسہ تحقیق کے ایسے کالمیں موجود ہیں جو ایک نقطہ اشارہ سے ماسوی کا سبق پڑھاتے ہیں سعادت اتفاق ہی سے حاصل ہوتی ہے اور اگر اسے ذرا بھی شعور ہو تو فرصت کا دامن اسے ہاتھ نہیں دینا چاہئے عظیم دولت کو حاصل کئے بغیر اسے چین نہیں ملنی چاہئے۔ آفتاب کی موجودگی چراغ کی روشنی کی طرف متوجہ ہونا نور کی بے حرمتی ہے اور سمندر کے پڑوس میں رہ کر سراب کے گمان میں نگاہیں بند رکھنی شرمندگی کی بات ہے۔

اس شکایت کے لب و لہجہ سے ایسا لگتا ہے کہ علم و دانش کے حصول میں بیدل حقیقی بزرگوں کی صحبت سے زیادہ ایسے درویشوں کی صحبت میں نشست و برخاست رکھتا تھا جو محض صورت عالم اور بزرگ تھے حتی کہ شاہ قاسم ہولالمی جیسے عظیم عالم فاضل اور بزرگ اوڈیہ تشریف لائے بیدل نے ان بزرگ فقیروں کی صحبت مکمل طور پر ترک نہیں کی تھی۔ اسی بنا پر مرزا ظریف نے شاہ صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ فائدے کی امید میں یہ ہر کس و ناکس کے پیچھے سرگرداں رہتا ہے۔ جبکہ آپ جیسا کہ خدا شناس یہاں فروکش ہے اور خدمت میں حاضر باشی کے ذریعہ وہ زیادہ سے زیادہ علم کی دولت مالا مال ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس کی کوششوں کا حاصل نصیب اوقات کے سوا کیا ہے۔

شاہ صاحب نے جواب دیا:

”و اما از سطر لہلال، عرض نسخہ کمال نباید خواست، و بر رویہ نہال دامن گلچینی نشاید آراست۔ در آئینہ ظہور انسان کہ تجلی گاہ مراتب اسرار است و مظہر امور افعال و آثار، اظہار بر سنی متعلق آئی است۔ وکل کردن ہر رنگی موقوف زمانی، اما پوشیدہ نیست کہ بنای فطرت این نقش بنیاد، بکمال متانت و استواری۔ و بساط این خاکسار نژاد، در نہایت صافی و ہمواری۔ اما جوانی متعفی بی پروا نیست۔ گدازشکی مستلزم رسائی۔ امید کہ آتش کج وضعی، تغییر جمعیت نہ بیند و اشغالتش در پیچ حلقی، تہمت غفلت نخیزد، دماغ از ادیش، سر خوش جرعہ ذوقیت، زانی نشاء دو بالائی ساز بی تعینش، سیر آہنگ زمزمہ شوقی، مژدہ اقبال عروج نوای۔“ (۲۱۲)

یعنی ایک عقلمند آدمی کو ہلال سے بدر کمال کی توقع نہیں رکھنی چاہئے اور ایک ننھے پودے سے ہلال کی امید رکھنی فضول ہے۔ انسان کا آئینہ ظہور جو مختلف اسرار و رموز کی تجلی گاہ ہے اس میں ہر صفت کا ایک مخصوص وقت سے وابستہ ہے لیکن یہ بات بھی صیغہ راز میں نہیں ہے کہ اس نقش بنیاد (بیدل) کی اس فطرت انتہائی متانت اور استواری پر قائم ہے لیکن بے اعتنائی جوانی کا تقاضا ہے اور منزل رسائی کے لئے اسے نظر انداز اور درگزر کرنا ضروری ہے۔ امید ہے اس کا وقت کسی بھی طرح نہ گزرنے سے نہیں گزرے گا۔ اس کی آزاد نشی نے جرعہ ذوق سے مست ہو کر نشے کو دو بالا کر دیا ہے۔ شاہ صاحب کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ بیدل اگرچہ لا پرواہی اور آزاد نشی سے کام لے رہا ہے مگر یہ جوانی کا تقاضا ہے اس لئے یہ قابل درگزر ہے اس کی جس سوجھ بوجھ کا میں نے مشاہد کیا اس کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ اس کے اندر اعلیٰ درجے کی متانت اور استواری ہے علاوہ ازیں انسان جو عظیم واقعات کے رموز کا مظہر ہے اس لئے ہر رموز کا ظہور ایک مخصوص وقت سے وابستہ ہے۔

بیدل کا بیان ہے کہ ادھر دونوں کا سلسلہ گفتگو جاری تھا اور میرا حال یہ تھا کہ میں سر جھکائے بیٹھا تھا نہ تو پلک جھپکا سکتا تھا اور نہ لب کشائی کی جرأت کر سکتا تھا۔ درحقیقت ایک عجب منظر تھا۔

گرم طعن و محرماں مست ثنا من ہماں آئینہ حیرت پرستہای خولیش  
خاف لوگ لعن طعن کرنے میں لگے تھے اور محرم حضرات میری تعریف کرتے نہیں تھتے تھے میں  
اپنی حیرت کا آئینہ بنا ہوا تھا۔

مرزا ظریف جب مجلس سے رخصت ہو گئے تو شاہ صاحب نے بیدل کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا:  
”ای باب محبوب قباب عزت! نگاہ ظاہر بینان، در تمیز کیفیت احوالت، غبار آلود کلفت نا  
آہست۔ و ہم لفظ آشنایان، بدرک معنی اسرار، پیاپیہ عجز و نارسائی۔ کسوتی نہ پوشیدہ ای کہ

چشم ہرکس، نقاب یقین کشاید۔ ویرنگی نہ جوشیدہ ای کہ امتیاز ہا از عہدہ تحقیق بر آید۔ جائیکہ آفتاب آئینہ ماہ پرداز دزد، دیدہ ہا ناچار حیرت نگاہست۔ و ہر جالہ انوار قرب، بساط دور بینی چند، تصور ہا ناگزیر شبہ سیاہی۔ اگر طبایع، بکنہ اوضاع و ارسد، جای اعتقاد است، نہ محل فضولی ارشاد۔ و اگر ہوشہا، بر مزاطوارت پی برد، عالم تسلیم است، نہ گستاخیہای تعلیم۔ میرزا را در ہمہ معذور باید داشت۔ و رقم کدورتی، بر صفحہ خیال نباید نگاشت۔ اینجا سعی نا صبح، باعتبار خود، مصروف ترغیب کماست۔ و منظور معلم، تہذیب اخلاق و احوال، ہر گاہ معنی و مدعا، مشعر حقیقت اخلاص باشد، بنا بر بولی الفاظ نباید رنجید۔ و ہر جا حاصل جست و جوا، غیر از وصول مقصد مقصود نیست از لغزش رفتار مخرف نباید گردید۔“ (۲۱۳)

اے قباب عزت میں پوشیدہ حجاب اظہار بین حضرات کی نگاہ تیرے حالات اور کیفیات اندازہ لگانے میں کلفت نا آشنائی سے غبار آلودہ ہے۔ اور لفظ آشنا حضرات کی فہم تیرے اسرار معانی درک کرنے میں بے بس ہے۔ تو نے ایسا کوئی لباس زیب تن نہیں کیا ہے جو ہر کس و ناکس کی نگاہ یقین کو بے نقاب کرے۔

اس تسلی آمیز جواب سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیدل کافی سوجھ بوجھ کا حامل تھا۔ شاہ صاحب اپنی ایمانی فراست سے اس کا اچھی طرح اندازہ لگالیا تھا مگر مرزا ظریف باوجود یکہ ایک تہیہ تھے، بیدل کی پوشیدہ لیاقتوں کا سراغ لگانے میں ناکام رہے۔ اسی وجہ سے شاہ صاحب نے ان کے نام تر علم و دانش کے باوجود انہیں ”ظاہر ہیں“ سے تعبیر کیا اور بیدل کو نصیحت کی کہ ان کی ناصحانہ اور تلخ کلامی سے متاثر نہ ہونیز ان کے بارے میں کسی قسم کی کوئی کدورت دل میں راہ نہ دے۔

ایسی محفلیں جن میں شاہ صاحب شریک ہوتے اور بیدل ان سے استفادہ کرتا گاہے گاہے منعقد ہوتی تھیں اور وہ بھی گھنٹے دو گھنٹے تک جاری رہتی تھیں، ان مجلسوں میں شاہ صاحب کی توجہ و توجہ کی بہ نسبت بیدل پر زیادہ رہا کرتی تھی۔ ان مجالس میں اگر کبھی کوئی نثر پارہ یا نظم بیدل کے طبع موزوں سے تراوش کرتی تو اصلاح کی خاطر وہ اسے شاہ صاحب کی خدمت میں پیش کرتا اور شاہ صاحب ذیل الفاظ سے اس کی غیر معمولی حوصلہ افزائی فرماتے تھے:

”شعر موزونی ذاتی ازین کلام سرخوش پیام روشن است و معنی تلامذہ الرحمن ازین مقالات شوق آیات مبرہن“ (۲۱۴)

یعنی اس کلام سرخوش پیام سے ذاتی موزونی طبع عیاں ہے اور ان مقالات شوق آیات تلامذہ الرحمن کا مفہوم واضح ہے۔

مطلب یہ ہے کہ قرآن پاک میں شاعروں کو شتر بے مہار سے تعبیر کر کے ان کے قول و عمل میں خصوصیت بیان کی گئی ہے مگر ایمان و عمل سے آراستہ شاعروں کو ان سے مستثنی رکھا گیا ہے، ان تلامذہ الرحمن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پس بیدل کا تعلق بھی یہ قول شاہ صاحب اسی طبقے سے ہے۔ شاہ صاحب نہ صرف یہ کہ اس کی منظوم و منشور تخلیقات کی تعریف کرتے تھے بلکہ اس کے کیفیات کو بھی ”آزادگی“ اور ”بے نیازی“ کی خصوصیات سے منصف کرتے تھے۔

”در ضمن این الطاف، اوضاع این گرفتار، بحر سلسلہ تحیر را بہ آزادی می ستود“ (۲۱۵)

شاہ صاحب کے بارے میں بیدل کے بیانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ موصوف بہ جامع شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی زندگی کے گونا گوں پہلو بتاتے ہیں کہ بلند عارفانہ مقام پر فائز ہونے کے علاوہ صرف فحی و صنایع و بدایع، شعر و ادب، تفسیر و حدیث اور الہیات و غیرہ موضوعات میں مہارت حاصل تھا اور جس موضوع پر بولتے یا بحث کرتے ایسا لگتا کہ اسے اوج کمال پر پہنچا دیا ہے۔ ان کی بیہوشی کی صحبت سے بیدل کا استفادہ دوسرے بزرگوں کی بہ نسبت کثرت اور کیفیت دونوں کے ساتھ زیادہ رہا ہے۔ ان کے چند کرامات اور اپنے بعض استفادے کا تذکرہ کرنے کے بعد بیدل کے شاہ صاحب کے مناقب اتنے زیادہ ہیں کہ رشتہ تحریر میں نہیں لائے جاسکتے۔

”و اما مناقبش بی پایاں تر از آنت کہ بہ سعی خامہ فطرت در نگارش آن توان پرداخت ...“

”بہ تفصیل می کوشید فر صہا تحمل نمی کرد و اگر بہ بست می پرداخت اندیشہ رنگ و سعت می

بخت“ (۲۱۶)

ان کے مناقب کا لامحدود دفتر اس سے کہیں زیادہ ہے کہ خامہ فطرت کی کوشش سے ان کو دائرہ کار میں لایا جاسکے اس کی تفصیلات اگر بیان کرنا شروع کریں تو فرصت میں اس کی سکت نہیں اور اگر اسے کام لیا جائے تو قوت فکر یہ وسعت کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔

اسی بنا پر جیسا کہ عرض کیا گیا شاہ قاسم ہوالہی کا بیدل کی روحانی ارتقا، فکری بالیدگی اور شخصیت سازی میں اہم رول رہا ہے۔ خصوصاً شاہ صاحب کی مسلسل حوصلہ افزائیاں بیدل کی پوشیدہ صلاحیتوں کو نکالنے کے لئے بڑی معاون ثابت ہوئی ہیں۔ مختلف واقعات کے ضمن میں جو اہم نکات اس کے بارے میں درج ہوئے ہیں ان سے برآمد کئے وہ ہر چیز سے کہیں زیادہ ہمارے لئے قابل قدر ہیں۔ شاہ صاحب اس قسم کے بعض وہ واقعات بیان کئے جاتے ہیں جو شاہ صاحب کے روحانی مقام و مرتبہ کے لحاظ سے نیز ان نتائج کے لحاظ سے جو ان سے برآمد ہوئے اہمیت کے حامل ہیں۔

## خان دوران محمود کی بیماری کا واقعہ:

بیدل جب مرزا ظریف کے ہمراہ اوڑیسہ پہنچا تو وہاں کا صوبیدار خان دوران سید محمود کٹک میں اپنے قیام کے دوران سید محمود کو ایک بیماری لاحق ہوئی جسے طبی اصطلاح میں ”داء السب“ کہتے ہیں اس بیماری میں بال گردنے لگتے ہیں، اسے بال خورہ بھی کہتے ہیں۔ اس کا زہریلہ ناخنوں تک سرایت کر گیا تھا اور اس کا پورا جسم اس سے متاثر ہو گیا تھا۔ اطباء کی طرف جس قدر رجوع حاصل ثابت ہوتا تھا۔ معالج سے مایوس ہو کر مجبوراً اس نے اہل قبور اور بزرگان دین کی طرف رجوع کرنا شروع کیا۔ اس سلسلے میں اس نے بارہا حضرت شاہ صاحب سے بھی دعا کی درخواست کی تھی نہ کسی وجہ سے اس کی درخواست ثلثی رہی بلکہ کہنا چاہئے ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے اور وہ وقت آیا تھا، آخر ایک دن مرزا ظریف نے شاہ صاحب سے اس کے لئے سفارش کی۔ شاہ صاحب نے اس کی درخواست قبول کی اور اس سے ملنے کے لئے روانہ ہوئے۔ جونہی خان دوران کے گھر میں تمام حاضرین نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا لیکن خان دوران اپنی علالت کی وجہ سے کمرے میں استقبال نہ کر سکا بلکہ نحیف اور غم زدہ آواز میں تسلیم بجالایا اور بڑی مشکل سے سر تک ہاتھ لے جا کر حال سے کہا۔

براہت مرده ام اما زیارت خانہ خاتم  
تو می آئی ومن آسودہ آتش

شاہ قاسم نے جواب دیا:

”ما از تو چندین سال کلفت برداشتم، تا ساعتی بجمعیت خاطر بیاسائی۔ ہر گاہ ماموران عالم قدرت، بار دوش ناتوانی بری گیرند، مدعا راحت اوست، نہ تعظیم فرمائی، تشویش و تردید این زمان، تمکین طراز مسند گوہر مشاہدہ گردانست۔ و آشتی انفس، بعد ازین، مصرف شیرازہ پیرای دل، بمطالعہ آوردنی۔“ (۲۱۷)

ہم نے کئی سال تمہارے لئے دعائیں کیں کہ کسی طرح تم کو سکون قلب اور اجتماعی نصیب خدا کے مامورین حضرات جب کبھی کسی ناتواں کے کاندھے کا بوجھ اپنے سر لیتے ہیں تو تمہارا ناتوانوں کی راحت رسانی ہوتی ہے۔ اپنی تعظیم و تکریم کرائی نہیں۔ خوشخبری ہو کہ تمہارے ناخوش حالات اب تم سے رخصت ہوتے ہیں۔

گر فلک صد در تشویش برویت واداشت  
مژدہ ات باد کہ یکبارہ فرازش کرد  
اتفاق سے وہاں موجود حاضرین میں اسد نام کا ایک ندیم بھی تھا۔ وہ ہمیشہ شراب پی کر مست رہا کرتا تھا۔ ان الفاظ کو شاہ صاحب کی زبان سے سنتے ہی آگ بگولہ ہو گیا اور لاجول پڑھتا ہوا

دعا لیاں دیتا ہو بولا:

”اگر کو نیت در مزاج ارباب دل مضرب باشد با پھو خود ستایان معتقدانہ پیش نیاند۔ و با این قسم بسر و پایان طریق حلق نہ پیناند۔ اختیار عزلت، کمینہ گاہ امید یست کہ ثقیب اشتہارش، در مجلس صاحب دولتی راہ تزویر و انما بند و بہ افسون ساختہ چند، دفتر عرض خوارق و کرامات دیند بی صرفہ گویمہا باین مرتبہ کہ شکل خان دوران را بگویند کہ، ترانجات بخشدہ ایم۔“ (۲۱۸)

اسد کو شاہ صاحب پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ ان گوشہ نشین حضرات کا گوشہ نشینی سے فائدہ نہ رہتا۔ انہ کی وہ توقعات ہیں جو منصب داروں سے ان کو وابستہ ہوتی ہیں۔ اپنے کرامات کے لئے جس قدر حقیقت جادو سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے، وہ امیروں کے دل میں اپنی جگہ بناتے ہیں بیدل نے اس کے پاس کر لکھا ہے کہ جیسا کہ اس طبقے سے امید کی جاتی ہے اسی قسم کی اور بدکلامی بھی اس نے کی۔ اس حالت میں وہ اپنے گھر لوٹ رہا تھا۔ جونہی اس کی پاکی دروازہ شہر کے پاس پہنچی ایک بجلی سی لگی۔ زمین لرز اٹھی، پاکی پلٹ گئی، جو لوگ پاکی کو لے جا رہے تھے اس خیال سے کہ شاید دروازہ کھلے۔ مگر پرتو نہیں گر رہا ہے ہوش و حواس کھو بیٹھے کچھ دیر بعد جب ہوش آیا تو اسد کی تلاش شروع کی۔ پاکی پاکی میں نہ تھا۔ ان کو حیرت ہوئی، آخر کافی تلاش و جستجو کے بعد اسے اس پل کے نیچے پایا۔ اس کی غلاظت بھیٹکی جاتی تھی۔ وہاں وہ برہنہ سر، سو جے ہوئے چہرے اور غلاظت سے لت پت ہوا۔ اس نے غلاظت میں غوطہ خوری کرایا ہو۔ غرض اس کا پورا پیکر خاکی عذاب کا شکار تھا۔ ان لوگوں نے خیال کیا شاید اس نے شراب کچھ زیادہ پی لی ہے اس لئے بیہوش ہو گیا۔ اس نے پیدل اور پاکی میں فرق نہیں کر سکا۔ باوجودیکہ اسے صاف ستھرا کرنے میں انہوں نے کوئی کسر نہ کی۔ چہرہ اس کے چہرے کی سیاہی ناپید نہ ہو سکی۔ اور اس کی زبان کھولنے کی جتنی کوشش کی گئی اس کی زبان میں اضافہ ہوتا گیا۔ بہت زیادہ پوچھ گچھ کرنے پر صرف لفظ عو، اس کی زبان سے نکلتا۔ اس کی مناسبت سے بیدل نے چند اشعار بھی کہے ہیں جن میں اس عذاب کا سبب اس نے ایک شعر میں انکار قرار دیا ہے۔

عمر شان کامل ہر کجا آید بچشم  
بی تامل شد یقین سگ بود یا خبر بودہ است  
انسان کامل کا منکر جہاں کہیں نظر آیا بلا تامل مجھے یقین ہو گیا کہ وہ یا کتا ہے یا گدھا ہے۔

اسد ہم جنس نتوان یافتن بوی حسد  
طبعہای مختلف، از ہم مکرر بودہ است  
کیونکہ ہم جنسوں میں حسد کی بوباس نہیں ہوتی ہے مختلف افتاد طبع کے حامل لوگوں میں ہی حسد ہوتا ہے۔



ڈاکٹر سید احسن الظفر

تجویز کی ہے اور اس کا علاج شراب کے چند جام سے تجویز کی ہے۔ اس تجویز پر عمل کرتے ہی موت اور غرغر کرتا ہوا وہ اس دنیا سے کوچ کر گیا۔

واقعہ کے بعد شاہ صاحب نے فرمایا کہ جب کبھی کوئی افسر یا حاکم علاقے کے نظم و ضبط پر ہے تو اس کا پہلا فرض یہ ہوتا ہے کہ سانج کے مختلف افراد کے درمیان عدل و انصاف اور امن و امان کے لئے مقصد کے لئے ضروری ہے کہ جن کا وجود معاشرے میں بد امنی کا سبب ہو ان کو دبا جائے آج یہ کام میرے سپرد ہوا ہے۔

... فی الحال چاؤشان بارگاہ قضا، باین تاکید حکم در داده اند و قدر اندازان عرصہ تقدیر، باین

دک ششت انتقام کشاوه که جان بی ایمانش، پهمان بی اعتدالی مستی قبض گردانند و به

خطیب گاہ اغلال و سلاسل مالک رسانند (۲۲۱)

شاہ صاحب کی گفتگو سے ایسا استنباط ہوتا ہے کہ ان کا تعلق ابدال سے تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت ان بزرگوں سے وابستہ ہے جو غوث، قطب اور ابدال وغیرہ ناموں سے مشہور ہیں۔ ان ستر کے قریب ہوتی ہے، چالیس شام میں رہتے ہیں اور تیس دوسرے مقامات میں جب ان کے دل اس دنیا سے کوچ کرتا ہے تو دوسرا آدمی اس کی جگہ منتخب کیا جاتا ہے۔ (۲۲۲) اس لئے تعجب نہ ہو کہ جب بھی انہیں روحانی شخصیتوں میں ہوں جن کو اس زمانے میں اڑیہ کی حکومت ملی ہوئی ہے علاوہ حدیث صحیح میں آیا ہے کہ امت محمدیہ میں سداً تقریباً چھ سو ابدال رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے بہت خوش نصیب تھا کہ اس کو ایسی روحانی شخصیت کی رفاقت نصیب ہوئی۔

جستے لوگوں کو اس واقعہ پر اعتراض ہے۔ اور بیدل کو دروغگو کہتے ہیں لیکن بیدل نے شروع میں جواب دے دیا ہے کہ یہ میری آپ بیتی ہے میں کسی سے زبردستی منوانا نہیں چاہتا ہوں۔

بہارِ نبویؐ میں از مطلب بے نیاز افتادہ است بر حریفان گر نخواہم انقدر ہا فرض نیست  
بہارِ نبویؐ میں نے موقعہ کی مناسبت سے حضرات انبیاء و اولیاء اور ان کے معجزات و کرامات کی  
تفصیل روشنی ڈالی ہے یہ بحث دلچسپ بھی ہے اور وضاحت طلب بھی۔

### کیمیاہر گیلانی کا واقعہ:

دنوں بعد ایک اور واقعہ پیش آیا۔ ایک دن شاہ قاسم مرزا ظریف کے گھر تشریف لائے۔

علت اضراد خلق او ج و حسیض فطرتست زین سببها بولہب حصم سیمیر بودہ است  
مخلوق کے تضاد کا باعث انسانی فطرت کی پستی و بلندی ہے اسی وجہ سے ابولکب پیغمبر کا دل  
اسد کے انجام کی خبر جب ان لوگوں کو معلوم ہوئی جو خان دوران کے حاشیہ نشین تھے تو  
یقین ہو گیا کہ یہ عذاب درحقیقت اسی گستاخی کا نتیجہ ہے جو اس درویش کے ساتھ اس نے کیا تھا  
واقعہ کے رونما ہونے سے قبل شاہ صاحب، مرزا ظریف اور بیدل کے ہمراہ اپنے گھر لوٹ پہنچے  
لیکن ابھی لوگ ایک دوسرے سے رخصت نہیں ہوئے تھے کہ خان دوران نے ایک آدمی شاہ صاحب  
خدمت میں روانہ کیا اور ان الفاظ میں اس کی طرف سے معذرت چاہی کہ ایک عرصہ سے  
خاکسار کی صحبت میں رہا ہے اور حضرت کے روحانی مقام سے لاعلمی کے سبب وہ گستاخی کر رہا ہے  
جبکہ وہ اس کی وجہ سے موت کے آستانے پر پہنچ چکا ہے اس کی طرف سے معذرت چاہتا ہوں“

دریا دلاں کہ سینہ بگوہر جلاں ہند خاشاک را چو گل بسر خویش  
اس خوشامد آنہ گفتگو کون کر شاہ صاحب چیں بہ جیں ہو گئے اور ان کے چہرے پر  
آثار نمایاں ہو گئے۔ انہوں نے فرمایا:

”بیخودان محفل غنما فارغند از اندیشه فخریکه خلق مجهول بہ نیکی شاں بستانند و مقیمان گوشہ فنا،

آزادند از تو هم پیشگی که هر زره درایان، بعرض بدی ایشان غلو نمایند۔ اما غیرت معنی، رعایت

پرور ناموس این طایفه است، روانی دارد که هر پیاکی، کمر بخواری و نارسائی شان بر بندد.

وز لقلقه زبان، عذریکه بدتر از اعاده گناه باشد۔ بامن اباد ملامت پیوند، فی الحال،

چاوشان بارگاه قضا، باین تاکید علم در داده اند- قدراند از ان عرصه تقدیر، باین ناوک شست

انتقام کشاده که جان بی ایمانس، بهمان بی اعتمادی سستی، قبض کردند، و به لعصب گاه اغلال و

محفل بے نیازی کے بنیاد حضرات اس اندیشہ فخر و غرور سے عاری ہیں کہ مجہول عوام  
ستاش کرے اور گوشہ فنا کے مقیم حضرات اس وہم سے آزاد ہیں کہ یا وہ گوارا بیہودے لوگ  
برائیوں کو بے نقاب کرنے میں غلو سے کام لیں لیکن غیرت متقی جو اس طبقہ کی آبرو کی لاج رکھتی  
ہے وہ انہیں رکھتی کہ ہر گستاخ آدمی ان کی توہین کی ہمت کرے اور لہلہ زبان سے ایسا عذر پیش کرے  
گناہ کے تکرار سے بھی زیادہ برا ہو۔ فی الحال بارگاہ قضا و قدر کے چاؤش نے تاکید کے ساتھ یہ فیصلہ  
ہے کہ اس بے ایمان کی جان اسی بے اعتدالی کے ساتھ قبض کی جائے۔

ادھر شاہ صاحب یہ ارشاد فرما رہے تھے کہ خبر آئی اٹھانے اس کا سبب مرض شراب کی برد



پائے اور اگر یہاں آنا چاہے تو اس ارادے سے اس کو باز رکھنا اور کہنا کہ دودن اور صبر  
اللہ اسے سیدی راہ کی طرف رہنمائی کروں گا۔

بیل کا بیان ہے کہ شاہ صاحب کے حسب ہدایت جب ہم لوگ اس کے گھر پہنچے تو اس کے آہ  
سوندہ پہلے ہی ہمارا استقبال کیا، جب مزاج پرسی کی تو کہنے لگا:

”پوچھئے تو مجھے کوئی ایسی بیماری لاحق نہیں ہوئی ہے جس کا سبب مزاجی بے اعتدالی ہو بلکہ قصہ  
جس دن سے شاہ صاحب سے میری ملاقات ہوئی ہے اپنے اندر کچھ عجیب و غریب کیفیت پاتا  
ہوں۔ بیان کر سکتا اور نہ ہی اسے اپنے قلب و دماغ میں محفوظ رکھ سکتا ہوں۔ زبردست کشمکش  
ہے۔ ہوں کسی طرح چین نہیں ملتا۔“ گھر سیلاب کے دوش پر ہے، خاک یا اس کو سر پر اڑانے کے  
بغیر تیرے کہاں۔ پیداوار بجلی کے رحم و کرم پر ہے گدا کے سوا آبیاری کی امید کسے ہے، مجھ پر ایسی  
توجہ پڑی ہے کہ شاہ صاحب کی توجہ کے بغیر ممکن نہیں بخیر و عافیت اس سے بچ نکلوں آپ لوگ  
شاہ صاحب کے محرم راز ہیں اس لئے یہ حیرت انگیز واقعہ بیان کر رہا ہوں۔

مرزا میرے والد نور الدین جو خود بھی طبیب تھے، اسی باغیچے کے صحن میں سپرد خاک  
ہوئے۔ حق کی بنا پر جو باپ کا اولاد پر ہوتا ہے روزانہ شام کو فاتحہ خوانی کے لئے وہاں جاتا تھا۔  
شاہ صاحب کی محفل سے واپس لوٹنا، حسب معمول شام کو ان کے مزار پر گیا، وہاں کی بدبو سے  
پنہ لگا اور ایک عجیب و غریب پیکر نظر آیا جیسے کوئی عضویت قبر سے سر اٹھا رہا ہو، غور سے دیکھا  
تو پندیدہ شکل میں بیٹھا نظر آیا اور اس قدر کالا کھونا تھا جیسے کالے پانی میں اسے غوطہ دیا گیا ہو  
تو اس کی جگہ نہ تھی جہاں رہیچھ کا تصور بھی کیا جاسکے اس کا وجود تو دور رہا۔ اس لئے میری عقل نے  
اس کی طرف متوجہ کیا کہ یہ واقعہ اصل میں ایک درس عبرت ہے جس کے ذریعہ مجھے اپنے مذہبی  
حالت پر جان بین کرنی چاہئے۔ بہر حال اس نا پسندیدہ اور کریہہ منظر کو دیکھ کر جو نبی واپسی کا ارادہ کیا  
میرے آواز دی:

”میں تمہارا باپ نور الدین ہوں۔ مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ جو شکل تم دیکھ رہے ہو  
اس کی صورت ہے جس سے عبرت لینے کی ضرورت ہے یہ درحقیقت اس معصیت کا انجام ہے  
جو تمہاری دانست میں طاعت سمجھتا رہا اور اس بد نصیبی کا ثمرہ ہے جسے اپنے خیال میں خوش نصیبی  
سمجھتا رہا۔ (بیدل کے الفاظ میں) ہنوز استقبال موجودہ عذاب سے آفتاب قیامت کے استقبال کا  
مہموم ہے۔ اور یوم محمود کے انتظار میں طرح طرح کی سزائیں بھگت رہا ہوں... جو عذاب میں  
میں کی قیدی کو نہ ہو اور جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں کسی کافر کو نصیب نہ ہو۔“

و معروف طبیب حاذق شار کیا جاتا تھا۔ جو بیماروں کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہی اسباب مرض کا پتہ  
تھا۔ وہ نہ صرف یہ کہ معالج تھا بلکہ متین طبع، پروقا اور شیریں گفتار شخص بھی تھا۔ گفتگو کرتا تو ایسا  
الفاظ نہیں ہیں بلکہ نہایت موزونیت سے پروئے ہوئے موتی ہیں اس کے دلنشین انداز گفتگو  
صرف حاضرین بلکہ شاہ صاحب بھی متاثر تھے اس لئے شاہ صاحب نے اس کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا  
”ما از حق در خواستیم تا باطن را بر رنگینی ظاہر متصف گرداند۔ و آئینہ اعتقاد ہم بر تہ صافی  
کلامت رساند۔ اما غریب و قبیح بانجا مبت کشید۔ و طرفہ حلقی عنانی با طرف گردانید۔  
بہر حال انجام میقل کاری حقیقت نہایت موعود است۔ و گل کردن اسرار معیت در ضمن ہمیں  
ایام معدود۔“ (۲۲۳)

ہم نے خدا سے دعا کی ہے کہ تیرے باطن کو تیری ظاہری رنگینی سے آراستہ کر دے اور تیرے  
آئینہ اعتقاد کو تیرے صاف اور شستہ کلام کے رتبے تک پہنچا دے لیکن شاید ابھی اس کا وقت نہیں  
ہے اور تیری حالت ابھی اس کے لئے مستعد نہیں ہے۔ بہر حال تیرے انجام کی میقل کاری ایک  
پوشیدہ حقیقت ہے جس کا وعدہ ہو چکا ہے اور تیرے اسرار معانی ان ہی چند دنوں کے اندر گل کریں گے  
ما و تو جملہ منتظر فضل و رحمتیم تا شاہ قبول نصیب کنار کیست؟  
ہم تم سب اس کے فضل و کرم اور رحمت و عنایت کے منتظر ہیں دیکھئے قبولیت کا معشوق  
پہلو کو نصیب ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ حکیم گیلانی کا ایک فرقہ مخصوص سے تعلق تھا، اس کا باپ حکیم نور الدین  
مسک کا تھا اور عرصہ ہوا دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔  
اس پس منظر میں شاہ صاحب کی دعا پر غور کیجئے۔ دعا کا حاصل یہ ہے کہ جس طرح خدا  
تجھے رنگین بیان اور شیریں زبان بنایا ہے تیرے قلب کو بھی وہ ہر قسم کے باطل افکار و خیالات اور غیب  
سے پاک و صاف کر دے۔

ملاقات کے تین دن بعد جبکہ شاہ صاحب کے ارادہ مند ان کے گرد حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔  
آدمی حاضر خدمت ہوا اور عرض کیا کہ حکیم طاہر گیلانی سوداوی بحران سے دوچار ہے اور اس کا سارا  
سکون غارت ہو گیا ہے، کسی کروٹ اسے قرار نہیں ہے اور حضرت سے ملاقات کا متمنی ہے۔  
درخواست سننے کے بعد شاہ صاحب نے مرزا ظریف کو اپنے پاس بلایا اور بیدل کے  
کر کے انہیں حکم دیا کہ مزاج پرسی کے لئے وہ حکیم موصوف کے گھر جائیں۔ شاہ صاحب نے  
ہدایت کی کہ اپنے مسک کے بارے میں اسے ندامت لاحق ہوئی ہے اس لئے اس کی حالت درج

نور الدین کے عبرت آمیز بیان سے اس کا لڑکا حکیم طاہر گیلانی اتنا خوفزدہ ہوا کہ اس کے اڑ گئے۔ وہ مرزا ظریف سے بولا:

”ان الفاظ کو سن کر اور یہ منظر دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے، میں بے ساختہ زمین پر گر گیا، یہ دوستوں نے اٹھا کر مجھے بستر پر لٹایا۔ تب سے میں اس طرح وقت گزار رہا ہوں کہ کسی کروٹ بھی نہیں ہے، انکھیں کھولتا ہوں تو وہی منظر دکھتا ہوں کہ سامنے گھومتا ہے اور بند کرتا ہوں تو وہی سماں دکھتا ہے۔ پھر تا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ حالات میں یہ انقلاب شاہ صاحب کی توجہ اور تصرف کا نتیجہ ہے۔ ہوں میری بقیہ زندگی بھی اگر اسی نچ پر گزری تو برے انجام میں کوئی شبہ نہیں۔ براہ کرم خانہ حالات سے شاہ صاحب کو آگاہ کیجئے اور ان سے میری نجات کی درخواست کیجئے میں اپنے کرتوت تو بہ کرتا ہوں۔

بیدل لکھتا ہے کہ شاہ صاحب کے حسب ہدایت میں نے اس سے کہا دو دن اور صبر کیجئے ہے کہ آپ کا انجام بہتر ہوگا۔ واپسی پر اس کی ساری رام کہانی شاہ صاحب سے بیان کی۔

اس واقعہ کے تیسرے دن صبح کو جبکہ احباب اپنے معمولات سے فارغ ہو رہے تھے ایک برپا ہو کہ حکیم طاہر گیلانی شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا ہے۔ شاہ صاحب پر نظر پڑتے ہی طرح نعرہ لگاتے ہوئے اس نے جست لگائی اور سر خاک پر رکھ دیا۔ شاہ صاحب نے اسے اپنے گونچے میں لے لیا اور بڑی شفقت سے اپنے سامنے بٹھایا، شاہ صاحب کے محبت آمیز برتاؤ نے گوشت مردہ جسم میں جان ڈال دی تھی حکیم طاہر زبان حال سے کہ رہا تھا۔

ای خوش آنحال کہ چوں بر تو نظر بکشایم  
ہر نفس چوں نفس از خود روم و باغ  
بخیل تو چنان گم شوم از ہستی خوش  
کہ عدم ہم نتواند کہ نہ  
شاہ صاحب کی عنایتیں جتنی زیادہ اس کے حال پر ہوتیں اس کے اعضا میں اسی منہج رعشہ طاری ہوتا اور حسرت آمیز زبان سے کہ رہا تھا۔

”روز در کسب ضلالت شب کردہ ام و بمر در حمت روی تو قع آوردم بر غفلت عالم زنی

بجیرت کارم تسمی“

گمراہی کے حصول میں دن رات ایک کر دیا ہے اور رحمت و عنایت کی آس نہ رہی ہوں، میری غفلت پر ترس کھائیے اور میری حیرت پر تبسم فرمائیے۔

نخل آہی ہمہ تن یاس بیار آمدہ ام  
فرستی سوختہ بر دوش شراب  
نخل ہوں آہ کا اور ہو کے سراپا اک یاس  
ہوا حاضر ہوں تریے در پہ آدم

ہوں فرصت بریاں، پھر بھی ہو کے کاندھے پشور کے ترے آیا میں پاس  
خشاک من آوارہ گرداب عدم از پی سوختن انکوں بکنار آمدہ ام  
”مرد از چراغ زندگی پر تو نفسی باقیست آغوش کشای وداع امید۔ و از سحاب فرصت عرق  
جب در نظر آبیار افعال جاوید“ (۲۲۵)

آج چراغ زندگی کی ایک لوباتی ہے جو وداع امید کے لئے اپنی آغوش وا کیے ہوئے ہے اور  
پیشانی کا پسینہ دائمی ندامت کی سیرابی کراتا ہے۔

شاہ صاحب کی زبان پر بے ساختہ مغربی کے درج ذیل اشعار تھے  
ما ہادی عالم صفاتیم  
جہان نمائی ذاتیم  
ما ہادی عالم صفاتیم  
جہان نمائی ذاتیم  
کو تشنہ؟ دراکہ ما فراتیم (۲۲۶)  
اور صفات کے اک رہبر و رہنما ہم  
ہے تشنہ کہاں کہ پلائیں اسے ہم  
کے بعد فرمایا:

یہ نظم از میں تا آسمان یک در فیض تصور کن کہ بار بودن از تسلیم حلقہ اش ابد اسر نخواہد  
و در از نمودن ہر گز بہر امن خیالش نتواند گردید تا بسگی این در، دلیل وسعت آغوشی شخص  
دقت است۔ و کشادگی این بنگاہ، حجت دستگاہ فضل و کرامت۔ مغفرت پر بہانہ جوست۔  
در وقت اتفاقات خو۔ اینجا عقدہ ہای غفلت، بیک آہ ندامت، نقاب دل آگاہی می کشاید۔  
کہ خواب، در یک مژہ باز کردن، مدنگاہی بری آید۔ تا رعونت سری در پیش افکند آداب  
است۔ تا سرکشی، فال خیدنی زند، محراب۔

ندامت پر کلام غبار اھلک نوید یست از عسستہای رقم سیاہ کاری۔ ویاس آہنگی توبہ  
از عسستہای از ساز محفل رستگاری۔ شاہد فضل چھدر مشتاق بود کہ نقاب آں حقیقت میچشم  
در معرض ظہور این ہدایت، از شکبہ قید اوہام وار ہانیدنست و بہ وسعت آباد سر  
سنانیدن۔ ہر کر ابر گزینند باین دقت گرد این حالش برابند و ہر کر ابر نوازند، باین  
نکستہ خدایا نہاید۔“ (۲۲۷)

شاہ صاحب کی غفلت کا حاصل یہ تھا کہ گناہ چاہے جتنا ہو بندہ جب توبہ کرتا اور اس پر ندامت کا  
حاصل ہوتا کہ رحمت اس کے حال پر متوجہ ہوتی ہے اور اسے معاف کر دیتا ہے۔ خوشی کی بات یہ  
ندامت اور توبہ کی توفیق فرمائی۔

اس کے بعد اسے کلمہ شہادت کی تجدید کرائی اور اپنی چادر عنایت کی۔ چاروں طرف مبارکباد کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ حکیم طاہر نے نیاز مندی سے عرض کیا کہ حضرت نے جو عطا فرمایا ہے اس کے شکر میں اگر ہر سانس میں ہزار رکعت بھی ادا کریں تو کم ہے اور خاکسار کو شایاں دوسانس سے زیادہ مہلت حاصل نہیں ہے۔ اس لئے اجازت مطلوب ہے کہ اپنے گھر جا کر دو رکعت کروں۔ شاہ صاحب نے مسکرا کر فرمایا: ”ایسے نیک کاموں میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔“ بعض دوستوں نے اس کے گھر تک اس کا ساتھ دیا۔ جونہی وہ وہاں سے واپس ہونے لگے رونے کی آواز بلند ہوئی کہ حکیم طاہر رکوع کی ادائیگی کے بعد ابدی سجدے میں پہنچ گیا۔ شاہ صاحب ہمراہ سارے احباب اس کے گھر گئے اور اس کی تجہیز و تکفین کی ساری ذمہ داری خود شاہ صاحب اپنے سر لی اور اپنے مبارک ہاتھوں سے اسے سپرد خاک کیا۔

بھو اخوان عمر ہا در بند غفلت صرف کرد یوسفی در جلوہ آمد تاہم از چہ در درد پیدا کن کہ این دریا سراسر مرہم است نیست محروم اجابت گر خوشی یوسف کے بھائیوں کی طرح ساری زندگی اس نے غفلت میں گزاری۔ یوسف جلوہ آہ وہ (غفلت کے) کنواں سے باہر نکلا۔ درد عشق پیدا کر کہ یہ دریا سراسر مرہم ہے اگر خاموشی آہ نہ بات تو اجابت و قبولیت سے محروم نہیں رہتی ہے۔

یہ تھا دوسرا واقعہ۔ مشہور محقق قاضی عبدالودود صاحب نے ایک انٹرویو میں جو راقم السطور نے میں دیا، اس واقعہ کی بنیاد پر بیدل کو دروغ گو کا لقب دیا۔ ایسا لگتا ہے کہ بیدل کو بھی اندازہ تھا کہ وہ ہیں اور آئندہ بھی ہوں گے جو اس قسم کے مشاہدات پر یقین نہ کریں گے اسی وجہ سے اپنے تجربات مشاہدات کے بارے میں چوتھے عنصر میں صاف لفظوں میں اس نے کہا۔

سرگزشت من ز مطلب بی نیاز افتادہ است گر نخواہم بر حریفان آنقدر ہافزش نہ بہر حال یہ اس کے ذاتی مشاہدات تھے اور ذاتی مشاہدات دوسروں کے لئے جوت

ہوتے۔ شاہ صاحب کے اور بھی واقعات ہیں جو بڑی حد تک ان کے کرامات سے وابستہ تھے ہیں اور جن کو ان کے روحانی مقام کی تعیین کے لئے بیدل نے ذکر کئے ہیں۔ راقم السطور نے اس لحاظ رکھا ہے کہ صرف وہ واقعات یہاں ذکر کئے جائیں جنہوں نے بیدل کی روحانی نگری اور ارتقا میں اہم رول ادا کئے ہیں۔

بیدل لکھتا ہے کہ ایک دن شاہ قاسم مرزا ظریف کے گھر قیام پذیر تھے اور حاضرین کو مشہور شاعر والہ ہروی بھی شامل تھا، اپنی صحبت سے فیضیابی کا موقع فراہم کئے ہوئے تھے۔

نے صنایع و بدائع سے متعلق بہت سے اہم نکات بیان کئے۔ گفتگو کا سلسلہ آخر صنعت ہو چکا۔ بیدل نے اس کی تعریف یوں لکھی ہے۔

صنعتی است در سلک ہر مصرع رشتہ یک لفظ مملو جو ہر نقط و لفظ دیگر از بی گوہری ہماں شیخہ در قطار۔ رعایت ہمیں نق در مراتب حروف ایات وضوابط ہماں قاعدہ بترتیب عرض در جات۔“ (۲۳۰)

یعنی ایک صنعت ہے جس کے اندر مصرع کی لڑی میں ایک لفظ نقطہ دار تو دوسرا نقطے سے خالی ہے۔ ایات کے حروف میں اس نظم و ترتیب کی رعایت رکھنے کا نام ”خیفا“ ہے۔

”خیفا“ اصل میں اس گھوڑی کو کہتے ہیں جس کی ایک آنکھ سیاہ اور دوسری سفید ہوتی ہے اور اسی سے شعر کی اس صنعت کو کہا جاتا ہے جس میں ایک لفظ نقطہ دار اور دوسرا بغیر نقطے کا ہوتا ہے۔ یہ بیان ہے کہ جبکہ شاہ صاحب اس صنعت سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے

فکرت رشک آید ز گردیاں گردیدن کہ خواہم زین الم آخر زبان مار گردیدن فکرت کے محبوب کی گردن کے گرد طواف کرنے پر مجھے رشک آتا ہے اس تکلیف کی وجہ سے

چراغ افروز بازندہ شد رنگ رخس آخر چراغان کرد و جوش خط ز شام تا گردیدن (۲۳۱) شرم کے اس کے چہرے کے رنگ پر پسینہ چھوٹنے لگا خط کے جوش نے شام کے تیرہ و

راہ نام شداو بہ بخشش و مال تنوع او زینت ممالک شد (۲۳۲) راقم السطور یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ مذکورہ بالا دونوں ایات میں صنعت خیفا کی رعایت رکھی

گئی ہے یا نہ گئی ہے اس کی مثال میں درج ذیل شعر لکھا ہے۔

بہمنہ ز نفرت قدمای این فنون راہ طریکہ ناپیودہ تواند بود، بعیدی نماید۔ یا عقدہ طریش قدرت سلف نکشودہ تواند نمود، کتر با متحان می آید۔ اما زمزمہ ہای این نوا تازہ کی خورد۔ ہمہ حال طبیعت سحر آفرینت ہر چہ نگارد۔ و خیالات قیامت کین از ہر

بہمنہ ہا آرد۔“ (۲۳۲)

بہمنہ اور زمین کا خلاصہ یہ ہے کہ قدیم شعرانے تمام تر شاعرانہ ذوق اور طبع رسا رکھنے کے

باوجود اس راستے میں قدم نہیں رکھا اور جنہوں نے رکھا انہیں بہت کم کامیابی ہوئی لیکن تہا۔  
سے ایسا لگتا ہے کہ تم ایک غیر معمولی شاعرانہ ذوق اور طبع رواں کے مالک ہو اور اس میں بہت  
لئے ہو۔ شاہ صاحب نے تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

”دانا یں فن بلاغت مجرد وزن و قافیہ پینائی را در ہر طریق بہم نگی معانی کمال بخیدہ اند  
و سستیہای عبارت را نیز درین مقام بعد گمی بنای فطرت برگزیدہ۔ بی تکلف صوت  
تمثال این مضمون، از آئینہ صنایع حیرت و شگفتگی این رنگ عبارت از حدیقہ ہر  
قدرت“ (۲۳۳)

یعنی فن بلاغت کے عالموں نے وزن آرائی اور قافیہ پینائی کو اس شکل میں کمال حاصل کیا ہے۔  
ہم آہنگ کیا ہے اور عبارت کی سستی کو بھی اس موقع پر سیکڑوں استواری سے ہمکنار کیا ہے۔  
کی صورت بلاشبہ صنایع حیرت کے آئینے سے وابستگی رکھتی ہے اور اس عبارت کی شگفتگی  
کے حدیقے سے تعلق رکھتی ہے۔

شاہ صاحب کے ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ بیدل اس وقت جبکہ آستانہ جوانی میں قیام  
رہا تھا (کوئی ۱۷ سے ۱۹ سال کی عمر میں) کس قدر پاکیزہ شاعرانہ ذوق اور طبع موزون کا مالک  
شاعری اور اس میں بھی صنعت ”خفیا“ کا استعمال کامیابی سے کر سکا جبکہ اچھے اچھے شاعر اس  
رہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ مشکل صنعت کے استعمال سے شعر کا مضمون ہی خبط ہو جاتا ہے۔  
صنعت اور مضمون میں ہم آہنگی کی کوشش کلام میں سستی عبارت پر منتہی ہوتی ہے لیکن بیدل  
میں کامیاب و کامران نکلا۔ اسی وجہ سے شاہ صاحب نے اس کی بڑی تعریف کی۔  
صاحب کی بیدل کی کامیابی کے لئے دعا اثر سے خالی نہیں جاسکتی تھی۔ غرض شاہ صاحب کی  
بیدل نے صنایع و بدائع سے متعلق بہت سے نکات سیکھے۔

جس زمانے میں بیدل شاہ صاحب کی صحبت سے استفادہ کرنے میں مصروف تھا  
کے لئے اس کو کسی کام سے شاہ صاحب کی صحبت سے غیر حاضر رہنے کا اتفاق ہوا۔  
کتاب کے مطالعہ سے وہ اپنا دل بہلاتا تھا۔ ایک دن وہ مجموعہ رسائل تالیف ابو بکر شبلی کا مطالعہ  
جو کسی دوست کے ذریعہ اسے ہاتھ لگا تھا اور جس میں سلوک و عرفان کے مسائل بیان کیے  
اچانک شاہ صاحب نے پہنچ کر پوچھا۔

”ازین مکتوب کدام مکتہ مسرور وقت ساخت و ازین سطور چہ نقطہ بدل نشینی  
پرداخت“ (۲۳۳)

یعنی اس کتاب کی کونسی بات تم کو اچھی لگی اور اس کے سطور کا کونسا نقطہ تمہارے دل میں اتر کر

بیدل نے جواب دیا:

”مدتہا رشتہ اندیشہ عقدہ داشت و خامہ تامل تردوی می نگاشت۔ امروز از مطالعہ کلام تحقیق  
انجام شیخ طریقت شبلی، آن عقدہ بکشا لیش مقرون گردید و آن ترد، بمضمون تسلی انجامید کہ  
فرمودہ است:۔ التصوف شرک لانہ صیانة القلب عن غیر و لا غیر۔“

یعنی عرصہ سے رشتہ اندیشہ کو ایک گرہ سے سابقہ تھا اور خامہ تدبیر پریشان نگاری کیا  
تھا۔ آج شیخ طریقت حضرت ابو بکر شبلی کے کلام تحقیق انجام کے مطالعہ سے وہ تسلی سلجھی اور وہ  
دور ہو کر تسلی ہوئی، انہوں نے فرمایا:

التصوف شرک لانہ صیانة القلب عن غیر و لا غیر

تصوف شرک ہے اس لئے کہ وہ دل کو غیر اللہ کے تصور سے محفوظ رکھنے کا نام ہے اور غیر کا کہیں  
بیدل ہے۔

بیدل کے اس بیان کو سرسری نظر سے پڑھ کر نہیں گزرنا چاہئے بلکہ اس کے عارفانہ افکار و خیالات  
کی بے انتہا وسعت انقلاب کا سرچشمہ اسے کہنا چاہئے۔ جس پر آگے چل کر تفصیل سے بحث ہوگی۔

حضرت شبلی کے خیال کا خلاصہ یہ ہے کہ تصوف کی مشہور تعریف یہ ہے کہ دل کو حق سبحانہ تعالیٰ  
کے سامنے خالی کر دینا اور دل کو ”عین ذات“ سے وابستہ رکھنے کے لئے لازم آتا ہے کہ ”عین“ اور ”غیر“

میں تمیز نہ ہو۔ ”عین ذات“ سے وابستہ رکھنے کے لئے لازم ہے ماسوا سے خود کو دور  
رکھنا۔ ”عین ذات“ فرماتے ہیں کہ جب ”ماسوا“ یا ”غیر“ نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ دنیا اور جو کچھ دنیا

میں ہے وہی ذات حق ہے، پس ”غیر“ کے قابل ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ دل کے تصور کردہ میں  
”ذات“ اور ”غیر ذات“ دونوں موجود ہیں، اگرچہ ایک مثبت اور دوسرا منفی شکل میں ہے۔ یہ بات تو

ایک خدا کی پرستش کے سراسر خلاف ہے، اور جو چیز ”یکتا پرستی“ کے تقاضوں کے خلاف ہو  
تو اس پرستش کے خلاف ہے۔ لیکن ظاہر ہے اس طرح کی باتیں عام

مذہبانی نیست میں بزرگوں کی زبان سے نکلتی ہیں ورنہ کلمہ لا الہ الا اللہ میں خود اولیٰ غیر اللہ  
تعالیٰ کی پرستش اور ایسے لوگ رہے ہیں، آج بھی ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے جو غیر اللہ کی پرستش

کے لئے اپنے نماز کی ابتدا میں ہم لوگ ”ثنا“ پڑھتے ہیں، اس میں ایک جملہ ”لا الہ غیرک“ کا

بہر حال بیدل کے اس بیان نے کہ حضرت شبلی کے اس ارشاد نے میری گتھی سلجھادی یہ واضح کر دیا کہ اس وقت سے اس نے ”ہمہ اوست“ یا ”وحدت الوجود“ کے عقیدے کو اپنے کلام کا مخصوص مادہ ہم موضوع قرار دیا۔ جبکہ پچھلے حالات کو سامنے رکھتے سے ایسا لگتا ہے کہ یہ دوسرا موقع تھا جب مسئلہ ”وحدت الوجود“ سے وہ اتنا متاثر ہوا۔ درج ذیل غزل اسی خیال کا نمائندہ ہے۔

ایقدا رگروہم وطن، اعراض وجوہر یختند چشم واکن تاچہ صہبا از چہ ساغر ریختند  
وہم وطن (جس کا وجود محض خیالی اور ظنی ہو) عرض (قائم بہ غیر) اور جوہر (قائم بالذات) انسانی کثیر تعداد میں دنیا میں پھیلا دیئے ہیں تو آنکھیں کھول کر دیکھو کون سی شراب کسی ساغر سے لپک رہی ہے۔ گفتگوی عشق شیریں کاربی تکرار بود شیرہ این قد بیکاران مکرر رفت عشق شیریں کار کی گفتگو غیر مکرر تھی بیکاروں (عاشقوں) نے اس قد کا شیرہ بار بار گرایا ہے۔ دم مزن از اصطلاح طوطیان ایں قفس یعنی ایں شیریں نوا یاں سخت شکر ریختند اس قفس کے طوطیوں کی اصطلاح کا دعویٰ مت کر دے یعنی ان شیریں نواؤں نے بڑی حد تک شکر چھینٹ دی ہے۔

شاہ صاحب نے بیدل کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا:

”چندی تماشائی ایں مجمع اسرار بایت بود و این مصاحب قدیمی را انیس خلوت مایل بایت نمود، امید کہ باین لطایف کلمات دیگر نیز در رفع حجاب معانی، امداد فرماید و چشم یقینیت مطالعہ نسخہ تسلی کشاید۔“ (۲۳۵)

یعنی تمہیں چاہئے کہ اس مجموعہ اسرار (رسائل ابوبکر شبلی) کے کچھ دنوں تماشائی بنو اور اس مصاحب کو انیس خلوت قرار دو امید کہ اسی قسم کی دوسری لطیف باتیں معانی کے چہرے سے حجاب کرنے میں تمہاری مدد کریں اور تمہاری چشم یقین کو نسخہ تسلی کا مطالعہ نصیب ہو۔

شاہ صاحب کے حسب ہدایت بیدل نے اس کا پوری طرح مطالعہ کیا اور اس سے غافل نہ رہا اسے یہو نچا۔ اس کے بہت سے شبہات دور ہو گئے اور ساتھ ہی ساتھ بعض صوفیانہ اصطلاحات واقف بھی ہوا۔ لکھتا ہے:

”خون مشتق آثار شبہات رنگ چہرہ یقین افروخت و خاستر شعلہ اوہام صفای آئینہ ادراک اندوخت۔ باری طبیعت بیگانگی احتراج، با بعضی از مصطلحات این طایفہ آشنائی بہم رسانید۔ تا بقدر مناسبت، در فہم عبارات قاصر نماںد۔ و از درگاہ استفہام، سطور نارسائی محسوس نمائند۔“ (۲۳۶)

یعنی آثار شبہات کے خون ہونے سے چہرہ یقین کا رنگ چوکھا ہو گیا شعلہ اوہام کی راہ نے ادراک کی صیقل گری کی۔ غرض تصوف سے بیگانہ طبیعت کو اس طایفہ صوفیہ کی بعض اصطلاحات سے آشنائی حاصل ہوئی تاکہ مناسبت طبع کے بقدر ان کی عبارتوں کے سمجھنے میں قاصر نہ رہے اور درگاہ استفہام سے نارسائی محسوس کے سطور کا مطالعہ نہ کرے۔

بیدل کے بیانات سے ایسا مستفاد ہوتا ہے کہ ”مجموعہ رسائل“ نے اس کے افکار و خیالات کی ایک انقلاب برپا کیا۔ چنانچہ اس کتاب کا ایک انتخاب تیار کرنے کے بعد اس نے ایک مفصل مکتبہ کے ساتھ ملحق کیا جس کے دو اشعار درج ذیل ہیں:

دارد این نسخہ از علوم کمال یابس و رطب چوں کتاب مبین  
بزم ہوش از لطافتش روشن باغ فہم از معارفش رنگین

اس کے بعد اسے شاہ صاحب کی خدمت میں پیش کیا، شاہ صاحب نے اسے سراہا۔ اس منظوم کے ذریعہ بیدل نے اپنی جس شاعرانہ لیاقت اور خداداد صلاحیت کا اظہار کیا اس سے شاہ صاحب اتنے متاثر ہوئے کہ اسی دن مرزا ظریف کو بلا کر بیدل کے بابت فرمایا:

”پیش ازین خبر داده ایم کہ حقیقت کمال در پردہ ایں لعبت باز گرم شغل طوفان سازیت۔ و عقلی قدرتی، در کسوت این نقطہ موہوم، مستعد قیامت طرازی۔ ہر چند احوال ظاہر ش، در نظر بیکاروای نمایند۔ ماروی باطلش، ابواب نواید عظیمی کشائند۔ باید دانست کہ در میخانہ استعداد، تا دماغ ہستی بے نقاب تحقیق نمی رسد، باین کیفیتش آشنائی سازند و تا رسافتی، محرم نجات یقین نمی گردد، باین آہستہ کنش نمی نوازند۔“ (۲۳۷)

اس سے پہلے بھی میں نے تم کو بتایا ہے کہ اس مجازی کھلونے کے پردے میں حقیقت کمال طرازی میں سرگرم کار ہے اور اس نقطہ موہوم کے لباس میں مفہوم قدرت قیامت طرازی کے لئے ہر طرح آمادہ ہے۔

اس کے حالات اگرچہ بظاہر ازکار افتادہ نظر آتے ہیں تاہم اس کے چہرہ باطن پر عظیم فوائد کے ذخیرہ ہوتے ہیں۔ واضح رہے کہ استعداد کے شراب خانے میں دماغ ہستی جب تک نفع تحقیق حاصل نہیں کر لیتا اس کیفیت سے اسے آشنا نہیں کرتے اور فطرت رسا یقین کے نغون کا جذبہ گرم نہیں ہو جاتی ہے اس آہنگ سے اسے نہیں نوازتے۔

شاہ صاحب کے بیان سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ بیدل اس وقت تک غیر معمولی صلاحیت کا حامل ہو چکا تھا۔ اس کے بعد شاہ صاحب نے بیدل کے قلعے کو اپنے ہاتھ سے

لکھ کر اس نوٹ کے ساتھ شاہ نعمت اللہ فیروز پوری کے پاس جو بلند پایہ مشائخ میں تھے اور شاہ قاسم ان کے خوشگوار دوستانہ تعلقات تھے، روانہ کیا کہ:

”غموشی نشہ درابجد درس سلوک بایں نطق لب کشودہ است۔ و تحیر آئینہ در آغاز کسب شہود صورت این تمثال وانمودہ۔ از آنحضرت نیز ملتئم دعاست۔ اثر انقار بنای فطرش گماشتن است۔ و رشحہ امدادی بہ پرورش نہال معنیش مبذول داشتن۔“ (۲۳۸)

غموشی نشہ (بیدل) نے درس سلوک کے ابجد ہی میں اس کلام کے ساتھ لب کشائی کی ہے تحیر آئینہ نے کسب شہود کے آغاز ہی میں اس تمثال کی صورت دکھائی ہے۔ جناب والا سے بھی درخواست ہے، بہرہ یابی کا اثر اس کی فطرت کی بانسری سے وابستہ کیجئے اور امداد کی قطرہ اندازنی سے اس کے نہال معنی پر توجہ فرمائیے۔

اور شاہ نعمت اللہ صاحب نے اس طرح جواب دیا:

”کار صاحب این کلام باہمہ نقص تمام است۔ و آغاز ہر روان این مراتب، در ہر طریق بہار انجام۔ آہنگ عندیہی کہ باین کیفیت، منقار رنگین نوای کشاید۔ و عالم افروز چرخیکہ این بسط دامن پر تو آراید۔“ (۲۳۹)

اس شاعر کا کلام اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود کامل ہے اور اس منزل کے رہرو کی ابتداء سے بہار انجام ہے۔ یہ اس بلبل کی آواز ہے جس نے اس کیفیت کے ساتھ رنگین نوای کے لئے کھولی ہے اور یہ وہ عالم افروز چراغ ہے جو اس کشادگی دامن کے ساتھ پر تو آرائی کر رہا ہے۔ ان بزرگوں کے ارشادات کی نقل سے مقصود یہ پتہ لگانا ہے کہ بیدل نے فکری اور ادبی مراحل کس طرح طے کئے اور اس کے شاعرانہ ذوق کی آبیاری اور اس سطح کے بلند کرنے میں درپہ کیا عوامل کا رفر مار ہے ہیں اور سب سے زیادہ اہم نکتہ یہ سامنے آتا ہے کہ بنی نوع انسان کے ان خیر خواہوں کا جو ہر قابل کی پرورش اور اس کی حوصلہ افزائی میں کتنا بڑا رول ہوا کرتا ہے جیسا کہ شاہ نعمت اللہ کا مقولہ اوپر گزرا

”کار صاحب این کلام باہمہ نقص تمام است“

ظاہر ہے جس میں نقص اور خامی ہوا سے ہم کامل کس طرح کہہ سکتے ہیں پس لاجالہ یہ پڑے گا شاہ صاحب کا مقصد اس پوشیدہ جوہر کی حوصلہ افزائی تھی جو بیدل کو قدرت نے عطا کی تھی وہ اسے بنی لگا تار مشق سے ترقی دے سکے۔

شاہ قاسم ہوالہی کی صحبت سے استفادے کا سلسلہ خواب میں بھی جاری رہا۔ چنانچہ بیدل

رات میں خواب کی آغوش میں پڑا ہوا تھا، دیکھتا کیا ہوں کہ ایک پورا مجمع شاہ صاحب کے گھر کا سلسلہ جاری ہے یہاں تک کہ ”حیا“ کا تذکرہ چھڑ گیا۔ ہر آدمی اپنے اپنے خیال اور مطالبات اس کی تعریف کر رہا تھا اچانک میری طرف متوجہ ہو کر شاہ صاحب نے پوچھا:

”ایں عالم بخاطرت چہ گذر د؟“

یعنی اس سلسلے میں تمہارا کیا خیال ہے؟

اپنے ساتھ شاہ صاحب کے برتاؤ کا تذکرہ کرتے ہوئے بیدل نے لکھا ہے کہ مجالس میں جب کبھی کوئی بات چیت ہوتی اور کوئی نکتہ احباب کو بہت پسند آتا تو شاہ صاحب میری طرف مڑ کر کہتے: موقع محل کی مناسبت سے کوئی شعر کہو یا مناسب نکتہ بیان کرو“ اور میں حسبِ کرتا تو حاضرین مجلس اس پغیرہ ہای تحسین بلند کرتے۔ خواب کے عالم میں جب شاہ صاحب کی فرمائش کی تو یہ خیال آیا کہ اس سلسلے میں اپنے خیال کا اظہار شاہ صاحب کے حضور لب کشائی پر محمول ہوگا اور ان کا ادب اس کی اجازت نہیں دیتا حتیٰ کہ ایک اشارہ بھی اپنی ہنر نمائی اور کے زمرے میں شمار کیا جائے گا۔ اسی کشمکش میں تھا کہ ایک طرف ان کی فرمائش لب کشائی پر دوسری طرف ادب و احترام خاموشی کا تقاضا کر رہا تھا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کروں کیسے کے ساتھ زیر بحث موضوع بھی میرے دل و دماغ میں بیچ و تاب کھا رہا تھا کہ اچانک

”حیا“ خواندم نگہ در گرد خط ماند

ادب کر دم، رقیمہ در نقط ماند

یہ سارا ماجرا خواب کی دنیا میں پیش آیا۔ کچھ عرصے کے بعد ایک دن شاہ صاحب کی مجلس میں دوبارہ سابق مقدم ہوئی تھی ”تذکرۃ الاولیاء“ پڑھی جا رہی تھی۔ سارے حاضرین توجہ سے سن رہے تھے حضرت بایزید بسطامی کا تذکرہ آیا، کوئی ارادتمندان کی زیارت کے لئے آیا تو دیکھتا کیا ہے کہ اس نے سامنے زرد پانی بہہ رہا ہے۔ اس نے دریافت کیا حضرت! یہ کیا ہے؟ شیخ نے

”حقین مخوری تر زبان مسئلہ حیا، بود و بذوق نہ تسلیم ساغر سوالی می پیبود۔ گردش پیمانہ بیان

درب گزارش انداخت تا درین صورت، سنگ بنای ہستی، بطوفان عرق در بخت۔

حقیت تمثال تجملی است، باین ہیئت دماغ تسکین رسانیدہ، و شخص توہمی، باین کیفیت،

آینہ حقین گردید۔“ (۲۴۰)

یعنی ایک دن ایک آدمی نے داخل ہو کر مسئلہ ”حیا“ کے بابت دریافت کیا (کہ اس کی تعریف



کیا ہے؟) شیخ نے اس کا جواب دیا تو وہ آدمی پانی میں تبدیل ہو گیا، ایک دوسرا آدمی آیا اور آستانے پر دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور پوچھا: شیخ یہ کیا ہے انہوں نے فرمایا: ایک آدمی نے اکر 'حیا' کے نام سے سوال کیا میں نے جواب دیا تو وہ اس کی تاب نہ لا کر یوں پانی میں بدل گیا۔

بیدل کا بیان ہے کہ اس نکتے پر غور کے دوران مجھے یہ نہیں سمجھ میں آ رہا تھا کہ کس حرف الفاظ کے جاے میں پیش کروں۔ اس خیال کے صفحہ ذہن پر ابھرتے ہی شاہ صاحب نے فرمایا: ”حق آنت کہ تو آن شب نظم معروض داشتی اما در طریق بیان اشارات بسیار است دلی

حرف و صوت، عبارات بی شمار۔“ (۲۳۱)

یعنی حق تو وہی جو تو نے اس رات کو نظم کی شکل میں پیش کیا البتہ انداز بیان کا فرق ہوتا ہے حرف و صوت سے آزاد بھی عبارتیں ہوتی ہیں۔

اس واقعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شاہ صاحب کا دل ٹھیک آئینے کی طرح تھا جس پر دور دور کے واردات کا عکس نمایاں ہو جاتا تھا۔ یہاں موقع محل کی رعایت سے بیدل نے مسئلہ ”خفا“ بھی بحث کی ہے اور اس کے اسباب و علل پر روشنی ڈالی ہے اسے پانچویں باب ”بیدل کے خیالات“ کے ضمن میں بیان کریں گے۔

شاہ قاسم ہولالمی اور ان کی خدمت سے بیدل کے استفادے کا تذکرہ قدرے طویل فرمایا لیکن بیدل کی شخصیت کی شناخت اور اس کی فکری اور ذہنی ارتقا بلکہ بیدل ہی کے الفاظ میں ”شخصیت کی و انمودی“ کے لئے اس کا تفصیلی تذکرہ کرنے پر ہم مجبور تھے۔ شاہ صاحب سے اپنی اور حق شناسی کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے بیدل لکھتا ہے۔

”الحاصل این ناکس جہان اعتبار بہ بمن نگاہ کرم دستگاہش صاحب اقبال شہرت گیتی

گردید۔ و این مشتگی گیارہ بی مقدار از رشہ سحاب توجہش آبروی قدرت طوبی بہم رسانید۔ ہم

در خور بزرگبہای کیمیای اوصافش بود کہ ذرہ رابہ آفتابی ستود و قطرہ راحیط و انمود۔ و ہم

از قانون عاجز نواز یہای اوست کہ امر و ساز بیدلی بہ ہزار آہنگ استغنی ناز و دوزخینی نالہ

بیکسی بہ چند نو علم بی نیازی می افزا زد۔

تا بہار زندگی دار و دوسر و برگ نفس موبہوم آشیان سجدہ تسلیم اوست  
مرگ ہم زان آستان مشکل کہ سازد غافلیم ہر قدر خاکم ہوا گیر، ہمان تعظیم اوست  
رنگ گل تا شوخی سنبل بہار آلودہ است انچہ از اند پشہ ام گل می کند تعلیم اوست  
جہاں اعتبار کا یہ ناچیز ان کی نگاہ کرم کی برکت سے صاحب اقبال شہرت گیتی ہو گیا۔

بہار خاک ان کے ابر توجہ کی بوندوں سے قدرت طوبی کی آبرو بن گیا۔ ان کے کیمیائے حیات کی بزرگی کے لائق تھا کہ ذرے کو آفتاب کہہ کر تعریف کرتے اور قطرے کو سمندر بتاتے۔ ان کی (نوازی) کے راگ کی بات ہے کہ آج ساز بیدل استغنا کے ہزاروں آہنگ پر فخر کرتا ہے اور کسی کی غم آگین کی صدا سے علم بے نیازی بلند کرتا ہے۔

۱۔ سر و برگ نفس میں جب تک زندگی کی بہار برقرار ہے میرا بال بال ان کے سجدہ تسلیم کا پتہ ہے۔ ۲۔ موت بھی مشکل ہی سے مجھ کو اس آستانے سے غافل کر سکتی ہے ہوا میری خاک کی بلندی پر اڑا لے جائے ان کی تعظیم بدستور اسی طرح برقرار رہے گی۔ ۳۔ پھول کے رنگ کی سنبل کی شوخی تک سب بہار آلودہ ہیں، میری قوت فکر یہ سے جو افکار و خیالات صفحہ قرطاس پر لکھے ہیں سب ان ہی کی تعلیم کا نتیجہ ہیں۔

اس آخری مصرع ”انچہ از اند پشہ ام گل می کند تعلیم اوست“ سے بیدل کے دل و دماغ پر ان کی چمک چمک کا پتہ چلتا ہے، اور اس کے عارفانہ افکار و خیالات کے سرچشمے کی نشاندہی میں معاون ہوتا ہے۔

شاہ صاحب کی خدمت سے بیدل کے استفادے کا سلسلہ یہ قول اس کے تین سال تک جاری رہا جس میں اس کا ذکر آئے گا اس لئے اس سال کے بعد ہی دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوئے لیکن بیدل کی ہسانی تھی ورنہ ایک اشارہ ایسا ملتا ہے کہ بیدل کا شاہ صاحب سے رابطہ مراسلات کے ذریعہ ۱۰۸۳ھ (۱۰۸۳ھ) تک قائم رہا۔

اس وقت تک بیدل اپنی زندگی کی اکیسویں منزل میں پہنچ چکا تھا اور ایک خوبصورت میانہ قد، سن اور کشادہ پیشانی کے ساتھ ذوق سلیم اور طبع مستقیم کی حامل شخصیت کی حیثیت سے ایک روشن مستقبل کے لئے تیار ہو رہا تھا کہ اچانک مرزا ظریف نے دنیائے فانی کو خیر باد کہا۔ آدمی جب حقیقی کی راہ پر گامزن ہو تو اسے سرپرستی کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ اس وقت کوئی آدمی ایسا نہیں رہ سکتا جس کی حمایت کرتا اور اس کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری سنبھالتا۔ ایسی حالت میں اس کے لئے مرزا ظریف کی وفات پر کہا ہے

قدوہ اہل فضل خواجه ظریف کہ چو او ساکی یگا نہ نبود  
نفسی جز حدیث درد نداشت قدمی جز براہ فقر نسود



ہر قدر فضل و علم بیشی کرد  
درس تسلیم و مسکنت افزود  
آخر از آشیان بیرنگی  
طایرش بانگ ارجعی بشنود  
چشم پوشید و از جہات گذشت  
مژہ بر بست و بال ناز کشود  
وقف این مصرع است تاربخش  
نیک فرجام عاقبت محمود ۱۷۵۵ھ

اہل علم و فضل کے پیشوا خواجہ ظریف جو یگانہ روزگار صوفیانہ شخصیت کے مالک تھے۔ درویش کے سوا کسی طرح کی کوئی بات نہیں کرتے اور راہ فقر کے سوا کسی راستے پر نہیں چلتے تھے۔ ان کے ہر نفس میں جس قدر اضافہ ہوتا تسلیم و مسکنت میں بھی اسی انداز سے ترقی ہوتی۔ آخر آشیانہ بیرنگی سے ان پر بند نے ارجعی (اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جا) کی آواز سنی آنکھیں موند لیں اور جہات کی تہ سے آزاد ہو گئے۔ آنکھیں بند کر لیں پر ناز کے بازو پھیلا دئے۔ اس کی تاریخ کے لئے یہ مصرع وقف ہے۔ ”نیک فرجام عاقبت محمود“

### بیدل کا شمالی ہند کا سفر:

تیرہ بختی در وطن ایجاد غربت می کند  
گر ز چینی مودمد چمنش همان بنگالہ است  
قسمت نہیں ہے دیس میں گر سازگار تو  
ہے اس کا اقتضا کہ پردیس کو  
وطن میں اگر آدمی کی قسمت سازگار نہیں ہوتی ہے تو وہ اسے پردیس سدھارنے پر مجبور ہوتا ہے چینی کے برتن میں اگر بال پڑ جائے تو اس کو بنگال ہی میں درست کیا جائے گا (کیونکہ وہیں یہ برتن تیار ہوتے ہیں۔)

خاک غربت کیمیای مردم نیک اختر است  
قطرہ در گرد و تپیمی خشک چوں شد گوہر است  
بیدل کا سفر دہلی کہاں سے اور کس طرح شروع ہوا؟ اس سلسلے میں تذکرہ نگاروں میں اختلاف ہے۔ شاد عظیم آبادی کے بیان پر اعتبار کر کے ڈاکٹر عبدالغنی صاحب نے یہ فیصلہ کر دیا کہ:

”اس وقت (مرزا ظریف کی وفات کے وقت) اب ایسا کوئی آدمی نہ تھا جو بیدل کی حالت اور سرپرستی کرتا۔ اس کے پاس کوئی ذریعہ معاش بھی نہ تھا۔ اپنے روزمرہ کے اخراجات کا کیا کرے ایک مستقل دروسر بنا ہوا تھا۔ ایک کبڑی بڑھیا بیدل کے گھر آتی تھی اور اس کی ضروریات پوری کرتی تھی۔ یہ بڑھیا بیدل پر بہت مہربان تھی حتیٰ کہ اس پریشانی کے عالم میں بھی اس کا خیال رکھتی تھی۔ اس کا سلسلہ بھی کچھ زیادہ عرصے تک نہ چل سکا۔ اس قسم کے قرض سے اس کی صرف عارضی ضرورتیں پوری ہو جاتی تھیں۔ اس لئے لوگوں نے اسے دہلی جانے کا مشورہ دیا جو سلطین کا مرکز تھا جہاں وہ اپنے

رہتا تھا۔ بیدل نے اپنے انتہائی مختصر اٹائے کو ایک گھوڑے پر رکھا، باگ ہاتھ میں لی اور بیدل کے باکر اس سے رخصت ہوا اور ہندی کا یہ شعر کہا:

بب کوئی نہیں تب دشمن آپن کیس  
پٹنہ نگری چھاڑ دہن اب بیدل چلے بدلیس  
بڑھیا نے اپنی انگلیاں اکھبوں کے ساتھ جواب دیا:

بیدل بھی کرمت چھاڑو پوتا آپن نگری (۱۷۵۵ء)  
کے بیانات کے تحلیل و تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق زیادہ تر سماعی روایات سے ہے۔ مرزا قادر جو بیدل کے چچا تھے، ان کے بارے میں لکھتا ہے کہ بیدل جب سترہ سال کا تھا تو بنگالہ میں گیا جبکہ خود بیدل کے بیان کے مطابق مرزا قادر اس وقت بنگال روانہ ہوا اور بیدل اپنے وقت میں آیا اور جیسا کہ اس سے پہلے لکھا گیا ایسی حالت میں بھی وہ گاہے ماہے چچا سے ملتا رہتا تھا۔ شاد کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ رخصت ہوتے وقت بیدل پٹنہ میں تھا اور بڑھیا بیدل کی سرپرستی کرتی تھی وہیں رہتی تھی۔

بیدل نے ۱۷۵۵ھ/۱۶۶۵ء میں اڑیسہ میں ایک خواب دیکھا۔ اس کے ایک سال بعد دہلی

آ گیا۔

بھلا از کمال آن واقعہ درس یکہزار و ہفتاد و شش ہجری فال عبور بہ قیامتکہہ شہر دہلی

آ گیا (۱۷۵۵ء)

یعنی اس واقعہ کے ایک سال بعد ۱۷۵۶ء میں اقامتکہہ شہر دہلی سے گزرنے کا اتفاق ہوا۔

ایک قطعہ بھی اس نے سفر سے متعلق کہا ہے۔

نیک بہار سوی دہلی  
چون اشک رواں شدید نیکیں

دہلی کی طرف آنسو کی طرح بے یار و مددگار روانہ ہوا۔

شہود فضل بچوں  
ہمراہ حضور فیض اقدس

دہلی میں ان کے فضل و کرم اور فیض اقدس کے ہمراہ۔

تاریخ این عزیمت  
دریاب کہ ”راہبر خدا بس“ (۱۷۶۶ء)

اس سفر کا سال تاریخ ”راہبر خدا بس“ سے معلوم کر جس سے ۱۷۵۶ء نکلتی ہے۔

بلا اقتباس اور قطعہ کو سامنے رکھ کر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ۱۷۵۶ء میں اڑیسہ میں مرزا ظریف

دہلی کے ارادے سے مختلف شہروں سے عبور کرتا ہوا کم و بیش ایک سال کے بعد وہ

۱۷۶۶ء میں دہلی پہونچا۔ دوران سفر مختلف شہروں میں کچھ قیام بھی کیا۔ اس طرح وہ سب

سے پہلے پٹنہ پہنچ کر وہاں کچھ قیام کیا اور مرزا قلندر سے ملاقات کے انتظار میں رہا لیکن چونکہ مرزا بنگال سے واپس نہیں ہوئے اس لئے اپنی بیکی کا خیال کر کے دہلی روانہ ہوا۔ اس خیال کی تائید درج ذیل شعر سے بھی ہوتی ہے۔

بے یاس دل از فکر وطن برگزفتم تا آبلہ پا گشت گھر فال سفر زد  
ممکن ہے کچھ احباب نے بھی مشورہ دیا ہو مگر بڑھیا کا قصہ تو منجملہ ان حکایات کے ہے جو عام طور سے لوگ بڑی بڑی تاریخی شخصیتوں کے بارے میں گھڑ لیتے ہیں اور اسی وجہ سے اس کی کوئی سند نہیں پیش کی دوسرے یہ کہ جیسا کہ آئندہ صفحات میں پڑھیں گے بیدل ہندی زبان واقف نہ تھا اس میں شعر کہنا تو دور کی بات رہی (۲۳۷)۔ پٹنہ کے بعد راجم السطور کے خیال میں الہ آباد میں کچھ دنوں قیام کیا وہاں گنگا میں ہندوؤں کے غسل کا منظر جسے ”گنگا اشان“ یا کبھ کاسیہ ہیں اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔ مثنوی عرفان میں گنگا اشان یا کبھ کے میلے سے وابستہ ایسے اشعار دیں جو اس خیال کی تائید کرتے ہیں:

حاصل الامر ازاں سواد طرب موج می زد ہزار رنگ طلب  
غرض طرب و خوشی کے اس علاقے سے شوق ہزاروں رنگ میں موجزن تھا۔  
از سراندیپ تا حد ملتان شور لبیک دل گستہ عنان  
سراندیپ سے لے کر ملتان تک لبیک کے شور نے دل کی باگ توڑ رکھی تھی۔  
تا در آں کعبہ صفا تمثال شستہ خوانند نامہ اعمال  
تاکہ اس صفا مثال کعبے (گنگا) میں اپنے نامہ اعمال کو دھو ڈالیں۔  
بی محابا بطوفش از ہمہ سو ہند چوں سلی تیرہ داشت غلو  
اس کے طواف کے لئے ہر طرف سے ہندوستان ایک تاریک سیلاب کی طرح امنڈ اچلا۔  
سعی شبگیر ہا ہلاک سفر کز زلالش کشید جام سحر  
شبگیر (پچھلی رات کو عبادت کے لئے اٹھنے والوں) کی سعی اس لئے سفر کی نذر تھی کہ کسی  
جام صوبی اسی (گنگا) کے بیٹھے پانی سے نوش کریں۔

از ذکور و اناث کافہ ناس ہچو امواج سر ز پائش  
مرد و عورتیں غرض سب لوگ موج دریا کی طرح رواں دواں ہیں اور کسی کو سر پاؤں کا ہوش نہیں۔  
بہزار آفت نشیب و فراز گرم می تاخت ناقہ تگ و تاز (۲۳۸)  
پستی و بلندی کی ہزاروں آفات کے باوجود تگ و تاز کی اونٹنی گرم رفتار تھی۔

ان اشعار میں بیدل نے دریائے گنگا میں غسل کے لئے مرد عورتوں کے جوش و خروش، ان کے شوق اور ملک کے گوشہ و کنار سے وہاں ان کی آمد اور جم غفیر کا تذکرہ جس طرح کیا ہے اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس طرح کے مقامات بنارس اور الہ آباد کے سوا کوئی نہیں ہو سکتے۔ ان کی یہ حیثیت ہنوز برقرار ہے۔ حمید عظیم آبادی نے اپنے ایک مضمون ”بہار اور اردو“ میں

”بیدل جو پور عبور کر کے دہلی پہنچے۔“ (۲۳۹)

نے اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ خوشگو لکھتا ہے:

دہلی (اڈیسہ) سے میر کا مگار کی دعوت پر ہندوستان پہونچے، کچھ دنوں شہر اکبر آباد میں

قیام کیا اس کے بعد دار الخلافہ شاہجہان آباد پہنچے۔“ (۲۵۰)

خوشگو کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیدل میر کا مگار کی دعوت پر اڈیسہ سے ہندوستان یعنی دہلی پہونچے تھے اور دوسرے شہروں (۲۵۱) میں پہونچا اس کے بعد دہلی پہونچا۔ میر کا مگار کا مختلف مقامات پر فائز ہونا جیسا کہ ”احباب بیدل“ کے ضمن میں آنے گا واضح کرتا ہے کہ وہ ۱۱۱۳ ہجری ۱۷۰۲ء وادیہ کا ناظم تھا اور بیدل کی تمام مسافرتوں کو مد نظر رکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ ۱۰۷۶ ہجری سے دہلی آنے کے بعد اس نے پھر بہار اور اڈیسہ کا رخ نہیں کیا۔ میر کا مگار ۱۰۷۶ ہجری میں اپنے باپ جعفر خاں وزیر اعظم کے ساتھ دہلی میں رہتا تھا (۲۵۲) اور ظاہر ہے بیدل کے روابط اس وقت کے مذکورہ سال سے پہلے قائم نہیں ہوئے لہذا خوشگو کا بیان غلط فہمی پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ دہلی پہونچنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ بیدل نے وہاں اپنے بعض پرانے آشناؤں یا ہم ذوق احباب کے ساتھ ملاقات کی۔ ان میں بیشتر مجذوب قسم کے لوگ تھے، لکھتا ہے:

”جب اتفاق زیارت آشنائی کا ثابت قدم اس طریق سلوک دست بہم داد۔“ (۲۵۳)

یعنی اتفاق سے راہ سلوک کے ثابت قدم حضرات میں سے ایک آشنا کی زیارت حاصل ہوئی۔ حیدر آبادی کا بیان ہے:

”وہاں راہ میں حیران پریشان رہ کر دہلی پہونچے۔ استاد شاعروں کا مجمع تھا۔ شاعروں نے خوب خوب طبع آزمائیاں ہوتی تھیں۔ مرزا بھی شریک ہونے لگے۔ طبیعت نقاد اور فکر مند تھے ہی تھے تھوڑے دنوں میں شہرہ ہو گیا۔“ (۲۵۴)

اس کی اساس پر پروفیسر غلام حسن مجددی نے لکھا ہے:

”شاعروں کا شاو نے حوالہ دیا ہے اگرچہ ان کے نام واضح نہیں ہیں لیکن حقیقت یہ ہے

دلی میں شاہ کا بلی سے ملاقات:

دہلی پہنچنے کے بعد جو سب سے پہلا واقعہ پیش آیا وہ بیدل کی شاہ کا بلی سے ملاقات تھی۔  
موصوف سے اپنی ملاقات کی نوعیت بتانے سے قبل بیدل نے ایک مقدمہ لکھا ہے۔ شاہ موصوف کو  
کا جواب تصور کرنا چاہئے جو ایک سال قبل بیدل کے دل میں اٹھا تھا تب ہم اس رول کا صحیح  
تفسیر کر سکیں گے جو شاہ صاحب نے بیدل کی روحانی اور فکری بالیدگی میں ادا کیا ہے۔ بہتر ہے اس  
خود بیدل کے الفاظ میں ملاحظہ کریں:

”در بدایت احوال مدتها چون نفس بال جستوی افشاندیم ونی دانستم چہ می جویم شعلہ ای از  
طبیعت جوش می زد کہ شراردوش از عالم اسباب متصور نبود۔“

بال گرم طپش و مقصد پرواز نہاں آہ مجنوں روش واصل تک و تاز نہاں  
یعنی شروع میں عرصے تک سانس کی طرح کسی نامعلوم چیز کی تلاش میں سرگرداں رہتا تھا پر سمجھ  
تا تھا کہ آخر تلاش کیا کر رہا ہوں۔ طبیعت سے ایک شعلہ سا بھڑکتا تھا جس کے دھوئیں کی چنگاری  
اسباب کی چیز نہیں لگتی تھی۔ باز و گرم طپش ہیں پر مقصد پرواز نگاہوں سے اوجھل ہے۔ آہ کی کیفیت  
جیسی ہے اور اصل تک و تاز پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس کے بعد اپنی حقیقت کا سراغ لگا کر لکھتا ہے:

”پس از عری، چشم تماشا، بشہوداں جلوہ ام کشود کہ آئینہ حقیم چشمہ ایست از اسرار عالم  
ذلت، و آب و گل طہیتم جوہری منزہ از اعراض کدورت و کثافت تخیل ہستی، عنقائی بدام  
نفس کشیدہ۔ و تو ہم بال و پر، نفسی برای خود تراشیدہ۔ پرواز نہاں ام، آنسوی داغ امید و بیم  
است۔ و جولان معینم، خارج الفاظ تحقیر و تعظیم۔ بچہ مدعا بال کشایم تا کوشش دامن، بر جمعیت  
دل تواند افشاند؟ ہلکہ ام آرزو میل نمایم تا فطرت ذوق کمالی تواند ہم رساند؟ اگر با کدورت  
نفاختہ ام، طلب صفای چست؟ و اگر با ظلمت نیر داختہ ام، سودای نور تو ہم کیست۔“

ایک عرصے کے بعد چشم تماشا اس جلوے کا مشاہدہ کرتے ہوئے کھولا کہ میرا آئینہ حقیقت عالم  
ذلت کا ایک چشمہ ہے اور میری آب و گل طہیتم کدورت و کثافت کے لوٹ سے پاک ہے۔  
خیل نے ایک عنقا کو میرے دام میں گرفتار کر دیا اور تو ہم بال و پر نے اپنے لئے ایک نفس تراشا  
نہے۔ کاپرواز دماغ امید و بیم سے پرے ہے اور میرا جولان معنی تحقیر و تعظیم کے الفاظ سے  
کس مدعا کے ساتھ بال کشائی کروں کہ کوشش جمعیت حال پر دامن افشانی کرے؟ اور کس  
خوف مائل ہوں کہ فطرت ذوق کمال مہیا کرے۔ اگر میں کدورت سے آلودہ نہیں ہوں تو صفا  
پیدا ہوئی؟ اور اگر تاریکی میں پڑا نہیں ہوں تو نور کا سودا سر میں کیوں سمایا ہے؟

کہ شاہجہاں آباد پہنچنے کے بعد بیدل کو ایک نئے اسلوب شاعری سے آشنائی حاصل ہوئی۔  
خود اس نے اعتراف کیا ہے کہ جب تک بہار میں رہے کلاسیکی شاعروں کے اسلوب میں  
طبع آزمائی کرتے رہے۔ اس وقت اس کا دھیان اس امر کی طرف گیا کہ دارالحکومت میں  
ایک بالکل نئے اسلوب کا رواج ہے جسے ”سبک ہندی“ کہتے ہیں۔ مثنوی ”محیط اعظم“ پر  
جو چند سال بعد بیدل نے ایک مقدمہ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے عہد  
کے شاعروں کے کلام کا مطالعہ کیا ہے، اس نے بابر، جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب  
کے عہد کے جن شاعروں کا تذکرہ کیا ہے وہ ہیں ظہوری (وفات ۱۰۲۵ھ) ہلالی (عہد بابر  
کا شاعر)، زلالی (وفات ۱۰۳۱ھ)، سالک (عہد شاہجہاں کا شاعر)، شیدا (عہد جہانگیر  
کا شاعر) سلیم (وفات ۱۰۵۷ھ) اور صائب۔“ (۲۵۵)

جہاں تک بیدل کے مذکورہ بالا شاعروں کے کلام سے آشنائی کا تعلق ہے مرزا  
میں سلف کے کلام کے مطالعہ نے یہ کام بہت پہلے انجام دید یا تھا۔ اس لئے ان شاعروں سے  
آشنائی کا تذکرہ ضروری نہیں معلوم ہوتا ہے۔ ایک اہم نکتہ جو مثنوی محیط اعظم (سال تیسف  
۱۶۶۷ء) سے ظاہر ہوتا ہے یہ ہے کہ وہ مذکورہ بالا سال تک وہاں بڑی زحمتوں سے دوچار رہا۔  
کو پہنچنا تو دور رہا۔

گرفتارم ز گردوں دلی شاد نیست ز عدلش عیاں غیر بیداد نیست  
میں نے مانا کہ آسمان کے ہاتھوں کوئی دل خوش نہیں ہے۔ اس کے عدل و انصاف  
کے سوا کوئی چیز نمایاں نہیں ہو رہی ہے۔

مرا از کہ باید تعظم فروخت کہ بیداد اندیشہ خویش سوخت  
ظلم نے میری قوت اندیشہ کو جب نذر آتش کر دیا تو میں کس سے فریادری کے لئے  
دگر گشت در بحر آباد غم دو عالم جگر یک کباب  
رج و غم کی انگلیٹھی میں سیکڑوں جگر ظلم کی وجہ سے کباب بن گئے۔  
من از دور کلفت فروزم چرا خیال آتشی نیست سوزم چرا  
زمانہ کے ہاتھوں میں غم کو کیوں بڑھاؤں آگ کے تصور سے حقیقت میں آگ نہیں  
کہ اپنے آپ کو جلاؤں۔

نیم از محبان دنیا کہ من دہم شکوہ را دستگاہ سخن  
میں طالبان دنیا میں نہیں ہوں کہ شکایت پر اپنا زور قلم صرف کروں۔

آخر اس طرح اسے تسلی نصیب ہوئی:

”یاقہبای مراد امکانی یکسر از عالم تحصیل حاصل است۔“

امکانی یا مادی مقصد کی یافت سراسر تحصیل حاصل ہے اور شیوہ تسلیم و رضا کے عالم میں دل کی کیفیت ملاحظہ ہو:

”درحالی کہ از جہہ تسلیم، سپر انداختہ بودم، معلم اسرار ربوبیت گاہی بہ تعلیم سرخط نازم لیا نواخت و گاہی بہ تنبیہ آداب نیازم می گداخت۔“

یعنی ایسی حالت میں جبکہ پیشانی تسلیم سے میں نے سپر ڈال دی تھی اسرار ربوبیت ناز نامہ کی تعلیم مجھے دیتا اور کبھی آداب نیاز کا پاس دلچاظر کھنے کی تنبیہ کرتا تھا۔ گویا وہ اپنے وقت ناز و نیاز کی کشمکش میں گزارتا تھا۔ کبھی ذوق طلب کے دباؤ میں ناز میں مشغول ہوتا اور کبھی شیوہ تسلیم و رضا سے نیاز کی طرف متوجہ ہوتا تھا اس عالم میں اسے ایک دنیا نظر آئی:

”جہانی دیدم از محیط بی آرزو جو شیدہ و بزباں ہزار رنگ امواج خروشیدہ... ہمہ متفق کہ ماسوی اللہ اوہام است بروہم می چچند و جملہ متحد کہ غیر حق موجود نیست و خود را غیر می نمیدند۔“

ایک دنیا دکھائی دی جو ”آرزوؤں سے خالی“ دریا سے جوش مار رہی تھی اور ہزاروں لہروں کی زبان سے متلاطم تھی۔ ساحل مقصد کا پتہ نہ تھا پر سعی و تلاش کا سلسلہ طوفان غبار میں چل رہا تھا۔ گویا معلوم تھا پر غوطہ خوری کی کوشش بے اختیار جاری تھی۔ سب لوگ اس بات پر متفق تھے کہ سوا سب وہم ہے پھر بھی وہم پر بیچ و تاب کھار ہے ہیں اور سب لوگ اس امر پر متحد ہیں کہ کسی کا وجود نہیں ہے اور خود کو غیر سمجھے بیٹھے ہیں۔

”الحاصل بفضل ہمت یکتائی، لمبی بہ حرف آشنا داشتیم مخاطب دیگری نبود۔ اگر بہ خاموشی اتجا می بروم، غیر می در تامل نمی کشود۔ نشہ ای ز سانسیدم تا عشق بد اغم نرسد۔“

..... در آن حالت ہر گاہ غلبہ وجد مضرب اہتر از طبیعت می گشت این بیت بی اختیار بر زبانم می گذشت۔

از ہر چہ سرایت فزونی خود گوی چگویمت کہ چونی (۱۷۷)

اس سوال کا حاصل یہ ہے کہ ابتداء شعور میں بیدل عرصے تک اپنے دل کو کسی منزل کی طرف نہیں سرگرداں پاتا تھا لیکن منزل تھی کہ لگا ہوں سے اوجھل تھی۔ ایک مدت سے ہیں آوارہ منزل ہم لوگ اور منزل ہے کہ نظروں سے ہے پنہاں۔ کچھ دنوں بعد اس پر منکشف ہوا کہ وہ اسرار جہاں لطافت کا ایک چشمہ ہے جو کدورت

منزل میں صفائی اور پاکیزگی کی طلب کیوں پیدا ہو رہی تھی اس کے باوجود اس کا مقصد اور اس کے اندر سے اوجھل تھی۔ آخر کار تن بہ تقدیر شیوہ تسلیم و رضا کو اپنا اصول زندگی بنایا۔ اسی انداز میں ناز و نیاز کے متضاد تقاضوں کے تحت عجیب و غریب کشمکش میں گرفتار ہوا۔ یہ کشمکش تھی ”عین وغیر“۔ یعنی اس بات پر سب متفق ہیں کہ خدا کے سوا سب وہم ہے پھر بھی وہم پر بیچ و تاب کھارے۔ سوا کسی کا وجود نہیں پھر بھی خود کو ”غیر“ سمجھے بیٹھے ہیں قول و فعل میں یہ ناہما آہنگی ڈھنی گئی۔ اضافہ کر رہی تھی۔ اسی حالت میں درج ذیل شعر غیر شعوری طور پر زبان پر جاری ہوا۔

از ہر چہ سرایت فزونی خود گوی چگویمت کہ چونی  
گویا بیدل اللہ جل شانہ کی ذات کی کنہ تک پہنچنا چاہتا تھا لیکن اس سلسلے میں دانشوروں، فلسفیوں کے افکار و خیالات کا بہ غور مطالعہ کر کے وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ان کے بیانات حقیقت خدا ہے لہذا وہ لوگ خدائے تعالیٰ کی کنہ کے بارے میں مزید پیچیدگی پیدا کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ تب اس کا دل خدا کی طرف متوجہ ہوا خود اس سے اس کے تعارف کا طالب ہوا۔ اس طرح اور جس شکل میں بھی آپ کی تعریف کروں آپ اس سے بالاتر ہیں اس لئے آپ خود اپنے آپ کیا ہیں اور آپ کی حقیقت کیا ہے؟

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ”کنہ خداوندی کی تلاش“ ایک اہم سوال کی حیثیت سے بیدل کی زندگی میں رہتی ہے۔

آخر جس زمانے میں اس کا قیام اوڈیسہ میں تھا (یعنی ۱۷۷۰ء سے ۱۷۷۵ء) ایک رات عالم شعور میں شعر غیر ارادی طور پر اس کی زبان پر جاری تھا کہ اچانک ”الہام کدہ بی حرف صوت“ سے شروع ہوا۔ اس کے صفحہ قلب پر ظاہر ہوا۔

از ما باما ست ہر چہ گوئیم ما بچو توئی دگر چہ گوئیم

یعنی اپنے متعلق ہم جو کچھ کہتے ہیں وہ ہمارے ہی ساتھ مخصوص ہے بس یہ سمجھو کہ ہم بھی تمہاری طرح ہیں۔ اس سے زیادہ کیا کہیں۔

کنہ و حقیقت کو دوسروں سے زیادہ ہم سمجھتے ہیں اس لئے ہماری کنہ تک پہنچنے کا خیال ترک کر دیا۔  
موجودات و مخلوقات کے دائرہ فہم سے وراء الوراہ ہے۔

ای برتر از خیال و قیاس و گماں و وہم و زہر چہ گفتمہ ایم و شنیدیم و خواندہ ایم (احادیث)  
بیدل اس جواب سے کس قدر متاثر ہوا اس کے درج ذیل بیان سے قیاس کیا جاسکتا ہے  
”بمجر دایں ندا، خواب ماہوش از سرم دامن افشاند و موبہویم چون مژہ از خواب جست بھجرت  
باز ماند و نقاب حقیقت ان جلوہ، غیر از همان جلوہ باز نکشاید۔ شب ز پرتو خورشید چہ داند۔ و  
خورشید از سواد شب چہ خواند؟“ (۲۵۸)

اس آواز کا سننا تھا کہ میرے ہوش اڑ گئے، میرا بال بال پلک کی طرح خواب سے بیدار  
حیرت و استعجاب کا پتلا بنا ہوا تھا۔ اس حال کی کیفیت کا بیان اسی حال میں ممکن ہے اور اس میں  
حقیقت کا نقاب اسی جلوہ سے سرک سکتا ہے۔ رات کو سورج کے پرتو کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے اور سورج  
رات کی تاریکی کا کیا علم ہو سکتا ہے۔

یہاں بیدل خدائے تعالیٰ کی کنہ تک پہنچنے میں انسان کی بے بسی اور درماندگی کے نتیجے پر  
ہے اور اس ناپیدا کنار وادی میں خود کو ایک حیرت انگیز مقام پر کھڑا دیکھتا ہے۔

من آن شوقم کہ خود را در غبار خویش می جویم رہی در حیب منزل کردہ ام ایجاد می جویم  
میں کیا ہوں؟ وہ شوق ہوں جو آپ کو خود آپ اپنے غبار میں تلاش کر رہا ہے خود اپنی  
گریباں میں ایک راستہ بنا کر اس پر دوڑ لگا رہا ہوں۔

پہنچدیں اختلاف صورت و معنی، من بیدل جز او دیگر چہ می خواہم و انمود آئینہ  
بیدل! صورت و معنی کے اتنے اختلاف کے باوجود مجھے اس کے سوا کسی کی طلب ہے  
اس کے آئینے کا و انمود اور عکس ہوں۔

اس ”الہام کدہ بی حرف و صوت“ سے کون سی شخصیت مراد ہے؟ اس سوال کا جواب تب  
جب بیدل کی دہلی میں شاہ کاہلی سے ملاقات ہوتی ہے اس لئے خواب کے اس واقعے کو پیش نظر رکھتے  
ہوئے قارئین اب ملاقات کی اس نوعیت پر توجہ دیں۔

بیدل کا بیان ہے کہ اس واقعہ کے ایک سال بعد ۱۰۷۶ھ - ۱۶۶۵ء میں جب دہلی آیا  
اتفاق سے بعض جانے پہچانے صوفی مشرب حضرات کے حلقے میں میری رسائی ہوئی۔ گفتگو کے دوران  
مجذوبوں کا تذکرہ چھڑا تو ایک شریک محفل نے بتایا:

”مجذوبی در این ایام ویرانہ را بکچ حضور پر داختہ است۔ و گوشہ را بہ پرتو شمع اقامت نور

ساختم۔ از غریب احوال آئکہ ہر قدر طعام پیش بگذارند خاشاک باتش پر و دست۔ و  
چند آنکہ آب در نظرش عرضہ ہند، قطرہ بخاک سپردن۔ اما تا تکلیف طعمائی نہ نمودہ اند کہ اگر  
انہما بگذرد، شعلہ التفات اغذیہ اش ساکن برودہ خاموشیت۔ و تا مصدرع آبی نکرده اند،  
چشمہ رغبت اثر بہ اش محو تراوش بی جوشی الخ۔“ (۲۵۹)

”ایک مجذوب شہر دہلی میں ایسا وارد ہوا ہے جس کی حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جب کھانے پر  
میں پہنچتا ہوں تو جتنی بھی غذا رکھی ہوتی ہے سب چٹ کر جاتا ہے اور اگر ہفتوں سے آب و دانہ نہ ملے تو کسی  
کھانے کی بات اور نقاہت کا احساس اسے نہیں ہوتا اور بدستور اپنی طبعی حالت میں نظر آتا ہے، کسی سے  
پوچھ کرنا، اس قدر فروتنی اور خاکساری کے باوجود اس کے چہرے سے ایسی متانت اور اتار عجب  
ہوتی ہے کہ کسی کو اس کے مقابل ٹھہرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ جب بھی اس کی زیارت کو گیا دیر تک  
اسے نہ دیکھا نہ پایا۔ اس بنا پر کہ کبھی ”کابل“ میں نظر آیا تھا کچھ لوگ اسے ”شاہ کاہلی“ سے یاد کرتے ہیں۔  
میں سمجھتا ہوں کہ جو نبی دسترخوان بچھا اور کھانا چنا گیا وہ مجذوب اچانک مسکراتا ہوا آنکلا۔ سارے  
مصرعین اس کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ جب اسے کھانے کی دعوت دی گئی تو عین اسی حالت میں  
میں نے غریب پر پڑی، اس نے کھانا شروع کیا، چند لقمے کھائے ہوں گے کہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے  
کر اسے لوٹنے لگا اور اپنی قیامگاہ پر جو شہر سے باہر تھا، لے آیا۔ وہاں دونوں ایک دوسرے کے آنے  
کے ناموش بیٹھے تھے لیکن وہ تمام تر خاموشی کے باوجود بات کرنا نظر آ رہا تھا۔

منش است با تو بصدر رنگ گفتگو است شوق آرمیدہ است و فلک تاز جستجو  
حق خاموش ہوتے ہوئے بھی سیکڑوں انداز سے تم سے محو گفتگو ہے، شوق آرام و سکون سے  
میں کی جستجو آسمان پیاٹی کر رہی ہے۔

نذر مصر کے وقت سے لے کر رات کا کچھ حصہ اسی کیفیت میں بیت گیا۔ ایک عجیب و غریب  
حالت کی تھی۔ ایک طرف غور فکر کی صلاحیت جواب دے چکی تھی تو دوسری جانب اس کے سامنے  
حیرت انگیز کی جرأت مفقود تھی۔ اچانک انہوں نے مسکراتے ہوئے اسی شعر کو پڑھا جسے اوڑیہ میں عالم  
کاتب میں ”الہام کدہ بی حرف و صوت“ سے میں نے سنا تھا۔

از ما با ماست ہر چہ گوئیم ما ہچو توئی، دگر چہ گوئیم  
ہم جو کچھ اپنے بارے میں کہتے ہیں وہ ہماری ہی ذات کے ساتھ مخصوص ہے۔ ہم بھی تمہاری  
طبیعت میں اس کے سوا کیا کہیں۔

اس شعر کا سننا تھا کہ میرے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا اور ضبط کی باگ ہاتھ سے چھوٹی نظر آرہی

تھی۔ ایسی حالت میں دریافت کیا یہ شعر کس کا ہے؟

”ہمارا ہے، اس میں شبہ کی کیا بات ہے۔“

انہوں نے جواب دیا پھر پیر پھیلا کر لیٹ گئے اور بولے:

”ایک کشارچشم غیر از ”حیرت“ چیزی ندارد، باید خوابید۔ و بیداری جز ”تشویش“ باری آید۔“ (۲۶۰)

باید وا کشید۔“ (۲۶۰)

یہاں اگر آنکھیں کھولیں تو حیرت کے سوا کچھ پلے نہ پڑے گا اس لئے جو خواب ہو جانا چاہیے۔ بیداری سے تشویش کے سوا کچھ ہاتھ نہیں لگتا اس لئے لیٹ جانا چاہیے۔

اب شاہ صاحب تو خواب کی آغوش میں پہنچ چکے تھے اور میں اسی طرح حیرت کا پتلا کشکش سے دو چار تھا، نہ بھاگنے کی سکت تھی اور نہ نالہ کرنے کی ہمت۔ آخر کار رات کے آخری حصے میں مجھے بھی نیند آ گئی۔

صبح ہوئی، آفتاب کی کرنوں نے دنیا کو روشن کر دیا، نیند سے بیدار ہو کر اس ”نشر غیب“ کو ادھر ڈھونڈا کیا پر کہیں ان کا کوئی سراغ نہ ملا۔ کچھ دنوں تک دلی لگی کوچوں میں انہیں تلاش کرتا رہا کہیں ان کا کوئی نشان پتہ نہیں تھا۔

آن جلوہ غیب کایں تحیر آراست و انگہ چوں نگہ ز پیش چشم برخاست  
گر گویم خضر بود، ترک ادب است آنجا کہ حق است خضر و الیاس کجاست  
اس ”جلوہ غیب“ نے ”حیرت“ کا بازار سجایا پھر مثل نگاہ کے میرے سامنے سے اوجھل ہو گیا اگر یہ کہوں کہ وہ خضر تھا تو ترک ادب ہوتا ہے جہاں حق ہے وہاں خضر و الیاس کی کیا گنجائش ہے۔

شاہ کاہلی سے بیدل کی یہ پہلی ملاقات تھی اور اس کے جو نقوش اس کے صفحہ دل و دماغ پر ثبت ہوئے اس کا اندازہ اس کے درج ذیل بیان سے لگایا جاسکتا ہے۔

”لند الحمد کہ لعدہ وقوع آن کیفیت، ظلمت ہزار رنگ شبہات، از آئینہ یقینم زدود۔ و شکوک

یک عالم اہام، از صفہ اندیشہ ام پاک نمود۔ بحکم یخودی چون اشک سراز پانی شافتم و چون

نالہ، از کند تشویش بیرون می تاختم۔“

عالم ہمہ یک برق تجلی دیدم محل گردی نداشت، لیلی

زیں سرمہ کہ حق کشید در دیدہ من ہرجا لفظی دمید، معنی دیدم (۱۰)

خدا کا شکر ہے کہ اس کیفیت کی چمک نے ہزاروں طرح کے شبہات کی تاریکی کو میرے

یقین سے دور کر دیا..... پھر تو بیخودی کا یہ عالم تھا کہ آنسو کی طرح سر اور پیر میں خط امتیاز نہیں

کی طرح تشویش کے کند سے باہر نکل آیا تھا۔

ساری دنیا مجھے ایک ”برق تجلی“ کا کرشمہ نظر آنے لگی۔ کجاوے میں کوئی گرد و غبار نہ تھا اس لئے

(استثنا) پوری طرح نمایاں دکھائی دینے لگی۔ اس سرمہ کے بدولت جو خدا نے میری آنکھوں میں

جہاں بھی کوئی لفظ سامنے آیا میں اس کے معنی کی تہ تک پہنچ گیا۔

بیدل کے بیان سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ جس چیز کی تلاش میں وہ بیتابی سے سرگردان تھا وہ

شاہ کاہلی کے پاس مل گئی۔ ”جہاں“ اور ”جہاں آفرین“ اور دونوں کے ”درمیانی روابط“ کی

متعلق جو شبہات اس کے ذہن میں بیچ و تاب کھا رہے تھے شاہ کاہلی سے ملاقات کے بعد

نہ ہو گئے اور اس جدوجہد سے جس ایمان و یقین کا حصول اس کے پیش نظر تھا وہ اس کے ہاتھ

جب اس کی بیخودی کا عالم یہ تھا کہ مارے خوشی کے پھولا نہیں سماتا تھا۔ یہ یقین جو اس کی منزل تھی

حقیقت کائنات کے بارے میں اس کا یہ خیال تھا کہ وہ ایک ”برق تجلی“ سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

عالم ہمہ یک برق تجلی دیدم

یہ وہی خیال ہے جسے صوفیہ کی اصطلاح میں ”وحدت الوجود“ کہتے ہیں یعنی یہ کائنات خدائے

شریک لہ کی جلوہ گاہ یا ”جلوہ ذات احد“ بیدل کی تعبیر میں ہے ع

”عالم ہمہ جلوہ ذات احد است“

جس چیز پر نظر ڈالئے وہیں شاہد ازل نظر آئے گا۔ بظاہر محمل (کجاوہ یعنی کائنات) دکھائی دیتا

حقیقت میں محمل میں گرد تک نہیں ہے اور محبوب (خدای تعالیٰ جد مجد) براہ راست بغیر کسی پردہ

کے نظر آتا ہے۔

یہ ایک عظیم کامیابی تھی جو چند سالہ کاوشوں کے نتیجے میں اس کے ہاتھ لگی تھی۔ گویا مختلف ارتقائی

مرحلے طے کرنے کے بعد اسے بالآخر اپنی حقیقی منزل مل گئی۔ یہ بحث چونکہ بڑی حد تک ”وحدت

الوجود“ سے متعلق ہے اس لئے ہم اسے پانچویں باب ”بیدل کے افکار و خیالات“ کے لئے ملتوی

کرتے ہیں۔

اس کے بعد دو مختلف زمانوں ۱۰۷۸ھ اور ۱۰۸۰ھ میں بیدل کی شاہ موصوف سے دو ملاقاتیں

ہوئیں۔ ہر ایک ملاقات نے بیدل کی روحانی پیشرفت میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔

شاہ کاہلی سے دوسری ملاقات ۱۰۷۸ھ ۱۶۶۷ء میں متھرا کے بازار میں ہوئی۔ اس وقت

شاہ کاہلی کے مرض میں گرفتار ہو کر ایسا بے چین تھا کہ کسی ایک جگہ اسے قرار نہیں مل رہا تھا اور سدا سیر

میں وقت بتا رہا تھا۔ اسی حالت میں ایک دن بندرا بن کے علاقے سے اس کا گزر ہوا۔ دھوپ



کی تمازت کے سبب ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی آنکھیں نذر آتش ہو جائیں گی۔ جب شہر مقرر ہوا تو وہاں ایک انتہائی پر رونق بازار نظر آیا جہاں کی دکانوں میں مروت و انسانیت کی پستی چھوڑ کر ہر قسم کے ساز و سامان نہایت قرینے سے لگے ہوئے تھے۔ اسی دوران اس کا گزرا ایک دکان کے پاس سے ہوا جہاں بے قول بیدل ”وحدت اس کی کل پونجی تھی جہاں اس کے دیدہ تصور میں فیہ لئے کوئی گنجائش نہ تھی اور جب تک وہ خود پہلو نہیں بدلتا کسی اور کا خیال اس کے صفحہ ذہن پر نہیں آتا۔ اپنی سابقہ آشنائی اور مہربانی کے سبب اس نے تغافل کی بساط الٹ کر رکھ دی اور رشتے کی پیمائش سے سوئی کی آنکھ میں اس نے مجھے جگہ دی۔“ اس کے اصرار پر بیدل اس کے پاس بیٹھنے کو تو بیٹھا ہی تھا مگر خاطر ہونے کا اندیشہ اسے مضطرب کئے رہا۔ کیا عمدہ بات اس نے کہی ہے۔

بیک دو روزہ سرو برگ زندگی پسند کہ بہر خلق پی سود خود زیاں باش اگر غبار شوی، محو دامن خود باش چنان مباحش کہ تشویش دیگران باش یعنی دودن کی زندگی کے ساز و سامان جمع کرنے کے لئے اپنے فائدے کی خاطر کسی کا تصور گوارا مت کرو۔ اگر غبار ہو تو بھی اپنے ہی دامن میں محو ہو کر رہو ایسا نہ ہو کہ دوسروں کے لئے تشویش بنو۔

ایک گھنٹہ بھی ابھی نہیں بیتا تھا کہ ایک شخص دوکان کے سامنے آکر کھڑا ہوا۔ رفوگر نے عرض کیا: حضرت تشریف رکھئے۔ اس آدمی نے جواب دیا: یہ دردمند میرے دوستوں میں ہے پرسی کا ارادہ ہے تاکہ لہہ بھر کیلئے ایک دوسرے کے حالات سے باخبر ہو جائیں۔ دردمند کی وجہ سے بیدل آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا کہ پرانے آشنا کی آواز اس کے کانوں میں ٹکرائی، فوراً اس نے آنکھیں کھولیں دیکھتا کیا ہے کہ شاہ کا بلی رفوگر کی جگہ تشریف فرما ہیں ”صدیق“ اور مائل بہ نوازش ہیں اور چاروں طرف سے کٹ کر ساری توجہ میری حالت پر مرکوز کئے ہوئے ہیں۔ شاہ صاحب کی ملاقات سے بیدل کو بڑی خوشی ہوئی مگر سلام کی پہل کرنے سے پہلے شاہ صاحب نے فرمایا:

”ساعتی بخواب، تانہ ستائیم، عالم بیخودی، ہم عین شعور است و صحبت خواب نیز آئینہ حضور۔“

”جب تک ہم یہاں بیٹھے ہیں تم تھوڑی دیر سو رہو۔“ عالم بیخودی ”بھی عین عالم شعور“

ہے اور ”صحبت خواب“ بھی آئینہ حضور ہے۔“

شاہ صاحب کے بیان کی بیدل نے ایک نظم میں وضاحت کی ہے جس میں خواب و بیداری کی بحث فلسفیانہ انداز سے کی ہے اس لئے اس کو پانچویں باب ”بیدل کے افکار و خیالات“ میں بیان کر دیا گیا۔

نرخ شاہ صاحب کے حسب ہدایت بیدل نے جونہی آنکھیں بند کیں اس کا درد جاتا رہا اور کچھ دیر بعد جب بیدار ہوا تو شاہ صاحب کی تلاش شروع کی پر کہیں ان کا کوئی نشان پتہ نہ تھا۔ اپنی کیفیت کا اظہار اس طرح کیا۔

”ہر چند اثری از درد چشم، محسوس تامل نمی نمود۔ اما ہر طرف چشم می کشود، درد دل طوفان

قیامت اچھتہ بود۔ نہا سودا، ہتا زگی دوبالا گردید۔ و شور جنون مکرر بردماغ پیچیدہ۔“

یعنی درد چشم کا گو کوئی اثر محسوس نہ تھا پر جدھر آنکھیں کھولتا درد دل نے ایک طوفان قیامت کھڑا کیا تھا۔ ”نہ سودا“ از مرنو دوبالا ہو گیا تھا اور ”شعلہ جنون“ نئے سرے سے دماغ میں بھڑکنے لگا تھا۔

شاہ موصوف سے بیدل کی تیسری ملاقات ۱۰۸۰ھ/۱۶۶۹ء میں دہلی کے بازار میں ہوئی۔ اس

وقت میں بیدل کی شادی ہو چکی تھی اور ذریعہ معاش کی خاطر وہ اورنگ زیب کے تیسرے لڑکے

اورنگ زیب کے دربار سے وابستہ ہو گیا تھا۔ اعظم شاہ کے دربار سے بیدل کی وابستگی کی نوعیت اور مدت پر

تاریخات میں بحث ہوگی۔ مجموعی طور پر آزاد منش بیدل ازدواجی زندگی اور سپہ گری کے بندھنوں

میں گرفتار نہ ہو کر کچھ مطمئن نہیں دکھائی دیتا ہے۔ اس صورت حال کو پیش نظر رکھتے ہوئے شاہ صاحب

نے تیسری ملاقات کی تفصیل سنئے۔

ایک دن بیدل عربی گھوڑے پر سوار ہو کر دہلی کے بازار سے گزر رہا تھا، اس کا گھوڑا ہوا سے

اٹھ رہا تھا۔ دور سے کچھ لوگوں کی بھیڑ نظر آئی جن کی نگاہیں بیدل پر لگی ہوئی تھیں۔ جس قدر وہ ان

کی قریب ہوتا جا رہا تھا اس کی شخصیت اسی قدر تماشا گاہ بنتی چلی جا رہی تھی۔ اس نے اس کی وجہ جانی

تھی۔ جب ان کے بالکل قریب آ گیا تو ایک تماشا گاہ کو بولتے ہوئے سنا:

”دوستو! دیکھو ایک دیوانہ اس سوار کے پیچھے دوڑا چلا آ رہا ہے اور گھوڑے کے قدموں سے

قدم ملا کر قرض کرتا ہوا آ رہا ہے۔“

بیدل نے جو پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ شاہ کا بلی کا ”جمال خورشید تمشال“ تھا جس نے پردہ غیب

خاک سے ”ذریعہ بیتاب“ کو اپنی نگاہ مستی پناہ کی آغوش میں لے لیا تھا۔

فورا گھوڑے سے اترا اور چاہا کہ جلد سے جلد ان کے قریب پہنچ کر ان سے بغل گیر ہو لیکن شاہ

صاحب نے پہل کی اور انتہائی لطف و محبت سے اپنی آغوش میں کھینچ لیا۔

یہ بی پردہ دیگر تاب خود داری کراست ای رفیقاں! نوبہار آمد کنوں دیوانہ ام

دوست پردے سے باہر آ گیا اب ضبط کی تاب کہاں۔ اے دوستو! نوبہار آگئی اب تو میں

بیدل گیا۔



پاس ہی ایک دوکان خالی پڑی تھی۔ شاہ کے حسب ہدایت دونوں وہاں جا کر بیٹھ گئے۔

”جیسے پہلے تھے“ شاہ صاحب نے جواب دیتے ہوئے کہا ”اور جس حوصلہ و ہمت نے پہلے کیا تھا، تمہاری شخصیت کے انداز میں جو انقلاب آیا ہے وہ قدرت کی کرشمہ سازی ہے۔ یہاں طوفان رنگ نے موسم کی باگ توڑ کر رکھ دی ہے۔“

مطلب شاہ صاحب کا یہ تھا کہ جس طرح پہلے تم روحانی اور باطنی فضائل کے حصول کے لیے کمر بستہ رہتے تھے وہ صورت حال ہنوز برقرار ہے حالانکہ تمہاری شخصی خصوصیت ایسی لگتی ہے کہ یہ غنیمت کے بعد نقطہ عروج پر پہنچے گی پر اب تک تم اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کا اندازہ نہیں لگا سکے۔

توان حسی کہ با صد کیف و کم، خود را نمی یابی      ز بس آئینہ داری در عدم، خود را نمی  
تم وہ حسن ہو جس میں کیف و کم (مقدار اور وصف) دونوں چیزیں موجود ہیں لیکن  
آپ سراغ لگا نہیں پارے ہو۔ دنیائے عدم میں تمہارے پاس بے شمار آئینے ہیں لیکن خود ”آپ  
نہیں پہنچ پارے ہو۔

اگر صد عمر پرواز تو صرف جستجو گردد  
نقدس جوہر رمز کمالت کیست دریابی  
بیدل نے جواب دیا:

”عقلم تجرد، بریشیتا مل تنیده است۔ و بهار آزادی، بشاخ و برگ تعلق گردیده اما نسیم گلشن، بان رواج خبر است که نهال یکتا نسیم، بآبیاری نیرنگ علایق شمریکه عبارت از نتائج باشد۔ نخواهد بست، تا آنقدر بار خاطر تو اندر گردید۔“

ختم تجرد، ریشہ تماثل سے بن چکا ہے (میری شادی ہو چکی ہے) اور ”بہار آزادی“ شہر  
برگ کے تعلق سے وابستہ ہو چکی ہے۔ پرچمن کی بانہیں اس امر کو واضح کرتی ہیں کہ میری  
پودے میں نیگ علاقہ کی آبیاری سے وہ پھل جس کو نتیجے سے تعبیر کیا جاتا ہے نہیں لگے گا۔

شاہ صاحب نے اس کا جواب بڑی تفصیل سے دیا۔ چونکہ شاہ صاحب سے بیدل کی تہنیت اور آخری ملاقات تھی اس لئے پچھلی دو ملاقاتوں میں جو تنگی رہ گئی تھی شاہ صاحب نے اسے دور جن حقائق و معارف کو انہوں نے اشاروں اور کنایوں میں سمجھایا تھا ان کو تفصیلی سے بیدل کے گوش کرنا چاہا اس بنا پر ان کا تفصیلی بیان نقل کیا جاتا ہے۔

شاہ کاہلی کے ارشادات کو بیدل کے افکار و خیالات کا نچوڑ سمجھنا چاہیے۔ بیدل نے

نے ازدواجی زندگی کا طوق گلے میں ڈال لیا ہے تاہم میرے باطنی احساسات بتاتے ہیں کہ ”نہال یکتائی“ ہوں اور ہر طرح کے قیود و شرائط سے آزاد ہو کر صرف خدائے جل جلالہ کے لیے ہوں۔

حب نے بیدل کے خیال کی تائید کرتے ہوئے فرمایا:

۱۰ - کردارستان ای، ما افراد بیم یکن له کفوا احد - لطیف مطلقیم، تاملکہ حقیقت  
 "عالم کثیف" نامیدہ۔ و بہار نیر کیم، از تصور کیفیات خود، شاخ و برگ بر ہم تراشیدہ۔  
 ۱۱ - کشاف، غبار آئینہ لطافت است۔ و نہ تخیل شاخ و برگ، حجاب بہارستان نزاہت،  
 ۱۲ - ہم نفس، وجود تا عدم ہی سپر است و یک حرکت مژہ، غیب تا شہود تا بل نظر۔ تا چشم  
 ۱۳ - ایم تہا بل کردہ است۔ و تا مژہ بستہ ایم معنیہا پی بردہ۔ نفسی در دل گرہ بستہ ایم تنج  
 ۱۴ - معانی، نقد کیسہ تخیل، و نسبی در غنچہ وز دیدہ ایم، بہار رنگ عبارات، صورت آئینہ تامل۔

سال قدر تيم، بآرش مرآت افشار سیده - نفا شوقيم، مقیم ساغر دماغ گردیده - خیالیم در عرض تصور کائنات سرایت نموده - و نگاهیم، باعتبار کل صور نقاب تحقیق کشوده - اینجا لطیف، چنان لطیف است، واسطه چشم و گوش بهانه - و تزییه، آئینه تزییه است گفت و گوی جسم و

نفس، جزو و بچون است، از قعر "عدم مطلق" تا ساحل "وجود متقید"، طوفان  
 زشتی و مومن - و نگاه، بست و کشاد در پیچه غیب است، عینک پرداز مطالعه خلوت و  
 - اینکه "عالم" می خوانیم، صفحه دلی مطالعه کرده ایم - و آنچه "اشیا" می دانیم، سطرنگاهی

دیده - ”دل“ اجتماع کیفیت علوم است - و علوم ادراکات معانی نامفهوم - و سوسه از  
شیدن، هم صنعتی است، و اوهام بر خود بستن نیز قدرتی - در وادی ظهور کسب ما  
است - نه اظهار غیبت، هر قدر توانی، در لباس کوش - و تا ممکن است خود را به خود

۱- باسمه بی تعنی، ”غیر“ عبارت لعین ماست، یعنی حصول توهم پیدا کی۔ ”وعین“  
یعنی صفی، یعنی تفاعل اوضاع خود نمائی۔ ”صفت“ بی ذات معدوم است۔ تا ملی باید  
”ذات“ بی صفت موهوم چیزی نمی توان نمود۔ ہر جا موهوم صفات سیستم، ذاتیم۔ و

حضرت باسّم آمدہ ایم۔ صفاتی۔ (۲۶۳)

ہے جو تم نے سمجھا۔ اس کے بعد ”وحدت در کثرت“ اور ”خلوت در انجمن“ کی وضاحت فرمایا کہ ہم لوگ درحقیقت ایک ایسے خاندان کے افراد ہیں جس کا عنوان ہے ”لم یکن

کی یہ آیت خدائے تعالیٰ کے اوصاف کے تذکرے میں آئی ہے یعنی یہ کہ وہ اکیلا

سب کا مقصد یہ ہے کہ راہ سلوک کے مسافروں کو حتی الامکان یہی ”رنگ احدیت“ اختیار ہو جائے۔

شونی لباس، ہماں سر بجیب باش در ”عالم شہود“ ز مردان غیب باش  
باس کی تمام تر شونی کے باوجود تم سر بگریباں رہو ”عالم شہود“ میں بھی مرد غیب کی پوزیشن

ہر حقیقی است، نیاز مجاز ما بچند ”شوق موی“ و ”در شعیب“ باش  
ہمارے مجاز کا نیا حقیقت کا نانا ہے تھوڑی دیر ”شوق موی“ اور ”در شعیب“ بن کر زندگی گزارو۔  
نامہ خیال ”دوئی“ گرم کردہ ایم مائیم و عرض آئینہ گوجلوہ غیب باش  
”دوئی“ کے تصور کا ہنگامہ ہم نے گرم کر رکھا ہے ہم ہیں اور آئینہ سامنے ہے کہد ”جولوہ“ غیب

ہم کے بعد ”عین وغیرہ“ کے مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں تمام تر ”بے تعین“ کے باوجود  
”عین“ کی عبارت ہے یعنی ”تو ہم پیدائی“ کا حصول اور عین بی صفی کی اصطلاح یعنی ”اوضاع خود  
”بے تعین“ ہے۔ ”عین“ سے مراد وجود ہستی ہے لہذا جو لوگ نظریہ ”ہمہ اداست“ کے قائل ہیں وہ  
”بے تعین“ اور وجود کا انکار کرتے ہیں اس کے باوجود ”غیر ہمارے درمیان سے نہیں جاتا۔ ہاں ایسی شکل  
”ہستی“ ہماری قوت و اہمکی اختراع اور ایجاد ہے اور ”عین“ سے مراد ”بے صفی“ (خالی عن الصفات)  
”بے تعین“ جب ہم ذات کو صفت سے الگ ہو کر دائرہ خیال میں لاتے ہیں تو ”عین“ سامنے آتا ہے  
”بے تعین“ ہے اپنی اس ”خاکِ ہستی“ کو ”عین ذات احدیت“ کا نام دیں اس لئے ایسی صورت میں  
”بے تعین“ سے احتراز کرنے پر مجبور ہیں۔ یہاں شاہ صاحب ذات و صفت اور ان کے باہمی تعلق کی  
”بے تعین“ میں یہ واضح فرماتے ہیں کہ صفت بغیر ذات کے معدوم ہے یعنی ذات کے بغیر صفت  
”بے تعین“ ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح ذات بغیر صفت کے موهوم ہے یعنی بغیر صفت کے ذات کی  
”بے تعین“ کی جاسکتی۔ اس لئے دونوں کے تعلق کی نوعیت لازم ملزوم کی ہے۔ اس مقدمہ سے ہم اس  
”بے تعین“ میں کہ جب کبھی ہم صفت سے متصف نہیں ہوتے ہیں تو ہم ذات ہیں اور اگر صفت سے  
”بے تعین“ ہیں تو ہم صفات ہیں۔

بیدل نے ایک غزل کے ذریعہ شاہ صاحب کے خیالات کا لب لباب پیش کیا ہے۔  
”تو ہم“ کا موتی اور سمندر ہے، نہ سفر گزریں نہ اقامتی قدم و حدوث تخیلی، نہ شکستی و نہ سلامتی  
”تو ہم“ کا موتی اور سمندر ہے، نہ سفر اختیار کر اور نہ کہیں قیام کر۔ تیری قدامت و حداشت

ہے کوئی اس کا شریک و سا جھی نہیں اور نہ مد مقابل ہے گویا خدا کی ہستی لاٹانی ہے۔ ہم انسان  
پیدائش کے لحاظ سے انسانی خاندان کے افراد شمار ہوتے ہیں، پر اس بنا پر کہ اپنی ہستی کو خدا کی ہستی میں  
کر دیا یا فانی اللہ ہو گئے اور ہر چیز سے گٹ کر اس سے وابستہ ہیں اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ ہم خدا  
ایزد، کے افراد ہیں۔ ایک طرف ”لطیف مطلق“ ہیں، جسے عالم کشف، کہتے ہیں وہ اپنی حقیقت کا  
کدہ ہے۔ دوسری جانب ہم ”بہار نیرنگ“ ہیں کہ اپنے مختلف کیفیات و جذبات کی وجہ سے شام و  
تراشا کرتے ہیں۔ ”عالم خاک“ سے تعلق کے باوجود ہماری ساری توجہ اس جہاں پاک کی طرف ہے۔  
اس دنیا نے پلید کی کثافت کا خیال اس دنیا کے پاک کی لطافت کے آئینے کا غبار نہیں بناتا اور نہ  
برگ کا تصور ”بہارستان نزاہت“ کے لئے آڑ ہوتا ہے۔ ہمارا وجود و عدم دونوں باہم اس قدر قریب  
واقع ہوا ہے کہ ان دونوں کے درمیان نیم گام نفس، سے زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ اسی طرح ہمارے غیب  
شہود کے درمیان پلک کی ایک جھپک سے زیادہ کوئی تفاوت نہیں ہوتا ہے۔ ”نفس“ کیا ہے؟ غیب  
جذر و مد، جب عدم سے نکل کر منصوبہ وجود میں قدم رکھتا ہے تو ”ماومن“ کی تعبیر کے ذریعہ دوسروں سے  
خود کو ممتاز کرتا ہے۔ ”نگاہ“ کیا ہے؟ غیب کا بست و کشاد۔ جب واہوتی ہے تو انجمن کا مطالعہ کرتی ہے  
اور جب بند ہوتی ہے تو ”خلوت“ کے مطالعہ میں مصروف ہو جاتی ہے۔ جسے ”عالم“ کہتے ہیں وہ حقیقت  
میں ”صفیر دل“ ہے، جسے ”دل“ کہتے ہیں وہ درحقیقت نام ہے گونا گوں علوم و معارف کی پاک و  
”علوم“ نام ہے نامفہوم معانی کے ادراک کا، یعنی جب مفہیم و معانی واضح ہو کر ہمارے دماغ میں  
ہوتے ہیں تو ہم انہیں ”علم“ کہتے ہیں۔ اس وادی ظہور میں جسے ”عالم آب و گل“ کہتے ہیں ہم  
سانس لیتے ہیں تو ہماری ساری تنگ و دوغیریت، کہلاتی ہے۔ زیادہ واضح الفاظ میں ہماری ساری  
وجہ جو کامرکز و محور ایسی چیزیں ہوتی ہیں جو خدائے تعالیٰ سے بیگانگی کی نسبت رکھتی ہیں کیونکہ یہ چیزیں  
زیادہ تر کھانے پینے، پہننے اوڑھنے اور رہنے سہنے وغیرہ بنیادی اور غیر بنیادی ضرورتوں کی تکمیل  
وابستہ ہوتی ہیں۔ گویا ہمارا تعلق خدا سے ہر حال میں برقرار رہتا ہے حتیٰ کہ جب ہم اپنے  
ضروریات کی تکمیل کر رہے ہوتے ہیں ہمارا تعلق اس مرکز پر کار سے نہیں ٹوٹتا۔ وہ واحد چیز جس کا  
ہم ”تفاوت“ کی حیثیت سے کر سکتے ہیں وہ ہے ان کا دشو کی ”غیریت اور بیگانگی“ اس لئے  
ہدایت اور صلاح ہے کہ امکانی حد تک آپ کو خود آپ اپنے لباس میں پوشیدہ رکھو۔ حقیقی لباس صوبہ  
نزدیک ”لباس احدیت“ ہے جو عارفوں کے جسم پر پوری طرح راس آتا ہے۔ اسی قسم کے لباس  
لئے قرآن پاک میں ”صبغة اللہ“ (خدا کا رنگ) کی تعبیر آئی ہے اور اس کی اہمیت کو واضح  
ہوئے قرآن پاک کہتا ہے ”ومن احسن من اللہ صبغة“ اور اللہ سے بہتر کس کا رنگ ہو سکتا

تخیل کی کرشمہ سازی ہے۔ (ورنہ درحقیقت) ٹوٹا ہوا ہے تو اور نہ سلامت ہے۔

جمعیت حقیقت بیخزاں و وطن طربکہ جاوداں الٰہی بخود بز ہی کماں کہ تو عشرتی و غنہ تیرا چمن خزان سے عاری ایک حقیقت ہے، تیرا وطن ایک ابدی طرح لگا ہے۔ تو تو سراپا نیست نہامت ہے الم کو اپنے پاس پھٹکنے مت دے۔

بفلک فروغ تو در نظر، بز میں بہار تو جلوہ گر بہ چمن سحاب و بگل سحر ہمہ جا ظہور آسمان پر تیری روشنی اور چمک دکھائی دیتی ہے، زمین پر تیری بہار جلوہ گر ہے تو چمن میں اور پھول میں سحر کی شکل میں ہے غرض ہر جگہ تیری کرامت و شرافت کا ظہور ہے۔

چو ز خود بخود نظری کنی، روی از خود و دگری کنی تو مگر چنین ہنری کنی کہ بگویت چہ ماحول جب تو خود آپ اپنے اوپر (یا اپنی ذات اور ہستی پر) غور کر لے گا تو آپ اپنے "خود" سے نکل کر کچھ اور ہو جائے گا۔ ایسا کوئی ہنر اور فن دکھا کہ ہم یہ پوچھنے پر مجبور ہوں کہ آخرت چیز کی علامت ہے؟

بہ بیان کمال شریعتی، بہ بغل شگوفہ طریقتی بخیاں حشر حقیقتی، تو قیامت تو قیامت بیان کے لحاظ سے تو "کمال شریعت" ہے اور پہلو میں تو "انوکھی طریقت" کا حامل ہے خیال میں تو ایک محشر حقیقت کا ہے۔ تو قیامت واقع ہوا ہے تو قیامت واقع ہوا ہے۔

شاہ موصوف کی باتوں سے بیدل کتنا متاثر ہوا اس کا اندازہ اس کے درج ذیل بیان سے جاسکتا ہے۔

"مطالعہ اسرار" حیرتی "غبار نگاہم گردید" "بیخودی" درد ماغ شعورم پیچید۔ (۲۶۳)

اسرار "حیرت" کا مطالعہ میرے لئے غبار نگاہ بن گیا اور "بیخودی" میرے دماغ کے شعور رچ بس گئی۔

لیکن جب اسے ہوش آیا تو شاہ صاحب بیدل کو اکیلا چھوڑ کر وہاں سے روانہ ہو چکے تھے۔ دلدار رفت و بیخودیم در کنار ماند تمثال جست و آئینہ حیرت شکا محبوب روانہ ہو گیا پر میری "بیخودی" میرے پاس رہ گئی۔ تمثال جست کر کے روانہ ہو گیا اور آئینہ "حیرت شکا" رہ گیا۔

بیدل نے شاہ صاحب کے یہ ارشادات اس وقت قلم بند کئے ہیں جب تیسری ملاقات سال گزر چکے تھے یعنی ۱۱۰۰ ہجری کے آس پاس پھر بھی اپنی شخصیت اور روح پر شاہ صاحب کے اثرات کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

"امروز پست سالت، مست خیال آن ساغرم، و از خمار کلفجہای ہستی، بی خبر۔ مامور معیت ذوقم، ہر چہ فرماید۔ و مجبور ساقی شوقم، ہر چہ پیاید۔ گاہی در کسوت عبارت "معنی" بجوہ ایم۔ و گاہی بکیفیت معنی نقاب عبارت می کشایم۔ گردش بہ تسلسل کشیدہ است۔ و پرواز خیال، بر پطیدن تنیدہ۔ تا آن "پرکار تسلسل" کی بمرکز بر آید، و این پرواز خیال چہ وقت آشیانی نماید۔" (۲۶۵)

آج بیس سال ہو گئے اس "ساغر خیال" سے مست ہوں اور "ہستی" کی کلفتوں سے لاعلم ہوں، ہر وقت کی ہدایات پر اس کی رفاقت بجاتا ہوں اور شوق کا ساقی جس چیز کا دور چلائے اسے اختیار کرتا ہوں۔ "عبارت" کے لباس میں "معنی" نظر آتا ہے اور کبھی "معنی" کی کیفیت میں نقاب "عبارت" لگا دیتا ہے۔ گردش تسلسل کی صورت اختیار کر گیا ہے اور پرواز خیال آمادہ طیش ہے۔

بیدل کا انداز بیان ذرا پیچیدہ ہوتا ہے اس لئے اس کا ترجمہ کرنا آسان نہیں خصوصاً اس وجہ سے کہ اس کی معمولی بات بھی استعارات و کنایات کے حسین لباس میں ادا ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی ترجمہ ضروری ہے۔

شاہ کا بلی نے معرفت کی جو شراب بیدل کو پلائی تھی اس نے اسے ایسا مست کر دیا کہ اپنی ہستی کا شعور نہیں رہا اور زندگی کی کوئی خوشی یا ناخوشی اسے متاثر نہیں کر سکی۔ جب سے نظم و نثر کی شکل میں شعور سامنے آئے سب اس صوفیانہ اور عارفانہ ذوق کے زیر اثر تھے جو شاہ صاحب اسے ملاقات اور صحبت کے بعد اس کے اندر پیدا ہوئے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایک نمایاں شخصیت سے اس کی فانی ملاقات اس کے قلب و دماغ پر غیر فانی اثرات چھوڑ گئی۔ اس کے فکری سفر کا یہ نقطہ عروج تھا کہ اس کی سوچ کے دھارے کو ہمیشہ کے لئے متعین کر دیا اور مضامین کے لحاظ سے بھی اسے اتنا مست کر دیا کہ اپنے بیان کی ساری صلاحیتوں کو ان کی توضیح و تبلیغ اور تفسیر کے لئے وقف کر دیا۔

شیخ محمد اکرام بیدل کے ان روحانی اساتذہ کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"یہ تھے وہ حالات جس کے اندر بیدل کے عہد شباب کے قیمتی لمحات ان کے زیر اثر گزرے۔ اس کے نتیجے میں اس کے اندر غیر مرئی اور موہوم اشیاء کی طرف اس کا میلان شہا ہوا جس نے اس کے کلام کو ایک خاص رنگ عطا کیا۔" (۲۶۶)

اس انصاری مرحوم کا خیال ہے:

"یہ میں شاہ قاسم نے ان کی روحانیت کو نکھارا اور دہلی میں شاہ کا بلی سے انہوں نے معرفت کے رموز حاصل کئے۔" (۲۶۷)

لیکن جس طرح ہم نے بیدل کی فکری اور روحانی ارتقاء کا مطالعہ کیا اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوا ہے کہ ”وحدت الوجود“ سے متعلق جو شبہات بیدل کو تھے شاہ کابلی نے ان کے دور کرنے میں اہم ادا کیا اور جیسا کہ آئندہ صفحات میں آئے گا ”وحدت الوجود“ بیدل کی شاعری کا ایک اہم ترین عظیم ترین موضوع ہے اس لئے اس کے کلام کو ”دور دراز اور غیر مرئی اشیا“ کی طرف منسوب کرنا چاہئے۔

یہاں تک روحانی اساتذہ کی صحبت سے بیدل کے استفادے کا تذکرہ تھا اور اس میں شک کہ ہر ایک نے بیدل کے شاعرانہ ذوق کی آبیاری اور روحانی و فکری بالیدگی میں اہم رول ادا کیا۔ شاہ کابلی کے بعد بیدل کی ملاقات بیشتر نوابوں، زمینداروں اور شہزادوں سے نظر آتی ہے لیکن ان میں سے کسی کیلئے وہ ”خورشید نگاہ و عالی ہمت“ کی تعبیر استعمال نہیں کرتا۔

اب ہم ایک بار پھر ۱۰۷۶ھ ۱۶۶۵ء کی طرف واپس لوٹتے ہیں جبکہ بیدل نے دہلی وہاں کے سماجی و ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کیا۔

اس موقع پر شاہ محمد شفیع وارد طہرانی کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان (جس کا بظاہر دہلی، اکبر آباد، متھرا اور اس کے آس پاس کا علاقہ مراد ہے) پہنچ کر بیدل نے سب سے پہلے مرزا سلیمان کا تعارف حاصل کیا اور اس کی وفات تک اس کی صحبت میں رہا۔ مرزا سلیمان محمد شاہ عالم بہادر شاہ کا ماموں تھا۔ وارد لکھتا ہے۔

”میرزا بیدل در کمال جوانی رو بہ ہندوستان آورد و در صحبت میرزا سلیمان خالوی حقیقی سلطان محمد معز الدین خلف شاہ عالم بن عالمگیر سالہا بسر برد۔ بعد فوت میرزا سلیمان، در سلک ملازمان اعظم شاہ بن عالمگیر منسلک گشت بیت الغزل دیوان اعتبار گردید۔“ (۲۶۸)

مرزا بیدل نے عقوان شباب میں ہندوستان کا رخ کیا اور پہلے مرزا سلیمان جو سلطان محمد معز الدین خلف شاہ عالم بن عالمگیر کے حقیقی ماموں تھے، کی صحبت میں کئی سال گزارے۔ مرزا سلیمان کی وفات کے بعد اعظم شاہ بن عالمگیر کے ملازموں کی صف میں شامل ہو کر اس کے دیوان ”بیت الغزل“ ثابت ہوئے۔

رقعات بیدل میں مرزا سلیمان کے نام دو خطوط ملتے ہیں۔ یہ خطوط دونوں کے درمیان روابط پر روشنی ڈالتے ہیں۔ مرزا سلیمان اس سے محبت کرتا تھا اور اس کی سرپرستی بھی کرتا تھا۔ حد تک اس کے اخلاق حمیدہ سے متاثر تھا۔ لکھتا ہے:

”ہر چند غبار بی سرو پا در ہوا ی دامن مقصود سراپا پیش بود، بی توجہی نیم اقبال امداد جراتی

نرمود۔ در گرہ انتظار از امید گفتگی چنی را فراہم دارد و بہ شکر نغمای آن صبح بہار اخلاق و احسان نفسی شمارد۔“ (۲۶۹)

یہ بی سرو پا گرد (بیدل) دامن مقصود کے حصول میں اگرچہ سراپا پیش تھی (آپ کی طرف سے) توجہ کی توجہی نے اس کی جرأت کی مدد کی۔ گفتگی کی امید میں گرہ انتظار میں ایک چمن فراہم ہے اور اس بہار اخلاق و احسان کی صبح بہار کے شکرے میں نفس شماری کرتا ہے۔

ولیم ہیل کا بیان ہے کہ مرزا سلیمان عالمگیری عہد کے ایک وزیر تھے اور فضائل خاں کا خطاب مرزا موصوف لہذا میں اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ سرخوش نے اس کی تاریخ وفات بتائی ہے۔

شد شیخ سلیمان بہ سوی دارفا و ارست ز قید ہستی بی سرو پا (۲۷۰)

سلیمان نے جہان فانی سے کوچ کیا اور ہستی بی سرو پا کی قید سے آزاد ہو گئے۔ اب شاہ وارد کے بیانات کو اگر درست مانا جائے یعنی یہ کہ مرزا سلیمان کی وفات کے بعد شاہ عالم شاہ کے دربار سے وابستہ ہوئے تو لازم آتا ہے کہ یہ واقعہ ۱۱۰۹ھ میں پیش آیا جو کسی طرح صحیح ہے اس لئے کہ بیدل کے بیان کے مطابق ۱۰۷۹ھ - ۱۶۶۸ء میں شادی کے بعد اسے فوراً دہلی کی فکر لاحق ہوئی اور چونکہ پہلے سے اسے سپہ گری کا تجربہ تھا اور آبائی روایت بھی یہی رہی تھی اس لئے شاہ عالم کی ملازمت اختیار کر لی۔

”ناچار متبع سنت آباء گردید و طریقہ سپاہ گردید۔“ (۲۷۱)

میرزا آبائی روایت کی پیروی کی اور سپہ گری اختیار کی۔

اس لئے یقینی طور پر ۸۰-۱۰۷۹ھ ۱۶۶۸ء کے آس پاس ملازمت اختیار کی ہے قابل ذکر ہے کہ نام بیدل کے ایک خط سے جس کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس کی سال ۱۰۸۰ھ ۱۶۶۹ء ہے اس کے علاوہ خود بیدل کا بیان ہے کہ ۱۰۹۶ھ ۱۰۸۰ھ ہجری تک ۱۱۰۸ھ سال شکر اللہ خاں کی حمایت اور سرپرستی میں دہلی میں زندگی گذاری۔ ۱۱۰۸ھ ہجری میں شکر اللہ خاں کی وفات کے موقع پر ان کے صاحبزادے کے نام ایک تعزیتی خط لکھا گیا ہے:

از دست رفتن دامن دولتی کہ سلسلہ موافقتش دوازده سال محرک عمرت آہنگی ساز انفاص چشم عبرت یکبارہ بر روی ادبار کشود۔“ (۲۷۲)

اپنا پروردگار کا بیان شک و شبہ سے خالی نہیں ہے۔

لیکن مرزا سلیمان کے لئے بیدل کے الفاظ ”آن صبح بہار اخلاق واحسان“ بتاتے ہیں اس کی ملازمت میں نہیں رہے تو کم از کم اس کے حسن سلوک سے زیر بار رہے۔  
بیدل کے رفات سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی میں اپنے قیام ۷۷-۷۶ھ ۱۰۷۶-۱۰۷۵ء میں دوران شاہجہاں آباد کے ایک نامور امیر اور نواب عاقل خان رازی کے اوصاف حمیدہ و اخلاق پر اور ان کے خاندان کے بابت بیدل کو کچھ معلومات حاصل ہو چکے تھے۔ بیدل نے مرزا حمایت کے حصول کے لئے فیصلہ کیا کہ ان سے خوشگوار تعلقات قائم کیا جائے۔ عاقل خان نے بیٹے قیوم خان کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

”لہذا الحمد للہ تہذیب اخلاقیہ شایستہ این خاندان کرم آشیاں است انچی شنود گوش محامد نیوش، ذخیرہ سعادت می انپارڈ“ (۲۷۳)

بھمد اللہ اس تہذیب اخلاق کی بابت جو اس خاندان کرم آشیاں کے سزاوار ہے جو مرزا گوش محامد نیوش اس سے ذخیرہ سعادت اکٹھا کر رہا ہے۔

عاقل خان رازی سے اس کے اولین تعارف کی دلیل یہ ہے کہ ۷۸-۷۷ھ ۱۰۷۸-۱۰۷۷ء میں نے اپنی پہلی مثنوی ”محیط اعظم“ لکھ کر انہیں پیش کیا اور اس میں لکھا ہے کہ حسب وعدہ جناب ملاقات میں قدرے تاخیر ہوگئی اس لئے مثنوی پیش کر کے معذرت چاہتا ہوں۔

”وعدہ آں قرب سعادت، بہ بعد این ہمہ مدت کشید..... محیط اعظم را وسیلہ آرزش قصور نمودہ بہارگاہ قبول معذرت فرستاد۔“ (۲۷۴)

عاقل خان رازی کا شمار اورنگ زیب کے با اثر امرا میں ہوتا تھا۔ مرورایام کے ساتھ ہر کے تعلقات نہ صرف عاقل خان رازی بلکہ ان کے پورے خاندان خصوصاً داماد شکر اللہ خان کے نہایت مستحکم ہو گئے تھے۔ اس لئے یہاں رازی کے مختصر حالات کا تذکرہ بہ محل نہ ہوگا۔ مولوی محمد خان نے واقعات عالمگیری، کے انگریزی ترجمہ میں عاقل خان کے حالات مختلف منابع اور ذرائع ایک جگہ جمع کر دئے ہیں اس لئے من و عن اس کا ترجمہ پیش ہے:

میر عسکری جو عاقل خان رازی کے نام سے زیادہ مشہور تھے خراسان کے خانی سادات تعلق رکھتے تھے لیکن ان کی پیدائش ہندوستان میں ہوئی۔ وہ اورنگ زیب کے ابتدائی حامیوں میں سے تھے، اس لئے اپنی تخت نشینی کے وقت ہی اورنگ زیب نے انہیں ”عاقل خان“ کا خطاب دیدیا تھا۔ کا سرکاری عہدہ اکثر بدلتا رہا۔ انہوں نے اپنا منصب ترک کر کے دودفعہ ریٹائرمنٹ کی زندگی بسر کی لیکن شاہی عنایات اور مراحم نے انہیں دوبارہ درباری و سرکاری خدمات کو قبول کرنے پر آمادہ کیا۔

مرزا سلیمان نے جو حوالے ان کے بارے میں ملتے ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ وہ کبھی درباری اور سازشوں میں شریک نہیں ہوئے۔ انہوں نے پرامن زندگی گزارنے کو ترجیح دی جس میں وہ میوں میں اپنا وقت گزارا کرتے تھے۔ شعر شاعری ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ انہوں نے ایک مثنوی میں یادگار کے طور پر چھوڑی ہیں، لیکن نثر میں ”واقعات عالمگیری“ کے سوا کوئی اور کتاب ان کی طرف منسوب نہیں ہے۔ شاعری میں اپنا تخلص رازی اپنے مرشد حضرت برہان الدین رازی سے غیر معمولی عقیدت کی بنا پر اختیار کیا اور خانی اس لئے کہے جاتے تھے کہ ان کے اباؤ اجداد کے باشندے تھے۔

قل خاں نے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، شہزادہ اورنگ زیب کی خدمت میں سرکاری عہدوں پر شروع کیا۔ شہزادے نے جب شاہجہاں سے ملاقات کے لئے جو بیمار تھا، دکن سے دہلی کا رخ کیا تو خاں ”بخشی دوم“ کے عہدے پر فائز تھا۔ اسے شہر دولت آباد کے نظم و نسق کے لئے چھوڑ دیا گیا اور اس کا منصب بڑھا کر پندرہ سو ذات اور پانچ سو سوار کا کر دیا گیا۔ اورنگ زیب کی تخت نشینی کے بعد شہزادہ معظم کی مصاحبت کا حکم ملا۔ یہاں وہ دو آہ کے فوجدار مقرر ہوئے اور ان کا منصب پندرہ سو ذات اور ایک ہزار سوار کر دیا گیا۔ ۷۲-۷۱ھ ۱۰۷۲-۱۰۷۱ء میں خرابی صحت کی بنا پر انہیں اپنے منصب سے سبکدوش اور ریٹائرمنٹ کی اجازت ملی اور نو ہزار روپے سالانہ کی پنشن ان کے لئے منظور کی گئی۔ ۷۳-۷۲ھ ۱۰۷۳-۱۰۷۲ء میں کشمیر کے سفر سے واپسی پر اورنگ زیب نے لاہور میں اپنا دربار منتقل کیا اور عاقل خان نے جو اس وقت وہاں قیام پذیر تھے، شاہی خدمت میں دوبارہ داخل ہونے کی اجازت کی ظاہر کی اور انہیں ان کا منصب عطا کیا بلکہ دو ہزار ذات اور سات سو سوار کے عہدے پر انہیں فائز کیا۔ یہاں وہ بادشاہ کے حشم و خدم کی صف میں شامل ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ دہلی پہنچتے ہی شہزادے نے انہیں داروغہ غسٹخانہ کے عہدے پر فائز کیا۔ تین سال کے بعد ۷۷-۷۶ھ ۱۰۷۷-۱۰۷۶ء میں شہزادے کی ہزار ذات اور سات سو سوار کے عہدے پر ترقی ملی یہ واضح نہیں ہے کہ داروغہ غسٹخانہ کے عہدے پر انہوں نے کتنی مدت تک کام کیا۔ لیکن اتنا پتہ چلتا ہے کہ ۷۹-۷۸ھ ۱۰۷۹-۱۰۷۸ء میں وہ شہزادے کا چوکی کے عہدے پر فائز تھے۔ بارہ ہزار روپے سالانہ پنشن کے ساتھ وہ دوبارہ اپنے عہدے سے سبکدوش ہوئے جس کی منظوری ۷۷-۷۶ھ ۱۰۷۷-۱۰۷۶ء میں ہوئی۔ اپنی سبکدوشی کے دوران بھی وہ شہزادے سے اپنا تعلق بدستور برقرار رکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ شاہی فرمان کے تحت شاہ عالم بہادر نے سات ہزار کی مالیت کا خلعت اور شمشیر انہیں عطا کیا۔ اس کے فوراً ہی بعد ۸۰-۷۹ھ ۱۰۸۰-۱۰۷۹ء میں وہ بخشی تن کے عہدے پر فائز دکھائی دیتے ہیں۔ اورنگ زیب کے ۲۳ ویں جلوس کے

سال (۱۶۹۱ء میں) دارالخلافہ دہلی کے صوبے دار کے عہدے پر وہ فائز ہوئے اور خلعت اور منجلیکہ  
شمشیری ان کو عطا کیا گیا۔ اپنی وفات ۱۱۰۸ ہجری ۹۷۶-۱۶۹۶ء تک وہ اس عہدے پر بحال رہے۔  
کہا جاتا ہے کہ عاقل خاں اپنے فرایض کی ادائیگی میں بڑے پابند اور دلیر تھے، انہوں نے  
آزادی اور صاف گوئی سے کام لیا، اپنے سے بالا افسروں کے سامنے گستاخ رہے اور غربت و افسوس  
ذاتی زندگی میں بھی انہوں نے ضبط نفس کا دامن ہاتھ سے نہیں دیا۔ وہ فیاض، دریا دل، سخی، ایمان  
مخلص اور متدین قسم کے آدمی تھے۔ اسے خارج از امکان نہیں کہا جاسکتا کہ ان کی ادا فرض میں پابندی  
اور افسراں بالا کے ساتھ گستاخی ان کی عارضی سبکدوشی کا سبب بنا ہو لیکن ان کی خلصانہ اور بے باک  
خوبیوں اور اوصاف کو اورنگ زیب نے بجا طور پر قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھا اور ان کے لئے  
مراحم کی سفارش میں کبھی پیچھے نہیں رہا۔ (۲۷۵)

یہ ساری تفصیلات ایک امیر کے بارے میں بہ ظاہر یہاں ایک بے تکلیفی بات معلوم ہوتی  
لیکن بیدل کے بیان ”خاندان کرم آشیاں“ کی توثیق دوسرے ذرائع سے ضروری تھی اس لئے  
تفصیلات سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی تھی۔

بہر حال عاقل خاں رازی کے توسط سے ان کے داماد شکر اللہ خاں اور وزیر اعظم جعفر خاں  
بیٹے مرزا کامگار خاں سے ان کا تعارف ہوا۔

۱۰۷۸ ہجری ۱۶۶۷-۱۶۶۷ء میں بیدل متھرا کی سیاحت کرتے بھی دکھائی دیتے ہیں۔  
کی شاہ کاہلی سے دوسری ملاقات ہوئی جس کی تفصیل شاہ موصوف کے تذکرہ کے دوران آچکی ہے۔  
پہلی مثنوی ”محیط اعظم“ لکھ کر عاقل خاں رازی کی خدمت میں پیش کی۔ اس مثنوی کے مطالعہ سے  
ہوتا ہے کہ دہلی میں اپنے دوسالہ قیام کے دوران بیدل اپنے بعض سرپرستوں کی توجہ اپنی طرف مبذول  
کرانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

گرفتہ ز گردوں دلی شاد نیست ز عدلش عیان غیر بیداد نیست  
میں نے مانا کہ آسمان کی گردش سے دل خوش نہیں ہے پر اس کے انصاف سے بیداد کے  
کوئی چیز نمایاں نہیں ہے۔

اس لئے اس مثنوی کو نواب موصوف کی خدمت میں پیش کر کے انکی عنایات کا چشم  
رہا ہے۔ لکھتا ہے:

”حصول سعادت این اشعار موقوف درود و لقی است کہ منظور مطالعہ تواند گردانید۔ و عروج  
رتبہ این افکار و اسرار زبان سعادتیکہ بقبول اصفا تواند رسانید۔..... باہمہ فحلت زمیں

میر بہا، کند عجز بہ چنین خفته امید رسائیست کہ جذبہ لمعات ہدایت ورق افسردگی برگرداند  
و شبنم خاک نشین مارا بہا، چمن خورشید حضور رساند۔“ (۲۷۶)

اس اقتباس کے خط کشیدہ حصے سے مترشح ہوتا ہے کہ بیدل کو عاقل خاں رازی کی طرف سے  
بہت خواہ جواب ملنے کی توقع تھی نیز یہ کہ مثنوی کے مطالعہ کے بعد بیدل کی شاعرانہ لیاقت و  
تalent کا اندازہ لگا کر وہ اسے ملاقات کی دعوت دیں گے۔

غرض بیدل متھرا میں اپنے لگا تار تین سالہ قیام کے خوشگوار لمحات کو انتہائی خوشی کے ساتھ یاد  
رہے اور خصوصاً ہندوؤں کے تیوہاروں کے دلکش و دلربا مناظر کی تصویر کشی کرتا ہے جہاں بانسری  
بجانے والے گویوں نے اس کے رونق میں غیر معمولی اضافہ کر دیا تھا۔ بیدل لکھتے ہیں:

”بلدہ متورا، کہ سوادش از ہنگام دواغ گشتن، و اغیست سیاہی بیرون انداختہ، و ہوایش همان  
دشت آہی، در تلاش مطلب نایاب، رنگ تسکین باختم۔ سر شک گو پیان، ہنوز از خیمہ اش،  
موج خیر است۔ و صدای بانسری، تا حال از نی کوچہ ہائش شعلہ آہنگ غبار انگیزی۔“

”جب سے متھرا سے رخصت ہوا ہوں اس کا علاقہ باہر پڑے ایک سیاہ داغ کی حیثیت رکھتا  
ہے۔ اس کی محبت و دشت ناک آہ کی طرح ایک مطلب نایاب کی تلاش میں امن و سکون ہاتھ سے  
نکلے گا۔ گویوں کے انسواں کے خیمے سے ہنوز موجزن ہیں اور بانسری کی آواز اس کی گلی کوچوں  
کے گوشے گوشے سے ہنوز گرد و غبار فضا میں بکھر رہی ہے۔

زمینکے محبت اثری کا شتہ است گرد او خرمن چندین طیش انپاشتہ است  
جس سرزمین میں محبت اثر انداز رہی ہے اس کے گرد دھڑکنوں کا ایک کھلیان اکٹھا رہا ہے۔

بہار یکہ ازین کوچہ و زید است نسیم جگر چاک ز جیش علم افراشتہ است  
اس گلی سے موسم بہار میں جب کبھی باد نسیم چلی ہے اس کی صبح کے چاک جگر نے اپنا علم اٹھایا ہے۔

تن شوق شو و وادی مجنون دریاہ مشہد سوخجاں بوی دل داشتہ ست  
سراپا شوق بن جا اور وادی مجنون کا سراغ لگا (آتش محبت کے) جلے ہوئے لوگوں کی  
لہجہ سے دل کی بو آ رہی ہے۔

متھرا کا قصہ:

متھرا میں اپنے تین سالہ قیام کے دوران بیدل کو ایک عجیب و غریب واقعہ سے سابقہ پڑا، جس  
کے نتیجے میں ”خن“ کی حقیقت کا سراغ اسے ملا۔ اس واقعہ کی اس حیثیت سے بڑی اہمیت ہے کہ بیدل کی



افتاد طبع کی تشخیص و تعیین میں اس سے بڑی مدد ملتی ہے اس لئے اس کا تذکرہ یہاں ضروری ہے۔

مقتدر میں ایک قلعہ تھا، بیدل کا ایک دوست قلعہ دار کے عہدے پر فائز تھا۔ ایک دن قلعہ دار نے بیدل سے کہا: کچھ اوپر تین سال سے یہ قلعہ جناحوں کی دست دراز یوں کا شکار ہے۔ ایسا کوئی کام نہیں ہے جہاں اجنبی کی تباہ کاری کی وجہ سے اس کا سارا سکون و رہم برہم نہ ہو گیا ہو۔ اُن کی آغوش میں سنگ باری کی وجہ سے اس علاقے کے لوگوں کی زندگی تلخ ہو کر رہ گئی ہے۔ بہت سے عزائم خانہ اور اپنی کوششیں کیں۔ پران کی تحریکیں کاروائیاں کسی طرح موقوف نہ ہوئیں۔ یہی صورت حال اگر رہی رہی اور اس پر روک نہ لگائی گئی تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ یہ آبادی ایک دن کھنڈر کی شکل اختیار کرے۔ بیدل کا بیان ہے کہ اس کی ان باتوں کو سننے کے بعد میرے صفحہ دل پر درج ذیل شعر کا اظہار ہوا۔

با عفاریت جہانی دگر جانی کم نیست مکانی دگر

یعنی جنوں کے لئے دنیا میں اور بھی جگہیں ہیں کہیں کوئی تنگی تو ہے نہیں۔

درج بالا شعر کو سو کھے قلم سے لکھ کر کاغذ قلعہ دار کے حوالے کیا اور تعویذ کے اصول کے مطابق اسے ہدایت کی کہ ایک نیزے پر لٹکا کر قلعہ پر نصب کر دے۔ قلعہ دار نے ایسا ہی کیا۔ اس عمل کے بعد ہی سنگباری اور آتشبازی کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔ اپنے تین سالہ قیام کے دوران بیدل نے ان باتوں سے جو قلعہ میں آمدورفت رکھتے تھے، رابطہ قائم کیا اور ان کے حالات دریافت کئے۔ سب نے بالآخر یہ ظاہر کیا کہ تب سے اب تک مکمل سکون ہے۔ یہ تو تھا ایک واقعہ۔ بیدل نے یہاں اجنبی کی موقوفی کو ”خن“ کا اثر قرار دیا۔ کہتا ہے:

ای دماغ فطرت سرگرم سودای خن زیں بیاں دریاب اسرار اثر ہای خن

اے وہ شخص کہ تیری فطرت ”سودای خن“ میں سرگرم ہے (تجھ پر خن یا شاعری کا خط سوار ہے)

اس بیان سے ”خن“ کے اثرات کا اندازہ لگا۔

نقطہ و خطی کہ از پرکار امکان دیدہ ای فہم کن قدرت نگار یہاں اجزاء خن

پرکار امکان سے جو نقطہ اور خط بناتے ہیں دکھائی دیتا ہے اس میں اجزاء خن کی کرشمہ سازی پر غور کرو۔

دستگاہ رنگ و بوی عالم غیب و شہود نیست غیر از صورت پنہاں و پیدائی خن

عالم غیب و شہود کی دستگاہ رنگ و بوی خن کی ظاہر و باطن صورت کے سوا کچھ نہیں ہے جن دنوں

سب اس حکم کی تاثیر کے آئینہ دار ہیں افسوس اس طبعیت پر ہے جو خن کے اس اشارے سے بے خبر ہوئے۔

کیست زین تمثال نیرنگی باز در رنگ ہوش می رود از خود خن ہم در تماشا خن

ایسا کون ہے جس کا ہوش و حواس تمثال نیرنگی سے اڑ نہ جائے۔ خن کے تماشا کے لئے

(خ) خود بخود نکلتی چلی جاتی ہیں۔

زمین تا آسمان یک حلقہ آغوش اوست تک نتوان کرد از بیداشی جای خن

زمین سے آسمان تک سارا علاقہ (خن کا) ایک حلقہ آغوش ہے۔ بے علمی اور نادانی سے خن

کو نہ دیکھتے تو کم نہیں کیا جاسکتا۔

بہت مضمون دیگر بر طلسم خود مہند جز خن دیگر چہ داری ای معمای خن

اپنے طلسم و جود پر کسی اور مضمون کی تہمت مت لگاؤ (کسی اور چیز کی طرف دھیان مت کرو)

معمای خن یہاں ”خن“ کے سوا کیا رکھا ہے۔

ممکن ہے کہ قول بیدل یہ ”خن“ کی کرشمہ سازی ہو پر راقم السطور کے خیال میں اس کی ایک اور

وجہ بھی ہے۔ ایام طفولیت میں بیدل جب اپنے چچا مرزا قلندر کے زیر تربیت مولانا کمال قادری کی

مجتہ سے استفادہ کر رہا تھا آسیب زدگی کا اسی طرح کا ایک واقعہ وہاں پیش آیا تھا۔ بیدل اپنے

بچپن کے ساتھ کھیل میں مشغول تھا قریب کے گھر والے کی بیوی پر آسیب کا اثر ہوا۔ خبر ملتے ہی

بیدل نے کسی کی انگلی پر اسم اعظم دم کر کے کہا کہ آسیب زدہ کے کان میں رکھو۔ جو نبی اس نے یہ عمل کیا

تو اس کا پیچھا چھوڑ دیا۔ مولانا موصوف نے بیدل کو اپنے پاس بلا کر ارشاد فرمایا:

”با خبر باش طالع سلیمانی نظیر است و نفست عیسوی اثر“ (۲۶۹)

واضح رہے کہ تیری قسمت سلیمان نظیر اور تیرا سانس عیسوی اثر ہے۔

اس موضوع پر ”بیدل کے افکار و خیالات“ کی فصل کے تحت تفصیل سے بحث کریں گے۔

ہمیں معلوم ہے کہ بیدل کی شاہ کاہلی سے پہلی اور دوسری ملاقات نے اس کی حیرانی اور

حیرت میں اتنا اضافہ کر دیا تھا کہ کہیں بھی اسے قرار نہیں ملتا تھا ہمیشہ سیر و سیاحت میں زندگی گزارتا اور

اس پر سے تجربہ زندگی نے کسی مخصوص جگہ کا پابند نہیں رکھا تھا۔

بیدل کی شادی:

آخر ۱۰۸۰ ہجری ۷۰-۱۶۶۹ء کے آس پاس دہلی میں بیدل رشتہ ازدواج سے منسلک ہو گیا اور

ان سال شاہ کاہلی سے اس کی تیسری ملاقات ہوئی۔ ملاقات کے دوران اپنی ازدواجی زندگی کا تذکرہ وہ

اس انداز سے کرتا ہے:

”بعد از ملاقات ثانی کہ کاوش آشفکہ دل، بیکرار رسیدہ بود، دود انگیزی خرمن ہوش بہ شعلہ

کشیدہ۔ تا زمانہ اضطراب تسکین داغی بہم رسانید، دو سال دیگر گذشت۔ و تا موسم وحشت



باعتماد تلمی گرایید، فصلاً منقشی گشت ..... آخر الامر معنی تجربہ، بہ عبارت تعلق تحریر یافت، ونشہ مطلق رمز خمار متعبد شگافت (۲۸۰)

یعنی دوسری ملاقات کے بعد (جو ۱۰۷۸ ہجری میں ہوئی تھی) جبکہ آنکھ دہ دل کی کاوش، با معرض وجود میں آرہی تھی اور خرمن ہوش کی دو انگیزی شعلے کی صورت اختیار کر چکی تھی جب اضطراب کا زمانہ سکون کا داغ فراہم کرے دو سال اور بیت گئے اور وحشت و سرگردانی کا موسم جب اعتدال کی صورت اختیار کرے فصل کا وقت نکل گیا، غرض ”تجربہ“ کا مفہوم ”تعلق“ کی عبارت سے آراستہ ہوا اور ”نشہ مطلق“ نے ”متعبد“ کے خمار کے رمز میں شگاف ڈالی۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ شیخ محمد اکرام کا یہ خیال کہ بیدل نے ۱۰۷۸ ہجری میں شادی کی غلط فہمی پڑی ہے۔ (۲۸۱)

بہر حال بیدل نے اگرچہ ازدواجی زندگی میں قدم رکھ دیا تھا پر مکافہ سے اسے معلوم ہوا اس (ازدواجی زندگی) کے آثار کا نمایاں ہونا ایک مصلحت کا تقاضا ہے اس لئے تو الدو متاقل وسوسے سے خاطر جمع رہنا چاہئے۔ بیدل کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

”کل کردن آثار این کیفیت متقنی مصلحتی است، خاطر از وسوسہ توالدو متاقل باید پرداخت“ (۲۸۲)

یہ مصلحت کیا تھی؟ اس عبارت سے ایسا ترشح ہوتا ہے کہ یا تو بیدل نے اپنی شریک حیات سے سانسے خود کو نامرد پایا چنانچہ نبی ہادی صاحب نے تو فیصلہ ہی کر دیا کہ رجولیت ہی سرے سے غائب تھی۔ (۲۸۳) راقم السطور کے خیال میں سماج میں غیر شادی شدہ آدمی کا کوئی مقام نہیں ہوتا اور وہ لٹڈورا کہلاتا ہے۔ اس لئے یا تو سماجی حیثیت یا محض اپنی عصمت و پاکدامنی کی خاطر شادی کی، اولاد کی خاطر نہیں اس بنا پر بیوی کے ساتھ اس کا برتاؤ اس طرح کا بے اعتنائی نہ تھا مگر آخری عمر میں لڑکے عبدالغنی کی ولادت سے واضح ہوتا ہے کہ بیدل نامرد نہیں تھا اس لئے یہ طے ہے کہ (پہلی) بیوی کے بانجھ پن کی طرف اشارہ ہوا اور یہ بھی ممکن ہے چونکہ اس کا فطری رجحان خالق کائنات کے بوقلموں مظاہر پر غور و فکر کی طرف تھا اس لئے اس کے عشق کے سامنے ہوس کی کارفرمائی کے لئے کوئی گنجائش نہ ہونا چاہئے کہتا ہے:

مجبور عشق را بہ ہوسہا چہ نسبت است تسلیم جو مست دل، بہ تمنا چہ نسبت است یعنی جذبہ عشق سے مغلوب آدمی کو ہوس سے کیا تعلق دل کا کام تو رضائے الہی کے سامنے ڈال دینا ہے، اسے اپنی آرزو اور تمنا سے کیا تعلق؟ اس موضوع پر مزید بحث ”بیدل کی شریک حیات کے ضمن میں ہوگی۔“

شاہ کی خدمت میں ملازمت:

روزی آخر نگذاشت دامن ما گندم قفای آدم از بس دوید و نان شد اب جبکہ ازدواجی ذمہ داریوں کو اس نے قبول کر لیا تھا تو فطری طور پر ”باقاعدہ معاش“ کی فکر امن گیر ہوئی۔ اس وقت فوجی خدمت اختیار کرنے کے سوا کوئی اور راستہ اس کے سامنے نہ تھا۔ یہ گری اس کا آبائی پیشہ تو تھا ہی پچھلی زندگی میں اسے اس کا کچھ تجربہ بھی حاصل ہو چکا تھا۔

”در اس حالت کسی کہ اہل معاش بالزام آن ناگزیرند مناسب حال تحیر مال خودی دید، ناچار متعجب سنت آباء گردید و طریقہ سپاہ گزیہ، تا طبیعت خرسند از آفات تعین ورع، چندی در سایہ تیغ، امان داشتہ باشند۔ و رحم غرور تقوی بسر داری این وضع، دامن ناموس بی تعینی خراشد“ (۲۸۳)

ایسی حالت میں صاحب معاش آدمی کو جس چیز کا اختیار کرنا ناگزیر ہوتا ہے وہ اپنے حال کے مناسب نظر نہیں آتی تھی۔ مجبوراً آبائی روایت کی پیروی کی اور سپہ گری اختیار کی تاکہ وہ بیت جوق تقوی و ورع کی حد بند یوں سے کسی طرح مطمئن نہ تھی کچھ دنوں تیغ کے سایہ تلے اسے امن حاصل ہوا اور غرور تقوی اس ہیئت کدائی کی قیادت میں ناموس بے تعینی (فانی الوجود) کے دامن کو چارہ نہ کر دے۔

یہاں سے واضح ہوتا ہے کہ بیدل کا مقصد اپنی ضروریات کی تکمیل کے علاوہ یہ بھی تھا کہ اس کی طبعیت کو جوق تقوی کی پابندیوں اور اس کے تقاضوں سے آزاد رہنا چاہتی تھی تھوڑے دنوں تکوار سائے میں پناہ لینے کا موقع مل جائے چنانچہ ایک شعر میں کہتے ہیں:

دست پیشہ را نبود بہ ازدیوانگی کسی جنون کن یا سپاہی شوسپاسی ہم جنون دارد کہ انسان چاہے مجنوں بن جائے چاہے سپاہی۔ سپاہی پر بھی ایک طرح کا جنون سوار ہوتا ہے۔ دونوں صورتوں میں اسے ایک طرح کی بیخودی حاصل ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ مختلف قسم کے حالات سے متاثر نہیں ہوتا ہے، جیسا کہ کہتا ہے:

دنیا هیچ بر دیوانہ تاثیر نکرود بیشتر زیں برق عبرت خرمن فرزانه سوخت جہاں تک بیدل کی ملازمت کا تعلق ہے سارے تذکرہ نگاروں کا اس بات پر اتفاق ہے۔ البتہ اس امر میں ہے کہ کیا وہ معظم شاہ کی ملازمت میں تھا یا اعظم شاہ کی پھر یہ کہ اس کی مدت کیا تھی؟ ابراہیم خاں خلیل کہتا ہے:

”ہر گاہ بہ سن رشادت رسید بہ رفاقت شاہزادہ معظم خلف غلد مکان قدم نہاد، بمصوب

پانصدی و داروغگی کو شکر خانہ مخصوص شد۔“ (۲۸۵)

یعنی سن رشد کو پہنچنے کے بعد بیدل نے شہزادہ معظم بن خلد مکاں (اورنگ زیب) کی رفاقت اختیار کی اور منصب پانصدی اور داروغہ کو شکر خانہ کے عہدے پر فائز ہوئے۔

سید میر قاسم عرف قدرت اللہ قادری لکھتا ہے:

”در ابتدای حال بسکک سپاہیان عمدہ معاش و ملازمان امارہ تلاش شاہزادہ معظم و محمد اعظم

بہادر طاب ثراہ منسلک گردید۔“ (۲۸۶)

یعنی ابتداء میں شہزادہ معظم و محمد اعظم طاب ثراہ کے معزز سپاہیوں اور ملازموں کی صف

وابستہ ہوا۔

لیکن ان تذکرہ نویسوں کے مقابلے پر کچھ ایسے تذکرہ نگار بھی ہیں جن کا بیدل سے براہ راست تعلق تھا، منجملہ ان کے شیر خاں لودھی مصنف ”مرآۃ الخیال“ ہیں جو بیدل کے دوست اور ہم عصر تھے ہی، مزید برآں بیدل کے حالات لکھ کر خود ان کے پاس ان کی توثیق کے لئے بھیجا، لکھتا ہے:

”در اوایل شباب، چند روز بنا بر مصلحتی نوکری شاہزادہ عالیجاہ سلطان محمد اعظم اختیار

کرده، بمصعب عمدہ سرفرازی یافتہ“ (۲۸۷)

شروع جوانی میں چند دن مصلحتاً شہزادہ سلطان محمد اعظم کی ملازمت کی اور بہترین منصب پر

فائز ہوا۔

دوسرا تذکرہ نگار بندر ابن داس خوشگو ہے جو یہ قول خود ایک ہزار سے زیادہ دفعہ بیدل سے

اور اس کا شاگرد رہا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ بیدل نے پانصدی اور داروغہ شکر خانہ کے عہدے تک ترقی کی اور بیس سال تک اس عہدے پر فائز رہا۔ لکھتا ہے:

”بحکم رفعت استعداد و تحصیل اسباب معاش، ملازمت بادشاہزادہ عالیجاہ محمد اعظم شاہ در

یافت۔ و در اندک فرصت، معزز و مقبول گردید بمصعب پانصدی و خدمت داروغگی کو شکر خانہ

اتیاز یافت۔ بیست سال درین شغل اشتغال داشت“ (۲۸۸)

یعنی اپنی اعلیٰ صلاحیت کی بنا پر ذریعہ معاش کی خاطر شہزادہ عالیجاہ محمد اعظم شاہ کی ملازمت انہیں حاصل ہوئی اور تھوڑے ہی عرصے میں اعزاز و اکرام میں اتنا اضافہ ہوا کہ ”پانصدی“ اور ”داروغہ شکر خانہ“ کے منصب تک ترقی کی۔ بیس سال اس خدمت سے وابستہ رہے۔

اس کے علاوہ رفاقت بیدل میں ایک رقعہ اور مجمع الانشاء تالیف محمد امین عرف خان میں چار خطوں بیدل کے اعظم شاہ کے نام پائے جاتے ہیں۔ (۲۸۹) جن میں استعفاء سے متعلق مضامین موجود ہیں۔

دانش ہوتا ہے کہ وہ یقینی طور پر اعظم شاہ کے ملازمین کی صف میں شامل تھا نہ کہ معظم شاہ کے۔

شاہزادہ اعظم اورنگ زیب کا تیسرا لڑکا تھا اور ۱۰۸۰ ہجری ۱۶۶۹ء میں وہ پندرہ ہزاری نو ہزار سوار

عسکری پر فائز تھا (۲۹۰)۔ تاثر عالمگیری کے مطابق وہ نورس بانو بیگم کے لطن سے ۱۲ شعبان ۱۰۶۳ھ

میں پیدا ہوا تھا، فطری ذہانت و ذکاوت کے علاوہ مناسب تعلیم و تربیت کی وجہ سے بہت سے کمالات کا

مالک تھا۔ (۲۹۱) تذکرہ مرآۃ الخیال سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۰۸۰ھ میں دار الخلافہ دہلی میں

(۲۹۰)

بیدل کا چونکہ عاقل خاں رازی، شکر اللہ خان اور کامگار خان جیسے صاحب مناصب عمدہ امراء

عسکری سے رابطہ بلکہ دوستی تھی، اس لئے قیاس ہے کہ انہیں حضرات کے توسط سے وہ محمد اعظم شاہ کے

دانش میں شامل ہوا۔

جبکہ محمد شفیع وارو صاحب تذکرہ مرآت واردات کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ ۱۰۷۶ء میں

ان کے بعد بیدل نے سلطان معز الدین بن شاہ عالم کے حقیقی ماموں مرزا سلیمان کی صحبت میں

کے سال گزارے۔ مرزا سلیمان کی وفات کے بعد وہ اعظم شاہ بن عالمگیر کے ملازموں کی صف میں

درج ہوئے (۲۹۳) رفاقت بیدل میں ایک خط مرزا سلیمان کے نام ملتا ہے جس سے دونوں کے

دوستی و رابطہ پر روشنی پڑتی ہے۔ لکھتا ہے:

”..... در گہ انتظار از امید شگفتگی چمن را فراہم دارد بہ شکر نعمای آن صبح بہار اخلاق و

احسان نفسی می شمارد۔“ (۲۹۳)

یعنی شگفتگی غنچہ دل کی امید میں ایک چمن گرہ انتظار میں مہیا کئے ہوئے ہوں اور اس ”صبح بہار

احسان“ کی عنایتوں اور مہربانیوں کی شکر گزاری میں نفس شماری کر رہا ہوں۔ بیدل نے جو تعبیر

استعمال کی ہے اس سے ان کے تعلقات کی نوعیت ”محسن اور احسانمند“ کی معلوم ہوتی ہے نہ کہ

مستعمل نام کی۔ مشہور مؤرخ ولیم ہیل کے مطابق مرزا سلیمان عہد عالمگیری کا ایک وزیر تھا، اسے فضائل

و اخلاص ملا ہوا تھا اور اس کی وفات ۱۱۰۱ ہجری ۱۶۸۹ء میں ہوئی (۲۹۵) اس صورت میں لازم

آتا ہے کہ بیدل نے ۱۱۰۱ ہجری کے آس پاس محمد اعظم شاہ کی ملازمت اختیار کی جبکہ اگلے صفحات سے

معلوم ہوتا ہے کہ ملازمت کا واقعہ ۱۰۸۰ ہجری ۱۶۶۹ء کے آس پاس کا ہے۔

خوشگم کے مطابق، محمد اعظم کی ملازمت اختیار کرنے کے بعد، فارسی اور ترکی زبان و ادب میں

ترقی کی یکتا کی بنیاد پر، بیدل کو جلد ہی ”پانصدی“ اور داروغہ کو شکر خانہ کے عہدہ جلیلہ پر ترقی مل

گئی۔ عہدہ میں ”پانصدی“ ایسا عہدہ ہوتا تھا جو عام طور سے جاگیرداروں اور زمینداروں کو ملتا تھا۔

غیاث الغات میں اس کی وضاحت یوں ہے:

”پنج صدی ذات: بدانکہ صاحب منصب پانصدی ذات راہشت لکھ دام باشد۔ چوں چہل دام ایک روپیہ می شود بدین حساب ہشت لکھ دام را بست ہزار روپیہ شدند“ (۲۹۶)

یعنی پانصدی ذات کے منصب پر فائز عہدہ دار کے لئے آٹھ لاکھ دام وظیفہ مقرر تھا۔ چالیس دام کا ایک روپیہ ہوتا ہے اس لئے آٹھ لاکھ دام میں ہزار روپیہ ہوئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بیدل کو بیس ہزار روپے سالانہ (یا ماہانہ) پانچ سو زیادہ سپاہی رکھنے کے لئے ملتے تھے اور اس پانچ سو فوجیوں کا سالانہ خرچہ جو یقیناً ایک عزت کی بات ہے۔ دوسرا عہدہ ”داروغہ کوٹنگر خانہ“ کا ہے۔ لیکن یہ واضح نہیں ہے کہ دونوں عہدے ایک ساتھ ملے یا یکے بعد دیگرے۔ بہر حال کوٹنگر خانہ تعریف ناظم الاطبار کے الفاظ میں:

”عبارتست از جائیکہ آنجا تزییب و طلا کو بی می شود“ (۲۹۷)

یعنی کوٹنگر خانہ اس کارخانے کو کہتے ہیں جہاں سونے کا پانی چڑھایا جاتا یا طمع سازی کی ہے۔ بیدل اس کے داروغہ تھے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کا کام کارگیروں کی نگرانی، کارنامہ دیکھ رکھ، نظم و نسق اور اس کا حساب کتاب تھا۔ ظاہر ہے یہ عہدہ بھی پہلے عہدہ سے کچھ کم اہمیت کا تھا۔ بلکہ بیدل پر محمد اعظم شاہ کے غیر معمولی اعتماد اور اس کی ایمانداری و دیانتداری پر اس کے کمال کی نمائندہ ہے۔

شیر خاں لودھی نے ان دونوں مناصب کے لئے ”منصب عمدہ“ کی ترکیب استعمال کی ہے۔ خوشگو کے بیان کی تائید کرتی ہے۔ بہر حال ایک عہدہ اگر بیدل کی شجاعت و بسالت کو واضح کرتا ہے تو دوسرا اس کی دیانت و امانت کو۔

بیدل کو ذہانت و زکاوت کے علاوہ غیر معمولی جسمانی توانائی اور ہمت بھی فطری طور پر ملتی تھی۔ ڈاکٹر عبدالغنی نے نامعلوم حوالے سے بیدل کی دلیری کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ بیدل شہر موصوف کی رفاقت میں گھوڑے پر سوار کہیں جا رہے تھے کہ اچانک ایک شیر نے جنگل سے نکل کر شہزادے کے ملازمن پر حملہ کیا۔ بیدل نے بڑی جرات و ہمت سے کام لے کر اس پر جوابی حملہ کیا۔ اسے مار ڈالا۔ (۲۹۸)

اُس وقت تک بیدل کے درباریوں اور نوابوں سے تعلقات وسیع ہو چکے تھے۔ ان کے درمیان مراسلات کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ چنانچہ ۱۰۸۰ ہجری میں اپنی دوسری مثنوی ”طلسم حیرت“ کر بیدل نے نواب عاقل خان رازی کو پیش کیا اور نواب صاحب نے اس کا مطالعہ کر کے

میں تحسین آمیز کلمات لکھے۔ تو بیدل نے جواب لکھا:

”..... پس از ادای عبادت لوازم عبودیت، سجدہ شکر دیگری کہ طلسم حیرت، بتوجہ خانصاحب معنی مناصب، معنوں کیفیت اقبال گردید۔ و باین عنوان، نسبتی پیایہ منظوری آن قبلہ، ارباب حقایق رسانید۔ فیض اندوز معنی، کہ طبع تجلی شہودش پسند و سعادت عنوان کلامی، کہ بہ تحسین بان حق ترجمان پیوند و۔“ (۲۹۹)

یعنی بندگی کے لئے لازم سجدوں کی ادائیگی کے بعد اب ایک اور شکرانے کا سجدہ پیش ہے کہ عاقل خان صاحب (عاقل خان رازی) کی توجہ سے شرف قبول حاصل ہوا۔ اس طرح بیدل نے نواب حقایق کی منظوری کے مقام پر اس کی رسائی کی نسبت مجھے حاصل ہوئی۔ وہ معنی اور فیض اندوز ہے جس پر خانصاحب موصوف کی طبع تجلی شہود اپنی پسندیدگی کی مہر لگائے اور وہ کلامت عنوان ہے جس کو خانصاحب کی زبان ترجمان سے داد تحسین ملے۔

کچھ صفحات میں یہ مذکور ہوا کہ بیدل نے ۱۰۷۸ ہجری ۱۶۶۷ء میں اپنی پہلی مثنوی ”محیط اعظم“ کو نواب عاقل خان رازی کی خدمت میں پیش کیا تھا اور اس کے شرف قبول سے نوازے جانے کی امید تھی۔ اس خط سے واضح ہوتا ہے کہ خان موصوف نے اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور ایک خط میں خط بھی بیدل کو لکھا۔ اس کے بعد جب ۱۰۸۰ ہجری میں دوسری مثنوی ”طلسم حیرت“ بھیجی تو بیدل نے اس کے جواب میں ”سجدہ شکر دیگری“ ایک اور شکرانے کا سجدہ پیش کیا اور اس پر بیدل کی خوشی کا یہ عالم ہے کہ کہتا ہے:

”شکر کہ برد نامہ ام رنگ قبول بیدل بودم، ہزار دل گردیدم (اس بات پر کہ میرے خط یعنی تخلیق کو جناب والا نے شرف قبول سے نوازا میں سو بار شکر ادا کیا۔ میں تو بیدل (مایوس اور پست حوصلہ) تھا اب ہزار دل کا (حوصلہ مند اور امید وار کرم) ہوا۔“

اس وقت تک نواب عاقل خان رازی کے علاوہ، ان کے داماد نواب شکر اللہ خان سے بھی بیدل کا تعلق تھا۔ طلم حیرت کا ایک نسخہ ان کی خدمت میں بھی بھیج کر ان کی توجہات کا اظہار کیا۔ خروانہ کا امیدوار نظر آتا ہے:

”طلسم حیرت بیدل، عمریست کہ عبار آتش کبج وقت معانی واخریدہ..... مگر ترجم آن حق معانی و معنی تو جہی فرماید و بروی این شکستہ ہال مجر آشیاں، التفات آن قبلہ شکستہ گاہ، و نامیہ و نامیہ۔ ہر چند دیدہ حسرت نگاہ را، مطلع دیدار سعادت انوار بہ پر تو ظاہری نہ

نواخته است۔ اما گوش محمد نیوش، بتواتر صفات قدسی آیات، در مہمات چشم پر داخستہ۔ از انجا کہ سایہ اخلاق آن مہربان پناہ معنی پناہان بی بضاعت است، حیف معنی کہ از طبع اقبال اثر منشور قبول نمی گیرد۔ نیاز نامہ ملتجی باین تھا، آرزو مند دولت حضور است“ (۳۰۰)

بیدل کی مثنوی 'طلم حیرت' ایک عرصہ ہوا کہ اس کی عبارتوں میں باریک معانی پھرتے ہوئے ہیں..... شاید لفظ و معنی کے اُس حق شناس کی نظر عنایت اس پر متوجہ ہو اور اس بازوؤں نے آشیاں (بیدل) پر اُس قبلہ شکستگاہ (ٹوٹے دلوں کے قبلہ) نواب کی توجہ شہرت کا دروازہ دیے۔ اگرچہ دیدہ حسرت نگاہ کو، دیدار سعادت انوار کے مطلع نے، ظاہری جھلک سے نہیں نوازا (ملاقات کی نوبت نہیں آئی ہے) لیکن تعریفی کلمات سننے والے کان نے اوصاف قدسی آیات کے ساتھ سن کر مہمات پر نظر جمار کھی ہے۔ چونکہ اس مہربان نواب کے خلاق کا سایہ بے بضاعت پناہوں (کم مایہ شاعروں) کی پناہ ہے اس لئے اس "معنی" پر افسوس ہے جو نواب کے طبع اقبال اثر شرف قبولیت کا فرمان نہ لے۔ درخواست گزار کا نیاز نامہ اس درخواست کے ذریعہ دولت بادشاہ متعنی ہے۔

اس خط سے دو باتیں سامنے آتی ہیں اول یہ کہ نواب کی حمایت و سرپرستی اور قدر و ثناء حاصل کرنا کہ شاعری کے میدان میں شہرت بھی حاصل ہو اور آمدنی کا ذریعہ بھی ہاتھ آئے جس سے اس وقت یعنی ۱۰۸۰ ہجری کے آس پاس ملازمت سے پہلے وہ محروم تھا، دوسرے اس راستے نواب کی مجلس میں باریابی کی کوئی صورت نکلتے۔

بہر حال اعظم شاہ کے دربار میں بیدل کی ملازمت کے دوران، بہ قول خوشگومیر محمد زمان حاجی اسلم سالم، حکیم شیخ حسین شہرت وغیرہ چند دوسرے شعراء بھی اس کے دربار سے وابستہ تھے۔ شہزادہ انہیں گرانقدر صلے دیا کرتا تھا۔ علاوہ ازیں شہزادہ خود بھی طبع موزوں اور شاعرانہ تنقید کی ذوق حاصل تھا۔ (۳۰۱) اس زمانے میں بیدل مولانا عبدالعزیز عزت کی خدمت میں شاعری کی مشق پڑھاتا تھا۔ (۳۰۲)

باوجودیکہ خوشگوبیدل کے آخری ایام میں اس سے بہت قریب رہا ہے لیکن جب اس کے بیانات کا دوسرے ماخذ و مراجع بلکہ خود بیدل کے بیانات سے موازنہ کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ بہت سے مقامات پر وہ غلط فہمی کا شکار ہوا ہے۔ اس سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ بعد کے نگاروں بلکہ محققوں اور مصنفوں نے بھی بغیر کسی چھان بین اور جانچ پڑتال کے اس کے قول کو نقل کا فی سہھا۔

عزیز عزت سے مشق سخن:

یہاں ہم مولانا عبدالعزیز عزت کی خدمت میں مشقِ سخن کے مسئلے کا تاریخی جائزہ لینا ضروری

مولانا عبدالعزیز عزت ایک بلند پایہ شاعر و فاضل آدمی تھے۔ وہ ہرات (افغانستان) کے تھے، ہجرت کر کے اکبر آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ شاعری اور سپہ گری دونوں میں انہیں کمال حاصل تھا۔ (۳۰۲) جب ۱۰۸۰ ہجری ۱۶۶۹ء میں اورنگ زیب سے اُن کا تعارف ہوا تو بہت جلد اُن کو شہرہ کے منصب پر ترقی مل گئی، اس کے بعد مولانا اور اورنگ زیب کے بیچ جب کسی بات پر کشیدگی پیدا ہوئی تو ان کے درمیان سے لاہور چلے گئے۔ (۳۰۴) عزت کے نام ایزد بخش رسا کے ایک شاگرد کے ہوتے ہیں کہ بیدل کو رسا کی وساطت سے ہی ۱۰۸۵ھ میں مولانا عزت کا تعارف حاصل ہوا۔

”چهارم شہر رمضان ۱۰۸۵ ہجری..... انشاء اللہ العزیز میرزا عبدالقادر بیدل، کہ سراپا دلست،

عنقریب بملازمت سعادت اندوز د، الہی ہمیشہ بر حسب خواہش من باشند۔“ (۳۰۵)

۴ رمضان ۱۰۸۵ھ..... انشاء اللہ العزیز مرزا عبدالقادر جو سراپا دل ہیں جلد ہی آپ کی خدمت  
ی کی سعادت حاصل کریں گے۔ خدایا سدا میرے حسب خواہش ہوں۔

مولانا موصوف کے نام اپنے ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

”ہم شہر صدر ۸۵ء..... بیدل ہمہ دل را دیدم، و از دل نہادش پر سیدم۔ آخر

رمضان یا اول شوال بانجامی رسد۔ (۳۰۶)

۱۷ ماہ مذکور الصدر ۱۰۸۵ھ..... بیدل ہمہ دل کی زیارت نصیب ہوئی۔ دل سے ان کی کی۔ رمضان کے اواخر یا شوال کے اوائل میں وہاں پہنچ رہے ہیں۔

ان دونوں خطوط سے چند باتیں سامنے آتی ہیں، اول یہ کہ مولانا عزت سے بیدل کا تعارف کے رمضان کے اواخر یا شوال کے اوائل میں لاہور میں ہوا۔ دوم یہ کہ بیدل ان دنوں لاہور گیا یہ کہ اسی تاریخ سے دونوں کے درمیان خط و کتابت، اصلاح کلام اور مشورہ سخن کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ کہ ایزد بخش رسا سے بھی بیدل کا تعارف انہیں دنوں ہوا۔ رقعات بیدل میں مولانا عزت کے نام چار خطوط بیدل کے ملتے ہیں جن سے دونوں کے محبت آمیز اور مخلصانہ تعلقات قیام پائی ہی ہے استاد و شاگردی کا رشتہ بھی اُن سے نمایاں ہے، ایک خط کا مضمون ملاحظہ ہو:

ح معنوی حرم دلہا، ہادم اساس حرصہا، ہموارہ موصول وصول دوام دارد۔ سالکا

اصلاً دو مصرع سادہ، کہ الحال دل سوداں، طرح کردہ وکلک و دادسلک، در احاطہ دام  
مسطر آوردہ، طبع دارد کہ در در سگاہ مطالع اصلاح آراء ہمسک گو ہر کمال گردو۔“ (۳۰۷)  
حرم دل کی آبادی کی اساس رکھنے والے، حرص و آز کی بنیادوں کو ڈھانے والے  
وصول کا سلسلہ سدا جاری رہے۔ اے سالک واصل! دوسیدھے سادے مصرعے جنہیں اس وقت  
سوداں نے نظم کیا اور کلک و دادسلک نے دام مسطر کے احاطے میں گرفتار کیا ہے۔ اس امید کے  
حاضر خدمت ہیں کہ جناب والا کی در سگاہ مطالع اصلاح آراء (ایسی در سگاہ جہاں مطالعہ کر کے  
کا کام انجام پاتا ہے) میں گو ہر کمال سے ہر شتہ ہوں۔

ان تمام بیانات کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ مولانا عزت کی خدمت میں مشق سخن کی  
خوشگونی اپنے تذکرے میں بیان کی ہے وہ درست ہے مگر یہ کہ یہ بیدل کے اعظم شاہ کے دربار  
و ابستگی کے دوران جاری رہا، اس امر پر موقوف ہے کہ بیدل اس وقت تک دربار میں رہا بھی ہو  
میں کلام ہے۔ بیدل کے بیان کے مطابق، اس کا پہلا سفر لاہور ۱۰۸۵ ہجری میں پیش آیا۔ کہتا ہے۔

شوق را از عزیمت لاہور تازگیہای مشودہ شادیست  
لاہور کے عزم سے شوق سفر کو خوشی کی تازہ بہ تازہ امیدیں وابستہ ہیں۔

یعنی از دامگاہ افسردن چند گاہم نوید آزادیت  
یعنی افسردگی و پھر مردگی کی دامگاہ سے کچھ دنوں کے لئے رہائی کی خوشخبری ہے۔

سال تاریخ ایں عزیمت شوق لی تکلف شنو: خدا ہادیست

اس عزیمت شوق کی تاریخ (مادہ تاریخ) بلا تکلف ”خدا ہادیست“ ہے۔ (۱۰۸۵)

چهار عنصر کی ایک عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سفر دہلی سے ۱۰۸۵ء میں شروع ہوا  
کے ہمراہ کوئی دوست یا فوجی نہ تھے۔

”وقتی غبار قافلہ تجردم، از ساحت عرصہ دہلی، بسیر پنجاب دامن عزم شکست۔ و درای محمل  
خیال، پیش آہنگی سفر لاہور کمر شوق بر بست۔“ (۳۰۸)

میرے کاروان تجر و تنہائی کے غبار نے جب پنجاب کی سیاحت کے لئے دہلی سے عزم  
کے دامن میں شکست در یخت پیدا کی اور محمل خیال کی گھنٹی نے سفر لاہور کے ارادے سے کمر شوق  
سفر لاہور سے متعلق بیدل کے بیانات کو پیش نظر رکھ کر اگر ایزد بخش رسا کے خطوط کے مندرجہ  
اور محمد مستعد خاں ساقی صاحب مآثر عالمگیری کے بیان کی تحلیل و تجزیہ کریں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں  
رسا، جیسا کہ مولانا عزت کے نام ان کے بہت سے خطوط سے مترشح ہوتا ہے، عزت کے شاگرد تھے

خوف رکھتے تھے۔ مولانا موصوف محمد ساقی کے مطابق، اس وقت سہرند (موجودہ سرہند) میں  
کے فوجدار کے عہدے پر فائز تھے، ۲۷ شعبان ۱۰۸۵ھ ۱۶۷۷ء میں ان کے اور اورنگ  
کے درمیان کسی بات پر کدورت پیدا ہوگئی جس کے نتیجے میں وہ ملازمت ترک کر کے لاہور روانہ  
کئے وہاں سے انہوں نے بخارا و خان کو ایک غزل بھیجی، جس کا درج ذیل شعر ان کی پریشانی کا  
اظہار ہے:

بکشتی ایکہ زیک قطرہ آب گردابست (۳۰۹)  
اس دریا میں ایک ایسی کشتی پر بیٹھے ہیں جس کے لئے پانی کا ایک قطرہ بھی بھنور کی حیثیت  
کے لئے خدا کیا کرتا ہے۔

رسا کے ایک خط مورخہ ۱۲ رمضان المبارک ۱۰۸۵ھ سے واضح ہوتا ہے کہ اس نے مولانا عزت  
کو دیکھا تھا کہ چالیس پچاس روپے جس کی انہیں ضرورت ہے یا بیدل کی معرفت جو قریب ہی جانے  
لے ہیں بھیج دیں گے یا اگر دیر ہو جائے تو کسی کو بھیج کر مٹا لیں خط یہ ہے۔

”.....چہل و پنجاہ روپیہ کہ برای مایحتاج در کاراست، اگر دریں نزدیکی عازم آنطرف

شدند، می رسانند اگر چند روز توقف شود خداوندگار باید فرستاد“ (۳۱۰)

سفر لاہور سے وابستہ مذکورہ بالا قطعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بیدل اس وقت دہلی میں ناسازگار  
حالت سے دوچار تھا اور اس ”دامگاہ افسردگی“ سے نجات حاصل کرنے کے لئے اس نے لاہور جانے  
کا ارادہ کیا۔

اس طرح یہ بات بائہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ ایزد بخش رسا کی تحریک پر، بیدل مولانا عزت سے  
کے غرض سے نیز کسی کی ممکن سرپرستی یا ذریعہ معاش کی امید میں، دہلی سے یکہ و تنہا لاہور کے لئے  
نکلے۔ اور یہ کہ اس سے پہلے وہ ملازمت شاہزادہ سے سبکدوش ہو چکا تھا۔

اب ذرا اس بات پر غور کریں کہ شہزادہ اعظم شاہ اس زمانے میں کہاں تھا۔ صاحب مآثر عالمگیری  
کے مطابق شہزادہ موصوف ۱۰۸۵ھ ۱۶۷۷ء تک ”بارہ ہزاری سات ہزار“، ”پندرہ ہزاری نو ہزار سوار  
کے فوجدار چکھ سنبھل کے مختلف عہدوں پر فائز رہا اور اپنے والد کے ساتھ یا دہلی یا اکبر آباد میں زندگی  
کے گزیرا۔ ۱۰۸۶ھ ہجری میں ملتان کا صوبہ دار ہو کر وہاں گیا۔ اس کے بعد مختلف سالوں میں مختلف علاقوں  
میں عہدہ دار رہا۔ بیدل، جس نے اپنی خود نوشت سوانح عمری ”چهار عنصر“ میں تقریباً ان تمام مقامات کا  
ذکر کیا ہے بلکہ وہاں جو واقعات پیش آئے ہیں ان کی جزئیات تک کا تذکرہ کیا ہے، ملتان  
کا کوئی تذکرہ نہیں کیا اور نہ تذکرہ نگاروں نے اس کا ذکر کیا ہے۔ اس لئے قیاس یہ بتاتا ہے کہ

لاہور کے سفر سے پہلے (تقریباً شوال یا رمضان ۱۰۸۵ھ ہی میں اس نے شہزادہ موصوف کی ملازمت سے استعفا دیدیا تھا۔ صاحب تذکرہ "نشر عشق" کا بیان میرے قیاس کی تائید کرتا ہے لکھتا ہے: "بعد از ترک رفاقت شہزادہ ممدوح، بہ گلگشت سرزمین مغرب شتابد" (۳۱۲)

یعنی شہزادہ ممدوح کی رفاقت ترک کرنے کے بعد بیدل مغربی علاقے (پنجاب) سیاحت کو روانہ ہوا۔

### ملازمت سے استعفا کا قصہ:

کم و بیش پانچ سالہ خدمت کے بعد، بیدل اعظم شاہ کے دربار سے مستعفی ہو گیا۔ استعفا بیدل کی زندگی کا ایک اہم ترین واقعہ ہے جس سے اس کی افتاد طبع کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ بحث سے غور طلب ہے ایک یہ کہ استعفا کیوں دیا دوسرے یہ کہ کتنے دنوں کی ملازمت کے بعد دیا؟ خوشگوار نے استعفا کا واقعہ اس انداز سے بیان کیا ہے کہ اس سے اس کے اسباب پر روشنی پڑتی ہے۔ لکھتا ہے:

"بعد از آن چوں جذبہ در رسید، تمارض نمودہ از خدمت شاهی مستعفی گردید" (۳۱۳)

یعنی اس کے بعد جب طبیعت کے خلاف کوئی امر پیش آیا تو بیماری کا بہانہ کر کے شاہی خدمت سے سبکدوش ہو گئے۔

یہ خلاف طبع امر جس نے بیدل کو ملازمت ترک کرنے پر آمادہ کیا پوری طرح واضح ہے۔ شیر خاں لودی نے اس کی اس طرح وضاحت کی ہے۔

"روزی در مجلس شہزادہ ذکر شعرائی عصر در میان آمدہ یکی از مقربان یہ عرض رسانید کہ بالفعل در شاہجہان آباد، بلکہ در اکثری از سواد ہندوستان، بہتری از میرزا عبدالقادر بیدل، کہ در سلاک ملازمان سرکار منسلک است، نخواہد بود۔ شہزادہ فرمود بگوئید قصیدہ ای در مدح ما انشاء کند۔ تا زور طبعش معلوم نمودہ باضافہ منصب و تقرب سرفراز فرمائیم۔ این خبر بمیرزا رسید فی الحال بخانہ بخشی سرکار رفتہ، استعفا کی منصب کرد، و ہر چند دوستان مصلحت وقت در آن دیدند کہ یک قصیدہ در مدح شہزادہ توان گفت، قبول نکرد و ترک منصب نمود۔" (۳۱۴)

ایک دن شہزادے کی محفل میں اس کے معاصر شاعروں کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ ایک مقرب نے عرض کیا کہ اس وقت شاہجہان آباد (دہلی) بلکہ اکثر ہندوستانی علاقوں میں مرزا عبدالقادر بیدل دربار سے وابستہ ملازمین کے زمرے میں شامل ہیں، سے بہتر کوئی شاعر نہیں ہوگا۔ شہزادہ نے

ی تعریف میں ایک قصیدہ کہنے کی فرمائش کرو، تاکہ اس کا زور طبع معلوم کر کے اس کے بارے میں بھی اضافہ کر دوں اور اپنے تقرب سے بھی نوازوں۔ یہ خبر جب مرزا کو ملی تو فوراً بخشی سرکار کے پاس جا کر اپنا استعفا نامہ پیش کیا اور اگرچہ دوستوں نے مصلحت اندیشی کے پیش نظر یہ مشورہ دیا کہ بیدل کی تعریف میں ایک قصیدہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، بیدل نے اسے نام منظور کر دیا اور اپنے صاحب خیر باد کہا۔ شیر خاں لودی کے بیان سے درج ذیل نکتے سامنے آتے ہیں:

بیدل اس وقت تک دہلی بلکہ اکثر علاقوں میں خاصا مشہور ہو چکا تھا۔

اس دور کا ایک بہترین شاعر تصور کیا جاتا تھا۔

وہ بھی طور پر ایک خوددار آدمی تھا اور اپنی عزت نفس کا اتنا ہی زیادہ اسے پاس و لحاظ تھا کہ باوجود غیر معمولی شاعرانہ صلاحیت اور ذوق کے کسی بادشاہ یا امیر کی مدح سرائی سے اپنی زبان آلودہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

مدح سرائی سے اجتناب کی خاطر اس نے ایک اچھے عہدے کو ہاتھ سے دیدیا اور دوستوں کے اصرار کے باوجود انتہائی استغنا اور بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔ چنانچہ شیر خاں نے آگے لکھا ہے:

"اسی وجہ سے اس کے دیوان میں جو تقریباً بیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے، ایک شعر بھی مدح

نہیں ہے" (۳۱۵)

خود بیدل نے ارباب اقتدار کی مدح و ستائش کو شیطانی عمل قرار دیا ہے:

ایک تعریف سلاطین کردہ ای مشق تعلیم شیاطین کر وہ ای

اے وہ آدمی جس نے سلاطین کی تعریف کی ہے درحقیقت شیطانوں کی تعلیم کی مشق کی ہے۔

لیکن ارباب اقتدار کی تعریف سے تمام تر بے نیازی کے دعویٰ کے باوجود، بیدل کی کلیات میں بے قصیدے اور تہنیت ناموں پر مشتمل ایسے قطعے ملتے ہیں جن میں مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے اور

ان قصیدوں سے ان کی تعریف میں کہے گئے ہیں۔ اس موضوع پر ہم چوتھے باب میں بحث کریں گے۔ جہاں قصاید بیدل ہمارا اصل موضوع ہے۔ شہزادہ اعظم کی تعریف میں ایک قصیدہ بیدل نے کہا تھا

کہ بارے میں غلام حسن مجددی لکھتے ہیں:

"بیدل کے قصائد میں ایک بڑا زور دار قصیدہ شہزادہ اعظم شاہ کی تعریف میں ہے۔ یہ قصیدہ

بہت ہی وزن کے دو اجزاء پر مشتمل ہے لیکن اس کے قافیے مختلف ہیں۔ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ بیدل شہزادے سے سرپرستی و حمایت کی امید تھی۔ شاعر اپنے حالات نہایت بلند انداز میں بیان کرتا ہے۔

مست احوال از طرز خلص روشن است بیدلیہا چیدہ ام بر خود ز وضع روزگار



میرے حالات و کیفیات میرے تخلص سے واضح ہیں۔ زمانے کی ستم ظریفی سے میں بیدل بیدل بیدل سے دوچار ہوں۔

گر شود ابر عنایت آبیاری مزرعم خوشه سان از پائی تا سر جملہ دل آبدار  
عنایتوں کا ابر کرم اگر میرے کھیتوں کی آبیاری کرے تو خوشے کی طرح از سر تا پا سرسبز دل آبدار ہو جاؤں۔

یہ قصیدہ شہزادہ کے حضور پیش ہوا یا نہیں، پتہ نہیں چلتا لیکن واضح ہے کہ شہزادہ موصوفی کی خوبیوں کی تحلیل و تقدیر مخلصانہ طور پر اس میں کی گئی ہے لیکن جب بیدل سے کہا گیا کہ پیشہ در آئید، شاعروں کی طرح شہزادہ کی ستائش کی توقع اُن سے کی جاتی ہے تو فوراً انہوں نے اپنا استعفاء کر دیا۔ ان کے احباب نے اصرار کیا کہ مطلوبہ انداز میں ایک قصیدہ کہہ دیں لیکن بیدل نے اپنی شاعرانہ ذوق کی اس طرح فروخت کو ناپسند کیا۔ اسی وجہ سے انہوں نے عہدے کو خیر باد کہا۔ (۳۱۶)

مجددی کا یہ قیاس شیر خان لودی کے بیان سے، جو ایک معتبر اور مستند بیان ہے متصادم ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر میر حسن شاہ اور ڈاکٹر نور الحسن انصاری کا خیال ہے کہ یہ قصیدہ ”چراغانِ دہلی“ نام سے اورنگ زیب کی مدح میں ہے۔ (۳۱۷) یہ قصیدہ کلیات میں موجود ہے اس لئے یہ بات کے باوجود کہ شہزادہ کی مدح میں ہے، اس بات کا امکان ہے کہ اس وقت کہا ہو جب کہ شہزادہ کی قربت یا اس کے دربار میں ملازمت حاصل کرنے کا ارادہ ان کا رہا ہو، تاکہ اس طرح مستقل ذریعہ سوشل کا مسئلہ، جو اسی زمانے میں شادی کرنے کے بعد ان کے لئے دروس بن گیا تھا، حل ہو جائے۔ ورنہ وہ ملازمت کے دوران اچھے عہدے پر فائز تھا، کیونکر ممکن ہے کہ شہزادے سے اپنی پریشاں حالی تذکرہ کر کے مالی امداد کا خواہاں ہو جیسا کہ اس قصیدے سے معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر مان لیجئے ایسا ہے تو شہزادہ نے جب اس سے مدح کی فرمائش کر کے اس کے منصب میں ترقی کا وعدہ کیا تھا، بیدل کو اپنے منصب کو ترک کرنے کے بجائے مدح کر کے منصب موعود کو حاصل کرنا چاہئے تھا۔ اس کے علاوہ اس کلیات میں درمدح اعظم شاہ کے نام سے ایک قصیدہ موجود ہے جس کا ایک شعر یوں ہے:

وارث صاحبقران سلطان محمد اعظم آن کز گل مدحش زبان دارد چمن در آستین  
(صاحبقران بادشاہ (اورنگ زیب) کا وارث سلطان محمد اعظم جس کی مدح و ستائش کے پھل کو چمن اپنی آستین میں سجائے ہوئے ہے۔

اس لئے یقینی طور پر پہلا قصیدہ اورنگ زیب کی ستائش میں ہو سکتا ہے۔

شاہ محمد شفیع واردطہرانی نے استعفا کے سبب پر اور انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ لکھتا ہے:

”ایک دن بباطحکومت کے ایک مقرب شخص نے مرزا کے اشعار شاہ کو سنائے۔ شاہ نے پوچھا: کس کے اشعار ہیں؟ اس نے عرض کیا: بیدل کے۔ شاہ نے مزاحاً پوچھا کہ بیدل کی ہمدردی فوج میں جہاں سب دل و جگر والے نوجوان ہیں، کیا ضرورت ہے؟ یہ سنتے ہی مرزا نے رخت سبز باندھا۔ اور کچھ منزلیں طے کرنے کے بعد مقرر امیں دریائے جمنہ کے کنارے بود و باش اختیار کر لی۔“ (۳۱۸)

یہاں وارد نے استعفائے بیدل کا سبب شہزادے کی ظریفانہ گفتگو قرار دی ہے اور چونکہ بیدل نے بڑھاپے میں سال تک اس کے گھر میں قیام کیا ہے، اس لئے بظاہر اس کی بات پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ جس علت استعفا کا تذکرہ شیر خان لودی نے کیا ہے، چونکہ بیدل کی نظر سے وہ گزر چکی ہے اس لئے یہ قصیدہ بقی اسی پر ثبت ہو سکتی ہے۔

دوسرا مسئلہ اعظم شاہ کی خدمت میں بیدل کی مدت ملازمت کا ہے نیز یہ کہ استعفا کے وقت وہ کون تھا اور اس کے بعد کہاں گیا؟ اس سلسلے میں تذکرہ نگاروں میں زبردست اختلاف ہے، حتیٰ کہ دو روایتیں ہیں جو اس سے بہت قریب تھیں، ان کے بیانات میں بھی نمایاں فرق ہے۔ شیر خاں کا بیان ہے: ”دراوئل شباب چند روز بنا پر مصلحتی، نوکری شاہزادہ عالیجاہ سلطان محمد اعظم کردہ بمصوب محمد سرفرازی یافتہ بود“ (۳۱۹)

شروع جوانی میں بعض مصلحت کی بنا پر کچھ دنوں شہزادہ محمد اعظم کی نوکری کر کے نہایت اچھے پر فائز ہوا۔ خوشگوار لکھتا ہے:

”بست سال دریں شغل داشت ..... از خدمت شاهی مستعفی گردید و ہندوستان رسید۔“ (۳۲۰)

بیس سال تک اس عہدے پر کام کرتا رہا پھر شاہی ملازمت سے استعفا دے کر ہندوستان پہنچا۔

”ہما ناعت علاقہ نوکری قطع کردہ مدار الخلافہ شاہجہان آباد آمد۔“ (۳۲۱)

نوکری کو خیر باد کہہ کر دار الخلافہ دہلی چلا آیا محمد شفیع وارد لکھتا ہے:

”میرزا ہجر استماع این فحوائی خارج آہنگ ازان مقام قدم بوادی سفر گزاشت، پس از قطع منازل در بلدہ مقرر ابر کنار دریای جمنہ اقامت گزید۔ لعل محمد نامی حاکم آن مکان ذیاب حسن علی الہ وردی از قدوم میرزا اطلاع یافتہ در دجلوئی و خاطر داری کو شید۔ میرزا نیز

ادارہ صحبت او شد۔“ (۳۲۲)



اس بے ربط اور نامناسب مضمون کو سنتے ہی مرزا وہاں سے نکل کھڑا ہوا، کچھ منٹوں کے بعد متھرا پہنچا اور دریائے جمنا کے کنارے قیام کیا۔ وہاں کے حاکم لعل محمد کو جو حسن علی خان کا نائب تھا، جب مرزا کے ورود کی خبر ملی تو اس نے ان کی خاطر داری اور دلوئی کی پوری کوشش کی۔ بھی اس کی صحبت کا دلدادہ ہو گیا۔ علی ابراہیم خان خلیل لکھتا ہے:

”نیکمیلہ چند ترک خدمت گفتہ، از تاجہ دکن بدہلی آمدہ رعل اقامت انگلند“۔ (۳۲۳)

کچھ حیلہ بہانہ کر کے ملازمت ترک کر دی، دکن سے دہلی آیا اور یہیں بودو باش اختیار کر لیا۔ حسین قلی خان لکھتا ہے:

”بعد از ترک رفاقت شاہزادہ ممدوح، بہ گلگشت سرزمین مغرب شتاب و چندی بہ اکبر آباد سیاحت نمودہ متوجہ شاہجہاں آباد گردو“۔ (۳۲۴)

شاہزادہ ممدوح کی رفاقت کو خیر باد کہنے کے بعد مغربی علاقے کی سیر و تفریح کے لئے پڑا، کچھ دنوں اکبر آباد میں گھوما پھرا، اس کے بعد شاہجہاں آباد (دہلی) کا رخ کیا۔

ایسا لگتا ہے کہ کسی تذکرہ نگار نے چھان بین کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ جو کچھ کہیں دیکھا من و عن اسی طرح اسے نقل کر دیا حتیٰ کہ خوشگو، جو بہ قول خود، ایک ہزار سے زیادہ دفعہ بیدل کی صحبت سے فیضیاب ہوا ہے۔ مستند اور قابل اعتبار معلومات فراہم نہ کر سکا۔ علی ابراہیم کے ظاہر ہوتا ہے کہ بیدل اس وقت دکن میں تھا اور شہزادہ اعظم شاہ ۱۰۹۲ ہجری ۱۶۸۱ء میں دکن کا صوبہ ہو کر وہاں گیا ہے جبکہ بیدل اس وقت بقول خود دہلی میں تھا شاد اعظم آبادی نے علی ابراہیم کے قول کی تسلیم کیا۔ آزاد اور خوشگو کے بیان سے واضح نہیں ہوتا کہ بیدل اس وقت کہاں تھا۔ البتہ خوشگو کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیس سال تک وہ اعظم شاہ کے دربار سے وابستہ رہا۔ اگر بیدل کی سالانہ ملازمت کو اس کی شادی کا سال تسلیم کریں جیسا کہ بظاہر معلوم ہوتا ہے تو ملازمت کی ابتدا ۱۰۸۰ھ ۱۶۶۹ء اس کا خاتمہ ۱۱۰۰ھ ۱۶۸۸ء میں ہوا۔ بیدل اور شہزادہ اعظم شاہ کے مختلف سالوں میں مختلف پر قیام کا نقشہ ملاحظہ ہو:

سال (ہجری)	شہزادہ اعظم کا قیام	بیدل کا قیام	سال	شہزادہ اعظم شاہ کا قیام	بیدل کا قیام
۱۰۷۹	دہلی پندرہ ہزاری	متھرا	۱۰۸۶	ملتان کا صوبیدار	دہلی
۱۰۸۰	”	دہلی	۱۰۸۸	پٹنہ کا صوبیدار	پٹنہ نہیں چلا
۱۰۸۱	چکھ سنہل کا فوجدار	اکبر آباد	۱۰۸۹	اوڑیسہ کا صوبیدار	”

۱۰۹۰	”	پٹنہ نہیں چلا	”	۱۰۹۰	بنگلہ کا صوبیدار	دہلی نزور سام
۱۰۹۱	”	”	”	۱۰۹۱	پنجاب کا صوبیدار	”
۱۰۹۲	”	پٹنہ نہیں چلا	”	۱۰۹۲	دکن کا صوبیدار	”
۱۰۹۳	”	لاہور	”	۱۰۹۳	بیجاپور کا صوبیدار	متھرا
۱۰۹۶	”	”	”	۱۰۹۶	”	دہلی (مستقل قیام)

یہ نقشہ آثار عالمگیری، چہار غنصر اور رقعات بیدل میں پھیلی ہوئی معلومات کی اساس پر تیار کیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اعظم شاہ ۱۰۸۶ ہجری سے ۱۰۹۶ھ تک ملتان، پٹنہ، اوڑیسہ، بنگال اور بیجاپور کے صوبیدار کے عہدے پر فائز رہا اور بیدل ان دس سالوں کے دوران یا دہلی یا متھرا میں رہتا ہے اور شمالی ہند آنے کے بعد وہ پٹنہ یا بنگال واپس نہیں گیا ہے لہذا خوشگو کا یہ بیان کہ بیدل کے بعد بیدل ہندوستان آیا اور اس کے بعد مشرقی علاقے کا رخ کیا اور اوڑیسہ اور بنگال کی طرف رخ کیا اور وہاں رہا۔ بیدل کی ان مسافرتوں کے پیش نظر جس کا تذکرہ نقشے میں کیا گیا ہے وہ غلط ہے۔ بیان کہ بیدل نے صرف چند دنوں اعظم شاہ کی ملازمت اختیار کی زیادہ صحیح نظر آتا ہے۔

غرض بیدل اس وقت دہلی میں تھا اور چند سالہ ملازمت (جو ۱۰۸۰ ہجری سے ۱۰۸۴ء تک کم و بیش چار سال ہو سکتا ہے) استعفا دیا، اس کے بعد جب حالات ناسازگار ہوئے تو ایزد بخش رسا کے حسبِ بیعت ۱۰۸۵ ہجری میں لاہور روانہ ہوا۔

تذکرہ نگاروں کے بیانات کی تحلیل و تجزیہ اور دوسرے مآخذ سے ان کا مقابلہ کرنے کے علاوہ ہم نے دربار میں بیدل کی مدت ملازمت کی کمی کی دوسری دلیل اس کا وہ خط ہے جو قابل خان نشی کے پاس ہے۔ یہ خط راقم السطور کے دعوے کو بڑی حد تک صحیح ثابت کرتا ہے۔

پہلے یہ معلوم کریں کہ قابل خان نشی کون شخص ہے؟ صاحب عالمگیری نامہ محمد کاظم اور صاحب ”تذکرہ نشی“ محمد مستعد خان کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ قابل خان نشی کا شمار عہد اور نگ زیب کے دربار میں ہوتا تھا، جس پر اورنگ زیب کی خاص عنایتیں رہی ہیں۔ یہ واضح نہیں ہوتا ہے کہ کس سال شاہی خدمات سے وابستہ ہوا۔ مستعد خاں ۱۰۶۹ ہجری کے واقعات کے ضمن میں

”قابل خان نشی نے گوشہ نشینی (اور خدمت سے کنارہ کشی) کا ارادہ کیا۔ اسے پانچ ہزار روپے سالانہ عطا کیا گیا“۔ (۳۲۶)

۱۰۷۳ ہجری کے واقعات کے ضمن میں محمد ناظم لکھتا ہے:

”بادشاہ سلامت کے حضور بیان کیا گیا کہ قابل خان ٹٹھی جس نے ایک گوشہ نشین کی طرح لاہور میں ایک عرصہ زندگی گزاری ہے اس وقت شاہی طلبی پر حاضر خدمت ہے۔“ (۳۲۷)

۱۰۹۱ھ کے واقعات کے ضمن میں مستعد خاں لکھتا ہے:

”قابل خان ٹٹھی جو ابوالفتح خان ٹٹھی کی قدیمی والا شاہی کا بھائی ہے، اپنی قدیم ملازمت اور مزاج شناسی کی وجہ سے بادشاہ سلامت کا منظور نظر ہو گیا تھا، اس کی بدقسمتی کی راہ میں حائل ہوئی، نامناسب لغزشوں کی وجہ سے وہ بہک گیا ایک ہزار ستر سو ایک خدمت تقریب فرزند اور قانونگوئی صوبہ ٹٹھ کے عہدوں سے اپنے داماد عبدالواسع کے ساتھ برطرف کیا گیا۔ اس کی درخواست پر اسے دارالخلافہ جانے کی ہدایت ہوئی۔ وہاں پہنچنے کے بعد فولا دخال کو حکم ہوا کہ اس کا گھر قرق کر لیا جائے۔ جب وہ گھر سے نکلے تو گھوڑے پر سوار کر کے اسے شہر بدر کر دیا جائے۔ چنانچہ اسی پر عمل ہوا۔ اپنے ڈھائی سالہ مدت تقریب میں اس نے بارہ لاکھ روپے نقد علاوہ جنس اور نو ساختہ حویلی کے اکٹھے کئے تھے۔ یہ سب ضبط ہوئے اور اس نے لاہور پہنچ کر اپنی زندگی کے کپڑے تہ کئے (مرگیا)۔“ (۳۲۸)

ان سب بیانات کو پیش نظر رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قابل خان ٹٹھی۔

۱- ۱۰۶۹ ہجری میں لاہور میں گوشہ نشین ہو گیا تھا۔

۲- ۱۰۷۲ھ میں دارالخلافہ دہلی بلا یا گیا۔

۳- ۱۰۸۸ ہجری میں ایک ہزار ستر سو ایک، خدمت تقریب فرزند اور قانونگوئی صوبہ ٹٹھ کے عہدہ فائز تھا۔

۴- ۱۰۹۱ھ میں کشیدگی کی وجہ سے معزول ہوا اور دارالخلافہ بھیج دیا گیا۔

پھر اس کے سارے سامان و اسباب کو ضبط کر کے لاہور بھیج دیا گیا جہاں اسی سال وفات ہو گئی۔

اب بیدل کے خطوط کے مضامین پر توجہ کیجئے۔ ایک رقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قابل خان بیدل سے واقعہ استعفا کا خلاصہ دریافت کیا تھا اور اس نے جواب میں لکھا:

اولیں شخص جس نے (استعفاء کے بعد) یادآوری سے متعلق اعظم شاہ کا پیغام بیدل کو، عتیق اللہ تھا۔ اس کے الفاظ درج ذیل ہیں:

”ہفت سال قبل ازیں میر عتیق اللہ کو کہ پیغام زبانی رسانید کہ شاہ دین پناہ بھٹھائی فضل

یاد، یاد از حال فراموشی مال کردہ اند۔ اگر بوسیله نیاز نتیجہ افکار، ذخیرہ سعادت توان

نہرخت سعادت زمان فرصت از منتعمات کلی است۔“ (۳۲۹)

یعنی اب سے کوئی سات سال پہلے میر عتیق اللہ نے زبانی طور پر یہ پیغام دیا کہ شاہ دین پناہ نے ازراہ تربیت و سرپرستی (جناب والا کے) حال فراموشی مال کو یاد کیا ہے۔ اگر کسی نتیجہ پر پہنچ کر کے حاضری کی سعادت حاصل کی جائے تو موقع سازگار ہونے کے لحاظ سے انتہائی محنت ہے۔

بیدل کا دل چونکہ شاہی خدمات سے جس میں خوشامد اور تعلق کا پہلو بہت زیادہ شامل تھا، آچکا تھا اس لئے وہ دوبارہ یہ ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہ تھا لیکن میر عتیق اللہ کے لگاتار جتنے اس نے ایک ”نثری نسخہ“ بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ لکھتا ہے:

چند بلا حظہ ناکسی و بی مقداری خود برائیں و انموداں ہمہ ثبات یقینی نہ نمود۔ بحکم تاکید

میں امداد اطلاع نسخہ نثری تحفہ تسلیم نمود۔“ (۳۳۱)

یعنی اپنی ناکسی اور بیچ مقداری کا ہر چند اس سے اظہار کیا پر اس نے کسی طرح مان کر نہ دیا۔ اس کے اسرار و تاکید پر اپنی قسمت کی یاد دہی کے خیال سے ایک ”نسخہ نثر“ لکھ کر تحفہ پیش کیا۔

فرزند میر عتیق اللہ نے دوسرے سال یہ خوشخبری لا کر سنائی کہ شاہ (اعظم) نے اس ”نسخہ نثر“ کی درخیز کی اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ بیدل اپنے حالات اور کوائف شاہ کے حضور پیش کرے۔

”میر دیکر معاودت میر موی الیہ بمشورہ ابن عنایت سر بلندی بخشد کہ نیاز قطرہ در بار گاہ رحمت بقبول منصب گوہر رسید۔ و رشمہ پانچی سامعہ نواز حلقہ بگوشاں گردید کہ باستی

پس عرض احوال دریں حضرت، بار اقبال می جست، و چہرہ امید بعرق انفعال کامل قلمی

نہشت۔“ (۳۳۲)

یعنی واپسی کے دوسرے سال، میر موصوف نے اس عنایت کی خوشخبری سنا کر سر بلندی بخشی کہ میر دیکر بارگاہ میں منصب گوہر کے شرف سے نواز گیا اور جواب کا رشمہ حلقہ بگوشاں کے سامعہ نواز ہوا کہ اسے بادشاہ کے حضور اپنے حالات و کوائف پیش کر کے اقبال کی بارگاہ میں اور امید کا چہرہ عرق شرم سے دھونا چاہئے۔

خود نے شاہزادہ کا خط بیدل کے قلمداں میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا جس پر اس کا جواب تھا۔ یہ خط اس طرح ہے۔

”الحمد لله والمنه کہ ہنوز قوای بدنی آن رفعت و شجاعت دستگاہ بحال خوداوست،

۴  
 و باوجود برقراری حواس از خدمت عالی شاه قاعدورزیدن شرط ایفای حقوق اخلاص  
 نیست۔ تا حال ہم بچ نرفتہ۔ آنچہ ضروریات را در کار باشد، بہ بیوت دارالخلافت امرافاز  
 یافتہ، سرانجام کردہ خواهد شد۔ زود مستعد ملازمت گردو۔ (۳۳۳)

یعنی الحمد للہ کہ اس عالی مرتبہ بہادر سپاہی کی جسمانی قوت ہنوز بدستور باقی ہے اور  
 حواس کی برقراری کے باوجود بادشاہ کی خدمت سے کترانا حقوق اخلاص کی ادائیگی کے خلاف  
 اب بھی کچھ نہیں گیا ہے۔ ضروریات زندگی کے لئے جتنی رقم درکار ہو دارالخلافت کے خزانچی کو  
 ادا کیا جائے گا۔ جلد ملازمت کے لئے آمادہ ہو جائے۔

شاہزادہ کے خط سے واضح ہوتا ہے کہ:

- ۱۔ بیدل کے اندر بہادری اور دلیری کی وہ تمام خصوصیات تھیں جن کی ایک وفادار سپاہی کی  
 کی جاتی ہے۔
- ۲۔ انہی خوبیوں کی بنا پر شہزادہ نے اس سے از سر نو ملازمت میں شمولیت کی خواہش ظاہر کی۔
- ۳۔ بیدل کی ملازمت میں واپسی کے لئے شہزادے کی خواہش اتنی زیادہ بڑھ گئی تھی کہ وہ بیدل  
 اسے آنے کی دعوت دیتا ہے۔

۴۔ اس سلسلے میں اسے جتنے روپوں کی ضرورت ہے وہ بھی مہیا کرنے کو تیار ہے۔

اعظم شاہ کے تمام تر اشتیاق کے باوجود بیدل نہیں گیا۔ لگتا ہے کہ بیدل نے شاہی ملازمت  
 سے کنارہ کشی کا تہیہ کر لیا تھا اور آزادی اور بے نیازی کو اپنا اصول زندگی بنا لیا تھا۔  
 لیکن چونکہ رقعہ کا جواب دینا بھی ضروری تھا اس لئے اپنی ندامت اور سرافگندی کو دور  
 کے لئے اس نے دعا اور سلامتی پر مشتمل ایک رقعہ لکھ کر بھیجا چنانچہ قابل خان مٹی کے نام خط میں  
 تذکرہ اس طرح کرتا ہے:

”برف خجالت افسردگی، ناچار نقش جینی بسجود تحریر آراست۔ وفضولی طبیعت را مقدمہ وضع  
 نامرادی اندیشیدہ خیلی لشکر دعا خواست“۔ (۳۳۴)

یعنی شرم افسردگی کو دور کرنے کی خاطر مجبوراً نقش جین کو سجدہ تحریر سے آراستہ کیا اور نفس  
 آسا طبیعت کو وضع نامرادی و ناکامی کا پیش خیمہ تصور کر کے لشکر دعا کی درخواست خدا سے کی۔

شاید یہ وہی خط ہے جو رقعات بیدل مطبوعہ نو لکھنؤ میں اعظم شاہ کے نام پایا جاتا ہے  
 کے آخر میں ”دعا جمعیت منصب رضا“ کا تذکرہ ہے۔ لکھتا ہے:

”خداوند اللہ ہندوہ بہوای آفتاب بالی افشاند، ایندہ ناکسیش در پیش نگذاری تا بیابان

غبار افغان نشود۔ تا توان قطره بخیاں محیط بی طاقت است، صورت موہوش نشان  
 نہی تا بطوفان عرق شرم نرود۔۔۔۔۔ عمریست دور از قدم سجدہ طرازان حضور، بدر و نارسائی می  
 نہ فریادری ندارد۔ و مدتہاست، جدا از رکاب سعادت بیابان موکب اقبال، در غبار  
 کہ فرود رفتہ و از هیچ جاسر برنی آرد۔ بخت سریکہ محروم خاکبوس آن درگاہ است، ہرگز  
 نہ گریباں شناختہ۔ و حرمان نصیب چشمیکہ بی بہرہ غبار آن آستانست، در خواب ہم بہ  
 نہ مژگان نہ پرداختہ۔

یعنی جوانی، کہ وسیلہ آبروی بندگیست بہ ضعف پیری انجامید و استقامت قوی کہ دلیل  
 خدمت گزاریست سر بجنب از پا در افتادگی کشید۔

نہ ہمیں دعا، دولت ابدی ہنوز ممنون بقای نفس است و بہوای پرافشانی گلزار حمد و ثنا  
 نہ نفس نفس۔

از شاہ خود آنچہ ایں گداری خواہد جمعیت منصب رضا میخواید  
 بہمت فقر تنگ خواہش نکند سرخیلی لشکر دعا میخواید (۳۳۵)

یعنی جہان پناہ! یہ معمولی ذرہ (بیدل) آفتاب (شاہ) کی خواہش (ملاقات) میں اپنے بازو  
 اس کی ناکسی کا آئینہ اپنے حضور نہ رکھے تاکہ گردن دامت میں بیابان مرگی کا شکار نہ ہو۔  
 کہ قطرہ سمندر کے تصور میں ناتواں ہے، اس کی موہوم صورت کی نشاندہی نہ فرمائیے تاکہ عرق  
 کے خوفان کی نذر نہ ہو جائے۔ حضور کے سجدہ طرازون کے قدم سے دور رہ کر ایک عرصہ سے  
 رسالت کی تکلیف میں آہ و نالے کرتا ہے پر کوئی اس کا فریاد رس نہیں ہے اور سواری اقبال کے سعادت  
 کے رکاب سے جدا رہ کر ایک مدت سے غبار گمنامی سے اٹا پڑا ہے اور کہیں سے سر اٹھانے کی  
 نہ نہیں آتی۔ وہ سر بد نصیب ہے جو اس درگاہ کی خاکبوسی سے محروم ہے۔ اسے گریباں کی حلاوت کا  
 نہ اور وہ آنکھ بد قسمت ہے جو اس آشتی کی غبار سے بے بہرہ ہے خواب میں بھی پلکوں کی الفت  
 نہ اسے تسل نہ ہوئی۔

اور جوانی کی توانائی جو آبروئے بندگی کا وسیلہ ہے پیری کی ناتوانی پر منتہی ہوئی اور قوائے جسمانی  
 کی شہزادی نے جو سعادت خدمت گزاری کی دلیل ہے رو بزدال ہونے کے سبب اپنا سر گریباں میں  
 نہ لپک لپک۔

حمد اللہ دولت ابدی کے لئے میری دعا ہنوز بقای نفس کا ممنون ہے اور باغ حمد و ثنا کی پرافشانی  
 نہ نفس نفس کا مرہون ہے۔

قابل خان منشی کے نام بیدل کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ شہزادے کا بیدل سے واپسی کے بعد اور بیدل کی خدمت شاہی کو قبول کرنے سے انکار کا سلسلہ عرصے تک جاری رہا اور شہزادے کو زبردست اضطراب اور قلق پہنچتا رہا۔ جب قابل خان منشی کے توسط سے اس نے دوبارہ واپسی کا حکم دیا تو بیدل نے جواب میں لکھا: شہزادہ کی بندہ پروری اور ذرہ نوازی میں مجھے ذرہ برابر شبہ نہیں ہے۔ میں اپنی زندگی کا کچھ حصہ اس کی خدمت میں قطعاً نہ گزارتا۔ لیکن جب سے میں اس خدمت سے فارغ ہو گیا ہوں ”شیوہ فقر“ کو اپنا اصول زندگی بنالیا ہے اور اب تک اس پر قائم ہوں اور اس اصول کی نوبت نہیں آئی ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ مستقبل میں بھی اس کا دامن ہاتھ سے نہ ہلے۔ امید ہے کہ جب کبھی آپ کو شہزادہ کی باریابی کا شرف حاصل ہو میرا یہ پیغام پہنچا دیں گے۔

”متمثال رد و قبول مدتی خار خارا آئینہ انتظار بود۔ درینولا ابرام حسرت بہ تجددید عریض پر راحت و قرعہ سجود بنام جہہ اعتبار انداخت۔ اگر بر اخلاق ذرہ پروری و رافت ذاتی پادشاهان اعتقاد راسخ نمی بود پر افشانی مشت غبار در آن جناب معلیٰ چہ امکان داشت و گستاخی سدید نامہ سیاہ در طبقہ انوار قدس چہ طاقت می انگاشت۔ در مدت اختیار فقر، خاکساری این خیابان مہوم با شکستگی در ناختہ کہ ہر گاہ بر پستی افتد از خود نظر اندازد، بی اختیار یہاں وضع زمانہ رقتیت اعتبار شمارد۔ ہمہ حال، متوقع این توجہ است کہ ہر گاہ تقریبی ظہور پیوند در مقامی جرایم زمین گیری میں قد و معروض دارند و دعا گو را مرہوں احسانہا شمارند۔“ (۳۳۷)

راقم السطور کو ایک عرصے تک ان خطوط کی تلاش رہی جن کی طرف قابل خان منشی کے نام خط میں اشارہ کیا ہے رقعات بیدل مطبوعہ نولکشور و مطبوعہ صفدری، بمبئی و مطبوعہ کابل کو شروع سے ایک بغیر پڑھ گیا لیکن سوائے ایک خط کے جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے کوئی اور خط نظر نہیں آیا۔ ایک خط کے مناس بازار میں قیمتی کتابوں کی تلاش میں گھوم رہا تھا کہ ”مجمع الانشا“ نام کی ایک کتاب ملی۔ مولف محمد امین عرفان ہیں۔ رقعات بیدل میں ایک خط بیدل کا محمد امین عرفان کے نام دیکھنا تو اس نے خیال ہوا کہ مولف منجملہ دوستان بیدل ہے اسے خرید کر شروع سے آخر تک مطالعہ کیا تو اس خط کے نام بیدل کے چار خطوط ملے۔ انہیں غور سے پڑھا تو پتہ چلا کہ یہ سارے خطوط اسی استغفا نامہ میں واپسی کے مضامین سے وابستہ ہیں۔ تب سمجھ میں آیا بیدل کے اس جملے: ”عدم تمثال رد و قبول مدتی خار خارا آئینہ انتظار بود“ کا مطلب۔ یہ خطوط ترجمہ کے ساتھ حاشیے میں دیئے جاتے ہیں۔ (۳۳۸)

شاہ سے اس گدا کو جو چیز مطلوب ہے وہ منصب رضا کی جمعیت (یعنی شاہ کی خوشنویس حصول) ہے۔ ہمت فقر تا کہ خواہش کے تنگ دعا سے دوچار نہ ہو لشکر دعا کی سرخیلی اور خواہاں ہے۔

اس کے دیوان میں ایک غزل ایسی ہے جو اعظم شاہ کے اصرار پر بیدل نے ملازمت میں دوبارہ واپسی کی معذوری سے متعلق کہی ہے۔

اس جواب کو شہزادہ کے اس تقاضا کے پس منظر میں دیکھنا چاہئے جو اس نے بیدل کی خدمت میں واپسی کے لئے کیا تھا ورنہ اس بات کا امکان ہے کہ آدمی بیدل کے بارے میں بعض غلط فہمیاں ہو جائے چنانچہ پروفیسر نور الحسن انصاری مرحوم اسی بدظنی کے شکار ہو گئے۔ لکھتے ہیں:

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ بیدل شہزادہ اعظم کی سرکار میں پہنچنے کی کتنی کوشش کرتے ہیں۔ انہیں اپنا مقصد پورا ہوتا نظر نہیں آتا تو وہ ایک حسین بہانہ کی آڑ لے کر استعفا دیدیتے ہیں شہزادہ ان کا یہ خط قابل غور ہے۔

”دور از قدم سجدہ ازاں..... بختناختہ“۔ (۳۳۶)

اس کے برعکس بیدل کے خط سے یہ واضح ہوتا ہے کہ:

۱۔ بیدل کی خدمت میں واپسی کے لئے شہزادے کا تقاضا اول الذکر کے لئے موجب ضرورت ہوا۔

۲۔ استعفا دینے کے بعد بیدل کی اقتصادی حالت خراب ہو گئی۔

۳۔ مالی مشکلات سے دوچار ہونے کے باوجود وہ اپنی روش بے نیازی و استغنا کو ہاتھ سے نہ تیار نہ تھا۔ بیدل کے درج ذیل اشعار بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔

در مجلسی کہ عزت موقوف خود فروشی است دیگر کسی چہ باشد گر میرزا باد  
مخواہ ای مفلسی ذلت کش تسلیم دونانم زمیں تا چند زیر پا نشاند آفتاب  
آہ بر در دوئان التجا بردیم تشنہ کام می مردیم آبرو ہمہ  
۴۔ اس مقصد سے کہ ایک طرف بے نیازی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے اور دوسری طرف شہزادے کے تقاضے کا صریحاً انکار بھی نہ کرے اس نے نہایت خوبصورتی سے شہزادہ کی خدمت میں یہ لکھا کہ۔

”خدمت کی انجام دہی کے لئے جسمانی طاقت شرط ہے اور وہ جوانی کے ساتھ رخصت ہو چکی ہے اس لئے اس میں معذور ہوں۔“

محققین کی نظر شاید نہیں گئی۔ غزل سراسر ماجرائے استعفا کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال کی نشاندہی ہے یہ ذیل میں ترجمہ کے ساتھ حاضر ہے۔

جنس موہوم دکان ابروی چیدہ است  
میرے موہوم جنس نے دوکان آبرو کھولی اور لگا رکھی ہے۔ عالم امید میں بے وقت اور ہوشیاری کی بھی اہمیت ہوتی ہے۔

در جناب حضرت شاہ سلیمان بارگاہ  
حضرت شاہ سلیمان جیسی بارگاہ میں ایک ناتوان چٹائی نے اپنی عرضداشت پیش کرنے کی کیا ہے۔

زیں سطور چند کز تسلیم دارد افتخار  
یہ چند سطر جن کو شیوہ تسلیم کا فخر حاصل ہے ان کے ذریعہ میرے معنی راز نے زمین پر پیشانی ٹیکی ہے۔

تا برنگش واری از نقش ما غافل مباش  
کہ جب اس کے رنگ مضمون پر غور کریں تو ہمارے نقوش خلوص سے غفلت نہ برتیں، یہاں بلبلے کے دامن میں خاموش ہے۔

ہجو شبنم در تمنای ثار نو گلی  
تازہ پھول کو آپ پر بچھاؤ کرنے کی تمنائیں ہم شبنم کی طرح آنسو بہا رہے تھے، یہاں کہاں ٹپک پڑا۔

طبع آزاد از خروش جسم دارد انبساط  
آزاد طبع کو جسم کے جوش و خروش سے انبساط و خوشی حاصل ہوتی ہے زخمہ جب تار پر پڑتا ہے فطری طور پر آواز بلند ہوتی ہے۔

نقد انقاسم نہ تنها صرف آہنگ دعاست  
میرے سانس کی کل نقد پونجی نہ صرف دعاؤں میں مصروف ہے۔ اگر یہ سب سانس کا ہے تو میرے ساتھ ساتھ وہ بھی گردش کرتے رہے ہیں۔

در غلبہ خط نفس دزیدہ آہی می کشم  
خطوط کی گرد میں اپنی سانس روک کر آہیں بھرتا ہوں، دل نے سرے کی شکل اختیار کر لی۔ تب یہ آواز بلند ہوتی ہے۔

کز پیشانیم بست است نقش  
خط چہ معنی دارد اینجا سجدہ ہم لغزیدہ است  
نقش کی قوت نے جو میری پیشانی کی نقش بندی کی ہے، خط کی کیا حقیقت ہے یہاں تو سجدہ سے

نقش ہو جاتی ہے۔  
جز خیال شاہ فریادم کسی نشیدہ است  
نقش موشی میرے دل میں کہیں زیادہ نزاکت سے نغمہ سرائی کرتی ہے۔ شاہ کے تصور کے سوا کسی

نقش ہی زیادہ نہیں سنی ہے۔  
بچکان در ہر بن مویم نمک خوابیدہ است  
بچکان بوزھا ہوا چکا ہوں اور اس کے نعت دیرینہ اس

بچکان در ہر بن مویم نمک خوابیدہ است  
بچکان بوزھا ہوا چکا ہوں اور اس کے نعت دیرینہ اس

بچکان در ہر بن مویم نمک خوابیدہ است  
بچکان بوزھا ہوا چکا ہوں اور اس کے نعت دیرینہ اس

بچکان در ہر بن مویم نمک خوابیدہ است  
بچکان بوزھا ہوا چکا ہوں اور اس کے نعت دیرینہ اس

بچکان در ہر بن مویم نمک خوابیدہ است  
بچکان بوزھا ہوا چکا ہوں اور اس کے نعت دیرینہ اس

بچکان در ہر بن مویم نمک خوابیدہ است  
بچکان بوزھا ہوا چکا ہوں اور اس کے نعت دیرینہ اس

بچکان در ہر بن مویم نمک خوابیدہ است  
بچکان بوزھا ہوا چکا ہوں اور اس کے نعت دیرینہ اس

مقہرا میں دریائے جمنہ کے کنارے اس نے قیام کیا وہاں کے حاکم لعل محمد نے جو حسن علی خاں اللہ وردی کا نائب تھا، مرزا کے ورود کی خبر سن کر اس کی دلجوئی اور خاطر داری کی کوشش کی۔ مرزا بھی اس کی صحبت کا شیدا ہو گیا تھا۔ اتفاق سے سلطان عالمگیر جو اس وقت دکن میں تھا لعل محمد کو اپنے پاس طلب کیا۔ لعل محمد نے حسب حکم بادشاہ جبراً و قہراً دکن کا سفر کیا اور راستے ہی میں اس کی عزیمت کا گھوڑا راہی ملک عدم ہوا۔“ (۳۳۹)

۲۔ محمد ساقی صاحب آثار عالمگیری کے مطابق حسن علی خاں اللہ وردی ۳۰ رجب ۱۰۸۰ھ کو مرزا فوجدار مقرر ہوا (ص ۹۲-۹۳) شعبان ۱۰۸۰ھ میں مقہرا کا نام اسلام آباد پڑا، (ص ۹۵-۹۶) ۳۔ ذی الحجہ ۱۰۸۰ھ میں حسن علی خاں نے مقہرا کے باغیوں کی بغاوت کو کچلا (ص ۹۶-۹۷) ۴۔ لعل محمد اور دیگر ۵ زمینداروں کو مقہرا میں متعلقہ جگہ پر بدستور رکھ کر حسن علی خاں کو ہاتھ نے اپنے اپنے پاس بلایا اور احکام دیا۔ (ص ۱۰۰-۱۰۱) ۵۔ ۱۰۹۲ھ میں حسن علی خاں اس روانہ ہوا (۲۱۵) ۶۔ ۱۰۹۳ھ میں اورنگ زیب دکن روانہ ہوا۔ (۲۱۷)

۳۔ بیدل کے دو خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ لعل محمد اس کے مخلص احباب میں تھا ۲۔ اس کو پورا محفل اخلاق کے لقب سے یاد کرتا تھا۔ ۳۔ لعل محمد نے پست لوگوں کی ماتحتی کی ذلت سے آ کر خود کشی کر لی اس پر افسوس کا اظہار کیا۔ (چهار غصص ۱۲۷، ۱۵۳)

۴۔ شیر خان کا بیان ہے کہ ”دراوئل شباب چند روز بنا بر مصلحتی نوکری شاہزادہ عالی جاہ سلطان اعظم خاں اختیار کردہ“ ابتدائی جوانی میں کسی مصلحت کی بنا پر شاہزادہ اعظم شاہ کی چند روز ملازمت کی۔

ان سب تاریخی حقائق اور محمد شفیع، شیر خان اور بیدل کے کے بیانات کو پیش نظر رکھ کر ذیل نتیجہ نکلتا ہے کہ بیدل نے:

- ۱۔ ۱۰۸۰ھ کے آس پاس ملازمت کی۔
- ۲۔ پھر چند دنوں ملازمت کر کے اسی سال استعفا دیا۔
- ۳۔ استعفا کے بعد سیدھے مقہرا آیا۔
- ۴۔ مقہرا میں لعل محمد نے اس کا پر تپاک خیر مقدم کیا اور سرپرستی کی۔
- ۵۔ یہ سلسلہ ۹۴-۱۰۹۳ھ تک برقرار رہا۔
- ۶۔ ۱۰۹۴ھ میں جب مقہرا میں فساد ہوا اور اللہ وردی خاں کے دکن چلے جانے کے بعد لعل محمد پر کنٹرول نہ کر سکا تو بادشاہ نے اسے دکن سے طلب کیا۔

احسن ظفر کی وجہ سے اس نے راستے ہی میں خود کشی کر لی۔

بیدل دو سال تک پریشان حالی جھیلنے کے بعد ۲۷ جمادی الثانی ۱۰۹۶ھ کو دہلی چلا گیا۔

اس طرح اس کی ملازمت کا حال سال بھر یا اس سے بھی کم رہتا ہے۔

اس پر تفصیلی بحث کی ضرورت اس لئے پڑی کہ خوشگو کے بیان کی بنیاد پر بہت سے مصنفوں اور محققین نے غلط فہمی ہوئی ہے اور ایسے لوگ اب بھی ہیں جو بیدل سے زیادہ قربت کی وجہ سے خوشگو کے بیان کو مستند اور یقینی سمجھتے ہیں جیسے قاضی عبدالودود اور ڈاکٹر سید علی رضا نقوی نے تو یہاں تک لکھ

”چونکہ مولف اکثر بیدل کی خدمت میں رہا ہے اس لئے بیدل کے بارے میں اس کے بیانات دوسرے تذکر نگاروں کے بیانات سے زیادہ قابل اعتبار ہیں اور کہا جاسکتا ہے کہ بیدل کے بارے میں اس کی تالیفات کو چھوڑ کر اس کتاب سفینہ خوشگو سے زیادہ کوئی معتبر نہیں۔“ (۳۴۰)

پروفیسر حسن شاہ ”ریاض الوداد“ اور ”سفینہ خوشگو“ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”۱۰۸۵ھ اپریل ۱۶۷۴ء میں جب فوج حسن ابدال روانہ ہوئی تو بیدل اس کے ساتھ تھا اور فتح الاول ۱۰۸۶ھ تک اسی جگہ قیام پذیر تھا یہ بات ”ریاض الوداد“ میں ایزد بخش رسا کے ایک خط سے معلوم ہوتی ہے (ورق ۲۸) اور یہیں سے شاہزادہ کی رفاقت میں اس نے گجرات کا سفر کیا۔ اتفاق سے اس وقت شاہزادہ کی خدمت میں راجہ ہندی، حکیم شہرت، اسلم کشمیری، ایچاد اور دوسرے شعرا بھی تھے اور بیدل ان ہی لوگوں کے ساتھ تھا۔“ (۳۴۱)

پروفیسر نور الحسن انصاری کی کتاب ”فارسی ادب بہ عہد اورنگ زیب“ میں بھی اسی کا تذکرہ ہے اور انہوں نے ملانے سے پتہ چلا کہ پروفیسر میر حسن نے اسی کا ترجمہ فارسی میں کر کے شائع کیا اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ یہ انصاری مرحوم کی رائے ہے۔

یہ بات کہ بیدل ۱۰۸۶ھ ہجری تک حسن ابدال میں تھا خود بیدل کے بیان سے اس کی تردید ملتی ہے چند نچو ناب کرم اللہ خاں کے نام ایک رقعہ میں بیدل لاہور سے دہلی کی واپسی کی تاریخ کا مادہ دیا ہے (ص ۱۷۳) سے نکالا ہے۔ ہم بزم کرم اللہ خان (۱۰۸۶ھ)۔ (۳۴۳)

جہاں تک گجرات میں اعظم شاہ کے دربار میں مندرجہ بالا شاعروں کے ساتھ بیدل کے قیام کی تاریخ کا سلسلہ غلط ہے کیونکہ اعظم شاہ جیسا کہ نقشے میں اس سے پہلے ظاہر کیا ۱۱۱۳ھ ہجری ۱۷۰۱ء میں



احمد آباد کا صوبیدار ہو کر گجرات گیا ہے اور بیدل اس سے بہت پہلے ملازمت ترک کر چکا ہے۔  
۱۰۹۶ھ سے اس نے مستقل دہلی میں نواب شکر اللہ خان اور ان کے خاندان کی سرپرستی میں  
گزارنی شروع کی ہے۔

اسی طرح شاہزادہ کی ملازمت سے بیدل کی کنارہ کشی کے حال کا تذکرہ کرتے ہوئے  
غلام حسن مجددی لکھتے ہیں:

”یہ واقعہ ۱۰۹۶ھ بمطابق ۱۶۸۳ء کے آس پاس رونما ہوا اور یہ بات چہار غصہ کی ایک  
عبارت نیز بیدل کے ایک خط سے جو شکر اللہ خان کے نام ہے، معلوم ہوتی ہے۔ بیدل  
نے اس خط میں شکر اللہ خان سے درخواست کی ہے کہ اس کے لئے کوئی مناسب جگہ تلاش  
کریں۔ اور اگر ایسی کوئی جگہ دستیاب ہوتی ہے۔ تو اپنی بقیہ عمر سکون خاطر کے ساتھ وہاں  
گزار دوں گا۔“ (۳۳۳)

ڈاکٹر انصاری مرحوم نے بھی یہی لکھا ہے۔  
شیر خان لودی کے بیان اور قابل خاں منشی کے نام بیدل کے ایک خط کے علاوہ جس کی  
راقم السطور نے ثابت کیا ہے کہ بیدل نے ۱۰۸۳ھ کے آس پاس ملازمت ترک کر دی تھی۔  
میر حسن شاہ اور ڈاکٹر انصاری نے جس خط کا حوالہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں دیا ہے وہ بیدل کے  
اسے دہلی کے سفر سے وابستہ ہے جو اس علاقے میں بدامنی پھیل جانے کے سبب وہاں کے  
کہ بعد پیش آیا۔ بیدل اس وقت ۲۷ جمادی الاول ۱۰۹۶ھ کو دہلی پہنچا اور فوراً ہی مذکورہ  
نے شکر اللہ خان کو لکھا اس خط اور اس کے مضامین کا تذکرہ اپنی جگہ پر ہوگا۔

بیدل نے جیسا کہ چہار غصہ سے واضح ہوتا ہے ۱۰۸۱ھ بمطابق ۱۶۷۱ء سے ۱۰۸۲ھ بمطابق ۱۶۷۲ء  
اکبر آباد (آگرہ) میں زندگی گزاری ہے اور نسبتاً خوشحال اور فراغ البال رہا ہے اس لئے کہا جاسکتا ہے۔  
اعظم شاہ کے دربار سے وابستگی کے دوران وہ وہیں رہا ہے لیکن شیر خان لودی صاحب مرآۃ الانبال  
بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ استعفا کا واقعہ دہلی میں پیش آیا۔ ان دونوں اسناد کو سامنے رکھ کر قیاس کیا جاسکتا ہے  
کہ اعظم شاہ کے ساتھ وہ ۱۰۸۱ھ سے ۱۰۸۳ھ بمطابق تک اکبر آباد میں رہا پھر اس کی رفاقت میں دہلی آیا۔

خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا واقعہ:

اکبر آباد کے قیام کے دوران ۱۰۸۱ھ بمطابق ۱۶۷۰ء میں بیدل کو عالم رویا میں جناب رسول  
صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی۔ یہ واقعہ دو لحاظ سے قابل غور ہے: اول اس کے

اس کی وابستگی کے لحاظ سے دوسرے اس کے افکار و خیالات کے  
وقت بیدل اکبر آباد میں اپنے قیام کا تذکرہ اس طرح کرتا ہے جیسے اسے خاص کیف و سرور  
میں بسر اور روزانہ صبح و شام تحت الشعور میں اس کا احساس کرتا ہو۔ پر اس کے سبب کا پتہ نہیں

”سعادت حصول از منہ کہ در بلدہ اکبر آباد، بساط توقف می گسترانید۔ و فردوس آئین  
بیر این گلرین سپری می گردید۔ مٹی روی نمی نمود کہ جلای کیفیت افعال و آثار نور  
عنبرین از مرآت حیرت شہودم، بری می گیرد، و شامی گیسوی کشود، کہ رواج سہلستان اسرار،  
بہتر از می، بردماغ مستی سراغ ریزد۔“ (۳۳۶)

یعنی وہ زمانہ جب شہر اکبر آباد میں قیام کی بساط بچھا رہا تھا سعادت حصول (سعادت آمیز) تھا  
جو اس گل زمین کی سیر و سیاحت میں گزار رہے تھے فردوس آئین (بہشت صفت) تھے۔  
مٹی روی نمی نمود اور نہیں ہوتی تھی جو ”نور حضوری“ کے آثار کی جلا میرے حیرت مشہود کے آئینے سے  
میں نہ کرتی اور ایسی کوئی شام گیسو کشائی نہیں کرتی تھی جب اسرار و رموز کے سہلستان کی خوشبو کیف  
بہتر از می، بردماغ مستی سراغ پر نہ چڑھاتی ہو۔

فرض ایک رات جبکہ اقبال طلوع ہوا ہی چاہتا تھا اس پر ادگھ سی طاری ہو گئی اور جو غنی پلکوں کا  
عالم نظر آیا جو اس عالم آب و گل سے مختلف تھا۔ کچھ دیر تک خود کو اس عالم کی آغوش  
میں گم رہا اور خود سپردگی کی کیفیت سے دو چار پایا۔ اس حالت میں جب غور سے دیکھا تو پتہ چلا۔  
”کہ در رنگ شیونات داشتہم تجدد نگار صور حقایق اشیا۔“

انواع و اقسام کے شیون و کیفیات کا دور حقایق اشیا کی تازہ بہ تازہ صورتوں کے جلوے دکھا  
م مثال کی مختلف کیفیات سے گزرنے کے بعد وہ دیکھتا کیا ہے کہ:

”فمنس دیدم چوں چراغ بر بالینم نشست۔ و تارک سرم بہ آئینہ زانویں نقش اتصال  
بت۔ فقیدہ دماغ اقتباس نور از گرمی آن زانو داشت و نقاش آن فطرت بلعہ پر توش رموز  
دقائق می نگاشت۔ چوں وار سیدم، جو ہر ایجاد عالم و آدم بود یعنی رسول خاتم صلی اللہ علیہ  
و سلم۔“ (۳۳۷)

ایک آدمی چراغ کی طرح میرے سر ہانے بیٹھا ہے اور میرے سر کی مانگ اس کے آئینہ

زانو سے لگی یا اسی پر رکھی ہوئی ہے۔ دماغ کی جتنی اس کے زانو کی گرمی سے روشنی حاصل کر رہی ہے، نقاش فطرت اس کے پرتو کی چمک سے حقائق و دقائق کے رموز لکھ رہا ہے۔ غور سے جو دیکھا تو جو ایجاد عالم و آدم یعنی جناب رسول خدا خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

بیدل نے جب محسوس کیا کہ سرور کائنات ﷺ کی ذات گرامی تشریف فرما ہیں تو اس نے زانو سے سر اٹھانا چاہا مگر پاس ادب نے اسے ایسا کرنے سے باز رکھا۔ لیکن اسی کے ساتھ شرم و حشمت نے اسے پانی پانی کر رکھا تھا۔ آخر اس دامن میں پناہ لینے کے سوا کوئی چارہ اسے نظر نہ آیا۔ اسی حالت میں اس نے اپنے دل میں ایک عجیب کیف و سرور اور سرخوشی و سرمستی کی کیفیت محسوس کی پھر اس نے قدم آگے بڑھایا عالم مثال کی ایک اور دنیا اسے نظر آئی جہاں دیکھتا کیا ہے کہ۔

”شیری با مہابت دران ایوان مستقبل قبلہ نشستہ و جمع جہات تعین احرام نگاہ غیرت پناہش بستہ۔ سروش اسرار یقین گوش تا ملیم باین آہنگ کشود ملہم روز تحقیق آئینہ آگاہیم باین صیقل زدود کہ جناب ولایت مآب علی مرتضیٰ است متمکن بساط کبریا“۔ (۳۳۸)

ایک خوفناک شیر اس محل میں قبلہ رو بیٹھا ہے اور ”تعین“ کی تمام جہات نے اس کی نگاہ غیرت پناہ کا احرام باندھ رکھا ہے (دنیا کی ساری چیزوں کی توجہ اس کی ذات والا صفات پر مرکوز ہے) اور یقین کے فرشتے نے میرے گوش تامل کی اس آواز کے ساتھ نوازش کی اور ملہم روز تحقیق نے میرے آئینہ آگاہی و ادراک کی اس طرح صیقل گری کی کہ جناب ولایت مآب حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ بسات کبریا پر براجمان ہیں۔

گویا اس عالم میں اس کی ملاقات حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ہوتی ہے۔ بیدل قریب جا کر تعظیم و تکریم کے مراسم ادا کرنا چاہتا ہے لیکن ان کا رعب کچھ اس طرح اس پر طاری ہوتا ہے کہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتا ہے ایک عجیب کشش سے دوچار ہے اور بیدل کے الفاظ میں:

”ند طاقت بازگشتن کہ اگر برگردم بیرون آن شش جہت مسدودی دیدم نہ یارای پیش رفتن کہ بی دعوت قبولش دستگاہ اقبال مفقودی اندیشدم“۔ (۳۳۹)

کہ نہ واپسی کی صلاحیت تھی اگر واپس بھی ہوں تو باہر سارے دروازے بند تھے اور نہ آگے بڑھنے کی لیاقت کہ ان کی قبولیت کی دعوت کے بغیر آگے بڑھنے کی توانائی مفقود نظر آتی تھی۔ اچانک بیدل کو مخاطب کر کے فرمایا:

”نزدیک تر آتا زیارت این جناب مقدس، غبار تو ہم، از آئینہ تخیل برداری و بوسیلہ این تقرب اتفاقی، دامن جمعیت دوام، از دست نکلداری“۔ (۳۵۰)

اور نزدیک آ کہ تو اس مقدس حضرت کی زیارت کر کے اپنے آئینہ تخیل سے غبار تو ہم کو صاف کر کے اس اتفاقیہ تقرب کے ذریعہ دائمی جمعیت اور سکون خاطر کا دامن ہاتھ سے نہ دے۔ جب بیدل نے دیوانہ وار قدم بڑھایا اور اتنا قریب ہو گیا کہ دونوں کے پہلو آپس میں مل گئے تو اس وقت تک کہ وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔

”شب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم بخواب دیدہ ام و فرق نیاز بزانوی ربوبیت پناہش پناہش، لیکن اندیشہ تعبیرش آتش در بنای تصور می اندازد و عبرت این رویا بہ برق جزا رنگ نہ ہم می گذارد۔ یعنی انوار آفتاب ازل بدین ویرانہ تافت و سایہ تیرہ روز منہجماں زمین میرگون فطری ماند۔ وہاں گرمیہای آغوش رحمت بے حسی طینتم پہلوی افردگی برنگر ماند۔ باں صورتہ گرمین دار و دبا بن محرومی دیدم بدیدہ غم می آرد۔“ (۳۵۱)

آج رات جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت نصیب ہوئی اور اپنی جبین کے زانوے مبارک اور ربوبیت پناہ پر ملا لیکن اس خواب کی تعبیر کے خیال نے میرے بنائے خواب کو آتش کر دیا ہے اور ہزاروں قسم کی ندامتوں سے میرا واسطہ کر دیا ہے یعنی آفتاب ازل (جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم) کے انوار اس ویرانہ (بیدل) پر چمکے پھر بھی میرے روز سیاہ کا سایہ بدستور گریز فطرتی کا زمین گیر رہا (اپنی پست فطرتی پر قائم رہا) اور اس آغوش کی حرارت اور گرمی سے میری طبیعت کی بے حسی نے افردگی کا پہلو نہیں بدلا (یعنی طبیعت کی افردگی ختم ہو کر اس میں گرمی نہیں آئی) اس صورت حال پر مجھے رونا آتا ہے اور اس محرومی دیدار پر آنکھیں اشکبار ہیں۔

بیدل کی بے کلی اور بے قراری کی وجہ یہ تھی کہ ایک طرف جناب رسول خدا ﷺ نے اس پر اتنی کرم و رحمت کی کہ اس کے سر کو اپنے زانوے مبارک پر جگہ دی ہے تاکہ اس مینارہ نور سے ہر طرح کسب نور کرے اور دوسری جانب اس کی طبیعت اتنی منجمد واقع ہوئی تھی کہ اس مینارہ نور سے کسب نور تو دور رہا طبیعت کی سردی اور خودگی بھی دور نہ ہو سکی اسی کشش میں تھا کہ شیر خدا نے اس کی تعبیر اس طرح فرمائی:

”تعبیر خواب اینست کہ حقیقت محمدیہ ہمہ وقت سایہ گلن احوال تست با آنکہ غفلت چشمت کشید۔ و باطن نبوت ہچکچاہ دامن تربیت از سر برنی گیرد ہر چند آداب ظاہر از تو بجانی“۔ (۳۵۲)

یعنی خواب کی تعبیر یہ ہے کہ ”حقیقت محمدیہ“ سدا تیرے حال پر سایہ گلن ہے اگر چہ غفلت تیری غفلت کو لے دیتی ہے اور ”باطن نبوت“ کسی وقت بھی دامن تربیت تجھ سے نہیں سمیٹتا اگر چہ آداب ظاہر سے انجام نہیں پارہے ہیں۔

کہتے ہیں کسی کا خواب دوسرے کے لئے حجت نہیں ہوتا ہے خواب کا مسئلہ دو لحاظ سے بحث طلب ہے: اسلامی شریعت کے لحاظ سے اور نفسیاتی جائزے کے لحاظ سے۔

جہاں تک اسلامی شریعت کا تعلق ہے رویاے صادقہ کو نبوت کا ایک شعبہ باشاں بتایا گیا ہے لیکن ”رویایے صادقہ“ کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ شرعی احکام کے تقاضوں کے خلاف نہ ہو نہ میں شیطان کا دخل ضرور ہوگا۔ راقم السطور چونکہ مفتی نہیں ہے اس لئے بیدل کے خواب کے بارے میں اس حیثیت سے کوئی بات لکھنا مناسب نہیں سمجھتا۔ ویسے بخاری شریف کی ایک حدیث ہے کہ ”رَأَى رَأْسِي فِي الْمَنَامِ فَقَدْ رَأَى فَانَ الشَّيْطَانُ لَا يَتَمَثَّلُ فِي صُورَتِي“ جس نے خواب میں دیکھا اس نے یقیناً مجھ ہی کو دیکھا کیونکہ شیطان میری صورت میں نہیں آسکتا۔ (بخاری مترجم ص ۱۰۰) جہاں تک نفسیاتی تحلیل کا تعلق ہے تو اس موضوع پر ہم باب ”بیدل کے افکار و خیالات“ ضمن میں بحث کریں گے۔

اب اگر تھوڑی دیر کے لئے ہم یہ تسلیم کر لیں کہ بیدل کو خواب میں واقعی حضور ﷺ اور حضرت علی کی زیارت ہوئی اور حضرت علی نے خواب کی تعبیر بتائی تو یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ تعبیر خواب اس کے وضع قطع اور باطنی میلان و رجحان کی نشاندہی کرتی ہے۔ جیسا کہ آئندہ صفحات میں ہم پڑھیں گے بیدل نے ظاہری احکام سے کچھ بے اعتنائی کا اظہار کیا ہے حتیٰ کہ بعض اسلامی شعار مثلاً داڑھی وغیرہ کا تعلق تک اڑایا ہے اور زہد و تقویٰ پر طنز کیا ہے اور علم عقائد کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ اگر احکام و شرائع پر آدمی عمل نہیں کرتا ہے تو وہ بدل ہے لیکن اگر ان کا مذاق اڑاتا ہے تو کفر کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے۔

لے قدر ریش	چہ معنی دارد	غیر تشویش	چہ معنی دارد
آدمی خرس	چہ ظلم است آخر	مرد حق	میش چہ معنی دارد
حذر از زاہد مسواک	بسر	عقرب و نیش	چہ معنی دارد
زاہدی نمی دانم	تقویٰ نمی خواہم	سینہ صافی	دارم نذر درد نوشیہا

شاید بیدل کو دینی امور میں اپنی کوتاہی کا احساس بلکہ اعتراف تھا چنانچہ کہتا ہے:

بامید فضل تو ناز نہیں ہمہ را نیا ز دل است و دین من بیدل و عرق جبین کہ چہ در طبق کم  
اے خدا! تیرے فضل و کرم کی امید پر لوگ دین و دل بطور نیاز پیش کرتے ہیں میں تو بیدل ہوں، میرے پاس دل ہے نہ دین ہے میں ہوں اور تہیدستی کی وجہ سے پیشانی کا عرق ہے شرم آتی ہے کہ اس کو طبق میں رکھ کر تیرے حضور کیسے پیش کروں۔

اس لئے گمان نہیں ہوتا کہ اس طرح کے بہت سے اشعار میں اس نے زہد و تقویٰ اور ریش و ریا

بیدل کا نشانہ بنایا ہے، بلکہ درحقیقت ان لوگوں کو اپنی تعریض کا نشانہ بنایا ہے جو اس کی آڑ میں غلط کرتے ہیں یا دوسرے الفاظ میں جو فروشی اور گندم نمائی کرتے ہیں۔ بہر حال اسی کے دوش بدوش رہنے و دست الوجہ، معرفت، عشق، حیرت، صلح کل، فقر و غنا، تسلیم و رضا، خودی و بیخودی، عزم و ہمت، اہل و عشق، جدوجہد، وارستگی و سرخوشی، غرض بہت سے عارفانہ اور اخلاقی مضامین بھی اپنے کلام میں آئے ہیں اور اپنی تمام تر شاعرانہ صلاحیت اور لیاقت کو ان کی نشر و اشاعت اور تبلیغ و ترویج پر لگا دیا ہے۔ گویا یہ وہ موضوعات ہیں جن کو ہم اس کے الفاظ میں ”حقیقت دین محمدی“ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ بہر صورت خواب کی اس تعبیر کو سن کر بیدل کے دل میں کیا کیفیت پیدا ہوئی اس کے الفاظ میں

”بحر داستان، اہتر از پیکر، خروش قیامت انگیز۔ شیرازہ حواس توایم بحرکت مژگاں،

رہب کسبیت۔ سوادا گاہی کہ موقوف زمان خواب بود، ورق روشنی برگرداند و معنی تعبیر

یک درس سعادت یک عالم بیداری داشت مضر نسخہ خیال نمائند“۔ (۳۵۳)

یہ سنتے ہی میرے پیکر میں اہتر از نفس (خوشی سے جھومنے) کا یہ عالم تھا کہ اس نے ایک دست کا رنگہ کھڑا کر دیا اور میرے قویٰ حواس کا شیرازہ پلکوں کی حرکت سے بکھر گیا۔ علم و آگاہی کی روشنی نے جو خواب کے زمانے پر موقوف تھی روشنی کے ورق پلٹے اور ایک درس کی تعبیر کا مفہوم جو عالم بیداری کی سعادت کا حامل تھا ”نسخہ خیال“ میں پوشیدہ نہ رہ سکا۔

اپنے ان تاثرات کے ذریعہ بیدل نے گویا ہمیں یہ بتانا چاہا ہے کہ جن افکار و خیالات کو اس نے اپنی شاعری کا موضوع قرار دیا ہے ان کا تعلق اسی ”حقیقت محمدیہ“ یا ”روح دین اسلام“ سے ہے۔ اس خواب نے اس کے عارفانہ خیالات کی توثیق و تائید میں اہم رول ادا کیا ہے اور اس کے ادبی و فنی ارتقا کے مطالعہ میں اس نکتہ کو پیش نظر رکھنا بہت ضروری ہے۔

۱۰۸۲ھ ۱۶۷۱ء میں بیدل نے ”سوادا عظم“ کے عنوان سے ایک قصیدہ کہا جو نام کے ساتھ اس

قصیدہ کا مادہ بھی ہے۔ (۳۵۵)

ادبی مقابلے کا قصہ:

اکبر آباد میں قیام کے دوران ایک ادبی مقابلہ پیش آیا۔ یہ مقابلہ بڑی حد تک بیدل کی شاعرانہ صلاحیت و لیاقت، ہوش و گوش اور نظم و نظم پر اس کی یکساں اور بے ساختہ قدرت و توانائی کی دلیل ہے۔ ایک دن وہ اکبر آباد میں شاعروں کی محفل میں شریک تھا، حاضرین میں مرزا جعفر خان کا بیٹا

میر کا مگار بھی جو با اثر اور بارسوخ امراء میں تھا، موجود تھا اور بیدل کے بقول درویشوں سے اس کی ارادت تھی۔ بیدل کو بھی مجملہ درویشوں کے تصور کرتا تھا۔ ان دونوں میں بڑے خوشگوار تہذیبی اختلافات تھے۔ بیدل نے ان کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ لیکن ان کا یہ نشانہ بناتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی سب سے بڑی خامی اور نقص یہ تھی کہ اپنے مقابلے پر بڑے شاعروں مثلاً خاقانی اور امیر خسرو کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے، ست غزلیں کہتے اور اپنے خیال ان پر فخر کرتے اور سامعین سے داد و تحسین کے منتظر رہتے تھے۔ بیدل کو ان کا یہ انداز پسند نہیں آتا تھا۔ لے لے کہتا ہے کہ گو میں شاعری کا دعویٰ نہیں کرتا لیکن اسلاف کی توہین کا یہ انداز میری کدورت سبب بنا ہوا تھا۔ دیوان میں ایک غزل ہے جو غالباً اسی موقع کی مناسبت سے کہی گئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

امروز ناقصان بکمالی رسیدہ اند  
کمز خود سری بحرف سلف خط کشیدہ اند  
آج ناقص اور پست ذہن لوگ اس درجہ اوج کمال کو پہنچے ہوئے ہیں کہ خود سری سے کلام پر غلط کشی کرتے اور اس میں خامیاں نکالتے ہیں۔

انکار کاملاں ہمہ را نقل مجلس است  
ناکس گماں برد کہ بمعنی رسیدہ اند  
کاملوں کی صلاحیت کا انکار مجلس میں ان کی گفتگو کا موضوع ہے، نااہل اس گمان میں نہ آتے کہ بات کہہ گئے ہیں۔

این امت مسیلمہ از افسون یکدو لفظ  
در عرصہ شکست نبوت دیدہ اند  
مسیلمہ کی یہ امت ایک دو لفظ کے جادو سے نبوت کو شکست دینے کے لئے میدان میں آ رہی ہے۔

از صنعت محاورہ لولیان فارس  
ہندوستانیوں نے تمغیل (مخلواری) سے کام لیا ہے۔

از حرف شان تری نتر او چہ ممکن است  
دو فطرتاں سفال نواب دیدہ اند  
کب ممکن ہے ان کے کلام سے ندامت و پشیمانی نہ ٹپکے، پست فطرت لوگوں کو پانی کا پتھر نظر آتا ہے۔

ہرگاہ واری بعروج دماغ شاں  
در زیر پا چو ابلہ بر خویش چیدہ اند  
ان کے دماغ کی بلند پروازی پر اگر غور کیجئے تو زیر قدم ابلہ کی طرح خود آپ اپنی ذات پھول رہے ہیں۔

ابن گروہ بکرم وداع شرم  
بی شبنم عرق ہمہ صبح دمیدہ اند  
ابن گروہ کے سرخیل چونکہ شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ چکے ہیں اس لئے ان کی حیثیت ایسی صبح کی ہو گئی ہے جس میں شبنم نہیں گری ہو۔

از تحت و فوق چشم و دیرہا دریدہ اند  
ابن جو ز جوانان کہ یک قلم  
ان جوانوں سے قطعاً امید نہ رکھئے کہ ادب کا پاس و لحاظ کریں گے انہوں نے زیر و بالا سے اپنی نگاہیں بے شکاف ڈال رکھی ہے۔

شرمی کہ لولیان ہمہ تنبک خریدہ اند  
بیدل یہاں ادب کا ذکر کرنا ہی غلط ہے، شرم شرم کہ بازاری عورتوں نے تنبک (چھوٹا نقارہ، بھنگ) کا خرید لیا ہے۔

ان لوگوں نے بیدل کے متعلق اس خیال کا اظہار کیا کہ اپنے مخصوص افکار و خیالات کی بنیاد پر ادب شری یا مصرع کہہ کر ہمارا تقرب حاصل کر سکتا ہے۔ بیدل کو ان کے انداز گفتگو سے عجب و خود بیدل کی ہنک نظر آئی۔ تب سے وہ موقع کی تلاش میں تھا کہ کسی طرح ان کو زیر کیا جائے اور ان کے انداز کو کچل کر رکھ دیا جائے۔ اتفاق سے ایک دن اکبر آباد میں ”دہرہ“ کے مقام پر ایک مجلس برپا تھی جس میں وہ تمام شعراء موجود تھے۔ وہاں ایک بہت ہی خوبصورت باغ تھا جس کی آب و ہوا نہایت دلکش اور ماحول نہایت صاف ستھرا تھا اور مجموعی طور پر بڑے دلکش فطری مناظر وہاں تھے جس کا ایک صاحب ذوق شاعر کی طبیعت پر بہت گہرا اثر طاری ہو سکتا تھا اور شاعری کے لئے ان میں غیر معمولی ایک چیز اگر کہہ سکتی تھی۔ اس مجلس میں میر کا مگار نے کہا۔

”ال معنی در مدح و ذم ہر شی کمین گر بہانہ اند۔ اگر در مادہ ”غبار“ نظم، نثری بگوش خوردہ  
اشد، سرمہ داری نصیب چشم تامل باید رسانید یعنی ایجاد این کیفیت دامن ترددی باید  
افشاند۔ ہر چند پروردہ خیال غبار افشکن بی ملای نیست اما فی الحقیقت مقام طبیعت آزمائی  
است و معرض قدرت رسائی“۔ (۳۵۶)

یعنی ال معنی کو کسی چیز کی تعریف یا تنقیص کرنے کے لئے صرف ایک بہانہ درکار ہے۔ اگر موضوع پر کوئی نظم و نثر ہمارے کانوں سے ہم آغوش ہو تو چشم تامل کی نصیب میں سرمہ داری کی ضرورت ضرور ہو نہ چائی جائے یعنی اس کیفیت کی پیدائش پر دامن تردد کو جھاڑا جائے (اپنی طبیعت کو ہم میں لائی جائے) گو پردہ خیال میں بغیر زحمت اٹھائے ”غبار انگیزی“ ممکن نہیں پر طبیعت میں آزمانی کا مقام ہے۔

میر کا مگار کا مقصد تھا کہ مجلس میں شرکت کرنے والوں میں سے ہر ایک کی فکری وسعت واز اور شاعرانہ صلاحیت کی جانچ کی جائے۔ دیکھا جائے تو یہ ایک بڑی آزمائش اس معنی میں تھی کہ انتہائی معمولی اور ادنیٰ چیز ”گرد و غبار“ کی اہمیت پر نظم و نثر پر مشتمل چند صفحات لکھے جائیں۔ اس میدان میں طبع آزمائی شروع کر دی۔ بھلا بیدل جیسا عزت نفس کا حامل کس طرح اس اہمیت میں دوسروں سے پیچھے رہ سکتا تھا۔ اس نے لکھا:

”در آنحالت برق آہنگی شوق، تنگ افسردگی نہ پسندید و طوفان نوای ساز بیان بساط تنفس  
برنجید..... پیش از آنکہ این ہرزہ تازان، غبار وہمی بر انگیزند، سبک عنائی خامہ بیدل  
بمزل آرمیدہ بود۔ قبل از آنکہ آن تیرہ دروان، داغ سودائی بسوزند، پر تو این چراغ از  
خلوت بانجن رسیدہ۔ اگر چہ ازان عالم معنی نداشت کہ معنی طرازان را، مصدع تو بجی  
تواند گردید۔ اما بزبان بندی مہجولی چند، افسون قدرتی باخر رسانید۔ اگر توجہ طبیعت، اندکی  
بدر از نفسی می پرداخت، از جنس این عبارات طومار ہامہیا می باخت۔ (۳۵۷)

یعنی اس صورت حال میں شوق کی برق آہنگی کو افسردگی کا تنگ اچھانہ لگا اور ساز بیان کے طوفان صفت نوانے فرش تغافل نہیں بچھانا چاہا۔ اس سے پہلے کہ یہ بیہودہ دوز لگنے لگے (شاعر) غبار وہم اڑائیں خامہ بیدل کی سبک عنائی اور برق رفتاری منزل پر پہنچ چکی تھی اور اس سے پہلے کہ یہ بد باطن داغ سودا کو نذر آتش کریں اس چراغ کا پر تو خلوت سے انجمن میں پہنچ چکا تھا۔ اس مقابلے سے میرا مقصود یہ نہ تھا کہ معنی طراز (اچھے شاعروں) کی توجہ اپنی طرف مبذول کریں۔ چند مہجول (شاعری کے جھوٹے دعویدار اور بہ خیال خود عظیم شاعروں) کی زبان بندی کی خاطر چند پوری طرح دکھایا۔ اگر میلاں طبع معمولی دراز نفسی سے کام لے تو اس قسم کی عبارتوں کے انبار لگا دیں۔ غرض بیدل اس ادبی مقابلے میں گویے سبقت لے گیا اور شاعری اور نثر نگاری کے تقاسم اور کو اس نے پیچھے چھوڑ دیا اور یہ سب محض اس بنا پر تھا کہ وہ شعر اچھا و خود پسندی اور خود ستائی میں تھے جو بیدل کے غیر متند مزاج سے لگانیں کھاتی تھیں ورنہ ذرا دراز نفسی سے کام لیتا تو اس طرح کے مقالوں کا انبار لگا دینا اس کے لئے کوئی مشکل کام نہ تھا۔

”سرمہ اعتبار“ کے عنوان سے بیدل نے جو مقالہ چوتھے عنصر میں شامل کیا ہے وہی مقالہ جسے میر کا مگار کے حسب فرمائش ”باغ دہرہ“ میں اس نے برجستہ اور قلم برداشتہ لکھا تھا یہ مقالہ نظم و نثر پر مشتمل ہے اور کوئی چھ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور درحقیقت بیدل کی اظہار مافی الضمیر پر غیر قدرت کی دلیل ہے۔ اس مقالے کے آخر میں بیدل نے ایک غزل لکھی ہے جس میں اس نے

اسے اسلحہ تحریر کے طور پر استعمال کیا تھا اس کا تذکرہ کیا ہے۔  
شوقی گردی ز راہ میرزای کا مگار  
جلوہ فرمادہ بچہدیں اقتدار  
گردی راہ سے گردی شوقی بڑے کروفر سے میری نگاہوں کے سامنے جلوہ آرا ہوئی۔  
مخدوم ارباب وفا ناظر حسن ازل، منظور فضل کردگار  
مرزا کا مگار جو صوفیوں اور درویشوں کا خادم، ارباب وفا کا مخدوم، حسن ازل کا ناظر اور فضل

کا ناظر ہے۔  
تا نفس بردل رسائی رفتہ گیر از دل غبار  
اندیشہ عرض تمنا پیش او  
جس کے سامنے عرض تمنا کی فکر میں نفس جب تک دل تک رسائی حاصل کرے دل سے غبار

ہے۔  
شوق گردانگیت تا ایں جلوہ ہا شد آشکار  
نثری داشت طبع روشنش  
اس کے طبع روشن میں نظم و نثر کی خواہش پیدا ہوئی تو شوق نے اس حد تک گرد انگیزی کی کہ یہ

”عالم مہم“ پیہم شوقی نیرنگ نیست  
می دہد اینجافس صبح قیامت در کنار  
”عالم مہم“ سدا شوقی نیرنگ نہیں ہوتا ہے یہاں نفس اپنے پہلو میں صبح قیامت کو بھی جنم

دے۔  
نخت سامان چراغان داشت این مشت شرار  
از پر زدن خورشید انشا کردہ اند  
ذرے پر مار مار کر آفتاب کو جنم دیتے ہیں۔ اس مٹھی بھر چنگاری (انسان) کے پاس چراغان

ساز و سامان میں۔  
این بود کز گرد خیال انگیزش  
دیدہ غفلت نگاہ چند گرد و سرمہ وار  
مقصود یہ تھا کہ خیال انگیزی کی گرد سے چند دیدہ غفلت نگاہ کو کچھ سرمہ پہنچے۔

حاصل داخواب گل زین گرد مژگاں پرور است  
حاسد اینجا سولش الماس گو در دیدہ کار  
اس کے دوستوں کا خواب گل مژگاں پرور ہے (یعنی گرد پر لکھے گئے اس مقالے سے دوستوں

کو شک آتا ہے کہ انہیں نیند آ جاتی ہے) حاسدوں کو کہہ دو کہ ان کی آنکھوں میں ہیرا اپنا رنگ دکھائے۔  
خبر چند کز دامن گل افشاںدہ ایم  
چشم اگر باشد بسا مانست یک عالم بہار  
دامن گل سے جو یہ چند گرد و غبار جھاڑے ہیں آنکھ اگر وا ہو تو آسمیں ایک مکمل عالم بہار کا سامان

دکھائے گا۔

مقالہ ”سرمہ اعتبار“ لکھنے کے پیچھے کون سی چیز محرک تھی ان شعراء سے یہ تو معلوم ہے کہ اس کے علاوہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بیدل نے اس وقت تک شاعری میں اتنی ترقی اور شہرت حاصل کی تھی کہ اکبر آباد کے بعض شاعر اس سے جلتے تھے۔ اس پس منظر میں ہم شیر خان لودی کے یقین کر سکتے ہیں جس میں وہ اسے اپنے عہد کا سب سے بڑا اور مشہور شاعر قرار دیتا ہے۔ تاہم ہوگا اگر یہاں اکبر آباد کے بعض شاعروں کے بیدل سے حسد رکھنے کے ایک دوجا کا تذکرہ کریں جن کو خوشگونی اپنے تذکرے میں لکھا ہے۔

بیدل داڑھی مونچھ بالکل صاف کر دیا کرتے تھے ایک دن اکبر آباد کے ایک شاعر عبد الرحیم تھا، نے درج ذیل شعر لکھ کر اس کی پاکی میں ڈال دیا۔  
چہ خطا در خط استاد ازل دید آیا کہ بہ اصلاح خط وریش نیاز افتاد  
استاد ازل یعنی خدائے تعالیٰ کی تحریر اور انسانی ساخت کی بناوٹ میں آخر کون سی غلطی نظر آئی کہ آپ کو اپنے خط اور داڑھی کی اصلاح کی ضرورت پڑ گئی۔

بیدل نے فوراً اور بے ساختہ اس کا جواب دیا:  
مختصر کن بہ تغافل ہوس جنگ وجدل مدرسہ رشتہ تحقیق دراز افتادست  
بحث و مباحثہ اور لڑائی دنگ کی خواہش پر کنٹرول کرو۔ رشتہ تحقیق کا سرا بہت لمبا واقعہ ہے شاید بیدل کا مطلب یہ تھا کہ دین و مذہب پر تحقیق و تدقیق کا سلسلہ بہت دراز ہے اور اسے تقاضے طویل ہیں وہ صرف داڑھی مونچھ میں ہی سمٹ کر نہیں رہ گیا ہے بلکہ اصل چیز اسلامی روح مزاج ہے جسے وہ ”حقیقت محمدیہ“ سے تعبیر کرتا ہے۔ ظاہری حالات اور وضع قطع کا نام دین نہیں ہے۔

شاہ قاسم ہوا الہی کے انتقال کا واقعہ:  
۱۰۸۳ ہجری ۱۶۷۲ء میں عالم رویا میں حضرت شاہ قاسم ہوا الہی کی وفات کی خبر بیدل پر منکشف ہوئی۔ اس خواب کی اس لحاظ سے بڑی اہمیت ہے کہ اس سے ”کشف قلوب“ کے روشنی پڑتی ہے۔

واقعہ اختصار کے ساتھ اس طرح ہے کہ ایک دن بیدل عالم رویا میں خود کو حسب معمول شاہ صاحبؒ کی صحبت میں، جو اس وقت اڑیسہ میں تھے، دیکھتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک پیالہ ہے وہ پیالے کا پانی پیتا چاہتا ہے کہ ادب اور شرم دونوں آڑے آتے ہیں۔ آخر اس نے پیالہ شاہ صاحبؒ پیش کیا۔ شاہ صاحب نے سارا پانی پیالے کا پی لیا مگر ایسا لگ رہا تھا جیسے انہوں نے سرے سے پانی نہ

کی تھی بدستور قائم ہو۔ یہ صورت حال دیکھ کر بیدل کو حیرت ہوئی۔  
یہ تو رات کی رویداد تھی۔ دوسری رات کیا دیکھتا ہے کہ شاہ صاحب جام بدست و شیشہ در بغل فرماتے ہیں۔ انہوں نے شیشہ اور ساعز بیدل کے حوالے کیا بالکل اسی طرح جس طرح شرابی لوگ ساغر کا دور چلاتے ہیں۔ بیدل کو خیال آیا کہ شاہ صاحب کی محفل اس قسم کی شراب اور ساغر کی ہے اس لئے لامحالہ اس بادہ و ساغر میں کوئی راز مضمر ہے۔ غرض شاہ صاحب کے حسب عہد نے پیالہ بھر کر شراب پی۔ تب شاہ صاحب نے فرمایا:

”دور پیالہ خود دیشب بانجام رسانیدیم۔ لیکن در حسن قسمت تو بود کہ بتو عاید گردانیدیم۔ بعد ازین سرخوش قدرح پیانی شوق می باش و دماغ اندیشہ بہ خار ہای کدورت نخر اش“۔ (۳۶۰)

ہم نے اپنے پیالے کا دور شب گزشتہ پایہ تکمیل کو پہونچایا اتنی شراب تیری حسن قسمت میں تھی۔ اس کے بعد مئے شوق کی قدرح پیانی سے مست و سرخوش رہ اور دماغ فکر کو خار کدورت کی حالت مت لگا۔

شاہ صاحب کے حسب حکم بیدل نے چند گلاس نوش کئے پھر محسوس کیا کہ اس کا دماغ ہر قسم کی بات یا وہم کی کرشمہ سازی سے نجات پا چکا ہے۔ اس حالت میں وہ خود کو ”محیط عالم آب“ تصور کرتا ہے اور شرابیوں کی طرح اس کے پیر لڑکھڑاتے ہیں۔ جب خواب سے بیدار ہوا دل پر وہی مستی کی کیفیت طاری تھی۔ بیدل کو یقین ہو گیا کہ شاہ صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔

تیسری رات کو خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ کچھ صوفی اور مجذوب قسم کے لوگ ایک جگہ جمع ہوئے۔ جن میں اس نے اس محفل میں قدم رکھا ان حضرات نے اس سے درخواست کی۔  
”اگر تاریخی در واقعہ رحلت حضرت شاہ بزبان قلم آوردہ باشی آرزو سراپا گوش است و شنیدن سرا سر آغوش“۔

حضرت شاہ صاحب کے سانحہ وفات سے متعلق کوئی تاریخ کہو کہ اشتیاق اس کے سننے کے سراپا گوش بنا ہوا ہے بیدل نے برجستہ یہ مصرع کہا۔

”زبی تعینی ذات رفت نام صفت“  
یعنی نام صفت (شاہ صاحب) ذات (خداوندی) کی بے تعینی کے حدود سے نکل گیا۔  
اس مصرع کو سن کر ان پر کیف و سرور کا عالم طاری ہو گیا اور تعریف کرتے ہوئے کہا۔  
”الحق تاریخی باین لطافت نمی توان گفت و گو ہری باین نزاہت نمی توان سفت“۔



سچی بات یہ ہے کہ ایسی لطیف تاریخ نہیں کہی جاسکتی اور ایسا پاک و صاف موتی لڑی نہیں جاسکتا۔

جب خواب سے بیدار ہوا تو وہی مصرع اس کے ذہن و دماغ پر ثبت تھا۔ اس کے بعد عدو دشاری سے اس واقعہ کی تاریخ نکالنا ممکن نہ تھا لیکن کافی غور و خوض کے بعد معنی کا سرالفاظ شاہ صاحب کے سال وفات کے مطابق پایا جاسکتا تھا۔ یقین ہو گیا کہ ایک لمبے عرصے تک درمیان چونکہ قلبی تعلق قائم تھا اس لئے اگر اس قسم کے معانی اس کے قلب پر الہام ہوتے ہوں گے بعید نہیں کہ ایسا ہی واقعہ رونما ہوا ہو۔

اس کے باوجود چھٹے مہینے تک محض اس خیال سے اس کا تذکرہ نہیں کیا کہ کہیں یہ قوت اختراع نہ ہو آخر اس کے کچھ دوست اڑیسہ سے اس کے پاس آئے۔ انہوں نے اسی تاریخ میں صاحب کی وفات کا تذکرہ کیا جو تاریخی مصرع سے نکلتا تھا۔ بیدل کو اس پر حیرت ہوئی۔ مزید اشعار کہہ کر اسے ایک قطعہ کی شکل دیدی۔

شده سریر یقین قاسم ہوا للہی  
مرغ ہمت عنقا پیش رسائی کرد  
حضور ذات می شوق و حدش پیوود  
بعافیت کدہ غیب برد شمع شہودش  
ز سال واقعہ اش بیخودی بگو شم گفت

ترجمہ:

شاہ قاسم ہوا للہی سریر آرائے تخت یقین ہوئے ان کی ذات حق ایک ملک انتظام صفت کی تھی۔

ان کے عنقا صفت مرغ ہمت نے ایک اڑان بھری اور دام صفت آشوبگاہ (دنیا) سے پرواز کر کے حضور ذات نے ”شوق وحدت“ کی شراب نوش کی، تغافل برقی اور جام کی طرح برہم ہو گیا۔

ان کے شمع ”شہود“ نے انہیں غیب کے عافیت کدے میں اور خرام صفت پاؤں نے ”احدیت“ تک پہنچا دیا۔

عالم بیخودی نے اس واقعہ کے سال کی بابت میرے کان میں کہا، وہ نام صفت ذات کی بجائے سے آگے بڑھ گیا۔

یہ اس طرح ہے کہ ”زبی تعینی ذات“ کے اعداد ۱۶۵۳ ہوتے ہیں اس سے ”رفت نام“ نکال دیجئے جو ۵۷۰ ہوتے ہیں تو ۱۰۸۳ ہجری نکل آئے گا۔

اس واقعہ کے بعد بیدل نے کشف قلوب کے مسئلے پر بحث کی ہے۔ راقم السطور نے اس واقعہ کے باب ”بیدل کے افکار و خیالات“ کے ضمن میں اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔ ۱۰۸۳ ہجری ۱۶۷۳ء میں بیدل کہاں تھا؟ اس کی کتاب سے واضح نہیں ہوتا لیکن جیسا کہ اس کے بیان سے ظاہر ہے جب بیدل نے اعظم شاہ کی ملازمت سے کنارہ کشی کی ہے۔

بیدل کا سفر لاہور و حسن ابدال و کشمیر:

دماغ آشفٹہ خاصیت پنجاب و کشمیر

کہ بوی ہر گل آنجا با پیاز و سیری جوشد

پنجاب و کشمیر کی جغرافیائی یا اجتماعی خصوصیات کی وجہ سے جہاں ہر پھول کی خوشبو پیاز و لہسن کے آمیزش میں پھیلتی ہے، میرا دماغ آشفٹہ رہتا ہے۔

۱۰۸۵ھ ۱۶۷۴ء میں بیدل دہلی میں تھا اور وہاں سے جیسا کہ لکھا گیا لاہور کے لئے روانہ ہوا۔

شوق را از عزیمت لاہور تازگیہای مژدہ شادیت

لاہور کے لئے عزم سفر کے سبب شوق کو نوید مسرت کی تازگی نصیب ہوئی۔

جنی از دامگاہ افسردن چند گاہم نوید آزادیت

جنی دامگاہ افسردگی (افردہ دلی کے جال پرونے کی جگہ یعنی دہلی) سے کچھ دنوں کے لئے کوئی نوید ملا ہے۔

سال تاریخ این عزیمت شوق بی تکلف شنو ”خدا ہادیست“ (۳۶۳)

اس عزیمت شوق کے لئے بے ساختہ سال تاریخ سنو: ”خدا ہادیست“ (۱۰۸۵) ہے۔

اس سفر کی اگر وہ ترتیب پیش نظر رکھیں جس کو بیدل نے چار عنبر اور رقعات میں بیان کیا ہے وہ محمد ساقی مستعد خان اور غلام علی آزاد بلگرامی کے بیانات بھی مد نظر رہیں تو ہم حقیقت کا ایک نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں۔

گمان ہے کہ واقعہ استعفا کے بعد بیدل نواب شکر اللہ خاں سے زیادہ قریب ہو گیا۔ بیدل، محمد ساقی مستعد خان اور آزاد کے مجموعی بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ خان موصوف اس وقت (۱۰۸۵) میں

سہارنپور میں صوبیدار کے عہد پر فائز تھا۔ اور وہاں سے تحفے میں آم اور خر بوڑہ وغیرہ بیدل کو بھیجا تھا۔ جن مختلف عہدوں پر خان موصوف سرفراز رہے مستعد خان کے مطابق وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ فوجدار سہرند (سرہند) ۱۰۹۲ ہجری ۱۶۸۱ء سے پہلے۔  
۲۔ فوجدار شاہجہاں آباد یکم جمادی الاول ۱۰۹۲ھ تا ۶ شوال ۱۰۹۳ھ۔  
۳۔ فوجدار سکندر آباد ۶ شوال ۱۰۹۳ھ تا ۱۰۹۸ھ۔  
۴۔ فوجدار نواحی جہاں آباد ۱۰۹۸ھ تا ۱۱۰۸ھ (۳۶۳)

پہلے فقیر بسبب بارش ازراہ سہارنپور بدلی بازگردیدہ۔ (۳۶۸)

زمانے میں خاکسار بارش کے سبب سہارنپور کے راستے دہلی واپس ہوا۔  
جس کا پہلے لکھا گیا بیدل ۱۰۸۵ھ میں لاہور گیا تھا اور اسی سال وہاں سے واپس ہوا ممکن  
سہارنپور کے راستے ہوئی۔ دوسرے خط کا عنوان ہے۔

رسالہ دلی انبہ اس میں ایک جگہ لکھتا ہے۔

در سہارنپور بالہ بدلی بایدش محمل کشیدن (۳۶۹)

یعنی آسمان سے اگر سہارنپور میں پیدا ہوتے ہیں تو انکا کجاوہ دہلی تک کھینچ لانا چاہئے۔  
ان خطوط اور مذکورہ بالا قلمی کو سامنے رکھ کر یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ بیدل کو استعفا کے بعد جب

سہارنپور سے سابقہ پڑا اور اس کی طبیعت افسردہ رہنے لگی تو اس کی ملاقات ایزد بخش رسا سے ہوئی  
پہلے اس کے خطوط سے واضح ہوتا ہے اور اس کے حسب دستور مولانا عبدالعزیز عزت

کی خدمت میں اس نے لاہور کا عزم کیا کہ اس طرح شاید ”دامگاہ افسردن“ سے رہائی اور  
”میری“ کے حصول کی صورت نکل آئے۔ بلکہ ترکیب ”مژدہ شادی“ بتاتی کہ بیدل کے لئے

”میری“ کی ذریعہ آمدنی کی خوشخبری دی گئی ہوگی ورنہ اتنے لمبے سفر کے لئے زحمت اٹھانے کا کوئی  
”میری“ نہیں آتا ہے۔

ایزد بخش رسا لکھتا ہے:

”چند شہر رمضان ۱۰۸۵ ہجری..... انشاء اللہ العزیز میرزا عبدالقادر بیدل کہ سراپا دلست  
قریب بملازمت سعادت اندوز“۔ (۳۷۰)

چند رمضان ۱۰۸۵ھ انشاء اللہ مرزا عبدالقادر بیدل جو سراپا دل ہیں جلد ہی خدمت میں حاضر  
سعادت حاصل کرتے ہیں۔ لیکن اس سفر میں وہ پہلے شکر اللہ خان کے پاس سہارنپور گیا جہاں

بیدل نے اس پر غیر معمولی عنایتیں کیں۔  
مذکورہ بالا قلمی کے علاوہ چہار عنصر میں درج بیدل کے بیان سے بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ اس

وقت میں سازگار حالات سے دوچار تھا:  
آئی غبار قافلہ تجردم، از ساحت عرصہ دہلی، بسیر پنجاب دامن عزم شکست۔ دورای محمل  
پیش آہنگی سفر لاہور کر شوق بر بست۔ گردنہائی لشکری بود ہزار علم فتح در رکاب شکست

”حکومت سہرند، سہارنپور و میوات سرفرازی یافتہ“۔ (۳۶۵)

وہ سہرند، سہارنپور اور میوات کے صوبیدار رہے لیکن مستعد خان سہارنپور کی صوبہ داری کا  
تذکرہ نہیں کرتا اس لئے قیاس کیا جاتا ہے کہ سہرند سے پہلے وہ سہارنپور کے فوجدار رہے۔ بیدل نے

اللہ خان کے منصب میں ترقی کی مناسبت سے ایک خط اس کو لکھا جس میں مادہ تاریخ بھی درج ہے  
سے ۱۰۹۰ ہجری ۱۶۷۹ء لکھتا ہے۔

”تاریخ او مراتب تائید ایزدیت“۔ (۳۶۶)

مستعد خان کے بیان اور بیدل کے اس مادہ تاریخ کو سامنے رکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ  
خان ۱۰۹۰ ہجری میں سہرند کی فوجداری پر مامور تھا اس لئے یقیناً اس سال سے پہلے سہارنپور کی فوجداری

اس کے سپرد تھی۔ شکر اللہ خان کے بیٹے عنایت خاں کے نام بیدل کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ  
سہارنپور میں خان موصوف کے قیام کے دوران بیدل وہاں گیا اور نواب صاحب موصوف کی اس

بڑی عنایتیں اور مہربانیاں ہونئیں۔

”مہربانیاں خالصہ الطاف مناصب والفتاہای میر صاحب کرم مناقب از عالم تقریر  
بیرونست۔ گاہی بمقتضای بی اختیار ساری بہ سہارنپور کشد و بیادگرای صحبت خوددار

خدمت فیض منقبت ایشان دلی دہد۔ باطفای شعلہ ہای بیکسی، اگر آبی ہست در آنجا جلوگر  
ست، وہ تسکین جراحہای بیدی اگر مرہمست ہماچہ در نظر“۔ (۳۶۷)

خالصہ الطاف مناصب کی مہربانیاں اور میر صاحب کرم مناقب کی عنایتیں بیان سے  
ہیں۔ کبھی عالم بخود دی میں سہارنپور کا خیال کرتا ہوں اور صحبت گرامی کی یاد میں خدمت فیض منقبت

اپنا دل بہلاتا ہوں۔ بیکسی کے شعلوں کو بجھانے کے لئے اگر کہیں کوئی پانی ہے تو وہ وہیں نظر آتا ہے  
بیدل کے دغوں کو بھرنے کے لئے اگر کہیں کوئی مرہم ہے تو وہ بھی وہیں دکھائی دیتا ہے۔

بیدل کے دغوں کو بھرنے کے لئے اگر کہیں کوئی مرہم ہے تو وہ بھی وہیں دکھائی دیتا ہے۔

طرح پر دیوینر نور الحسن انصاری اور ان کے فارسی مترجم پروفیسر میر حسن شاہ نے لکھا ہے کہ: باب ۱۰۸۵ھ ۱۶۷۳ء میں اورنگ زیب کی فوج حسن ابدال گئی تو بیدل بھی اس کے ساتھ تھا اور رجب الاول ۱۰۸۶ھ تک وہیں قیام پذیر رہا اور یہ بات ایزد بخش رسا کے ایک خط سے جو اس کے مجموعہ خطوط ”ریاض الوداد“ میں شامل ہے معلوم ہوتی ہے۔ (۳۷۳)

بیدل کے بیان سے ان حضرات کی غلط فہمی یا غلط نتیجے پر رسائی پوری طرح واضح ہے کیونکہ ”گرد تہائی“ اور ”رنگ بیکسی“ وغیرہ کی تراکیب میرے خیال کی تائید کرتی ہیں۔ نیز یہ کہ رنگ زیب کی فوج ۱۱ محرم ۱۰۸۵ھ کو حسن ابدال کے لئے روانہ ہوئی (۳۷۳) جبکہ ایزد بخش رسا کے بیان کے اواخر یا شوال کے اوائل یعنی نو یا دس مہینے بعد بیدل لاہور کے لئے روانہ ہوا ہے۔

ابا با حسن ابدال کی از براہمہ با فقیر بیدل اتفاق رفاقت داشت۔ (۳۷۶) ابا حسن ابدال کے سفر میں ایک برہمن کو خاکسار بیدل کی رفاقت حاصل رہی۔ یہاں لگتا ہے کہ شروع میں وہ اکیلے ہی روانہ ہوا پھر سفر کے دوران اس کی ملاقات ایک برہمن سے ہوئی اور آخر تک ساتھ ساتھ رہا۔

### بیدل کا قصہ:

اس سفر میں بیدل کے پاس ایک چاقو تھا جس سے وہ قلم تراشا کرتا تھا لیکن وہ ایسی بھدی شکل کی چاقو کے پنجے موزوں پر گراں گزرتا تھا اور کانٹے کی طرح اس کی آنکھوں میں کھٹکتا رہتا تھا جب وہ اپنے سفر سے واپس آیا تو اسے وہاں کچھ لوہار نظر آئے ان سے پوچھا:

یہ کس پار شکستگی این کار دوزخی گمارد و نیک و بد اندامی از بنیاد این ترکیب بردارد؟ (۳۷۷) یعنی اس زخمی چاقو کی شکستگی پر پاؤں رکھنے اور اس کی بد شکلی کو دور کرنے کے لئے کون تیار ہے۔ وہاں اس کام کی انجام دہی کے لئے اپنی خدمت پیش کرنے کو آگے بڑھا۔ ایک ماہر لوہار نے اسے چاقو لے کر اس کو موزوں شکل و صورت دیدی۔ بیدل نے اسے اجرت دینا چاہا لیکن اسے اپنے سے انکار کرتے ہوئے کہا:

مے ذرا سے کام کے لئے اجرت کی امید رکھنے کا کیا موقع ہے۔ آخر ہم بھی تو اس گوشے میں نزول رحمت کی آس لگائے بیٹھے ہیں اور اس دیرانے میں نوید سعادت کے لئے ہمارے ہاں۔

ہالی۔ ورنگ بیکسی عالمی داشت چندیں بہار جمعیت در غبار آشفته حالی۔ اقبال لی سرو پای کلاہ سر شکستگی، از جنبیت کشان فلک دوار می ربود۔ شکوہ عریان تہی، مقابل نیزہ داران خورشید، آئینہ عرض اقتداری نمود۔ بآئین مجاذیب، سنگ و خشت پیش پا افتادہ را، تعلیم گل بازی پروازی کردم و خاک و گل براہ نشستہ را، پر کشا سعی ہوا، برمی آوردم۔ ہر کجا از پای می نشستم، آسودگی، چون نقش قدم، بساط عافیت می پرداخت۔ و ہر گاہ، براہ می افتادم وارتنگی چون نسیم، پیشم می تاخت۔ (۳۷۱)

یعنی جس وقت میرے قافلہ تنہائی کے غبار نے پنجاب کی سیاحت کی خاطر ساحت رحمت دامن عزم توڑا (پنجاب کی سیاحت کے لئے اکیلا روانہ ہوا) اور درائے مجمل خیال نے سفر لاہور کی آہنگی کے لئے اپنے شوق کا کمر کسا (لاہور کے سفر کا عزم کیا) گرد تہائی ایک ایسی فوج تھی جو ہر ہزاروں علم شکستہ ہالی کے رکاب میں تھامے ہوئے تھی اور رنگ بیکسی کا یہ عالم تھا کہ قلبی سکون کی بہاریں پر انگندہ حالی کے غبار میں گرفتار تھیں۔ ”بے سرو سامانی“ کا اقبال کلاہ جیرانی کو فلک چرخ کی جنبیت کشوں سے اچک رہا تھا اور ”عریان تہی“ کا شکوہ خورشید کے نیزہ داروں کے مقابلے پر عزم اقتدار کا آئینہ دکھا رہا تھا۔ (یعنی انتہائی بے کسی، بے سرو سامانی اور عریان تہی سے دوچار تھا) نیز سادے پڑے پتھروں اور ٹھیکروں کو مجذوبوں کی طرح گل بازی پرواز کی تعلیم دے رہا تھا (بے دلی سے) ٹھوکریں مارتا جا رہا تھا) اور راستے میں بیٹھی خاک اور دھول کو سعی ہوا سے پر کشا بنا کر نکال رہا تھا (اصل اڑاتا جا رہا تھا) جہاں کہیں تھک کر بیٹھ جاتا آسودگی نقش قدم کی طرح عافیت کی بساط بچھاتی تھی اور کبھی راستے پر چل پڑتا وارتنگی باد نسیم کی طرح میری آگواںی کرتی تھی۔

اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ بیدل پنجاب کے سفر میں شروع میں اکیلا تھا اور اپنے ہمالیہ حالات سے وہ اتنا پریشان اور پراگندہ خاطر تھا کہ یہ راستہ بھی انتہائی بیدلی سے طے کر رہا تھا۔ سنگریزے راستے میں پڑے ملتے تھے پاگلوں کی طرح ان کو اچھالتا اور دھول اڑاتا چلا جا رہا تھا۔ یسین خاں نیازی نے اپنے ایک مضمون ”مرزا بیدل کے تعلقات“ میں لکھا ہے کہ مرزا بیدل سے متعلق بیدل کا مذکورہ بالا بیان اس واقعہ سے متعلق ہے جو ۱۱۳۲ھ ۱۷۱۹ء میں پیش آیا تھا۔ یہ رباعی کی بنیاد پر جو بیدل نے سادات بارہہ کی نمک حرامی پر کبھی تھی حسین علی خاں کی ایذا رسانی سے واہمہ سے وہ لاہور بھاگ گیا تھا (۳۷۲) جب کہ بیدل نے چار عشر ۱۱۱۶ھ ۱۷۰۳ء میں تھل کر دی اور اس لئے یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ مذکورہ بالا عبارت بیدل کے اس سفر لاہور سے متعلق ہے جو وہ لاہور میں اس نے کیا تھا۔

دوران سفر ایک دن برہمن نے جو بیدل کی نمایاں اور بھاری بھر کم علمی شخصیت سے کسی حد تک متاثر ہوتا تھا محض اپنی تسلی خاطر کے لئے قیام قیامت کے زمانے کے متعلق دریافت کیا:

”شہیدہ ایم جی از جناب الفح دبستان کائنات رسول خاتم صلی اللہ علیہ وسلم مسئلت نمودند: مشاہدہ استقبال نتائج حال و مکافئہ وقوع پاداش اعمال، یعنی بی پردگی آشوب قیامت بکدام ساعت صورت خواهد بست و در چند مدت نظہو و خواہد پیوست؟ فرمود: در یک روزہ برہم زدن ال نقاب مرفوع است۔“ (۳۸۱)

جی ہم نے سنا ہے کہ الفح دبستان کائنات جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کی ایک قیامت نے دریافت کیا: ”نتائج حال“ کا مستقبل میں مشاہدہ اور پاداش اعمال کے وقوع کا مکافئہ یعنی قیامت کی بے پردگی کب صورت پذیر ہوگی اور کتنی دیر میں منہ شہود پر آئے گی فرمایا: ایک چمک جھپکتے میں وہ نقاب اٹھ جائے گا۔“

حضور ﷺ کے ارشاد پر برہمن کے اعتراض کا مطلب یہ تھا کہ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب دنیا اور دفعہ پلک نہ چھپکاتے ہوں لیکن قیامت کا ہنوز کہیں کوئی نشان پتہ نہیں ہے۔ اس میں شک نہ تھا کہ دنیا جن تبدیلیوں اور انقلابات سے گزر رہی ہے وہ یہ واضح کرتے ہیں کہ چمن کے پھول ہر آن اپنا ہوا کرتے ہیں اور کسی ایک مستقل اور پائیدار شکل میں نہیں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہماری سرگرمیاں ”زمان حال“ میں ہم انجام دیتے ہیں ان کے نتائج مستقبل میں کتنی دیر میں ہمیں نظر آئیں گے۔ سوال کرنے والوں نے ”مستقبل“ کے بابت کچھ نہیں پڑھا ہے۔ یہ لوگ جو موجودہ سرگرمیوں میں مصروف ہیں وہ ”مستقبل“ کو کس طرح سمجھ سکتے ہیں اس لئے جواب میں صرف اس نکتے پر اکتفا کیا کہ دنیا کے سارے معاملے مستقبل میں ایک چشم زدن میں حل ہو جائیں گے۔ سوال کے جواب میں یہ کیا ہو سکتا ہے؟ اگر قیام قیامت سے حضور کا مقصد ”تجدد امثال“ ہے تو پھر اس کے لئے اس سے زیادہ واضح اور غیر مبہم تعبیر استعمال کرنی چاہئے تھی تاکہ سوال کرنے والے کسی غلط فہمی کا شکار نہ رہیں۔ اسلامی فلسفہ کے برعکس ہندوؤں کے فلسفے میں قیام قیامت کے لئے ایک مخصوص اور معین وقت ہے جو ہندوؤں کی اصطلاح میں ”جگ“ کہلاتا ہے یہ جگ جب ہزار بار گردش کرے گا تو وہ برہما کے ایک دن کے برابر ہوگا اور جب اسی طرح سو سال گزر جائیں گے تو برہما کا خاتمہ ہو جائے گا اور دار و گیر کا نامہ کھڑا ہو جائے گا۔

بیدل کا جواب اول بعینہ اس طرح نقل کیا جاتا ہے بعد میں اس کی وضاحت کی جائے گی۔ یہاں پر اس کے بیان میں فلسفیانہ رنگ پوری طرح چھپایا ہوا ہے۔

بیدل اس کی اس دلکش اور منطقیانہ گفتگو سے کتنا متاثر ہوا اس کا اندازہ اس کے بیان سے جاسکتا ہے:

”بی تکلف لطف کلامی معانیہ کردم کہ قلقل ہزار محمدہ مینا بہ غشاء سہا عش نفس در کام دردیہ کیفیت نگاہی مشاہدہ کردم کہ موج ہزار سخن ساغر در مقابل ادائش خط بر زمین کشید۔ انداز آن گفتگو از عالم ظہور حرف و صوت نبود۔ سحر پردازی آن تبسم، غیر از درہای اعجازی کشود۔“ (۳۷۸)

انداز گفتگو کا وہ لطف ملا کہ ہزاروں محمدہ مینا کے قلقل (شیشہ یا صراحی سے شراب کے گتے کی آواز) کی سانس اسے سن کر حلق میں اکٹ کر رہ گئی اور نگاہ کی وہ کیفیت نظر آئی کہ ساغر کی لہریں اس کی ادا کے مقابلے پر زمین پر خط کشی کرنے لگیں (شرمانے لگیں)۔ اس گفتگو کا اندازہ صوت کے اس عالم ظہور سے لگا نہیں کھاتا اور اس مسکراہٹ کی سحر پردازی در اعجاز کے سوا کچھ نہیں کھولتی تھی۔

بیدل کی ایک برہمن سے ملاقات اور مسئلہ قیامت پر بحث:

یہ کہنا مشکل ہے کہ سرائے نیکو در بابا حسن ابدال سے پہلے ہے یا بعد میں لیکن بیدل کے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دہلی سے اول تہا پنجاب روانہ ہوا اور سرائے نیکو در تک آکھارہا اور جب ابدال کی طرف بڑھا تو راستے میں ایک برہمن کی رفاقت اسے حاصل ہوئی۔ لکھتا ہے:

”در سفر راہ بابا حسن ابدال یکی از براہمہ بانقیر بیدل اتفاق رفاقت داشت۔“ (۳۷۹)

بابا حسن ابدال کے راستے میں خاکسار بیدل کو ایک برہمن کی رفاقت حاصل ہوئی۔ ابدال صوبہ اٹک کا ایک شہر ہے جو کھیل پور سے پورب کی طرف پچیس میل کے فاصلے پر واقع ہے مسلمانوں، بدھوں اور سکھوں کی زیارت گاہ ہے۔ (۳۸۰)

برہمن سے بیدل کی بحث کا موضوع یہ تھا کہ ”پلک جھپکتے میں قیامت کا مرحلہ کیسے ہو جائے گا“ یہ واقعہ اس لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ ایک طرف بیدل کے وسیع مطالعہ ہندوؤں کی مذہبی اور فلسفیانہ کتابوں کے مطالعہ تک کی نشاندہی کرتا ہے دوسری طرف اس کے منطقیانہ مناظرے کی صلاحیت کو واضح کرتا ہے۔ علاوہ ازیں قیامت کے بابت اس کے خیالات کیا تھے یہ بات بھی واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔ کچھ لوگوں جیسے نیاز فتح پوری اور جان رپاؤ نے اس کے بعض اشعار کے ظاہری مفہوم کی بنیاد پر اسے ”قیامت کا منکر“ قرار دیا ہے۔

”ایں کلام تقدس مقام از معجزات خیرالانام است صافی عبارت، نقاب شہد از روی جزئیات امکانی برداشتہ، و عروج معنیش علم ادراک الہی کلی برداشتہ۔ مجذب جمیع لطایف، نہ وحشی مرغزار ”حال“ را از احاطہ کندش، یارای بدر میدان۔ و نہ پنجر صید گاہ ”استقبال“ را از آغوش صغیرش امکان بردن طہیدن۔ اینجا ہم معنی ”الاعراض لا یقی زمانین“ سر بر خط تسلیم اشارت است۔ وہم مضمون ”یوم ینفخ فی الصور“ از مقیمان پردہ عبارت۔ اثر این لفظ قدرت شامل اسرار مرکب و بسیط است۔ یعنی از چشمک ذرات کون تا مژگان بر ہم زدن ”بشن“ محیط۔ براہم ”مرتبہ وجوب“ را ”بشن“ می خوانند و عقل کل را ”برہما“ می دانند۔ اصل معتقدات شان ایست کہ می گویند: ”طومار عمر برہما“ با آہمہ درازی در فرصت یک چشم زدن ”بشن سیاہ“ است، و افسانہ رشتہ ہای المانش بفرہم آوردن این یک گرہ کوتاہ۔ تا مژہ او خط کشیدہ است صفحہ این برقم نیستی رسیدہ۔ و تا خامہ اوشق و لرزیدہ است خطوط این نقطہ موہوی انجامیدہ۔ زیرا کہ عقل کل آئینہ ایست امکانی بسبب تقابل نیرنگ و وجوب نقشند صور و اشکال موجودات۔ و بواسطہ تنزل خیالات الوہیت، چہرہ پرداز احوال و امثال کاینات۔ ہر گاہ واجب نقوش بی تو جہی گمارد با غماض ایں تماشا مژہ بر ہم فشارد۔ ممکن کہ آثار بہارش گردست بعالمی موہوی پیوستہ، و مینای اعتبارش رنگی در عین درشتی شکستہ، فرصت کمین بہانہ ایست تا بحیط ناپیدائی غوطہ زند۔ و زورق تو ہم بگرداب معدومی مطلق اگلند۔ اغماض بہار جز پیچیدن بساط رنگ و بود و بارندارد و تغافل سحاب، غیر از خشکی آثار نشو و نمائی کا برد۔ مینوایمہائی بہ نفس دزدیدن مطرب وابستہ، و نارسایمہائی آہنگ بستن رشتہ ساز پیوستہ“۔ (۳۸۲)

یہ تقدس مآب کلام در حقیقت حضرت خیرالانام صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک معجزانہ ارشاد ہے۔ اس کی شگلی عبارت نے جزئیات امکانی کے چہرے سے شہجے کا نقاب ہٹا دیا ہے اور اس کی بلندی معنی نے ادراک الہی کلی کا پرچم لہر ادا کیا ہے۔ ”مجموعہ لطایف“ ہونے کی کشش کے باعث مرغزار ”حال“ کے دشت کو اس کے حلقہ کند سے باہر بھاگنے کا یا را ہے نہ شکار گاہ ”استقبال“ کے شکار کو آغوش صفر (پرندہ کی آواز) سے سرگرمی دکھانے کا امکان۔ (یعنی آپ ﷺ کا ارشاد حال و مستقبل دونوں زمانوں کے تقاضوں اور خصوصیات کا حامل ہے) یہاں الاعراض لایستی زمانین (اعراض دوزمانوں میں باقی نہیں رہتے ہیں) کا مفہوم خط ”تسلیم“ کی طرف اشارہ ہے (شیوہ تسلیم و رضا کو بتاتا ہے) اور یوم ینفخ فی الصور فساتون افواجا۔ (نبا ۱۸) جس دن صور پھونکا جائے گا تو تم سب فوج در فوج آؤ گے اور

”پردہ عبارت“ میں پوشیدہ ہے اس لفظ قدرت صفت کا اثر کیا مرکب اور کیا بسیط سب کے شمول ہے یعنی عالم ”کون“ کے ذرات سے لے کر ”بشن“ کے پلک جھپکنے تک سب کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ برہمن لوگ مرتبہ وجوب کو ”بشن“ کہتے ہیں اور مرتبہ ”عقل کل“ کو ”برہما“ سمجھتے ہیں۔ اصل انکا عقیدہ ہے کہ برہما کی مدت حیات اپنی تمام تر رازی کے باوجود ”بشن سیاہ“ کے ایک بار جھپکنے کی مہلت کے برابر ہے اور اس کے رشتہ اماں کے افسانے اس ایک گرہ کوتاہ کی فراہمی سے ہیں۔ جب تک جب تک اس کی پلک خط کشی کرے (کھولے) اس کا صفحہ، عدم کی رقم تک پہنچ چکا ہے۔ (ایسی عدم ہو چکا ہوتا ہے) اور جب تک اس کا قلم شق ہو اور اس میں حرکت آئے اس کے ”نقطہ موہوم“ تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں اس لئے ”عقل کل“ ایک ایسا ”آئینہ امکانی“ ہے جو ”نیرنگ وجوب“ کے مقابلے پر موجودات کی شکل و صورت کے نقوش بناتا ہے اور ”خیالات الوہیت“ سے تنزل کے سبب کائنات کے احوال و امثال کے چہرے اکر تے ہیں۔ جب کبھی واجب ان نقوش سے بے توجہی برتا ہے تو اس تماشا کی طرف سے چشم پوشی کی خاطر پلک جھپکا تا ہے۔ جس کے آثار بہار عالم موہوم سے وابستہ ایک گرد کی حیثیت رکھتے ہیں جس کا میناے اعتبار مہمختی میں ایک شکستہ رنگ رکھتا ہے، صرف ایک بہانہ کی تاک میں لگا رہتا ہے تاکہ عدم کے سمندر میں فرو گئے اور تو ہم کی ڈینگ کی کو ”معدومی مطلق“ کے کھنور میں ڈال دے۔ بہار کی چشم پوشی میں رنگ و بھٹا چینی کے سوا کوئی چیز اس کے پلے نہیں ہے۔ اور بادل کے تغافل میں خشکی کے سوانشو و نما کے آثار نمایاں نہیں ہیں۔ بانسری کی مینوائی مطرب کے تنفس سے وابستہ ہے اور آہنگ کی نارسائی رشتہ ساز کے ٹوٹنے سے جڑا ہے۔

بیدل استعارات و کنایات کے استعمال میں کبھی اس قدر افراط سے کام لیتا ہے کہ اس کے اسلوب اور مقصد تک رسائی مشکل ہو جاتی ہے جو کچھ اس راقم السطور کے فہم ناقص میں آتا ہے وہ ذیل ہے۔

قیامت کے برپا ہونے کے سلسلے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے علاوہ خود اللہ تعالیٰ اپنی مقدس کتاب میں فرمایا ہے و ما امر الساعة الا کلمح البصر او هو اقرب (الح) اور قیامت کا کام تو بس ایسا ہے جیسے لپک نگاہ کی یا اس سے بھی قریب۔ مطلب یہ ہے کہ عام انسان کے محسوسات کے موافق تو اس کی سرعت کو آنکھ جھپکنے سے تعبیر کر سکتے ہیں لیکن واقع میں اس سے کہیں قیامت قائم ہوگی کیونکہ بحسب بہر حال زمانی چیز ہے اور ارادہ خداوندی پر مراد کا ترتیب آنی ہم حال آپ کا ارشاد در حقیقت آپ کے مجملہ معجزانہ ارشادات میں ہے۔ آپ کے الفاظ اتنے

جامع و مانع ہوتے ہیں کہ حال و مستقبل سے وابستہ چاہے کوئی زمانہ ہو اس کے دائرے سے باہر نہیں  
سکتا۔ آپ کا ارشاد گرامی مشہور اصول ”الاعراض لا یبقی زمانین“ (اعراض دوزمانوں میں رہتی  
نہیں رہ سکتے) کے مفہوم کو بھی شامل ہے اور ”یوم ینفخ فی الصور“ کے تقاضے کو بھی شامل ہے۔  
اصل کہ ”اعراض“ دوزمانوں میں قائم نہیں رہتے، بظاہر حضور کے ارشاد سے متصادم نظر آتا ہے، لیکن  
موجودات میں ہمیشہ تبدیلی آتی رہتی ہے لہذا جو چیز اس وقت زمان حال میں موجود ہے وہ مستقبل میں  
نہیں ہے۔ لہذا کس طرح ممکن ہوگا کہ جو حال سے وابستہ موجودات ہیں مستقبل میں بھی برقرار رہیں۔  
بیدل کہتا ہے کہ حضور کے ارشاد اور اس اصل کے بیچ کسی قسم کا تعارض نہیں ہے ”قیامت کے پھٹنے  
میں برپا ہونے“ کی تعبیر بہت ہی برجستہ اور موزوں ہے جس میں ہر قسم کی بسیط و مرکب اشیاء  
ہو جاتی ہیں کیونکہ اشیاء دو حالات سے خالی نہیں ہوں گی۔ جہاں تک آیت کریمہ کہ ”جب قیامت  
ہوگی تم لوگ جوق در جوق اکٹھے ہونے لگو گے“ کا تعلق ہے حضور کے ارشاد کے عین مطابق ہے۔

بیدل کا خیال تھا کہ جواب سوال کرنے والے کی فہم کے مطابق ہو اس لئے اس نکتے کی  
وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ برہمنوں کے عقائد کے مطابق مرتبہ و جب کو ہم ’وشنو اور  
'برہما' کے مساوی قرار دے سکتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ برہما کی زندگی اپنی تمام تر درازی کے  
وشنو کے ایک پلک جھپکنے کے برابر ہے، جب کبھی وشنو پلک جھپکا تا ہے برہما کا وجود راسی  
جاتا ہے۔ عقل کل جو برہما کے مساوی ہے و جب کی بہ نسبت جو وشنو کا مساوی ہے، ایک آنے کی  
ہے جس میں موجودات کے نقوش ثبت ہوتے ہیں۔ جب واجب ان نقوش سے بے اعتنائی برتا  
یہ نقوش، جو درحقیقت ممکنات کا نام ہے، واجب کے مقابلے پر ایک گرد سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔  
موہوم سے وابستہ ہو جاتے ہیں اور اپنے وجود سے عاری ہو کر عدم کے سمندر میں غوطہ لگاتے ہیں۔

پس یہ پلک جھپکنا ذرات کون کی چشمک بازی اور وشنو کے پلک جھپکنے کو شامل ہے۔ یہ  
چونکہ بہت ہی دقیق اور عمیق ہیں اس لئے کم فہم لوگوں کو سمجھانے کے لئے ”چشم زدن“ سے تشبیہ  
ضرورت پڑی۔ ورنہ دریا کے اسرار و رموز کو گوش گرد اب کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا ہے۔ اسی طرح  
وغیرہ اگرچہ دریا کی سطح پر شوری کرتے ہیں پر وہ دریا کی لہروں کی زبان نہیں سمجھ سکتے۔

چہ دانی رمز دریا چوں نداری گوش گردابی کہ کار خار و خس نبود زبان موج نہایت  
اگر تمہارے پاس گرداب کے کان نہیں ہیں تو تم دریا کے راز کو کیا سمجھو گے کیونکہ  
زبان کا سمجھنا خار و خس کے بس کی بات نہیں ہے۔

نیاید راست ہرگز صحبت زنگ و صفا با ہم چہ حاصل سایہ را از خانہ خورشید پر

زنگ و صفا (اچھے برے) کی صحبت با ہم راس نہیں آتی ہے سایہ سے خانہ خورشید کے بابت پو  
چھا گیا۔

مرزا کا جواب اور گھر ہمہ از خود بروں آئی نہ چنید خاک پایاں سپہرا ز سعی بالیدن (۳۸۴)  
انہی ذات سے پوری طرح باہر بھی آجاؤ تو بھی اس کے محرم نہیں ہو سکتے خاک، جولانی  
انہی اسرار نہیں پاکتی ہے۔

بیدل کہتا ہے ہر آدمی اپنے مخصوص انداز سے عارفانہ مسائل کی توضیح کرتا ہے لیکن جو نکتہ سدا  
وہ یہ ہے کہ جواب سوال کرنے والے کے عقائد اور اس کی فہم کی سطح کے مطابق ہونا  
جب قیامت کے مسئلے پر سوال و جواب میں مکمل مطابقت ہوگی تو اس کا اعتراض پادروا  
نے اسلام قبول کر لیا۔

بہمن صورت جواب سایل ہم از پردہ اعتقادش معرض بیان پیوست رنگ شعلہ اعتراض  
بہمن شکوت شکست۔ در صحبتی چند زنگار شکوک اوہام بھفای معنی یقین تبدیل یافت و

من قیامت اسلام از آئینہ باطلش نقاب تغافل شکست۔ (۳۸۵)

مسائل کے جواب کی شکل جب اس کے پردہ اعتقاد کے مطابق عرض بیان سے پیوستہ ہوئی  
(۳۸۵) کے مطابق بیان ہوا) تو شعلہ اعتراض کا رنگ لامحالہ خاک سکوت سے ٹکرایا (اعتراض  
انہی جہتوں میں اس کے شکوک اوہام کا مورچہ یقین کی صفائی میں بدل گیا) (اسے یقین ہو گیا)  
انہی حسن نے اس کے آئینہ باطن سے نقاب تغافل سر کا یا (اسلام قبول کر لیا)۔

ان واقعہ بلکہ مناظرہ سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ بیدل نے اسلام اور ہندوؤں کے فلسفے کا  
مقابلہ کیا تھا۔ خوشگوا کا بیان اس خیال کی تائید کرتا ہے۔

تمہارے مہابھارت کہ در ہندیان ازان معتبر کتابی نیست بیادداشت۔ (۳۸۶)

مہابھارت جس سے زیادہ معتبر کوئی کتاب ہندوؤں میں نہیں ہے بیدل کو اس کے سارے قصے  
میں

یہ بات کہ بیدل لاہور پہونچا یا نہیں! یا پہونچا تو کتنی مدت تک وہاں رہا؟ یہ مسئلہ بھی  
میں نے غلام حسن مجددی لکھتے ہیں:

”میں بیدل کے قیام کے سلسلے میں معلومات دستیاب نہیں ہیں لیکن اتنا پتہ چلتا ہے

کہ وہ حسن ابدال تک گیا ہے۔“ (۳۸۷)

یہ خیال درست نہیں ہے شکر اللہ خان کے بیٹے کرم اللہ خان کے نام بیدل کے ایک خط سے



معلوم ہوتا ہے کہ وہ لاہور تک گیا اور اسی سال وہاں سے دہلی واپس آ گیا اور لاہور میں اس کی چند مہینوں سے زیادہ نہیں رہا لکھتا ہے۔

”بتائید اتفاق ازلی، بساط سلسلہ وفاق از لاہور تا دہلی آراستہ..... تفصیل آن از مکاتیب خان کرم عنوان مکشوف رای معنی ضیا خواہد بود۔ کلک آرزو سلک بعرض این مطلع مینست رتاریخ زمان ورود است۔“

جنت عیش و طرب خادماں ہمد بزم کرم اللہ خاں (۲۸۸)

ازلی اتفاق (خدائے تعالیٰ) کی تائید سے سلسلہ وفاق کی بساط لاہور سے دہلی تک پہنچا۔ خان کرم عنوان کے مکاتیب سے اس کی تفصیلات معلوم ہوگی۔ درج ذیل مطلع کے ذریعہ آرزو سلک نے زمانہ ورود کی تاریخ نکالی ہے۔

جنت عیش و طرب خادماں ہمد بزم کرم اللہ خاں (۱۰۸۵ھ) (۵۸۹)

ہمیں معلوم ہے کہ ۱۰۸۵ھ کے اواخر رمضان یا اوائل شوال میں بیدل لاہور روانہ ہوا۔ اسی سال وہ واپس ہوا اس لئے یقینی طور پر چند مہینے ہی وہ وہاں ٹھہرا۔

لاہور سے بیدل کی واپسی اور اس کی تفصیلات سے متعلق اس خط میں ’خان کرم عنوان‘ کی خطوط کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ خان کرم عنوان سے بیدل کی مراد کیا ہے واضح نہیں ہے۔ رقصات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خان کرم عنوان سے مقصد شکر اللہ خان ہے کیونکہ ان کے ایک خط میں واپسی کے وقت پیش آنے والے اپنے بعض حالات کا تذکرہ بیدل نے کیا ہے۔ یہ عنوان کے تحت ہے۔

”بشکر اللہ خان زمانیکہ فقیر بسبب بارش از راہ سہارنپور بدلی باز گردیدہ۔“

امید گاہ! حالیکہ از سکر و یہاں ابر بہار مشاہدہ نمودم کہ در دم شمشیر آبدار تصور نمود۔ از مقام ”لونی“ تا ”شیخ پور“ قصد راہ جزبہ سقی شامیسر نیامد۔ ہر چند نفس تر و دسوخت، غیر از عرق غلت چراغ را ہی بغیر وخت۔“ (۳۹۰)

امید گاہ! ابر بہار کی سکر و ی سے جو حالت میں نے مشاہد کی اس کا تصور آبدار شمشیر کے میں بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ”لونی“ سے ”شیخ پور“ تک کا راستہ تیر کر ہی طے کرنا پڑا۔ نفس تر و دسوخت ہر چند عرق غلت کے سوا کوئی اور چراغ روشن نہیں کیا۔

لونی، دہلی سے تقریباً پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا جواب دہلی میں شامل ہو گیا ہے۔ شیخ پور پنجاب میں ہے۔ بیدل، برسات کی وجہ سے بجائے اس کے کہ لاہور سے براہ راست

’لی تکلف اگر شکوہ امی ہست از بیدلی است۔ و گردن دریں مسافرت سیر عالم آبی و کیفیت

شت وادی بمعاینہ ز رسیدہ کی باید عمر با بخیالش ساغر تحیر کشید۔“ (۳۹۱)

دہلی واپس آنے کے بعد بیدل کہاں گیا اس کے بیان سے واضح نہیں ہوتا۔ ریاض الوداد میں ہم ایزد بخش رسا کا ایک خط پایا جاتا ہے اس سے ہم ایک نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔

پست و کیم شہر جب ۱۰۸۶ھ۔

بخلاصہ آب و گل میرزا عبدالقادر بیدل صاحباً و خدوما! ظہار اشتیاقیکہ در یک شہر، علت فصول ملاقات نباشد، مفقعی تکلیف است و لب از آں مقولہ بر بستن برخلاف نفس الامر۔ لمولف۔

ز آہ شعلہ سیمہ درد پیدا است زبان مضرب طنبور دل ماست بہر حال مشتاقیم، و اشتیاق بر موعود زیادہ از حد داریم مترصد کہ اخیراً با خبر کوچ صاحبی میرزا کا مگار بفرستد والد دعا۔“ (۳۹۲)

۲۱ رجب ۱۰۸۶ھ

خلاصہ آب و گل مرزا عبدالقادر بیدل کے نام۔ مخدومی! اس اشتیاق کا اظہار، جو مہینے بھر کے حصول کا سبب نہ ہو تکلیف دہ ہے اور اس گفتگو سے لب بندی نفس الامر کے خلاف ہے۔ حضرت آہ سے درد نمایاں ہے۔ زبان ہمارے طنبورۂ دل کا مضرب ہے۔ بہر حال ہم مشتاق ہیں۔ سادہ نغم ملاقات پر اشتیاق کا عالم بیان سے باہر ہے۔ امید کہ حال میں جناب عالی کے کوچ کی مرزا کا مگار کو بھیج دیں گے والد دعا۔

رسا اور نگ زیب کی حکومت میں ”داروغہ بیوتات“ کے عہدے پر اکبر آباد (آگرہ) میں فائز (۳۹۳ھ) اور اپنے خط مورخہ ۵ رجب ۱۰۹۶ھ (۲۸ مئی ۱۶۸۵ء) میں اور نگ زیب کو لکھا ہے کہ تیس سال سے میں شاہی داروغہ کے عہدے پر مامور ہو کر اپنے فرائض انجام دے رہا ہوں اور اس اثناء میں سے کم روپے شاہی خزانے میں جمع نہیں کئے ہیں (۳۹۳) جس وقت اور نگ زیب آفریدوں کی لونی کے لئے ۱۰۸۶ھ (۶۷-۱۶۷۵ء) میں حسن ابدال روانہ ہوا، رسا اس کے ہمراہ تھا اور کم از کم

رجب ۱۰۸۸ھ تک (ستمبر ۱۶۷۷ء) تک وہیں رہا کیونکہ جو خط اس نے وہاں سے ناصر علی سے بھجوا دیا تھا اس پر پہلی تاریخ درج ہے۔ (۳۹۵)

اب رسا کے اس خط کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یہ خط ۲۱ رجب ۱۰۸۶ھ کو لکھا گیا ہے اس کی ظاہر ہے کہ اس نے اسے حسن ابدال سے بیدل کو لکھا ہے۔ اس خط سے واضح ہوتا ہے کہ بیدل کی نظر میں کیا عزت اور وقعت تھی، نیز ان دونوں کے درمیان کیسے انتہائی مخلصانہ روابط تھے یہ خط کہ خط و کتابت میں تاخیر رسا کے لئے شکایت کا سبب ثابت ہوا۔ مرزا ایزد بخش کا کوئی دوست وہاں سے کوچ کیا ہے اس نے بیدل سے درخواست کی ہے کہ مرزا کا مگار کو اس کی اطلاع کریں۔

اس خط میں لفظ ”کوچ صاحبی“ غور طلب ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ایزد بخش رسا کو عبدالعزیز عزت سے شاگردی کی نسبت کے علاوہ غیر معمولی ارادت بھی تھی۔ مولانا عزت اور اوزار زیب میں اختلاف پیدا ہونے کے سبب مولانا نے ۱۰۸۵ھ میں سرہند کی فوجدار کا عہدہ تیاگ دیا اور چلے گئے تھے۔ مرزا کا مگار، بقول ساقی مستعد خان، اس وقت اکبر آباد میں پانچ سو دو ہزار کے عہدے پر فائز تھا اس بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ بیدل ۱۰۸۶ھ ہجری ۱۶۷۵ء میں اکبر آباد یعنی آگرہ میں تھا اور ایزد بخش کا خط حسن ابدال سے اکبر آباد بیدل کو روانہ کیا گیا ہے تاکہ وہ سرہند سے مولانا عبدالعزیز کی لاہور کی طرف کوچ کی خبر مرزا کا مگار کو پہونچا دیں۔

تفصیلی بحث کی ضرورت اس لئے پڑی کہ پروفیسر میر حسن شاہ اور ڈاکٹر نور الحسن انصاری دونوں کا خیال ہے کہ بیدل ۱۰۸۶ھ ربیع الاول تک حسن ابدال میں رہا۔ لکھتے ہیں:

”جب ۱۰۸۵ھ ۱۱ اپریل ۱۶۷۳ء میں فوج حسن ابدال گئی تو بیدل ان کے ساتھ تھا۔ یہ بات ایزد بخش رسا کے ایک خط سے معلوم ہوتی ہے۔“ (۳۹۶)

پہلے خیال کی غلطی ثابت کر چکے ہیں دوسرا خیال بھی جس طرح کہ بحث کی گئی صحیح نظر نہیں آتا ہے کیونکہ رسا کے جس خط کا حوالہ پروفیسر میر حسن شاہ نے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں دیا ہے۔ بیدل کے بیان سے متضاد ہے دوسرے یہ کہ ریاض الوداد مخطوطہ و محفوظہ خدا بخش لاہوری پٹنہ کا ازاں تا آخر مطالعہ کر ڈالا لیکن سوائے اس خط کے جس کا تذکرہ اوپر ہوا بیدل کے نام اور کوئی خط نہیں ملا۔ پروفیسر میر حسن کا بیان ملاحظہ ہو:

”یہاں (حسن ابدال) سے شہزادہ اعظم شاہ کی رفاقت میں بیدل نے گجرات کا سفر کیا۔ اتفاق سے اس وقت شہزادہ کے دربار میں حکیم شہرت، راج سرہندی، اسلم کشمیری، ایجاد اور دیگر شعرا بھی تھے اور بیدل بھی ان کے ساتھ تھا۔“ (۳۹۷)

پروفیسر میر حسن کے بیان پر ہم بیدل کی ملازمت کے سلسلے میں پہلے بحث کر چکے ہیں لیکن ان کے بیان کی اساس پر تفصیلی بحث کریں گے۔ ان کا بیان خوشگو کے بیان پر مبنی ہے اس لئے پہلے خوشگو کے بیان کو بعینہ اسی طرح نقل کرتے ہیں۔ میر محمد احسن ایجاد کے تذکرے کے ضمن میں لکھتے ہیں:

”چندوں نوازش خاں طالع کی رفاقت میں وہ گجرات گیا اور شہزادہ عالیجاہ محمد اعظم کی فوج میں رہا۔ وہاں مرزا بیدل حاجی اسلم سالم اور شاہ گلشن کے ساتھ اس کی صحبتیں کرتا۔“ (۳۹۸)

شہزادہ کے بارے میں لکھتا ہے:

”مرزا بیدل، میر محمد زمان راج، حاجی اسلم سالم اور حکیم شیخ حسین شہرت اس کے دربار کے شعرا ہیں۔“ (۳۹۹)

خوشگو کے بیان سے معلوم ہوتا کہ مرزا بیدل شہزادہ کی رفاقت میں حسن ابدال سے گجرات گیا پروفیسر میر حسن شاہ اور ڈاکٹر نور الحسن انصاری کا یہ دعویٰ صحیح نہیں معلوم ہوتا ہے۔ رہی یہ بات کہ اعظم شاہ کے ساتھ گجرات میں تھا اس نقشے کو پیش نظر رکھ کر جو اس سے پہلے دیا گیا ہے اور شہزادہ کے دربار میں اس کی مدت ملازمت کو دیکھتے ہوئے جس کو پچھلے صفحات میں ثابت کیا گیا، یہ نہیں آتا ہے۔ کیونکہ ۱۱۱۳ھ ۱۷۰۱ء میں شہزادہ موصوف احمد آباد (گجرات) کا صوبیدار ہو کر آیا ہے جبکہ بیدل نے اس سے بہت پہلے ملازمت سے استعفا دیدیا تھا اور میر حسن شاہ کے بقول ۱۰۹۶ھ میں اس سے دست بردار ہو کر دہلی میں گوشہ نشین ہو گیا تھا۔ البتہ اس حقیقت سے انکار کیا جاسکتا کہ شعراء مذکورہ بیدل کے ساتھ کبھی اعظم شاہ کی خدمت میں رہے ہیں۔ کیونکہ شیر خان نے بھی اعتراف کیا ہے کہ شاعروں کی ایک تعداد جو اعظم شاہ کے دربار سے وابستہ تھی۔ بیدل کی قائل تھی۔

بیدل کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے نہ صرف پنجاب بلکہ کشمیر کا بھی سفر کیا ہے۔

آشفۃ خاصیت پنجاب و کشمیرم کہ بوی ہر گل آنجا با پیاز و سیرمی جوشد  
پنجاب اور کشمیر کی خاصیت سے میرا دل دماغ آشفۃ و پریشان ہے جہاں ہر پھول کی خوشبو  
کشمیر کی بو سے آمیختہ معلوم ہوتی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کے لوگ پیاز و لہسن لانے کے بڑے عادی ہیں۔

## بیدل جنوبی ہند میں:

پروفیسر میر حسن شاہ لکھتے ہیں:

”ایسی روایات موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ بیدل جنوبی ہند بھی گیا ہے۔“ (۴۰۰)

راقم السطور کو اس بات کی تلاش تھی کہ ۱۰۸۶ھ/۱۶۷۵ء کے بعد بیدل کہاں گیا۔ بیدل کی مسافرت اور قیام کی ترتیب کو پیش نظر رکھنے سے معلوم نہیں ہوتا ہے کہ ۱۰۸۷ھ تا ۱۰۸۹ھ (۱۶۷۵ء تا ۱۶۷۸ء) کا درمیانی زمانہ اس نے کہاں گزارا۔ پروفیسر موصوف نے صرف اس کا اشارہ کیا کہ حوالہ نہیں دیا آخر مثنوی عرفان کے مطالعہ سے یہ کتنی سلجھی۔ اس کے دو شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ عرصہ اس نے جنوب میں گزارا ہے۔

در سواد جنوب ہندوئی داشت از رنگ آگهی بولی

مدتی بادل وفا شامل بود مانوس صحبت بیدل

جنوبی ہند میں ایک ہندو پنڈت جو صاحب علم و دانش تھا ایک عرصہ تک دل و فاشال کے بیدل کی صحبت سے مانوس رہا۔

لفظ ”مدتی“ بتاتا ہے کہ خاصے وقت تک وہ وہاں رہا ہے بیدل کے ایک ہندو دوست اس کی صحبت سے مانوس تھا مسئلہ تناخ سے متعلق اپنے والد کا ایک واقعہ بیان کیا۔ بیدل نے مسند پر بحث کے دوران مثنوی عرفان میں اس واقعہ کا حوالہ دیا ہے جس کا تذکرہ اپنی جگہ پر ہوگا۔

جناب غلام حسن مجددی لکھتے ہیں کہ بیدل نے ۱۰۸۷ھ تا ۱۰۸۹ھ کا وقفہ مقرر میں بسر کیا

”بیدل پنجاب سے کب لوٹا یا لوٹنے کے بعد کہاں ٹھہرا پتہ نہیں چلتا ہے۔ اس کے باوجود

چہار عنصر میں اس نے لکھا ہے کہ لگا تار تین سال مقرر میں رہا ہے۔ اگر اس کے گزشتہ

آئندہ حالات کو پیش نظر رکھیں تو یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اس کے علاوہ دوبارہ وہ مقرر میں

رہا ہے لیکن اتنے لمبے عرصے تک نہیں رہا ہے۔ اس بار ایسا لگتا ہے کہ ۱۰۸۷ھ سے ۱۰۸۹ھ

تک کا زمانہ اس نے وہیں قیام کیا ہے۔“ (۴۰۲)

جیسا کہ پچھلے صفحات میں لکھا گیا بیدل ۱۰۸۵ھ/۱۶۷۴ء میں لاہور روانہ ہوا، چند مہینے قیام

بعد اسی سال وہ دہلی واپس آیا پھر ۱۰۸۶ھ/۱۶۷۵ء میں وہ اکبر آباد گیا اس لئے مجددی کا بیان

نہیں معلوم ہوتا ہے۔ رہی یہ بات کہ ۱۰۸۷ھ تا ۱۰۸۹ھ کا درمیانی وقفہ اس وجہ سے مقرر کیا

اس کے بقول لگا تار تین سال وہاں گزارے ہیں، شبہ سے خالی نہیں ہے اس لئے کہ اس کا یہ

بھی تین سال (۱۰۸۷ھ تا ۱۰۸۹ھ) کا رہا ہے جیسا کہ پہلے ثابت ہو چکا ہے۔

جناب ڈاکٹر محمد شفیع صاحب مرحوم لکھتے ہیں:

”جب شاہزادہ موصوف ۱۰۸۸ھ میں بنگال کا صوبہ دار تھا اور تین سال تک وہاں رہا

مرزا بیدل شاہ شجاع کے بعد شاہزادہ کی ملازمت میں رہا۔“ (۴۰۳)

بیدل کی ملازمت اور واقعہ استعفا پر بحث کے دوران اس موضوع پر کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے

بیدل کے بیان کی تغلیط کی چنداں ضرورت نہیں رہتی ہے۔ اس مسئلے پر ان کی غلط فہمی پوری

تعمیل ہے۔

غلام حسن مجددی مزید لکھتے ہیں:

۱۰۸۷ھ میں جبکہ بیدل شاید مقرر میں تھا اس کے استاد عبدالعزیز عزت ۳۸ سال کی عمر

میں انتقال کو پیارے ہو گئے۔ بیدل نے دو قطعے کے ذریعہ اس واقع پر اپنے رنج و غم کا اظہار

کیا ہے اور دوبارہ تاریخ اپنے محبوب استاد کی وفات کی مناسبت سے کہا جو یوں ہے۔

”ہندو نور از چراغ عالم“ ”چہل و ہشت سالہ مرد“۔ (۴۰۴)

میر محمد ساقی مستعد خان صاحب مآثر عالمگیری نے مولانا عبدالعزیز عزت کی وفات ۱۰۸۸ھ

تاریخ میں لکھا ہے:

۱۰۸۷ھ ششم ربیع الاول شیخ عبدالعزیز روز بخلو تکدہ بقا آورد۔“ (۴۰۵)

اس لئے مجددی کا قیاس شبہ سے خالی نہیں ہے۔

بیدل کی تصویر:

بیدل ۱۰۹۰ھ/۱۶۷۹ء میں دہلی میں نظر آتا ہے جہاں وہ مشہور مصور انوپ چترا کے

تصویر کشی کے لئے آیا تھا۔ بقول بیدل انوپ چترا عہد اور نگ زیب کا ایک بہت ہی

مستحق تصور تھا اور اس کا درجہ مانی اور بہزاد سے کسی طرح کم نہ تھا لکھتا ہے:

”مینی بکسوت غبار رنگ گرد وید و فطرت بہزاد در پردہ ناموس خاک انفعال تر

”مینی بکسوت“۔“ (۴۰۶)

مینی کی روح غبار رنگ کی پوشاک میں اس کے قلم کے گرد گھومتی تھی اور بہزاد کی فطرت

پر دے میں اس کی مشاقی اور فنکاری سے شرمندہ ہو رہی تھی۔ شاید یہ وہی مصور ہے

جو انوپ چترا کی تصویر کشی کے لئے آیا تھا اور نگ زیب کے ایک منظر کی تصویر بنائی تھی۔ انوپ

چترا کی عادت تھی اس لئے اس نے بار بار بیدل سے درخواست کی کہ اجازت دیجئے آپ کی

است در ہرہ افعال و اعمال معذور۔ از بنجار عمر احوال خود پی بردن و مراتب بی اختیاری و اشردن۔“ (۴۰۸)

اس نیرنگ کے راز ہائے سر بستہ کا فاش ہونا خداوندی قدرت کا ایک انوکھا کرشمہ ہے کہ انسانی کسی طرح اس کی تحقیق کا معممہ سلجھا نہیں سکتی اور عالم غیب کے سوا کوئی اس کی کیفیت کے رموز کی عقل گری نہیں کر سکتا ہے۔ انسانی فطرت اگر اس قسم کے اسرار کو پیش کرنے کا جو ہر رکھتی تو ہرگز ہر عجز کے معانی کے نقوش ثبت نہ کرتی۔ باوجودیکہ ہر صاحب ہوش میں قدرت اظہار کی تلاش ہے اور ہر فرد کے دماغ میں قدرت آثار کا سودا خیال پایا جاتا ہے۔ اگر زمین میں قدرت پرواز آدھ آسمانی وضع اختیار کر لیتی تاکہ پستی اور پامالی کا رنج نہ اٹھاتی اور اگر ذرہ کو دستگاہ قدرت کا اختیار نہ آتا تو آفتاب بن کر ابھرتا تاکہ وہ خفت و رسوائی اور ذلت و خواری کی تہمت سے بچ جاتا۔ لہذا آدمی تمام میں مجبور ہے اور تمام افعال و اعمال میں معذور ہے۔ یہاں سے اپنے حالات و کیفیات میں ”عجز“ کا سراغ ملتا ہے۔ اور ”بے اختیاری“ کے درجات اور مراتب کا شمار کیا جاسکتا ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بیدل رفتہ رفتہ جبریہ فرقے کے قریب آتا ہے۔ اور اس لحاظ سے کہ اس کا اس کے افکار و خیالات پر گہرا اثر ہے ہمیں اس ماجرا کو سدا پیش نظر رکھنا چاہئے۔ ہم مجبور حکم تقدیریم کرد و ناکرد اختیاری نیست دوسری طرف یہ واقعہ بیدل کے سماج میں ایک مقبول اور محبوب فرد اور انوب چتر کے ایک معمولی نقش ہونے کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔

بیدل دہلی میں شکر اللہ خان کی معیت میں:

جب کہ پچھلے صفحات میں گزرا، بیدل نے عاقل خاں رازی کی خدمت میں اپنی مثنوی ”معیط“ ”طلسم حیرت“ بھیج کر ان کی توجہات کریمہ اور حمایت امیرانہ حاصل کرنی چاہی تھی اور وہ اس مقصد میں کامیاب بھی ہوا جیسا کہ اس کے درج ذیل شعر سے ظاہر ہوتا ہے۔

صد شکر کہ برد نامہ ام رنگ قبول بیدل بودم، ہزار دل گردیدم (۴۰۹)  
(میرا خط شرف قبول سے نوازا گیا اس کے لئے میں بے انتہا شکر گزار ہوں میں تو بیدل اور میرا حال تھا اب ہزار دل اور (خوشحال) ہوں اس لئے پروفیسر غلام حسن مجددی کا یہ کہنا کہ۔

”اگرچہ بیدل کی عاقل خاں رازی کی نگاہ میں وقعت و عزت تھی لیکن ایسا لگتا ہے کہ حسب خواہش ان سے اس کا دوستانہ اور مخلصانہ تعلق قائم نہ ہو سکا۔ اس وقت بیدل کو خیال

ایک یادگار تصویر بناؤں۔ بیدل چونکہ اس قسم کے امور کو تفریح سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا اس لئے اس پر توجہ نہیں کرتا تھا۔ آخر ایک دن بڑے اصرار کے ساتھ اس نے عرض کیا۔  
”مگر دش رنگ ہم صنعتی دارد اگر ساغر قبول پیاید۔“

اگر آپ میری درخواست قبول کریں تو دیکھیں گے کہ رنگ آمیزی یا گلکاری بھی ایک نیا بیدل نے اجازت دیدی۔ انوب چتر نے جو تصویر بیدل کی بنائی اسے خود بیدل دیکھ کر حیرت رہ گیا کہ آیا یہ وہی ہے یا اس کی تمثال ہے۔

”تفیتی منظور تماشا گردید کہ تحقیق در برابرش شبہی پیوود آئینہ در مقابلش عکس می نمود۔ بہ تفتیش تفاوت امتحانی شعور ہر چند تامل می پر داختم شخص خود را از ان تمثال بازی شناختم۔“ (۴۰۷)

ایک ایسی کیفیت نظر آئی کہ تحقیق اس کے سامنے شبہ پیائی اور آئینہ اس کے مقابلے پر غور کرنے لگا۔ شعور کے امتحانی تفاوت کی جانچ پر جس قدر غور کرتا اپنی شخصیت اور اس تصویر میں جو فرق نظر نہیں آتا۔

بیدل نے اس تصویر کو ایک کتاب میں حفاظت سے رکھ دیا۔ دس سال تک اسے دیکھ کر لطف لیتا رہا۔ ۱۱۰۰ ہجری ۱۶۷۸ء میں اس کو ایک ایسا مرض لاحق ہوا جس میں وہ موت کے دہانے پہنچ گیا۔ اس کے احباب اس کی زندگی سے بالکل مایوس ہو گئے۔ اسی حالت میں اس کا ایک دوست کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ اچانک اس کی نگاہ اس تصویر پر پڑی، اس نے افسوس کے ساتھ خیال ظاہر کیا: لگتا ہے اسے چشم بد لگ گئی ہے، جیسے کسی بچے نے نم آلود ہاتھ سے اسے پکڑا ہو۔ وجہ سے اس کا رنگ اڑ گیا ہے۔ جو لوگ وہاں موجود تھے سب اس پر افسوس کا اظہار کر رہے تھے۔ خود بیدل نے اسی کو دیکھا تو حقیقت میں وہ اس کی بیماری والی حالت کی طرح رنگ پریدہ نظر آئے۔ دنوں کے بعد جب بیدل صحت یاب ہوا اور مکمل طور پر تندرست ہو گیا اور اس کی نظر اپنی تصویر پر پڑی اس میں پھر وہی سابقہ تازگی، شوشی اور شگفتگی نظر آئی، اس کے احباب بھی تصویر کی اس تبدیلی کی حیرت زدہ تھے۔ لیکن بیدل کی حیرت اس کی بیہوشی کا سبب ثابت ہوئی جب اسے ہوش آتا تو دیکھنے کا یا را اس میں نہ رہا۔ کتاب سے نکال کر اسے سپرد خاک کر دیا۔ بیدل اس واقعہ سے عادت ایک نتیجہ نکالتا ہے۔

”بی پردگی این نیرنگ، از غرائب قدر تہای بھونی است کہ فہم انسانی، پہنچ تالی معمای حقین آن کشاید و غیر از ہماں عالم غیب آئینہ رموز کشفیتش نہ ز داہد..... پس آدمی در جمیع امور مجبور

آیا کہ عاقل خاں کے داماد شکر اللہ خاں اس مقصد کے لئے زیادہ مناسب معلوم ہوئے ہیں۔“ (۴۱۰)

بالکل بے اساس ہے۔ اس کے برعکس شعر مذکور یہ واضح کرتا ہے کہ عاقل خاں رازنی سے اس کے گہرے مخلصانہ روابط تھے چنانچہ اسی خاں موصوف کے نام اپنے ایک خط میں لکھتا ہے:

”مراتب عبودیت کہ تافس باقیست از گردن عقیدت ساقط نیست“۔ (۴۱۱)

جب تک سانس چل رہی ہے مراتب بندگی گردن عقیدت سے ساقط نہیں ہو سکتے۔

بلکہ عاقل خاں سے آگے بڑھ کر اس کے تمام افراد خاندان تک اس کا دائرہ وسیع ہو چکا تھا کہ عاقل خاں کے بیٹے قیوم خاں کے نام ایک خط میں اشارہ کرتا ہے۔

”لله الحمد از تہذیب اخلاقی کہ شایستہ این خاندان کرم آستان است آنچہ می شنود گوش حامد نیوش و خیرہ سعادت می انپارد و از حسن اطوار یکہ خاصہ ایں سلسلہ جہان تغیر ست ہر چہ بمع می رسد، امید جمعیت نوید، نصیبہ مینست بر می دارد۔“ (۴۱۲)

اس خاندان کرم آستان کے شایان شان اخلاق و اطوار کے بابت جو کچھ سنا کرتا تھا اللہ محمد حامد نیوش اس سے اپنے لئے خیرہ سعادت اکٹھا کر رہا ہے۔ اور اس سلسلہ جہان تغیر کے حسن اطوار جو خبر کانوں میں پہنچ رہی تھی امید جمعیت نوید کو مینست نصیب ہو رہی ہے۔

مجملہ ان کے عاقل خاں کے داماد شکر اللہ خاں تھے جن سے ذوقی ہم آہنگی کی بنا پر بیدل نے روابط دوسرے افراد خاندان کی بہ نسبت کہیں زیادہ تھے۔ عاقل خاں کے نام بیدل کے ایک خط جس میں شکر اللہ خاں کے اعلیٰ اخلاق کا تذکرہ اس نے کیا ہے۔ نیز محمد ساقی مستعد خاں اور آزاد بکری کے بیانات سے جن کا تذکرہ پچھلے صفحات میں آچکا ہے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ۱۶۸۱ھ میں شاہجہان آباد (دہلی) کے فوجدار مقرر ہونے کے بعد شکر اللہ خاں نے وہاں سکونت اختیار کی، بیدل نے جس پر بہت پہلے سے خان موصوف کی نظر عنایت اور مراحم خسروانہ رہی تھی، اب خواہ اپنی درخواست پر شکر اللہ خاں کے التماس پر ان کی رفاقت میں زندگی گزاری شروع کی۔ شکر اللہ خاں نے ایک خط میں کمرہ اس کو دے رکھا تھا اور اس کی ضروریات کی کفالت بھی اپنے سر لی تھی۔ بیدل جو بہت سیر دنیا میں زندگی گزارتا رہا تھا، اب سکون خاطر اور دلجمعی کے ساتھ زندگی گزارتا دکھائی دیتا ہے۔ موصوف کی صحبت کو زندگی کے معتنم لمحات میں شمار کرتا ہے۔

”عاجز نواز! عاطفیکہ ہمہ جاشاں حال فقر است، توجہ خان صاحب اخلاص مناقب، مقناطیس دل شکر منزل گردید و رشتہ الفت بی اختیاری بر طبعیت وحشت پیچیدہ۔ در عالم تسلیم

بی پر دہالی، آشیان جمعیتی مقرر است۔ دور گوشہ عجز بی تر ددی، آب ودانہ میسر۔ فیض صبحہا از منتخبات زندگی مشاہدہ می نماید۔“ (۴۱۳)

دل میں شکر اللہ خاں کے دولت کدے پر قیام کے دوران، خان موصوف سے بیدل کی ملاقات اور صحبت کے علاوہ دونوں کے درمیان اقادہ اور استفادہ کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اس کے ایک یہ ہے کہ مثنوی ”طلم حیرت“ کے شکر اللہ خاں نے مختلف عناوین قائم کئے۔ اور بیدل عاقل خاں کو لکھتا ہے کہ جب کبھی جناب عالی کی طبیعت اس کے مطالعہ کی طرف مائل ہو تو ایک نسخہ آپ کی خدمت میں بھیج دیا جائے گا۔

”درین ایام خان سعادت عنوان باکشاف مطالب ”طلم حیرت“ عنوانہا مقرر نمودہ اند و مرآتی کہ خلاصہ مدعای آں نسخہ است بہ صیقل تحریر زدودہ۔ حاصل توجہ آنکہ ہر گاہ نگاہ معنی پناہ میل مطالعہ فرماید، بی تاہل نقاب آرزوی مطلب کشاید، از نظر مینست اثر خواہد گزشت۔“ (۴۱۴)

حیرت کے قیام کے دوران چہار عنصر اور مثنوی عرفان کی تصنیف:

۱۰۹۳ھ بمطابق ۱۶۸۲ء تک شکر اللہ خاں اسی منصب پر سرفراز رہے پھر جب سکندر آباد کے فوجدار کے منصب پر فائز ہو کر وہاں منتقل ہوئے تو بیدل نے مقرر اکابر خ کیا جہاں ۱۰۹۵ھ بمطابق ۱۶۸۳ء میں چہار عنصر اور مثنوی عرفان لکھنا شروع کئے۔ چہار عنصر کے شروع میں لکھتا ہے:

”از آن ہنگام تا حال، کہ نفس شماری عمر مقارن سال چہل و یکم است“ (۴۱۵)

یعنی تب سے اب تک جبکہ زندگی کی نفس شماری اکتالیسویں سال سے ہمارا ہنگ ہے۔

اس عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ ۱۰۹۵ھ بمطابق ۱۶۸۳ء میں چہار عنصر کی تصنیف کا کام شروع ہوا اور شکر اللہ خاں کے نام ایک خط میں بیدل لکھتا ہے:

”درین ایام بمقتضای غیبت شناسیہای فرصت، فکر نظم عرفان و نشر چار عنصر در پیش دارد و نسبی چند وسیلہ این تخلیلات می شمارد۔“ (۴۱۶)

اس زمانے میں فرصت کو غیبت سمجھ کر مثنوی عرفان کو نظم کرنے اور چہار عنصر کی نثر لکھنے کی فکر کی ہے اور ان مصروفیتوں کے ذریعہ کچھ دیر نفس شماری کر رہا ہے۔

ان دونوں اقتباسات کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ مقرر ا میں قیام کے دوران ان دونوں تصانیف کی تصنیف شروع کیا۔

## مقہر اکے گرد بد امنی اور بیدل کی دہلی روانگی:

مقہر میں قیام کے دوران بیدل کو ناسازگار حالات اور بد امنی سے سابقہ پڑا۔ ۱۲۸۲ء میں اورنگ زیب نے دکن اور بیجاپور کی تسخیر کے لئے وہاں کا رخ کیا۔ اعلیٰ سرکاری دہلی اور اکبر آباد میں مامور تھے اورنگ زیب کی عدم موجودگی میں امن وامان برقرار رکھنے کے لئے اپنے فرایض بہتر طریقے سے انجام نہ دے سکے اس کے نتیجے میں اس علاقے میں زبردست بے چیل گئی۔ عوام نے اورنگ زیب کی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ خصوصاً میوات کے علاقے کا حال سب سے بدتر تھا۔ قتل اور غارتگری کا بازار گرم تھا اور شریفوں کی عزت خاک میں رہی تھی۔ اورنگ زیب دکن سے بغاوت کو فرو کرنے اور امن و آشتی قائم کرنے کے لئے ایک حاکم مقرر کیا۔ لیکن جو بھی وہاں پہنچتا بے اثر اور نا اہل ثابت ہوتا۔ غرض کہ سیاسی حالات نہایت خراب تھے۔ بیدل نے چارہ مضمر میں ان حالات کا تذکرہ تفصیل سے اور رقعات میں اجمال کے ساتھ کیا ہے۔

بموجب انقلاب احوال عالم، خاصہ تہلکہ نواح اسلام آباد کہ دریں ایام، ناموس صاحب قدر

تاں، ہم در آں سرزمین بی تھذری نیست تا بغربای بی دست و پاچہ رسد“۔ (۳۱۷)

گردش روزگار خصوصاً نواحی اسلام آباد (مقہر) کی بد امنی کے سبب کہ اس وقت باڑوں کی عزت و آبرو بھی اس علاقے میں محفوظ نہیں ہے، ہم غریب اور بے کس لوگوں کی کیا حقیقت ہے۔ ایسے آشفٹہ اور ناگفتہ بہ حالات میں دولت مند لوگ تو بندوق سے مسلح ہو کر فساد یوں سے نئے لئے سر راہ تیار بیٹھے رہتے تھے اور غریب و نادار لوگ خدا پر بھروسہ کر کے گھر خالی کر دیتے اور ہر حالات کا سامنا کرنے کے لئے گھر کی دہلیز پر بیٹھے رہتے تھے۔ بیدل کا تعلق اسی دوسرے طبقے تھا۔ اس کے اضطراب کی بڑی وجہ کچھ معذور ”بی دست و پا“ کی موجودگی تھی جن سے مراد شاید بیوی و معذور خادم تھے جن کی کفالت کی ذمہ داری اس کے سر تھی۔

”از انجملہ فقیر بیدل راتشولیش طبایع بیدست و پای چند کہ بحکم اتفاق، بارتعلق شان

برودہ، خیال افتادہ بود۔ ہر ساعت غبار دیگر از بنیاد حال بری انگینت و کشا کشہای تردد احوال شان، ہر نفس، رشتہ واری از ساز جمعیت می گسینت۔ تلوا سہ اضطراب بر چہرہ اوضاع و اطوار ہم

غبار دامن صحرائی افشانند“۔ (۳۱۸)

انہیں لوگوں میں فقیر بیدل بھی تھا جس کو کچھ ”بی دست و پا“ (شاید بیوی اور دو معذور خادمہ) کی، جن کا بارتعلق اتفاق سے میرے کاندھوں پر تھا، تشویش خاطر کا خیال دامکیر رہتا تھا جو ہر لمحہ

سے ایک نیا غبار اڑاتی تھی اور جن کے تردد و احوال کی کشاکش ہر نفس ساز جمعیت کے تار توڑ کرتی تھی۔ چہ احوال پر لا چاری اور بیچلی کا عالم یہ تھا کہ دامن صحرا پر جمی گرد کو بھی اڑائے دے رہی تھی۔

دو سال انہیں خطرناک حالات میں بیت گئے۔ آخر ۱۰۹۶ ہجری ۱۶۸۳ عیسوی میں اس نے دہلی گیا کہ ہر قیمت پر مجھے مقہر اسے دہلی روانہ ہو جانا ہے۔ پروانے کی طرح خود کو دفعہ نذر آتش اس سے بہتر ہے کہ ہر لمحہ ایک نئی سوزش کا سامنا کیا جائے۔

”پروانہ دار بیک بارہ بر آتش زدن محفوظ تر از آست کہ ہر ساعت رنج سوختن تازہ

کشیدن“۔ (۳۱۹)

جو لوگ بیدل کی مدد کر سکتے تھے انہوں نے اس کو اس سفر کے خیال سے باز آنے کا مشورہ دیا۔ جناب ہر وقت دوستی کا دم بھرا کرتے تھے وہ بیگانوں کی طرح سامنے آئے اور مذاق کے طور پر کہتے تھے۔

”ہمیں اس عزم اگر باعتماد خوارق است پس از امتحان سلامت ایمان آورونی است و اگر

بتدابیر شجاعت متعلق پس از وقوع فتح، مبارکباد ادا کردنی“۔ (۳۲۰)

اس عزم کی بنیاد اگر خوارق اور کرامات پر ہے تو اگر اس آزمائش سے صحیح سالم نکل گئے تو ایمان لاتے ہی بنے گی اور اگر اپنی شجاعت و دلیری پر ہے تو فتح و کامرانی کے بعد مبارک باد

بیدل نے چونکہ پختہ ارادہ کر لیا تھا اس لئے تمام تر بے سروسامانی کے باوجود چند بہلیاں کرائے میں اور دہلی کے لئے روانہ ہو گیا۔ پہلے دن مقہر کے نزدیک واقع ایک مقام ”عظیم آباد“ پہونچا۔ یہاں سے پچاس بہلیاں نظر آئیں جن کے مسافر ایک ماہ سے (راستہ بتانے والے) راہبر کے انتظار میں تھے لیکن کوئی مسلح سوار یا پیادہ ایسا سامنے نہیں آیا جو اس خطرناک فریضے کو انجام دینے کے لئے تیار ہو۔ دوسرے دن بیدل اپنے عزم جزم کی بنا پر آگے بڑھا۔ سارے لوگ اس کے پیچھے ہوئے لیکن اس وقت کے لوگوں نے ناگفتہ بہ حالات کی بنا پر انہیں اس عزم سے باز رکھا۔ اس وقت بیدل کے ہمراہ دو خادم تھے جن میں سے ایک طویل بیماری سے دوچار تھا اور خادم سے مخدوم بن کر رہ گیا تھا دوسرا اپنی ذاتی کی وجہ سے ہر خدمت سے آزاد تھا۔ ناسازگار حالات کے باوجود اس نے توکل کو اپنا راہبر بنایا۔ کئی چند قدم اس نے بڑھائے ایک فقیر سامنے آیا جس کے ہاتھ میں ایک پنجرہ تھا پنجرے میں ایک

مذہب تھا، اس نے کمال اشتیاق کے ساتھ آسمان کی طرف منہ اٹھا کر کہا۔

”آفتاب عالم اقبال ہمسفر ماست بسلا خطہ ظلمت او ہام بناید گرداند“۔ (۳۲۱)



عالم اقبال کا آفتاب ہمارا ہم سفر ہے وہم و خیال کی تاریکی دیکھ کر واپس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس پیشین گوئی کو سن کر پورا قافلہ جس نے سفر کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا اب چلنے کو تیار ہو گیا اور قسم کے انجام سے بے نیاز ہو کر راستے پر چل پڑا، حتیٰ کہ دھوپ کی تمازت اور تنگی کی شدت بھی انہیں قلعہ راہ سے باز نہ رکھ سکی۔ دو کوس چلنے کے بعد انتہائی مرطوب مقام پر وہ لوگ پہنچے جہاں پھسل کر گرنا احتمال تھا۔ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش میں بیدل کی پہلی کا دھرا ٹوٹ گیا۔ جو لوگ اس سوار تھے مع اسباب و سامان کے زمین پر آ رہے۔ بیل بھی زخمی ہو گیا تھا۔ قافلے والے اتنے سرد ہوئے تھے کہ اس مشکل میں بجائے اس کے کہ بیدل کی کچھ مدد کرتے، اسے اپنی جگہ چھوڑ کر آگے گئے۔ بیدل کو اپنے معذور خادموں کے ساتھ بیاباں مرگی کا اندیشہ لاحق ہوا اور تنہا رہتا رہتا کھانسی غور و خوض سے دیکھنے پر تاج کی کیل کا نیم جو حصہ نمودار ہوا۔ بیدل نے کہا کہ اس تاج کو دھڑکے سے جوڑ دیا جائے شاید اس طرح وہ کام کرنے لگے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا ہے تو پھر سارے ساز و سامان کو چھوڑ کر اس خطرے سے اپنی جان ہی بچالے جانا غنیمت ہے۔ لیکن خوش قسمتی سے یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی اور اس وقت تک بیل بھی سستا کر چلنے کے لائق ہو گئے تھے۔ چند دیہاتوں سے گزر کر ”شیر گڑھ“ کے ایک موضع پہنچے۔ شاید یہ طے ہوا تھا کہ وہاں سے دوسری پہلی کرائے پر لے لی جائے گی لیکن جب دستیاب نہ ہوئی تو اپنے معذور ملازموں کی خاطر اسی پہلی کو کرائے پر لیا۔ بہلوان نئی شرح کرائے پر لے جانے پر تیار ہوئے۔ رات کے وقت ساحل دریا پر ہی قیام کیا، اس اندھیری رات میں بہلوانوں نے شوز چپایا کہ قافلہ سفر کے لئے تیار ہے اس لئے قافلے کی رفاقت کے لئے اسی وقت روانہ ہونا ضروری ہے، تاکہ دوسری منزل پر اس سے جا ملیں۔ اسی وقت رخت سفر باندھ کر قلعہ کے پاس پہونچے جہاں قافلہ ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں سے ایک کوس کے فاصلے پر ایک دیہات نظر آیا اور پتہ چلا کہ اس موضع کے باشندے ڈاکو ہیں جو روزانہ لوٹ مار کا بازار گرم کئے رہتے ہیں حتیٰ کہ قلعہ کے اہالی بھی ان کے غور و خوض سے تنگ آ چکے تھے۔ یہ بہلوان ان کے عزیز واقارب تھے اور لوگوں کو دھوکہ دے کر چاہتے تھے کہ ان کے ہاتھوں یہ قتل کئے اور ان کے مال و اسباب لوٹے جائیں تاکہ ان کو بھی اس میں سے حصہ سکے۔ بیدل کا بیان ہے کہ ساحل دریا پر قیام کے دوران کچھ ہم سفر حضرات کو بہلوانوں کے بارے میں شک ہوا۔ ان کے چہرے بشرہ سے ایسا لگتا تھا کہ انہوں نے اتفاق کر لیا تھا کہ اہل قافلہ میں ان پر آدمیوں کو جو نیکی ولا چاری میں اس حد تک پہنچ چکے تھے کہ ان کا کوئی پرسان حال نہ تھا، اپنا شکار کئے اور بیدل کے الفاظ میں ”حلوای بے دودی بہولت بدست نمی توان آورد و لقمہ بی استخوانی باین“

”میں تو اس کر“، یعنی یہ لقمہ ترائی آسانی سے پھر دستیاب نہ ہوگا۔ کیا خوب کہا ہے بیدل نے۔  
بیدل! بر خلق کسر شاں نمائی  
تاثیر تو ان شدن کمان نمائی  
خاصیت اس معرکہ عاجز کشی است  
ایجا زنہار ناتوان نمائی  
بیدل! عوام کے سامنے کسر شان سے کام نہ لینا جب تک تیر کی طرح سیدھے رہ سکتے ہو کمان خود کو جھکا ہوا طاہرمت کرو۔ اس معرکہ دنیا کی خاصیت ”عاجز کشی“، یعنی جو کمزور پڑے اس پر

غرض اسی بنا پر انہوں نے قافلے کا عام راستہ چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کیا۔ اسی حالت میں بیدل نے اور صبح نمودار ہوئی لیکن قافلے کا دور دور تک کوئی نشان پتہ نہ تھا۔ بیدل نے ان سے پتہ نہ کیا کہ اس دوڑ بھاگ میں کہیں ایسا تو نہیں کہ قافلے کو ہم نے بہت پیچھے چھوڑ دیا ہو ورنہ آخر قافلے کوئی نشان کیوں نہیں ملتا ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ قریب کے راستے میں چونکہ پستی و بلندی زیادہ تھے اس لئے اسے ترک کر کے ہموار راستہ اختیار کیا۔ اس طرح بیدل کو وہ جھوٹی تسلی دے رہے۔ اچانک سامنے ایک گاؤں نظر آیا جو بے قول بیدل ”زورق مقابل کام نہنگ گردید“، یعنی کشتی کے منہ کے بالکل سامنے آ کے لگ گئی تھی۔ اس نے بڑی منت سماجت کے ساتھ وہاں سے ہٹنے کی درخواست کی مگر وہ اپنے ارادے سے باز نہ آئے اور کاروان سے جا ملنے کے بہانے گاؤں کی طرف بڑھتے رہے۔ اچانک سواروں کا ایک دستہ نمودار ہوا جو اس گاؤں کے باہر اپنے گاؤں کے دوڑا رہے تھے لیکن اپنی تنگ و دو کے دوران وہ بیدل کو نہ دیکھ سکے۔ ان حالات میں بیدل کی حالت کشمکش سے دوچار تھا اور ”نہ پائی رفتن ونہ جائی ماندن“ کی صورت پیدا ہو گئی تھی، اس کے لئے سفر بھی حواس باختہ تھے۔ اس حالت میں پیلے رنگ کے گھوڑے پر ایک مسلح سوار اس کے سامنے نمودار ہوا جو اسے نکل کر ان کے سامنے آیا تھا۔ جب قریب آیا تو چہرے بشرے سے وہ مسلمان معلوم ہوا۔ اس نے بہلوانوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

”اے بد بختان! کد ام کوری خاک، در دیدہ شامنا پشت کہ با محبوبان سرادق رضا، راہ بی ادبی سر کر دید؟“  
اچانک کفران قساوت بردلہای شامگاشت کہ با مقبولان جناب تسلیم آئین،  
بیباکی بجا آوردید؟ ندانستید کہ انسون ظلمت بر آفتاب چیرہ نمی شود و مکر باطل با حق پیش نمی رود۔“ (۳۲۲)

یعنی اے کمبختو! کس اندھے نے تمہاری آنکھوں میں دھول جھونک دی کہ سرادق رضا کے گناہ کے ساتھ بے ادبی سے پیش آئے اور کس قدر قساوت تمہارے دلوں میں پیدا کر دی کہ جناب

تسلیم آئیں گے مقبول بندوں کے ساتھ گستاخی کر بیٹھے۔ یہ نہ سمجھا کہ تاریکی کا جادو آفتاب نہیں چن اور باطل کا مکر حق کے سامنے نہیں نکلتا۔

یہ سن کر وہ لوگ کانپ گئے اور معذرت کرتے ہوئے کہنے لگے کہ رات کے اندر سے میں راستہ بھٹک کر یہاں پہنچ گئے اور صحیح راستے کا پتہ لگانے کے لئے اس گاؤں کے لوگوں سے پوچھا تھا۔ اب آپ جس راستے پر چلے کو کہیں ہم چلنے کو تیار ہیں۔ اس مسلمان سوار نے تھوڑی دیر بیدل کے رہنے کے رہنما کے حال پر افسوس کا اظہار کیا اور بہلو انوں کو بہت برا بھلا کہا اس کے بعد خود اپنی رہبری میں اسے قافلے کا راستہ دکھایا چنانچہ تھوڑی دیر میں ہم لوگ قافلے سے جا ملے۔

اس واقعہ کو بیدل نے چہار عنصر میں ”عجائب وغرایب“ کے تحت قلم بند کیا ہے، جس کی توثیق خود بھی نہیں کر سکا ہے۔ مجموعی طور پر اس واقعہ سے دوا ہم نکتے سامنے آتے ہیں، اول یہ کہ دوا ہم وارادے کا پکا تھا جس چیز کا قصد کر لیتا تھا پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا تھا۔ اور ہر قسم کے انجام اور خطر سے بے نیاز ہو کر مقصد کی طرف رواں دواں رہتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس واقعہ کو اگر ہم درست فرض کریں تو اس کا شمار شیوہ ”تسلیم و رضا“ پر چلنے والے محبوب و مقبول شخصیتوں میں ہوتا ہے۔

قرآن پاک کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر آدمی پر اللہ نے اس کی حفاظت کے لئے کچھ فرشتے مقرر کر دیئے ہیں۔ جن کو قرآنی تعبیر میں ”حفظہ“ کہا جاتا ہے ”وہو القاهر فوق عباده و یوسل علیکم حفظہ حتی اذا جاء احدکم الموت توفته رسلنا و ہم لا یفرطون۔ (انعام ۶۱) اور وہی غالب ہے اپنے بندوں پر اور بھیجتا ہے تم پر نگہبان یہاں تک کہ جب آپ نے تم میں سے کسی کو موت تو قبضہ میں لے لیتے ہیں اسکو ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے اور وہ کوتاہی نہیں کرتے۔ جب تک اس کی زندگی منظور ہے تمام آفتوں سے اس کی حفاظت رہتی ہے اور جب موت کا وقت قریب آ جاتا ہے تو معمولی سی بات اس کی موت کا بہانہ بن جاتی ہے۔ اس طرح کے واقعات ہر شخص پر خود اس راقم السطور کی زندگی میں پیش آئے ہیں اور میں حیرت میں رہ گیا کہ موت کے منہ میں پہنچ کر کی طرح اس سے بچ نکلا۔

ڈاکٹر عبدالغنی لکھتے ہیں:

”قرآین سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیدل نے تمہر میں مستقل قیام کی غرض سے قیام کیا تھا

اور بدامنی کی وجہ سے دارالخلافہ دہلی جانے پر مجبور ہوا“۔ (۴۲۳)

راقم السطور کو ان قرآن کا پتہ نہ چل سکا۔ ڈاکٹر موصوف کا مقصد قرآن سے شاید بیدل کی بیدلی اور دو خادم ہیں جو اس کے ساتھ وہاں زندگی گزار رہے تھے لیکن یہ ایسی بات نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے

میں مستقل قیام کا دعویٰ کیا جاسکے۔ اس کے برعکس ایسا قرینہ موجود ہے جو یہ بتاتا ہے کہ بیدل کی سیاحت میں زندگی گزارتا تھا اور اب جبکہ وہ خانہ بدوش کی زندگی سے عاجز آچکا تھا دہلی پہنچ کر اللہ خان سے دہلی میں مستقل قیام کے لئے مناسب جگہ کی درخواست کرتا ہے۔ چنانچہ وہ موصوف کے نام اسی خط میں لکھتا ہے:

”میں نے بیدل بہ حیرانی گزشتہ گوشہ چشمی نہ شد پیدا کہ جاپیدا کنم  
ہے زندگی مری آوارگی میں یاں پایا نہ کوئی گوشہ کہ جا کر رہوں وہاں [   
میرس کہ بو در کجا وطن دارد نیافت مسکن ما ہم سراغ مسکن ما   
پہلے سے مت پوچھو کہ خوشبو کا وطن کہاں ہے ہمارا مسکن خود ہمارے مسکن کا سراغ نہ

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ بیدل اس خطرناک سفر سے بخیر و عافیت ۲۷ جمادی الآخر ۱۲۹۶ کو دہلی پہونچا۔

”پاشگلہ چند کہ بارگردن زندگی اندرخت سلامتی بیروں کشید و پیست و ہضم جمادی

الآخر داخل دارالخلافہ گردید“۔ (۴۲۵)

”پاشگلہ“ مجبور یا معذور افراد کے ساتھ جو بارگردن زندگی ہیں بخیر و عافیت پہونچا اور ۱۰۹۶ھ کو دارالخلافہ دہلی میں داخل ہوا۔

ڈاکٹر عبدالغنی صاحب لکھتے ہیں:

”بیدل اپنی بیویوں کے ساتھ دارالسلطنت میں داخل ہوا“۔ (۴۲۶)

رقعات میں لفظ ”پاشگلہ چند“ اور چہار عنصر میں لفظ ”بیدست و پای چند“ سے شاید ڈاکٹر صاحب موصوف نے ”بیدل کی عورتیں“ مراد لی ہیں لیکن جیسا کہ مفصل واقعہ بتاتا ہے خود بیدل نے انکار کیا ہے کہ:

”فقیر بادو خادم کہ یکی را امتداد بیماری باز مخدومی پرورده بود و دیگری را عذر ناتوانی از سلسلہ

تکلیف خدمت آزاد کرده فتح عزیمت جائز نداشت“۔ (۴۲۷)

فقیر نے اپنے دو خادموں کے ساتھ جن میں سے ایک کی طویل علالت نے اسے خادم سے ہٹا دیا تھا اور دوسرے کو اس کی ناتوانی نے سلسلہ تکلیف سے یکسر آزاد کر دیا تھا، فتح ارادہ سفر صاحب نہ سمجھا۔

پھر بھی اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس کے ہمراہ اس کی شریک حیات بھی رہی ہو البتہ

لفظ ”عورتیں“ جس کا استعمال ڈاکٹر غنی صاحب نے کیا ہے اور جس کا مطلب یہ ہوا کہ کئی عورتیں خالی از بحث نہیں ہے۔

بیدل کی دہلی میں مستقل سکونت:

دہلی میں قدم رکھنے کے ساتھ بیدل نے جو پہلا کام انجام دیا وہ تھا نواب عاقل خان شرف نیاز حاصل کرنا۔ رازی ۱۰۹۱ھ / ۱۶۸۰ء سے دہلی میں ناظم دارالخلافہ کے عہدے پر فائز تھے۔ دونوں کے درمیان یہ طے پایا کہ ہفتے ہیں ایک بار ملاقات ہوا کرے گی۔ اس کے بعد اس نے ایک کے ذریعہ شکر اللہ خان کو اپنی دہلی آمد، نواب عاقل خان سے ملاقات اور ہفتہ وار ملاقات کے وعدہ خبر دی۔ پھر اس سے درخواست کی کہ اگر چہ قسمت کی لکھی روزی ہر جگہ ہر حال میں پہنچ کر رہے گی۔ لگاتار سیر و سیاحت کے بعد قلبی سکون اور جمعیت خاطر درہم برہم ہو گئی ہے اس لئے دریائے کنارے یا شہر کے باہر کوئی گھریا تکیہ فراہم کر دیں تو اپنی بقیہ زندگی سکون سے وہاں گزار دیں۔ خانہ بدوشی کی زندگی سے نجات پائیں:

”شکر اللہ خان ہنگامیکہ فقیر از متھورا بدہلی رسید و نواب عاقل خان را دید..... باری سعادت زیارت کعبہ تحقیق بفریاد سرکشگاہی وادی نحوست رسید و بمساعت زمان فرصت، در ہفتہ یک روز موعود تحصیل سعادت است۔ و منظور الطاف و مرحمت رسامیہای سر رشہ آمال کہ انفاس موہومہ را با پیچ و تابش بی اختیاری ست بہ حل عقدہ ایں بی سواد کشیدہ کہ ہر چند رزق مقدر در ہمہ حال وہمہ جامعین و مقرر است اما آشیان جمعیت پریشانی مفقود و نامیسر۔ اگر دریں سواد موضعی کنار دریا یا لب شہر بہ سہولت در اتفاق کشاید یا تکیہ اختیار نماید باقی مدت مہلتی کہ از نظر یقین مخفی است، بی تشویش تغیر مکان بسر برد۔ اگر احیاناً طالع بیدلی از دور اصلی برنگردد، و امن ارض اللہ واسعہ، و زنجیر پای ہرزہ جولانی نیست۔

مدرم چون نگہ بیدل بہ حیرانی گزشت گوشہ چشمی نہ شد پیدا کہ جاپیدا کنم (یعنی کعبہ تحقیق (عاقل خان رازی) کی زیارت کی سعادت خدا خدا کر کے وادی نحوست کی آوارگی کے فریاد کو پہونچی اور زمان فرصت کی سازگاری سے ہفتہ وار ملاقات کی سعادت کا وعدہ مقرر ہوا۔ سر رشہ آمال کی مرحمت رسائی کے مقصد نے، جس کے پیچ و تاب سے انفاس موہومہ کا غیر اختیاری تعلق ہے، اس بی سواد کی گرہ کشائی اس طرح کی کہ روزی مقسوم اگر چہ ہر حال میں اور ہر جگہ مل کر رہے گی پر خاطر پریشانی کو آشیانہ میسر نہیں ہے اس لئے اگر اس علاقے (دہلی) میں دریا کے کنارے باب

بہ سہولت مہیا ہو سکے یا کوئی تکیہ مل جائے تو زندگی کے بقیہ ایام جو نظر یقین سے اوجھل مکان کی تشویش سے آزاد ہو کر گزار سکیں گے اور اگر خدا نخواستہ بیدل کی قسمت اپنے اصل پس نہ ہو سکی تو ارض اللہ واسعہ (اللہ کی زمین کشادہ ہے) کا دامن میری آوارہ گردی اور زنجیر پائیں بن سکتی۔

ساقی مستعد خاں کے حسب بیاں شکر اللہ خاں اس وقت سکندر آباد کے فوجدار تھے (۱۲۲۹) یہ خط دہلی سے سکندر آباد شکر اللہ خاں کے پاس روانہ کیا گیا۔

خوشہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بیدل کی درخواست منظور ہوئی۔ نواب شکر اللہ خاں اور خوجے شاہ خاں نے پانچ ہزار میں حویلی لطف علی خاں خرید کر بیدل کے حوالے کیا۔ مذکورہ حویلی کے باہر محلہ کیکریان میں ”گزرگھاٹ“ کے پاس واقع تھا۔ علاوہ ازیں ضروریات کی تکمیل کے لئے روزانہ دو روپیہ وظیفہ بھی مقرر کر دیا جس کا سلسلہ ۱۱۰۸ ہجری میں خان موصوف کی وفات کے بعد جاری رہا۔ بیدل نے اپنی زندگی کے بقیہ ۳۶ سال اسی مکان میں پوری فراغت کے ساتھ گزار دیے۔ (۱۲۳۰)

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ صاحب تذکرہ ”مرآت واردات“ محمد شفیع وارد نے لکھا ہے کہ شکر اللہ خاں کے خرید کردہ مکان میں مستقل رہنے سے پہلے بیدل ڈیڑھ سال پورے سکون اور فراغت کے گھر میں رہے۔

”میرزا تادمت“ ”یک و نیم سال در خانہ راقم ایں اوراق بی تشویش معاش رحل اقامت افتادہ تا آنکہ قاصد شکر اللہ خاں کہ دریں ایام حکومت ناول من اعمال میوات می پرداخت پیش مرزا رسید و مکتوب اشتیاق مع زری رسانید۔“ (۱۲۳۱)

لیکن اگر اسے تسلیم کر لیں تو لازم آتا ہے کہ ۱۱۰۸ھ میں خان موصوف کے انتقال کے وقت تک ساڑھے دس سال بیدل نے ان کی حمایت و سرپرستی اور بہ قول خود ”بیدل پروری“ کی اور ان کے خرید کردہ مکان میں زندگی گزاری جبکہ خود بیدل کا بیان ہے کہ شکر اللہ خاں کی سرپرستی کا سلسلہ بارہ سال قائم رہا۔ شکر اللہ خاں ثانی کے نام ایک تعزیتی خط میں لکھتا ہے:

”از دست رفتن دامن دولتی کہ سلسلہ موافقتش دوازدہ سال محرک عسرت آہنگی ساز انفاس بود، چشم عبرت یکبارہ بروئے ادبار کشود۔“ (۱۲۳۲)

یعنی اس دامن دولت کے ہاتھ سے چھوٹ جانے کے باعث، جس کی رفاقت کا سلسلہ بارہ سال ساز انفاس کی عسرت آہنگی کا محرک رہا ہے، چشم عبرت دفعۃً چہرہ ادبار پستی پر وا ہو گئی۔

ان وجوہ سے وارد کے بیان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا ہے۔ عالمگیر نامہ کے مطابق نواب خاں ۱۰۹۸ھ میں نواحی جہان آباد کا فوجدار تھا (عالمگیر نامہ ص ۳۰۳)۔ نیز نارنول میوات کے واقعہ میں واقع ہے جہاں ۱۰۸۲ھ میں اورنگ زیب کے خلاف بغاوت ہوئی تھی۔ (عالمگیر نامہ ص ۳۰۳) میوات کا علاقہ نواحی جہان آباد کہلاتا ہے۔ بیدل کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نارنول کی طرف اور وہاں اسے کچھ بیماری لاحق ہوئی، جس کے لئے دہلی واپسی پر قصد یعنی نشتہ لگانے کی ضرورت پڑی۔ اس کے بعد نواب کی توجہ سے اسے صحت حاصل ہوئی۔ لکھتا ہے:

”حاصل عرض نا تو انہا آنگہ بعد از رسیدن نارنول بی تامل باستقبال قصد شتافت و بتوجہ سامی ایشان تخفیف در تصدیح طبیعت محسوس یافت۔ (رقعات بیدل ص ۱۳۵)

اپنی ناتوانیوں کے اظہار کا ماحصل یہ ہے کہ نارنول سے واپسی کے فوراً بعد قصد لگوا دیا اور والا کی توجہ سے طبیعت میں تخفیف محسوس ہوئی۔

آمنہ رام مخلص کو مرزا کے قدیم و جدید دیوان کا ایک انتخاب عطا ہوا جس کو اس نے بیدل سے گزار کر اس کی توثیق کرائی اور اس پر مرزا کے دستخط لئے۔ اس دیوان پر مخلص کی تحریر سے واضح ہے کہ ۱۰۹۸ھ میں بیدل نارنول میں تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ شوال ۱۰۹۸ھ کے آس پاس شکر اللہ خاں کے پاس نارنول میں قیام پذیر تھا۔

خوشگلو کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی پہنچنے کے بعد بیدل نے دوسری شادی کی اور یہ چوتھی شریک حیات تھی:

”نامہ لکھنؤ وچہارم حرم در حریم داشت“۔ (۳۳۳)

یعنی شادی کی اور چوتھی حرم حریم میں رکھتا تھا گویا دہلی آنے سے پہلے اس کی تین بیویاں تھیں اور شاید اسی بنا پر ڈاکٹر عبدالغنی صاحب نے ”پاشکستہ چند“ سے بیویاں مراد لی ہیں لیکن جہاں تک بیدل تعلق ہے اس نے صرف ایک بیوی یا ایک دفعہ کی شادی کا تذکرہ کیا ہے اس پر تفصیلی بحث ہم ”بیدل زوجہ“ کے زیر عنوان کریں گے۔

بیدل نے جب دہلی میں قدم رکھا تو جیسا کہ پچھلے صفحات میں عرض کیا گیا اورنگ زیب دہلی میں سنبہ کی بغاوت کو فرو کرنے اور بیجا پور کو فتح کرنے میں مصروف تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں اطراف دہلی کے عوام خصوصاً میوات کے جاٹ اور راجپوت نے دکن میں اورنگ زیب کی شکست کی افواہ سن کر حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا تھا۔ ان باغیوں میں ایک شخص ’باجی رام‘ تھا جس نے اپنے سات جوان اور بہادر لڑکوں کے ساتھ اس علاقے کے لوگوں پر عرصہ حیات تک کر رکھا تھا اور غیر معمولی

فساد پھیلا رکھا تھا۔ یہ لوگ زیادہ تر بیراٹ کے پہاڑوں میں پناہ لے کر تباہی و بربادی اور فساد کا بازار گرم رکھے ہوئے تھے۔ شکر اللہ خاں کو ان کی سرکوبی کا کام سپرد کیا گیا۔ شکر اللہ خاں نے بیدل کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ خاں موصوف نے پہلے اپنے لڑکوں کو اس کام کے لئے ”شکر اللہ خاں ہنگامیکہ صاحبزادہ ہارابہ تنبیہ جات فرستادند“۔ (۳۳۳)

لیکن شاید یہ لوگ اس مہم کو سر نہ کر سکے اور شکر اللہ خاں کو جانا پڑا۔ وہ اس ذمہ داری سے بخوبی آگاہ تھے اور نرو کہ باجی رام کو اس کے ساتوں لڑکے سمیت زبردست شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

”اللہ الحمد توجہ ذات معنی آیات، در آں سست ید بیضا نکلشود و عصای قدرتی نہ نمودہ کہ آل

فرعون یعنی زمرہ طاغیان کہ غرق نہیل ادبار اند، تا قیامت سراز آب تیغ بر آردند“۔ (۳۳۵)

لہذا کا شکر ہے ذات معنی آیات (نواب) کی توجہ نے اس طرف (اگرچہ) کسی ید بیضا کی عصای نہ قدرت دکھایا (پھر بھی) آل فرعون یعنی باغیوں کی جماعت ادبار و پستی کے غم میں اس طرح غرق ہو گئی کہ اب تا قیامت سر اٹھانے سے رہی۔ بیدل نے اس مناسبت سے منظوم مبارکباد کا ایک خط لکھا:

کرد در یک دم زدن بنیاد میواتی خراب  
گردہر گردکش بنشیند از تیغش در آب  
حاسد او گر ہمہ دریا سست می گردد سراب  
آفتابست آفتابست آفتابست آفتاب (۳۳۶)

کل رات کو آسمان سے آواز آئی کہ خان دلنواز نے دم زدن میں میواتیوں کی بنیاد تہس نہس کر دی۔

میں نے کہا خدا سے اس بات کی توقع ہے کہ ہر باغی کی گردن اس کی تلوار سے پانی میں ڈالی جائے۔

اس کی ذات اقدس بیدل پروری میں بہت زیادہ مصروف ہے۔ اس کا حاسد اگر دریا بھی نہ ہو تو رہے گا سراب ہی۔

اس کے ارادے کی ایک برقی کوند بہت سے چمگاڑ کے لئے کافی ہے وہ آفتاب ہے آفتاب ہے آفتاب ہے۔

دوسرے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ شکر اللہ خاں نے بیدل سے التماس کیا تھا کہ اس کے سرکاری کامیابی کی مناسبت سے کوئی مادہ تاریخ بھیج دیں اور بیدل نے باوجود یکہ 'بابی رام' کے انتخاب مشکل تھا خاں موصوف کی خواہش پوری کی، لکھتا ہے۔

”بجسم ماموری نظم تاریخ فتح، باوجود وقت، بحر انچہ مطابق قوانین افتاد بی تکلفانہ لطمی دارد“۔

سرخیل نروکہ بابی رام از باد بروت پشیم در دست  
باہفت پسر کہ ہر کدماش چوں کوہ، سری بہ تیغ می بست  
عمری در کوہسار میوات می بود چو خرس از خود مست  
با لشکر خاں آسمان جاہ گردید طرف ز فطرت پست  
یعنی بہ پناہ قلعہ کوہ سر جنگ مبارزاں کمر بست  
آتش زہد بہادران خورد چند انکہ ز سنگ چوں شرر جست  
بگریخت بہ صد ہزار تشویش تا از دم تیغ بی اماں رست  
در تاریخش مہندس فکر فرمود ”دل نروکہ بشکست“ ۱۰۹۷ھ

(۳۲۷)

یعنی نروکہ قبیلے کا سردار جو کبر و غرور کے نشے میں چور تھا اپنے سات بیٹوں کے ساتھ جن میں سے ہر ایک پہاڑ کی طرح ہٹا کٹا تلوار سے مسلح تھا ایک عرصے تک میوات کے پہاڑوں میں رہنے کی طرح خرمستیاں کرتا تھا اپنی پست فطرت کی وجہ سے آسمان مرتبہ خان (شکر اللہ) کی فوج سے ہار گیا۔ یعنی قلعہ کوہ کی پناہ میں جنگجوؤں سے جنگ کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ چھوٹے چھوٹے بہادروں کو آگ کی نذر کرنے والا اس حد تک کہ پتھر سے چنگاری جست کرنے لگی تھی۔ کافی پریشانیوں سے دوچار ہو کر فر ہو گیا یہاں تک کہ تیغ بی اماں سے نجات حاصل کی۔ مہندس فکر نے اس کی تاریخ میں کہا: ”دل نروکہ بشکست“ (نروکہ کا دل پاش پاش ہو گیا)۔

اورنگ زیب بیجاپور اور گولکنڈہ کو فتح کرنے کے لئے دکن گیا ہوا تھا۔ ۱۰۹۸ھ/۱۶۸۶ء میں زبردست کامیابی کے ساتھ وہ دہلی واپس آیا۔ اس مناسبت سے لوگوں نے اپنے اپنے طریقے پر مبارکبادی کا اظہار کیا۔ بیدل نے بھی اس میں شرکت کی اور مادہ تاریخ پر مشتمل ایک قطعہ کے ذریعہ اپنی مسرت کا اظہار کیا۔ شکر اللہ کے نام ایک خط میں لکھتا ہے:

”مژدہ فتح بادشاہ دین پناہ کہ سب جمعیت عالمی است دلیل فکر تاریخی گردیدہ، متوقع مطالعہ اقبال اثر است“۔ (۳۳۸)

بادشاہ دین پناہ (اورنگ زیب) کی نوید فتح، جو لوگوں کے لئے دل جمعی اور تسلی خاطر کا سبب تاریخ کی رہنما ثابت ہوئی۔ مطالعہ اقبال اثر کا امیدوار ہوں۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ نواب ظفر کے نام جب بیدل نے اس قسم کا ایک مبارک نامہ بھیجا تھا تو اس کے مخالفوں نے اس پر تملق اور ہنس کا الزام لگایا تھا۔ چونکہ اندیشہ تھا کہ اس دفعہ بھی کوئی نہ کوئی تیر ملامت کا نشانہ بنائے گا اس لئے تاریخی مادوں پر مشتمل مبارکباد لکھنے سے اپنے مقصد کی وضاحت کرتا ہوا لکھتا ہے، کہ اس جیسے اور ناداروں کے پاس اس کے سوا کوئی سرمایہ نہیں ہے کہ وہ اپنے نتیجہ فکر بادشاہ سلامت کے شوقیں کریں ورنہ نواب کی اس کی نظر میں کوئی اہمیت ہے اور نہ عالمگیر کی۔

”ہر چند ہرزہ فکر یہاں تاریخ نواب ظفر جنگ ہنوز مرہون صلہ انفعالی ست۔ اللہ الحمد اندیشہ دعا گوئی بہانہ جوی تقریبی است کہ ہاں وسیلہ تحفہ فقر اور پیش گزار دیا مصری درآں جناب معروض دارد ورنہ چہ نواب و کدماں مستطاب بلکہ چہ عالمگیر و کدماں بدرمیر۔ بطریق شوق بی پروا نگاشتی دارد و بآہنگ سازی بی نیازی، سراز پردہ پیروں می آرد“۔

یعنی نواب ظفر جنگ کے لئے مادہ تاریخ لکھنے کی فکری کاوش اگرچہ ہنوز صلہ انفعال و شرم کی مرہون ہے تاہم اللہ کا شکر ہے اس دعا گو کا خیال ایک مناسب موقع کا بہانہ ڈھونڈا کرتا ہے تاکہ اس ذریعہ ایک تحفہ یا ایک مصرع جناب عالی کی خدمت میں پیش کر سکے ورنہ نواب کیا ہیں اور مستطاب ان ہے بلکہ عالمگیر کیا ہیں اور بدرمیر کون ہیں۔ بطور شوق بی پروا لکھنے کی کوئی چیز صفحہ ذہن پر ابھرتی ہے تو اسے بے نیازی سے لکھ دیتا ہوں۔

عالمگیر یعنی حضرت اورنگ زیب آنکہ دارد تکیہ بر شمشیر او فتح و ظفر  
شش از اقلیم دہلی کرد آہنگ خروج تا کند بنیاد شاہان دکن زیر و زیر  
ایں سالیہ فتح ملک بیجاپور بود در غل و زنجیر رفت اسکندر از طوق و کمر  
تانت بر گل کندہ رایات ظفر سال دوم بچکان بر قلب قطب الملک طوقان داد سر  
ت از روی جمل در دیدہ اہل حساب سال فتح اولیس جشید نصرت، جلوہ گر  
روشن شود آئینہ فتح دوم داد شوخیہای دراکم دریں مصرع خبر  
ست یک معنی کہ تعبیر از دو تاریخش کند اعظم مطلوب، فتح بادشاہ نامور (۳۳۹)

بیدل کی اورنگ زیب سے آشنائی کا تذکرہ احباب بیدل کے تحت کیا گیا ہے۔  
قارئین اُن صفحات کو پڑھنے کی زحمت کریں۔

غلام علی آزاد کے مطابق شکر اللہ خان ۱۰۹۸ھ ۱۶۸۶ء سے وفات ۱۱۰۸ھ ۱۶۹۶ء تک  
کے فوجدار کے عہدے پر فائز رہے۔ اور ایسا لگتا ہے کہ میوات کے قیام کے دوران وہ دہلی میں  
رہتے تھے۔ اس آمد و رفت کے دوران ان کی بیدل سے ملاقاتیں ہوئیں۔ شکر اللہ خان کے  
سے معلوم ہوتا ہے کہ خان موصوف نے انہی صحبتوں اور ملاقاتوں کے دوران موسم باران میں  
کے حسین اور دلکش فطری مناظر کا تذکرہ ایک دفعہ اس سے کیا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ انشاء اللہ اس موسم  
اس کو اپنے ساتھ وہاں لے جائیں گے۔ جب برسات کا موسم آیا تو بیدل نے شکر اللہ خان کی  
اور میوات کے سفر کا انتہائی اشتیاق کے ساتھ انتظار کرنا شروع کر دیا اور اسی عالم اشتیاق میں ایک  
عنوان ”تمہید برسات کہ موعود دیدار بود“ خان موصوف کو لکھا جو موسم بہار کی طرح نہایت  
پر مشتمل ہے اس لئے لکھا جاتا ہے۔

”امروز کہ فضای دشت دور، ناگزیر آئینہ از غبار زودون است، و چشم گل تا مژگاں سبز بل  
اعتبار آغوش شوق کشودن، آثار دعوت بہارستان دیدار است و علامات قرب حقیقت گنار۔  
بعد چندین انتظار، خوان اکرام می گستراند تازہ کشان ماندہ فضل را محروم قسمت نکند ارد۔  
پس از دیری، باین صفت صلاے رحمت عام کند، تا مایوسان زادیہ بے بضاعتی نیز نصیب  
بردارند۔ ہزار سبزہ بر خواب عدم پای زدند تا یک مژہ بیدارم گردانند۔ و ہزار گل دیدہ بحیرت  
بازی کند تا یک نگاہ مژدہ حضورم رسانند یعنی بیدلاں درین صورت، بر جلی کما ہی چشم می  
کشاید و باین کیفیت از در فردوس یقین درمی آید، زودر سیہای شرا انتظار مہلت کین توفت  
مباد“۔ (۴۴۰)

غرض شکر اللہ خان بیدل کو حسب وعدہ اپنے ساتھ بیراث لے گئے۔ ڈاکٹر عبدالغنی نے  
کی اس سیاحت کو ۱۰۹۹ ہجری کے واقعات سے وابستہ سمجھا ہے لیکن سال کی تعیین کے لئے  
دلیل نظر نہیں آتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کے مطابق بیراث دہلی سے پتھم کی جانب ڈیہ  
کے فاصلے پر واقع ہے۔ (۴۴۱) لیکن ڈاکٹر نور الحسن انصاری مرحوم کا خیال ہے کہ صوبہ راجستھان  
بیجاپور کے نزدیک ایک پہاڑی سلسلے کا نام ہے۔ (۴۴۲) ڈاکٹر انصاری کو شاید مغالطہ ہوا اس لئے  
شکر اللہ خان اس وقت محمد ساقی مستعد خاں صاحب آثار عالمگیری کے مطابق جہاں آباد کے نواحی

نواحی جہاں آباد سے مراد دہلی کے قریب میوات وغیرہ کا علاقہ ہے چنانچہ غلام علی آزاد نے  
کے ساتھ اسے فوجدار میوات لکھا ہے راقم السطور نے ۱۹۶۰ء میں ان علاقوں کی سیاحت  
کے بعد سلعلاقہ ریگستانی اور ناقابل کاشت نظر آیا لیکن دوسری طرف پہاڑوں اور درختوں کا سلسلہ بھی  
یا جو بلاشبہ موسم باران میں حسین اور دلکش منظر پیش کرتا ہوگا۔

شکر اللہ خاں نے جو خود بھی صاحب قلم اور بڑی حد تک شاعرانہ ذوق کا حامل تھا اور خاکسار  
کے قلم میوات کے ان دلکش فطری مناظر سے متاثر ہو کر چند اشعار کہے تھے۔ پھر بیدل سے  
کہ وہ بھی اس موقع پر اپنے غیر معمولی شاعرانہ ذوق اور صلاحیت کا مظاہرہ کرے۔ اس طرح  
مشوئی طور معرفت، کو قلم کا روپ دیا۔ مشوئی کے آخر میں کہتا ہے۔

دگر نہ من کجا کو پرفشانی سرشکی بودم آں ہم بیروانی  
و نہ کہاں میں اور کہاں میری مشوئی نگاری میں تو ایک آنسو تھا اور وہ بھی بیجان۔  
درین گلشن خرامی داشت کلکش کہ پیوستم من بیدل بہ سلکش  
اس چمن میں ان کا قلم گرم رفتار تھا میں بیدل بھی اس سے وابستہ ہو گیا۔

کلامش گشت سرمشق خیالم ازاں سرچشمہ جوشد ایں زلالم  
ان کا کلام میرے لئے سرمشق خیال ثابت ہوا میرا یہ شیریں آب زلال اسی سرچشمہ سے جوش  
پیدا ہے۔

دو روزی در پس زانو نشست خیالی را بہاری نقش بستم  
دودن میں پوری یکسوئی سے بیٹھ کر قوت خیال و اندیشہ کو بہاری نقش و نگار سے آراستہ کیا۔  
بہ یمنش آخر ایں مکتوب منظوم بہ طور معرفت گردید موسوم  
آخر اس کی برکت سے یہ منظوم تخلیق طور معرفت، کے نام سے موسوم ہوئی۔

زہی سرچشمہ فیض الہی کہ سیرایم از و چندانکہ خواہی (۴۴۳)  
فیض الہی کے سرچشمہ کا کیا پوچھنا جس سے جتنا چاہا سیراب ہوتا رہتا ہوں۔

بیدل کے بعض رقعات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ طور معرفت کے نسخے عاقل خاں  
مرزا محمد امین عرفان اور مرزا عبداللہ کو پیش کئے گئے۔

میں معلوم ہے کہ انسانی ضروریات کی تکمیل اگر نہ ہو تو اس کا دل دماغ پر آگندہ رہتا ہے۔ مثل  
ہے پر آگندہ روزی پر آگندہ دل۔ خصوصاً وہ لوگ جو شاعرانہ ذوق اور ادبی مذاق کے حامل ہیں اگر



ان کے اقتصادی حالات درست نہ ہوں تو وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال نہیں کر سکتے۔

اب جبکہ شکر اللہ خاں اور شا کر خاں نے بیدل کی تمام ضروریات کی کفالت اپنے سر لے لی ہے اپنے مراحم خسروانہ کی نوازش اس پر کرنے لگے۔ بیدل کی ادبی خصوصاً شاعرانہ سرگرمی دہلی میں بڑھ گئی۔ رقعات بیدل اور خوشگو کے بیانات کی اساس پر ہم یہ نتیجہ بہ آسانی نکال سکتے ہیں کہ بیدل نے راجدھانی دہلی کے لوگوں سے جن میں سلاطین، شاہزادے، نوائین، امراء، زمیندار و تعلقہ دار شامل ہیں، ادیب اور معاشرہ کے دوسرے افراد بھی شامل ہیں، تعلقات کی نوعیت نے ادبی پہلو سے آگے بڑھ کر سماجی اور اقتصادی پہلوؤں کو بھی اپنی آغوش میں لے لیا اور یہ اس کی زندگی کا ایک مستقل باب ہے۔ کامطالعہ ہم ”بیدل کے احباب“ کے تحت کرتے ہیں۔

\*\*\*

## بیدل کے احباب

اس عصر است بیدل گرمیان دوستاں گاہ گاہی دید و وادیدی بدعوت می شود  
گذشتہ رفیقاں ز دل فراموشند کدام نالہ کہ در پردہ اش نمی جوشند  
انجمن حیرت نظر بودند کنوں بہ پردہ دل داغہای خاموشند  
اندازیں بزم تا سخن باقیست ز دیدہ رفتہ حریفان ہنوز در گوشند  
بسیا کہ عرض کیا گیا ”بیدل کے احباب“ اس کے رقعات کی روشنی میں بیدل کی زندگی کا ایک باب لکھا گیا ہے جو بیدل کی شخصیت کے حقیقی خدوخال اور رجحانات و میلانات کی شناخت اور اس میں بڑی حد تک محاول ثابت ہوتا ہے لیکن طوالت سے بچنے نیز اس سبب کی بنا پر جس کا تذکرہ اس باب میں کیا جاتا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی جگہ ذکر کیا جائے۔ اپنے ماموں زاد بھائی مرزا کے نام اپنے ایک خط میں بیدل لکھتا ہے:

”از درد تنہائی، کہ رفیق طبیعت و حشت نصیب است، چہ نگار کہ باوجود کثرت  
یک عالم آشنا از قحط سخن فہم، یمیم، انجمن تصویر بستن است و بہم صحبتی خواہنا کان بساط غرور بر  
”ترجمان رنگیہاں تعبیر“، گر یستن۔ نفس شاری اوقات جمعیت لہذا معتد داند کہ گاہی از  
زبان خامہ بادوات گرم سرگوشی می گرد و گاہی بصحبت کتابی ہمدرس خموشی می شود“۔ (۴۳۵)

اپنی طبیعت و حشت نصیب کے ساتھی ”تنہائی“ کی تکلیف کا عالم کیا تحریر کر دوں کہ دوست  
باب ایک وسیع حلقہ ہونے کے باوجود ان میں سخن فہم حضرات کا قحط ہونے کے سبب انجمن تصویر بستن  
میں نہیں آتے اور بساط غرور و شیخی پر محو استراحت غافل لوگوں کی ہم نشینی میں ”نت نئے انداز تعبیر کے  
انسان“ (بیدل) پر گریہ کناں ہوں۔ اوقات جمعیت کی نفس شاری بس اس قدر غنیمت سمجھتا ہوں کہ  
کی زبان قلم سے دوات کے ساتھ گرم سرگوشی ہوں (کچھ لکھتا رہتا ہوں) اور کبھی کسی کتاب کی  
صحت میں خموشی کا ہمدرس ہوتا ہوں (کچھ پڑھتا رہتا ہوں) اس خط سے درج ذیل چند باتیں سامنے

دہلی اور اس کے آس پاس میں بیدل کے دوست احباب کا ایک وسیع حلقہ پیدا ہو گیا تھا جو

معاشرہ کے مختلف طبقات سے تعلق رکھتے تھے۔

۲۔ اس کے دوستوں میں خن فہم حضرات کی تعداد بہت کم تھی۔

۳۔ اس بنا پر وہ اپنا بیشتر وقت یا تخلیقی سرگرمیوں میں گزارتا یا مطالعہ کتب میں۔ اور زندہ رہا۔

مطالعہ کرتا تھا جیسا کہ اس شعر میں اشارہ کرتا ہے۔

بیدل اگر افسردہ دلی جمع کتب کرو در مدرسہ دانش ما جلد کتابست

۴۔ وہ انواع و اقسام کے مضامین نئے مختلف اور دلکش انداز بیان میں پیش کرتا تھا۔ جس سے

لئے وہ ”ترجمان رنگینی ہای تعبیر“ کی ترکیب استعمال کرتا ہے۔

خوشگوار بیدل کے اپنے دولت کدے پر معمولات کی توضیح اس طرح کی ہے:

”مقرر آن کردہ بود کہ تمام روز اندرون محل، بہ تنہائی و تہجد نشسته، با سخن صحبت می داشت، و

سرشام بدیوان خانہ تشریف آوردی، تا نیم شب نشستی، و اقسام حکایات و امثال کار آمدنی

در میان آوردی۔ فقیر ملفوظاتی نوشتہ کہ اکثر مذکورات آن صحبہا در داخل است۔ و اکثر

اوقات، در گپ زدنها، زیادہ گذشتی فرمودی: یا ران! الحال باید ذکر خدا کی، کہ کنایہ از شعر

خوانی باشد، در میان آید۔ کلیات دیوان خود، کہ در یک جلد چہار مصرعائی نویساندہ مرتب

فرمودہ بود، طلبیدی و مجلس گرم داشتی۔ و نوبت بہ نوبت حاضران را خطاب کردی: از اشعار

خود عنایت فرماید۔“ (۴۴۶)

معمول یہ بتا رہا تھا کہ دن بھر اندرون خانہ اکیلے بیٹھے شاعری کیا کرتے تھے، سرشام

دیوانخانے (مردان خانے) میں تشریف لاتے اور آدھی رات تک وہاں ٹھہرتے، طرح طرح کے نئے

کہانی اور سو مند کہاوتیں بیان کرتے تھے۔ خاکسار نے ملفوظات، کے نام سے ان کے ارشادات

کئے تھے۔ اور بسا اوقات بات چیت کرتے کرتے جب کافی دیر ہو جاتی تو کہتے: دوستو! خدا کا

کرنا چاہئے، جس سے مقصود شعر خوانی ہوتی اور اپنی کلیات دیوان منگواتے جو ہر صفحہ پر چار مصرعے

ایک جلد میں مرتب کیا تھا۔ اس کے بعد مجلس گرم ہو جاتی پھر خاطمین سے نوبت بہ نوبت اپنا اپنا

سنانے کی فرمائش کرتے۔

بیدل کے ایک اور شاگرد سید محمد بن عبد الجلیل بھی اپنی تصنیف ”مختصرہ الناظرین“ میں ۳۳

کے واقعات کے ضمن میں بیدل کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

”در روز از خانہ بر نمی آید۔ و از ہنگام شام تا قرب نصف شب، با شعر او شاگردان خود صحبت

می داشت۔“ (۴۴۷)

دن کو گھر سے نہیں نکلتے اور شام کے وقت سے آدھی رات تک شاعروں اور شاگردوں سے

تسلیم کرتے تھے۔

شاید انہی مآخذ کو سامنے رکھ کر ریو لکھتا ہے کہ:

دلی میں بیدل کا گھر تمام شعر دوست اور ادب نواز حضرات کا ایک مشترک مرکز بن گیا تھا۔

خود بیدل نے ایک شعر میں ادھر اشارہ کیا ہے۔

پرستیم و نہ مسجد نہ خرابات گرم است ہمیں صحبت ما بانفسی چند

۵۔ یہ سے مطلب نہ مسجد سے سروکار احباب سے رہتی ہے مری گرمی گفتار

”رقعات بیدل“ کی بابت ڈاکٹر نور الحسن انصاری لکھتے ہیں:

”..... ان خطوط سے بیدل کے کردار اور ذاتی حالات کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ ان

سے بیدل کے عزائم اور ناکامیاں، ان کی نیاز مندی اور بے نیازی، ان کا فقر اور دنیا طلبی،

امراء سے ان کے تعلقات اور قناعت پسندی، ان کا اور دربار داری وغیرہ بہت سی باتوں پر

روشنی پڑتی ہے۔ ان خطوط کی روشنی میں بیدل کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ ان کے سوانح

نگاروں کے بنائے ہوئے خاکے سے مختلف بھی ہے اور متضاد بھی۔“ (۴۴۹)

رقعات کے مضامین، خوشگوار اور سید محمد کے بیانات کو مد نظر رکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ دہلی میں

قیام کے بعد بیدل کے تعلقات سوسائٹی کے مختلف طبقوں سے جن میں سلاطین اور شہزادے بھی

۶۔ امراء اور تعلقہ دار بھی ہیں، شعرا اور ادیب بھی ہیں، رقیب اور حریف بھی ہیں اور عوام و خواص بھی

تعلقہ دار تھے۔

لہذا اس مقصد سے کہ بیدل کا زیادہ سے زیادہ مستند اور بہتر تعارف حاصل کیا جائے ضروری

۷۔ ہے کہ دوستوں کی نسبت اس کے افکار و خیالات اور جذبات و تاثرات نیز برعکس کا جدا گانہ جائزہ

لیا جائے کہ جس نے یہ قول خود۔

آخر ز فقر بر سر دنیا ز دیم پا خلقی بجاہ تکیہ زد و ما ز دیم پا

(شیوہ فقر کو اپنا کر ہم نے دنیا کو ٹھکرا دیا ایک طبقے نے جاہ و شہرت پر بھروسہ کیا اور ہم نے اسے

۸۔ دنیا کو ٹھکرا کر کس طرح دنیا اس کے گرد منڈلانے لگی یا یہ کہ یہ اس کا نرا دعویٰ تھا۔

۹۔ سن اور شہزادے:

مشہور محقق قاضی عبدالودود سے ایک انٹرویو کے دوران بیدل کے سلاطین سے تعلق کا ذکر آیا تو

انہوں نے برجستہ کہا:

”کہتے ہیں بیدل ایک صوفی مشرب اور صاحب کرامت ولی تھا۔ اگر وہ واقعی ایسا ہی آدمی تھا تو مختلف سلاطین کے دربار میں در یوزہ گری کیوں کرتا تھا؟“

راقم السطور نے اس وقت تک بیدل کا پوری طرح مطالعہ نہیں کیا تھا اس لئے اس کا جواب تو دے سکا پر یہ سوال برابر دل کو کچھ کے لگا تا رہا اور اس بات پر آمادہ کرتا رہا کہ اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ صحیح اور مستند معلومات حاصل کروں۔ ہم جانتے ہیں کہ بیدل اورنگ زیب، اعظم شاہ شاہ بہادر شاہ، جہاندار شاہ، فرخ سیر اور محمد شاہ کا معاصر تھا اس لئے ان میں سے ہر ایک کے ساتھ بیدل کے تعلقات کی نوعیت پر جدا گانہ بحث مناسب رہے گی:

اورنگ زیب:

حالات پر بحث کے دوران اورنگ زیب کا تذکرہ سرسری طور پر آچکا ہے۔ یہاں تفصیل نکات کی وضاحت ہے جو بیدل کے اورنگ زیب سے تعلقات کی نوعیت کو واضح کرتے ہیں۔ نور الحسن انصاری صرف اس قدر کہہ کر گزر گئے کہ:

”شہنشاہ وقت اورنگ زیب سے بظاہر بیدل کا بلا واسطہ ربط نہیں معلوم ہوتا مگر وہ شاہی عنایت کے امیدوار ضرور تھے۔“ (۳۵۰)

اس میں شک نہیں کہ دونوں کے تعلقات ایسے نہیں تھے کہ دونوں کو ایک دوسرے کا دوست کہا جائے۔ اورنگ زیب کے بارے میں اس نے سب سے پہلے جس رد عمل کا اظہار کیا وہ اس وقت سے وابستہ ہے جب اورنگ زیب جنگ جانشینی میں اپنے بڑے بھائی اور رقیب دارا شکوہ کو شکست دے کر ۱۰۶۸ھ ۱۶۵۷ء میں تخت پر بیٹھا اس وقت بیدل لکھتا ہے:

”اورنگ زیب عالمگیر برعزم فرمانروائی دہلی سبقت کرد و حقوق خدمت پدر پیش از دیگران بجا آورد۔“ (۳۵۱)

اورنگ زیب عالمگیر نے دہلی پر فرمانروائی کے ارادے میں سبقت کی اور باپ کی خدمت حقوق دوسرے بھائیوں سے پہلے ادا کئے۔

یہاں دوسرا جملہ اس طنز کی نشاندہی کرتا ہے جو بیدل نے اورنگ زیب پر کیا ہے۔ ایسا ہے کہ سارے واقعات اس کی نگاہوں کے سامنے تھے۔ ملک کے امن و امان، صلح و اشتی اور تمام لڑکوں میں اس کی تقسیم سے وابستہ شاہجہاں اور اورنگ زیب کے درمیان خط و کتابت کا ہونا عالمگیر کا باپ کی تہا

”اتق نہ کرنا، بار بار کے تقاضے کے باوجود اس کی ملاقات سے انکار کرنا یہی نہیں بلکہ باپ کے لئے اتنا رات کو سب کر کے قلعہ اکبر آباد میں اسے قید کر دینا یہ سب باتیں اس طنز کی تلخی میں چھپی ہیں۔ شاہجہاں ایک خط میں اورنگ زیب کو لکھتا ہے:

”بابا من! بہار من!

من چراگریہ کنم از سبب سستی بخت کہ بجز امر خدا برگ نہ جہد ز درخت  
بیان اللہ! دیروز صاحب نہ لک سوار بودم، امروز بیک کوزہ آب محتاجم۔

آفرین بر ہنود در ہر باب مردہ را می دہند دائم آب  
ای پسر! تو عجب مسلمانی زندہ جانم بہ آب ترسانی  
ای فرزند مکار! اقبال دنیای غدار مفروز مہاش و خاک غفلت و تکبر بر سر عقل مہاش کہ  
دنیا فانی تنگنا کی ظلمت است و ہما حق یون و بر خلق شفقت کردن دولت جاودانی۔

من آنچه شرط فصاحت بود تو گفتم تو خواہ از خنم پند گیر خواہ ملال  
میرے بابا، میری بہارا!

میں اپنی کم نصیبی پر کیوں آنسو بہاؤں کیونکہ خدا کے حکم کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں ہلتا ہے۔  
نہ کل تک نولاکھ سواروں کا مالک تھا آج ایک کوزہ پانی کا محتاج ہوں۔ ہندوؤں کو ہر معاملے میں  
دنیائی دینی چاہئے جو اپنے مردوں کو برابر پانی دیتے رہتے ہیں بیٹا! تو عجیب و غریب مسلمان ہے زندہ  
میں بھی تو پانی کے لئے مجھے ترساتا ہے۔

اے مکار بیٹے! غدار دنیا کی اقبال پر مت پھول اور غفلت و تکبر کی خاک عقل کے سر پر مت  
دنیا فانی ایک تنگنا کی ظلمت ہے اور خدا کی یاد میں رہنا اور مخلوق پر شفقت کرنا دائمی دولت ہے۔  
فصاحت کا جو تقاضا تھا وہ میں نے تجھ سے بیان کر دیا اب چاہے تو میری بات سے فصاحت لے  
تو مل خاطر رہے۔

ایک رباعی میں بھی اس نے اورنگ زیب کی باپ بھائی کے ساتھ بدسلوکی پر طنز کیا ہے اور  
وقت کو مورد الزام ٹھہرایا ہے۔

چند بہ عدل دیں حق رہبر بود جہد علما پیرو حکم زر بود  
سلطان ہر گاہ ریخت خون پدرش گفتند: جہاد کردہ او کافر بود

اورنگ زیب کی کتاب زندگی کا یہ دوسرا رخ تھا جس کی بعد کے مؤرخوں اور دانشوروں نے  
تو اس وقت یہ ایک واقعہ تھا اور بیدل کا طنز اس پر مبنی ہے۔

۱۰۷۰ ہجری ۱۶۰۹ء میں جب اورنگ زیب کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور پڑی تو اس وقت بیدل لکھتا ہے۔

”ہنای شوکت شاہ شجاع با دار گہای عالم ادبار سید و اقتدار دولت بادشاہ عالمگیر بر جہات ممالک ہند صفا اقبال کشید“۔ (۳۵۳)

شاہ شجاع کی شان و شوکت کی بنیاد عالم ادبار و پستی کی آوارگی پر مبنی ہوئی اور عالمگیر بادشاہ کی دولت کے اقتدار نے کشور ہندوستان کے اکنا ف و نواحی پر صفا اقبال بچھایا۔

یہاں اس کا لہجہ کسی حد تک نرم ہو گیا اور اورنگ زیب کی شان و شوکت کا چاہے بادل ہوا اعتراض کیا ہے۔ ۱۰۷۶ھ ۱۶۶۵ء میں جب بیدل پایہ تخت دہلی میں قدم رکھتا ہے اور وہاں قیام کے بعد اس نے مثنوی محیط اعظم لکھی۔ اس مثنوی میں اس دور کے دینی سماجی اور ادبی حالات سخت تنقید کرتے ہوئے درپردہ اورنگ زیب کی پالیسی پر حملہ کیا ہے۔ لکھتا ہے:

گرفتہ ز گردوں دلی شاد نیست ز عدلش عیال غیر بیداد نیست  
میں نے مانا کہ آسمان کے ہاتھوں کوئی دل خوش نہیں ہے اس کے انصاف سے بے انصافی  
ہو آتی ہے۔

بہ نیرنگ عدلش نظر ہا پر آب بہ بیداد ظلمش جگر ہا کباب (۳۵۴)  
اس کے نیرنگ عدل سے آنکھیں اشکبار ہیں اس کے ظلم و جبر سے جگر کباب ہو گئے ہیں۔  
۱۰۹۷ ہجری ۱۶۸۵ء میں جبکہ عالمگیر کو کلکتہ اور بیجا پور کوچ کر کے واپس ہوا تو بیدل نے تاریخ پر مشتمل ایک خط لکھ کر شکر اللہ خاں کے ذریعہ بھیجا جس کا مطلع اس طرح ہے۔

شاہ عالمگیر یعنی حضرت اورنگ زیب آنکہ دارد تکیہ بر شمشیر او فتح و ظفر  
شاہ عالمگیر یعنی حضرت اورنگ زیب وہ شخص ہیں جن کی تلوار پر فتح و کامرانی فیک گاتی ہے۔  
ایک دوسرے قطعہ میں جو اسی مناسبت کہا تھا، درج ذیل شعر ملاحظہ ہو۔

سر شاہاں عالم، شاہ عالمگیر کز عدلش برنگ نور و ظلمت شد جدا از حق و از باطل  
جہانداری کہ چون ذاتش ندارد عالم امکان خدا دان و خدا گوی و خدا جوی و خدا حاصل  
(۳۵۵)

شاہنشاہ عالمگیر جس کے عدل و انصاف کی بدولت حق و باطل میں نور و ظلمت کی طرح جدا ہوئی۔ ایسا جہاندار ہے کہ عالم امکان (دنیا) ایسی ذات بابرکات نہیں رکھتا ہے۔ وہ خدا دان، خدا جوی و خدا حاصل ہے۔

اور سنہوں پر عالمگیر کو غلبہ حاصل ہونے کی مناسبت سے کہا:

عالمگیر خورشید ظہور فضل حق آنکہ ذاتش رانشاہ جز ہماں ذاتش نظیر (۳۵۷)  
عالمگیری بادشاہ جو فضل الہی کے ظہور کا خورشید ہے جس کی ذات کی نظیر خود اسی کی ذات  
ہوتی ہے۔

یہ سارے اشعار، تاریخی قطعے بلکہ تبریک نامے بیدل کے خیال میں ہونے والے دمدم  
کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں اس کے تنکھے اور تیز و تند لہجے دھیرے دھیرے نرمی بلکہ  
توجہ طلبی کی سیاست کی طرف کھینچتے چلے جا رہے ہیں۔ اگر چراغان دہلی کے زیر عنوان اس  
نکتہ کو درست مانا جائے جو کلیات بیدل میں موجود ہے اور بقول ڈاکٹر انصاری یقیناً اورنگ زیب  
کی مدح میں کہا گیا ہے تو ہمیں اعتراف کرنا پڑے گا کہ بادشاہ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کی  
دش میں اس نے استغنا و بے نیازی اور قناعت و سیر چشمی کو جس کا دعویٰ کیا ہے بہت پیچھے چھوڑ دیا اور  
دش میں اس نے استغنا و بے نیازی اور قناعت و سیر چشمی کو جس کا دعویٰ کیا ہے بہت پیچھے چھوڑ دیا اور  
دش میں اس نے استغنا و بے نیازی اور قناعت و سیر چشمی کو جس کا دعویٰ کیا ہے بہت پیچھے چھوڑ دیا اور

جہاں پناہ قبولیت کا وہ سرو سامان میرے پاس کہاں ہے کہ اس دربار میں اپنے حالات دل  
کرنے کے لئے باریابی کا شرف حاصل کر سکوں۔  
تاریخ احوال از طرز مخلص روشن است بید لیہا چیدہ ام بر خود ز وضع روزگار  
میرے مخلص سے میرے حالات واضح ہیں، صورت بہ میں حالت پیرس۔ زمانے کی تسم ظریفی  
دش سے میں نے اپنے لئے بیدلی و بے کسی اکٹھی کر رکھی ہے۔

سر اپا احتیاج و چرخ دول پرور خیس من طراوت امطار و ابر احسان شعلہ بار  
میں سر اپا احتیاج اور ضرورت ہوں اور دون پرور آسمان ذلیل خیس ہے میں طراوت و تازگی و  
دش و فراغی کے لئے سر اپا انتظار ہوں اور بادشاہ کے احسان کا بادل شعلہ بار ہے۔

ابر عنایت آبیار مزرع خوشہ سان از پای تا سر جملہ دل آرم بہ بار (۳۵۸)  
اگر شاہی عنایتوں کا بادل میرے کھیت کی آبیاری کرے تو خوشے کی طرح میں سر سے پیر تک  
دش کے سامنے رکھ دوں۔

جناب غلام حسن مجددی کا خیال ہے کہ یہ قصیدہ شہزادہ اعظم شاہ کی تعریف میں ہے۔ (۳۵۹)  
تاریخ احوال از طرز مخلص روشن است بید لیہا چیدہ ام بر خود ز وضع روزگار  
میرے مخلص سے میرے حالات واضح ہیں، صورت بہ میں حالت پیرس۔ زمانے کی تسم ظریفی  
دش سے میں نے اپنے لئے بیدلی و بے کسی اکٹھی کر رکھی ہے۔

کے دعویٰ ”آخر زفقہ بر سر دنیا زدیم پا“ کی تائید کرتے ہیں۔ بیدل کا جن دنوں اکبر آباد میں قیام تھا ایک دفعہ چند روز کی خوراک ختم ہونے کے بعد بھوک نے اسے بہت پریشان کیا اور حد یہ ہے کہ کمزوری کی وجہ سے اسے راستہ چلنا مشکل ہو گیا۔ اس عالم میں اس نے دریا کے کنارے جا کر پانی پی کر اپنی بھائی چاہی لیکن جیسے ہی وہ کھڑا ہوا اس کے پیر لڑکھڑانے لگے اور وہ گرتے گرتے بچا، اسی حالت میں اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اس خیال سے کہ کہیں لوگ اس کے گرد اکٹھا نہ ہو جائیں استنجائے ایک دیوار کے پاس بیٹھ گیا۔ اور اپنی مناعت پسند اور غیر تمند طبیعت کے بارے میں لکھتا ہے:

”کامروای منع حقیقی، بی نیازی در طبیعت گماشتہ بود کہ خود را دریغ صورتی آئینہ دار احتیاج نمی دیدم۔ وغنای تعلیمی معلم اسرار سرخوشی در مزاجم انپاشتہ کہ از بیج المی غیر از نوای خرسندی نمی شنیدم۔“ (۳۵۹)

منع حقیقی کی کامروائی نے میری طبیعت میں ایسی بے نیازی کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی کہ کسی شکل میں اپنے کو احتیاج کا آئینہ دار نہیں سمجھتا تھا (ضرور تمند محسوس نہیں کرتا تھا) اور معلم استغنائی تعلیم نے میرے مزاج میں ایسی سرمستی رکھ دی تھی کہ کسی بھی تکلیف سے خوشی کے سوا کوئی آواز کانوں میں نہیں آتی تھی۔ رباعی۔

جز حق سو ہر کہ حاجت بست احرام پیش آید ت این چارغم یاس انہم  
نک کم ہمتی و تشویش سوال رسوائی احتیاج و نومیدی کام (۳۶۰)

تمہارے احتیاج نے خدا کے سوا جس کا بھی احرام باندھا تم کو ان چار یاس انجام غموں سے پالا پڑے گا: ہمتی کی شرم، سوال کی تشویش، احتیاج کی رسوائی اور مقصد میں مایوسی۔

سوچنے کا مقام ہے جس شخص کا یہ قول و عمل ہو وہ کیا بادشاہ کے حضور میں اپنی حاجت طرح اظہار کرے گا اور اپنی عزت نفس کو خاک میں ملائے گا۔

”من سراپا احتیاج و چرخ دوں پرور خیس۔“

میں سراپا احتیاج ہوں اور کمینہ پرور آسمان خیس و ذلیل ہے۔

قصیدے کو اگر ہم الگ اٹھا کر کہیں تو ان قطعوں اور مبارکباد ناموں کے بابت کیا کہا جائے گا جن میں ایک طرح کا خوشامدانہ پہلو بن جاتا ہے۔

قطعوں سے مترشح اس خوشامدانہ لہجے کا لگتا ہے بیدل کو بھی اندیشہ تھا اس لئے اس نے سد باب کے لئے اس نے شکر اللہ خاں کے نام اپنے ایک خط میں اپنے موقف اور اصول کی وضاحت کردی ہے۔ لکھتا ہے:

”الحمد للہ اندیشہ دعا گوئی، بہانہ جوی تقریبی است کہ باں وسیلہ تحفہ فقر اور پیش گزار دیا مصرع در آنجناب معروض دارو۔ وگرنہ چہ نواب و کد ام مستطاب بلکہ چہ عالمگیر و کد ام بدر منیر برین شوق بی پروا نگاشتہ دارو بہ آہنگ سازی بی نیازی سراز پرودہ بری آرد۔“ (۳۶۱)

الحمد للہ اس دعا گو کی فکر ایک ایسی مناسبت کا بہانہ تلاش کرتی ہے جس کے ذریعہ فقیر کا تحفہ یا مصرعہ بادشاہ سلامت یا نواب کی خدمت میں پیش ہو ورنہ نواب کیا اور مستطاب کون بلکہ عالمگیر کیا بدر منیر کون۔ محض شوقیہ انداز سے بے اعتنائی کیساتھ کچھ لکھ دیا اور ساز بے نیازی کے آہنگ میں لاپ دیا۔

یک رباعی میں بھی اس کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

مدح و تاریخ بعضی از شاہ و امیر کروم بکالیف عزیزاں تحریر  
آنها مردند و من پشیمیاں گشتم فطرت بہ عذاب قبر ماند از تشویر  
اس بنا پر بیدل پر خوشامدی ہونے کا کیل نہیں لگایا جاسکتا یا اس کے ارادوں اور نیتوں میں شبہ کیا جاسکتا ہے۔

یہ تو اس تعلق کا ایک پہلو تھا آئیے اب اس کے دوسرے پہلو کا جائزہ لیں۔

اورنگ زیب، جیسا کہ مقدمہ میں لکھا گیا، شعر و شاعری سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا تھا یا اس کے بارے میں کوئی زیادہ اچھی رائے نہیں رکھتا تھا اور آیت کریمہ کے مطابق اس کی اہمیت کا قائل نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بیدل تمام تر تقریبی مناسبتوں کے باوجود اس کے دربار تک رسائی حاصل نہ کر سکا۔

اس کے باوجود محمد ساقی مستعد خاں کے بقول چند و نصائح سے متعلق اشعار اورنگ زیب کو بہت متاثر کرتے تھے۔

بقول خوشگو اورنگ زیب نے اپنے خطوط میں بیدل کے تین نہایت عمدہ اشعار نقل کئے ہیں۔

عظم شاہ اور معظم شاہ کے نام ہیں۔ اس کے علاوہ ایک خط اس آدمی کے جواب میں ہے جو اورنگ زیب سے مزید روپوں کی درخواست کر رہا تھا۔

از آہ مظلومیکہ ہنگام دعا کردن اجابت از در حق بہر استقبال می اید  
میں گویم زیان کن یا بفکر سود باش اے زفرست بیخبر در ہر چہ باشی زو دباش  
من قانع نیست بیدل ورنہ اسباب جہاں آنچہ مادر کار داریم اکثری در کار نیست (۳۶۲)

یہ انتخاب کلام اورنگ زیب کے ذوق اور رجحان طبع کا نمائندہ ہے۔ اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی ظاہر کرتا ہے کہ اس نے کم از کم بیدل کے دیوان کا مطالعہ کر کے چند و نصائح پر مشتمل اس کے عمدہ

اشعار کا ایک انتخاب تیار کیا تھا جن میں مذکورہ تین اشعار اس کے خطوط کے ذریعہ ہم کو معلوم ہوئے۔ اس بنا پر کوئی تعجب نہیں اگر اورنگ زیب کے دل میں بیدل کا کوئی مقام رہا ہو اور وہ اس حسن ظن رکھتا ہو اگرچہ ان کا تعارف ان کی دوستی پر منتہی نہیں ہوا۔

اعظم شاہ:

اعظم شاہ کے دربار میں بیدل کی ملازمت پر بحث کے دوران ان دونوں کے تعلقات نوعیت پر تفصیلی بحث گذشتہ صفحات میں آچکی ہے، اس لئے اس کے تکرار کی ضرورت یہاں نہیں ہے۔ اس تعلق میں ایک توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ بیدل نے اپنے استغفانامہ میں اپنے استغفا اور بے یار و مددگار ہونے کی طرح مظاہرہ کیا ہے کہ اعظم شاہ کا دل ایک عرصے تک مضطرب رہا اور اپنے چند خطوط کے ذریعہ اس نے بیدل سے ملازمت میں دوبارہ آنے پر اصرار کیا لیکن لگتا ہے اس نے بھی قسم کھا رکھی تھی کہ آزادی کا شیوہ ترک نہیں کرے گا مگر اس اندیشہ سے کہ کہیں شاہی عتاب کا شکار نہ ہو اس نے درج ذیل غزل لکھ کر بھیجی۔

اگر خورشید گردونم و گر گرد سر راہم گدای حضرت شاہم، گدای حضرت شاہم  
چاہے میں آسمان کا سورج ہو جاؤں یا گرد سر راہ ہو جاؤں بہر حال حضرت شاہ اعظم  
گدا ہوں۔

قبولی دہشتم در بارگاہ عرض تعظیمش کز اس کسب سعادت تھا کتوں مقبول  
اس کی بارہ گاہ تعظیم میں مقبولیت حاصل تھی اس کی سعادت حاصل کرنے کے بعد اب میں  
کے یہاں بھی مقبول و محبوب ہوں۔

ز اقبال زمیں بوش غنائی کردہ ام حاصل کز انعام فلک جز عذر استغنائی خود  
اس کے اقبال زمیں بوس سے میں نے غناء و بے نیازی حاصل کی ہے اب کے فلک کے انعام  
سے عذر استغنا کے سوا کچھ نہیں چاہتا۔

زمیں گیری ندارد منع تسلیم حضورش بخاک افتادہ ام اماہاں چوں سایہ ہر ام  
زمیں گیری اور شرمساری مجھے اس کے حضور میں تسلیم بجالانے سے باز نہیں رکھتی اگرچہ خاک  
میں پڑا ہوا ہوں پڑھیک سائے کی طرح اس کے ہمراہ ہوں۔

سجود می برم از دور خاک آستانش را بآن قریبکہ نزدیکان ہم از دورند آگاہ  
دور سے اس کے آستانے کی خاک کا سجدہ کرتا ہوں اس قربت سے آگاہ ہوں کہ قریب

دور والے ہوتے ہیں۔  
فدائی بودم اکنون از دعاگو یاں درگاہم  
کیا نزدیکی اور کیا دوری اس سے بندگی میں کوئی فرق نہیں آتا ہے۔ کبھی میں فدائی تھا اب میں  
دعا گو ہوں۔

نکسی داماں نازی دادہ ام از کف کہ می جوشد ز مژگاں چاکہا از دست کوتاہم  
نکسی و نااہلی کے سبب ناز کا دامن ہاتھ سے دیدیا ہے پلکوں کی طرح میرے دست کوتاہ سے  
دانی جوش مار رہی ہے۔

غیم، درد دلم، داغم، سرشکم، نالہ ام، آہم (۳۶۳)  
اس آستانہ سے جدا ہو کر بیدل میں کیا ہوں کیا بتاؤں بس یہ سمجھو کہ غم ہوں، درد دل ہوں، داغ  
سرسک (آنسو) ہوں، نالہ ہوں اور آہ ہوں۔

غزل کا انداز بتا رہا ہے کہ اعظم شاہ کی طرف سے بیدل کے دل میں جو کدورت پیدا ہو گئی تھی  
نہ ہو سکی اور چونکہ اس کے عتاب کا اندیشہ اسے لاحق تھا اس لئے اس کدورت پر اس نے اپنی  
منونیت و احسانندی کا پردہ ڈال دیا۔ ۱۱۱۹ھ ۱۷۰۷ء میں جنگ جانشینی میں اعظم شاہ کے قتل پر  
کدورت علانیہ طور پر سامنے آئی۔ شکر اللہ خاں عانی کے نام ایک خط میں بیدل اعظم شاہ کے بارے  
میں لکھتا ہے۔

دولت بیدار خواہا دیدند در آخر اعظم و بیدار بخت خوابیدند (۳۶۳)  
دولت بیدار (اپنی حکومت) کے وہم کا خواب دیکھتے رہے آخر کار اعظم شاہ اور اس کا لڑکا بیدار  
نہ دونوں محو خواب ہو گئے اور جنگ میں کام آگئے۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا بیدل نے اعظم شاہ کی  
تریف میں ایک قصیدہ کہا تھا چنانچہ اس کا ایک شعر درج ذیل ہے۔

صاحبقران سلطان محمد اعظم آں کز گل مدحش زبان دارد چمن در انجمن  
صاحبقران کا وارث سلطان محمد اعظم شاہ جس کی تعریف کے پھول سے زبان کو انجمن میں ایک  
گل کی حیثیت حاصل ہے۔

شاہ عالم بہادر شاہ:

بیدل کا شاہ عالم بہادر شاہ سے تعارف اور تعلق ایسا نہیں ہے کہ اس کی بنا پر ان دونوں کو ایک  
دوست کہہ سکیں لیکن خوشگو نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ



موصوف کو بیدل سے گہری ارادت تھی اور وہ اس کی غیر معمولی قدر کرتا تھا۔ لکھتا ہے:

”شاہ عالم بہادر شاہ بہنم خانخانان اکثر فرمود کہ بمیرزا بیدل تکلیف نظم شاہنامہ کردہ شود۔ خانخانان کہ آشنائی قدیم بود، پیشش بار در کتابت نوشت۔ میرزا قبول نہ نمود عاقبت جوابی بدرستی نگاشت۔ اگر خواہ خواہ مزاج بادشاہ برین پلہ است، من فقیرم جنگ نمی توانم کرد۔ ترک ممالک محروسہ کردہ بولایت می روم۔“ (۳۶۵)

شاہ عالم بہادر شاہ بہنم خانخانان کو اکثر کہا کرتا تھا کہ مرزا بیدل کو شاہنامہ لکھنے کی ذمہ داری سونپو۔ خانخانان نے جو بیدل کا قدیم دوست تھا پانچ چھ بار اس کو خط لکھا لیکن مرزا نے یہ ذمہ داری قبول نہ کی۔ آخر اس نے ایک سخت جواب لکھا: بادشاہ کا مزاج خواہ خواہ اگر یہی طے کر چکا ہے تو میں فتح آدمی ہوں جنگ کر نہیں سکتا۔ ممالک محروسہ کو ترک کر کے ولایت چلا جاتا ہوں۔

بہادر شاہ کا بیدل سے بار بار مغلیہ حکومت کا شاہنامہ لکھنے کا تقاضا واضح کرتا ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ بیدل سے واقف تھا بلکہ وہ اس کے شاعرانہ ذوق، رجحان طبع اور استعداد و صلاحیت کا اس قدر قائل تھا کہ دار الخلافہ کا کوئی اور شاعر اس کے خیال میں اس ذمہ داری کو نبھانے کے لئے اس سے زیادہ موزوں نہ تھا۔

دوسری طرف بیدل کا شاہنامہ نویسی لکھنے سے اجتناب کے لئے سخت جواب اس کی استعداد بے نیازی کی خصوصیت کو واضح کرتا ہے۔ لیکن تمام تر بے نیازی کے باوجود اس کے متعدد خطوط نے یہ ترشح ہوتا ہے کہ اس (بادشاہ) کے ساتھ اس کے مخلصانہ تعلق تھے۔ ان خطوط میں جس کے اندر شکر خان ثانی اور عاقل خاں مخاطب ہیں بیدل نے دوہرے واقعے کا تذکرہ کیا ہے۔ اول اعظم شاہ کا بہادر شاہ کے ہاتھوں قتل اور ثانی الذکر کی کامیابی اور کام بخش کا بہادر شاہ کے ہاتھوں قتل۔

ایسا لگتا ہے کہ اکبر آباد کے قریب اعظم شاہ اور بہادر شاہ کے درمیان جانشینی کی جنگ میں بیدل دفعہ میں اعظم شاہ کی فوج کا پلہ بھاری رہا اور بہادر شاہ کی فوج اضطراب اور بے چینی سے دوچار رہی۔ اس زمانے میں شکر اللہ خاں کے بیٹوں صاحبزادے شکر اللہ خاں ثانی، شاہ کر خاں اور عاقل خاں جو بیدل کے بہت ہی مخلص دوست تھے بہادر شاہ کی فوج میں اس کی طرف سے لڑ رہے تھے بیدل نے ان کی دلی اور نصیحت کی کہ خدا کے فضل پر بھروسہ کریں۔ یہ خط شکر اللہ خاں کے نام درج ذیل عنوان سے ہے۔

”شکر اللہ خاں وقتی کہ در اکبر آباد عسرت احوال لشکر شاہ عالم معانینہ نمودند و شاہ کر خاں و عاقل

خاں نیز بایشان بودند۔“ (۳۶۶)

شکر اللہ خاں کو جبکہ اکبر آباد میں شاہ عالم کی فوج کی تنگی احوال کا معائنہ کیا اور شاہ کر خاں

بھی ان کے ساتھ تھے۔

پھر جب بہادر شاہ کی فوج اپنے حریف بھائی اعظم شاہ کی فوج پر غالب ہوئی اور اعظم شاہ اپنے بھائی کے ساتھ مارا گیا تو بیدل نے درج ذیل عنوان کے ساتھ پھر ایک خط لکھا:

”بہ شکر اللہ خاں در عسرت کشید شدن اعظم شاہ و بیدار بخت۔“ (۳۶۷)

شکر اللہ خاں کے نام اعظم شاہ اور بیدار بخت کے تنگی اور عسرت کی حالت میں قتل کے جانے

اور اس واقعہ سے عبرت لیتا ہوا کہتا ہے۔

دولت بیدار خواہد۔ دیدند در آخر اعظم و بیدار بخت خواہد  
دولت بیدار اور حکومت پاندار کا خواب دیکھا کے آخر اعظم شاہ اور بیدار بخت دونوں اس میں کام آگئے۔

بہادر شاہ کی کامیابی اور فتح کی مناسبت سے ایک مبارکباد، جو مادہ تاریخ پر مشتمل ہے عاقل خاں کی طرف سے بھیجا۔ اس خط کا عنوان ہے۔

”بعاقل خاں..... مبارکباد فتح شاہ عالم بر اعظم شاہ و تاریخ جلوس۔“

یہ دو بیت، فقیر نیز دعا گوئی بادشاہ دین پناہ است۔

معدلت انوار پادشاہ ز من بایں مریع اسرار دادہ اند نشان  
افت یزداں، جلال قدرت شان ہماں خلیفہ رحمان، معظم دو جہاں (۳۶۸)  
عاقل خاں (شکر اللہ خاں کے تیسرے بیٹے کرم اللہ خاں کا خطاب تھا جو اپنے نانا کے خطاب پر  
نام شاہ عالم کی اعظم شاہ پر فتح کی مبارکباد و تاریخ جلوس کی بابت۔

ان دو اشعار کو پیش کر کے فقیر (بیدل) بھی بادشاہ دین پناہ کے لئے دعا کرتا ہے۔

زمانے کے بادشاہ کے جلوس معدلت انوار نے ان چار گونہ اسرار کی نشاندہی کی ہے۔

۱۔ شیون را فت یزداں

۲۔ جلال قدرت شان

۳۔ ہماں خلیفہ رحمان

۴۔ معظم دو جہاں

ان چاروں سے الگ الگ ۱۱۱۹ھ نکلتی ہے۔

اعظم شاہ کی شکست اور قتل اور بہادر شاہ کی فتح و کامیابی پر بیدل نے جس رد عمل کا اظہار کیا ہے

وہ ان کے ساتھ بیدل کے تعلقات کی نوعیت کو واضح کرتا ہے، پھر بھی دیگر احتمالات کو خارج از اعتدال نہیں قرار دیا جاسکتا ہے۔ یعنی ممکن ہے بیدل ابن الوقت رہا ہو کہ جو آدمی بھی برسرِ اقتدار آیا اس کی تعریف و ستائش کر دی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بیدل کا مقصد شاہی عتاب کا شکار ہونے سے خود کو بچانے کی غیر جانبدارانہ رویہ رکھنے پر سلاطین کی طرف سے امید کی جاتی ہے۔

دوسرا واقعہ کام بخش کے قتل سے وابستہ ہے۔ ۱۲۰ھ (۸-۱۷۰۷ء) میں بہادر شاہ کے بھائی کام بخش نے جو بیجا پور کا صوبہ دار تھا بہادر شاہ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ بہادر شاہ نے اس کی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے حیدر آباد میں فوج کشی کی۔ اس زمانے میں بہادر شاہ کی فوج میں شہر خاں ثانی شامل تھا اور شاید وہ اضطراب اور پریشانی میں مبتلا تھا۔ بیدل نے نواب موصوف کے نام پر ایک خط میں حیدر آباد میں فوج کشی سے متعلق توہمات کو دور کیا ہے۔ اس خط کا عنوان ہے۔ ”شکر اللہ خاں اور ہم لکھنؤ کشی با حیدر آباد“ (۳۶۹) (شکر اللہ خاں کے نام حیدر آباد میں فوج کشی سے متعلق) پھر جب کام بخش کام آگیا اور بہادر شاہ کامیابی کے ساتھ دہلی واپس آیا تو شاکر خاں کے نام ایک خط لکھا اس عنوان سے ”بشا کر خاں بعد از رسیدن شکر اللہ خاں از حیدر آباد“ و اتمام عافیت پس از فتح کام بخش۔“ (۳۷۰) شاکر خاں کے نام شکر اللہ خاں کے حیدر آباد سے دہلی پہنچنے اور کام بخش پر فتح حاصل ہونے کے بعد عافیت کے اتمام کے بارے میں۔

بیدل نے اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے گویا کام بخش کے مارے جانے پر اسے کسی افسوس نہیں ہوا۔ شکر اللہ خاں ثانی کے نام دوسرے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ بیدل نے مرزا خسرو بیگ کی معرفت شاہ عالم بہادر کو ”اکسیر احمر“ بھیجا تھا اور بادشاہ نے اسے شرف قبول سے نوازا۔ بیدل نے دوبارہ اپنی خود ساختہ دوائیں جیسے حب اعجاز، اکسیر احمر، اوجی اور رنجک شکر اللہ خاں کو بھیجیں اور ان سے درخواست کی کہ جن دواؤں کو آپ مناسب سمجھیں بادشاہ کی خدمت میں پیش کر سکتے ہیں۔ یہ دوائیں ہیں لیکن باطن دعائے مجسم ہیں جو اجابت سے بہت قریب ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ فقیر بھی ان شکل میں بادشاہ سلامت کی کوئی خدمت انجام دے سکے۔

”مرج تمنا ی بیدلا! قبل ازین بہ معرفت مرزا خسرو بیگ، قدری اکسیر احمر نیاز باریافتگان جناب تقدس انتساب پادشاہزادہ عالمیان مآب گردیدہ بود، بہ شرف قبول امتیاز یافتہ شد۔ بالفعل ازین اشیاء مرسلہ آنچہ شاید پیشکش بارگاہ دانند از نظر اشرف بگذارند۔ در معنی دعای مجسمی است در صورت دوا کہ اثرش با حصول اجابت مناسبتی قریب دارد، تا دریں کسوت فقر نیز خدمت بجا آورده باشند۔“ (۳۷۱)

بیدل کا اپنی خود ساختہ دواؤں کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کرنے سے کیا مقصد تھا؟ خط کشیدہ میں مذکور کرنے سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ اگر ہم کہیں کہ بیدل کو شاہی عنایتوں اور مراحم کی توقع تھی تو اس کا سب سے بہتر موقع وہ تھا جب اسے شاہنامہ نویسی کی ذمہ داری سونپی گئی تھی تو اسے قبول کر لیتا لیکن جیسا کہ ہمیں معلوم ہے اس نے یہ پیشکش قبول نہ کی لہذا ہم مجبوراً اسے مخلصانہ روالبط پر محمول کریں۔

جہاندار شاہ:

جہاندار شاہ کی مدت حکومت سات مہینے چند دن ہے۔ ظاہر ہے اس مختصر مدت میں جبکہ سلطنت کی ساری محنتیں مضبوط نہیں تھیں، بیدل کے شاہ سے تعلقات کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے۔ قطعاً اس سے معلوم ہوتا ہے جہاندار شاہ کی اپنے بھائیوں کے ساتھ جانشینی کی جنگ میں شکر اللہ خاں جہاندار شاہ کی طرف تھا۔ اس جنگ میں کامیابی کی مناسبت سے ایک تبریک نامہ شکر اللہ خاں ثانی کی طرف اس نے جہاندار شاہ کو روانہ کیا جو درج ذیل ہے۔

بال اے دل کہ شکر اللہ خاں را مدد کرد از جہاں کبریا فتح  
اے دل! اس بات پر فخر کر کہ جہاں کبریا نے شکر اللہ خاں کی فتح میں مدد کی۔  
در آں شور قیامت منتظر بود کہ با عزمش نماید اقتدا فتح  
قیامت کے اس شور و ہنگامے میں وہ اس امر کا منتظر تھا کہ فتح اس کے عزم و ارادے کی اقتدا کرے۔  
چو خورشید از بلند یہای اقبال نمودش صاحب کوس و لوا فتح  
اس کے اقبال کی بدولت خورشید کی طرح صاحب کوس و لوا (جھنڈے اور نقارے والے مراد) نے اسے فتح کی راہ دکھائی۔

عیار سال تار بخش گرفتیم دو مصرع ہمعناں گل کرد با فتح  
اس کے سال تاریخ کو جب معیار و محکم بنایا تو فتح کے ساتھ دو مصرع ساتھ صفحہ ذہن

برآمد آفتاب از برقع جود مبارکباد جہد صالح مرحبا فتح (۱۱۳۳ھ)  
آفتاب برقع جود سے باہر نکلا صالح اور نیک مساعی پر مبارکباد ہو کیا پوچھنا اس فتح کا۔  
اور وہ ازین شکر اللہ خاں ثانی کے نام بیدل کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاندار شاہ نے موصوف کو حکم دیا تھا کہ ندیم کی شکل میں وہ اس کے پاس بیٹھا کرے۔ یہ اجازت بھی دی

تھی کہ وہ حرمسرا کے اندر آمدورفت رکھ سکتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ نواب موصوف اس کے معتدوں کی صف میں شامل تھا۔ اس کے باوجود نواب نے بیدل سے مشورہ کیا اور بیدل نے جواب دیا: ”مایہ تعظیم عرفا برتر ازاں است کہ شاہاں آرزوی مجالست شاں نمایند۔ وہاں وسیلہ چشم بر حقیقت غنای مطلق کشاید نشہ بی نفسی مقتضی آن نیست کہ بسک اعتبار اعیان پر دازد و خود رامقید سلسلہ اعتبار سازد۔“ (۴۷۳)

عارفوں کی تعظیم کا سرمایہ اس سے کہیں برتر ہے کہ سلاطین ان کی ہم نشینی کی تمنا کریں اور ان کے ذریعہ غنای مطلق کی حقیقت پر اپنی آنکھیں وا کریں۔ نشہ بی نفسی، اس بات کا تقاضا نہیں کرتا کہ قیام اعیان کے مسلک سے وابستہ ہوں اور خود کو سلسلہ اعتبار کا پابند بنائیں (یعنی ندیمی کی دعوت قبول کر لیں) یہاں بیدل کا لہجہ بتاتا ہے کہ جہاندار شاہ کے بارے میں اس کا خیال کچھ زیادہ اچھا نہیں تھا۔ جناب غلام حسن مجددی لکھتے ہیں کہ نئے بادشاہ جہاندار شاہ کی تاجپوشی پر بیدل نے ایک خط لکھا کہی اور اس کی تعریف کی ہے جس کا ایک مقطع یہاں ذکر کیا جاتا ہے جس میں چار منتخب مادہ تاریخ میں نص شرف، شاہ زماں نجم الہدی، فیض ملک کشور کشا، موسی عصا، گیتی ستاں، جم گیتی ستاں، لیکن راقم السطور کو یہ شعر ایک قصیدے میں ملا جو فرخ سیر کی تعریف اور اس کی تاجپوشی کی تقریب میں کہا گیا ہے۔

### فرخ سیر:

فرخ سیر کے ساتھ بیدل کے روابط دوسرے مغل سلاطین کی یہ نسبت مخلصانہ اور خوشگوار معلوم ہوتے ہیں کیونکہ یہ قول خوشگو تخت شاہی پر جلوہ آرا ہونے کے بعد فرخ سیر نے بیدل کی غائبانہ مزاج پرسی کی اور جب اسے اندازہ ہو گیا کہ بیدل ملاقات کے لئے دربار میں حاضری دینے سے پہلو تہی کر رہا ہے تو دو ہزار روپے نقد اور ایک زنجیر ہاتھی اس کو پیشکش کے طور پر بھیجا۔ روپیہ تو اسے مل گیا لیکن ہاتھی لانے کے لئے کوئی آدمی بیدل کا نہیں جاسکا اس لئے فرخ سیر کے نوکر اسے ہضم کر گئے۔ (۴۷۴)

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ باوجودیکہ بیدل نے دربار میں حاضری دینے سے اپنی بے نیازی کا اظہار کیا فرخ سیر اس کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آیا جبکہ جانے کتنے شہزادے، نواب اور دوسرے حضرات اس کے عتاب کے شکار ہو کر یا قید ہوئے یا جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کا بہت پہلے سے بیدل سے ارادت تھی اس لئے کچھ بعید نہیں شاد عظیم آبادی نے اس کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے درست ہوا اگرچہ کہیں سے اس کی توثیق نہیں ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”ان کے معاصر بادشاہ فرخ سیر نے ان کے اشعار کے انتخابات اپنے ہاتھ سے بیاض میں اور اکثر رقعوں اور احکام میں بطور ضرب الملل کے لکھے۔“ (۴۷۷)

شاید انہیں جذبات و تاثرات کی بنیاد پر بیدل نے اس کی تاجپوشی کی تقریب میں ایک مبالغہ آمیز قصیدہ کہا ہے جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

جہاندار زمن روزی کہ شد برق آفریں اقبال قیصر دست شست از زہرہ تا خاقان چیں زمانے کے بادشاہ کی تلوار جس دن بجلی کی طرح کوندی قیصر کا اقبال زہرہ سے لے کر خاقان تک رخصت ہو گیا۔

غنی کی پیش شوکتش پست است لاف سرکشان گر پشہ او دم زند بر کوہ بر بند طنین ایسا بادشاہ ہے کہ جس کی شان و شوکت کے سامنے بڑے بڑے سرکش سلاطین کی ساری ساری کوئی حقیقت نہیں ہے اگر اس کا مجھ بھی جھنجھنائے تو پہاڑ پر اپنی آواز کی چھاپ لگا دے۔

شش سپہر معدلت جودش محیط مکرمت ذاتش بقائے مملکت، نامش جہاں بخش نگیں اس کا عدل و انصاف سپہر معدلت ہے اس کا جود و کرم محیط مکرمت ہے۔ اس کی ذات سے ملک کی وابستہ ہے اس کا نام نکلیں کو دنیا بخشنے والا ہے۔

علاق اس شاہجہاں یکسو بہشت انشاء کن است حرنی ز خلقش یاد کن در زیر چتر گل نشیں اس بادشاہ کے اخلاق سراسر بہشت آفریں ہیں اس کے اخلاق کی بات یاد کرو اور اس کی ہمتی کے نیچے بیٹھو۔

غیر از خضوع بندگی باطل حق کفرست بس آہ از گلوں بختی کزو در سینہ دزد و دہوی کیس اس ”سایہ خدا“ کے سامنے بندگی سے جھکنے کے سوا اور کوئی راستہ اپنانا کفر ہے۔ وہ آدمی کتابدہ کیس ہے جو اس کی طرف سے سینے میں کینہ و عداوت رکھے۔

دست اقبال او گردن کشان نامور خفتند در خاک سیہ افتند در زیر زمیں اس کے اقبال کی دہشت سے نامور سلاطین بھی خاک سیاہ میں گر کر محو خواب ہو گئے۔

عمر گاہ کاف و نون از دور آدم تا کنون روشن نہ شد زین امتداد آئینہ فتح میںیں کاف و نون (کن) کی عرصہ گاہ (دنیا) میں آدم کے عہد سے لے کر آج تک اتنی طویل مدت نہ گزری آئینہ فتح میں روشن نہ ہوا۔

میں بی پا و سر و اماندہ عرض ہنر از افعال ناکسی در کنج دل حیرت مکیں میں بے سرو پا عرض ہنر سے تھکا ہوا اپنی ناکسی و نااہلی کی شرم سے گوشہ دل میں حیرت کا پتلا بنا ہوا تھا۔

آمد بہ تسلیم ادب بہر ثمار حضرتش  
تسلیم ادب کے طور پر ان کی بارگاہ میں نچھاور کرنے کے لئے درج ذیل شعر علم ازل سے چر  
عمدہ تاریخوں کو ساتھ لے کر آیا۔

نص شرف، شاہ زماں، نجم الہدیٰ فیض ملک  
کشور کشا، موسیٰ عصا، گیتی ستاں، جم تلمی  
(۱۱۲۳ھ) (۲۷۸)

قصیدہ اور صلہ میں سے کون سی چیز پہلے وجود میں آئی اس کی کوئی سند ہمارے پاس نہیں ہے اس  
لئے یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کیا محرمات تھیں جس نے بیدل کو اس قدر مبالغہ آمیز قصیدہ کہنے  
پر مجبور کیا۔ اشعار خصوصاً خط کشیدہ اشعار اس کے درج ذیل دعویٰ سے بھی کوئی ربط نہیں رکھتے ہیں۔

بیدل ما را ہرزہ درائی شاں نیست مدح امیر و ستایش سلطان نیست  
زین است کلامیکہ زما می شنوی غیر از ایثار خدمت یاراں نیست (۲۷۹)  
بیدل بیہودہ گوئی ہماری شان نہیں ہے بادشاہ و امراء کی تعریف و ستائش ہمارا اصول نہیں ہے  
اسی وجہ سے میرا کلام جو تم سنتے ہو دوستوں کی خدمت میں ایثار کے سوا کچھ نہیں ہے۔

فرخ سیر کی مدت سلطنت لگ بھگ سات سال ہے۔ اس عرصہ میں بیدل نے مختلف مناسبتوں  
سے جو تاریخی مبارکباد دی اور قطعے کہے ہیں ان میں ایک مبارکباد نامہ وہ ہے جو راجہ اجیت سنگھ کی لڑکی  
سے اس کی شادی کی تقریب پر اس نے کہا تھا اس کے چند اشعار جو مبالغہ آمیز تعریف پر مشتمل ہیں  
درج ذیل ہیں:

شہ فرخ سیر خورشید تحقیق جہاں معدلت معراج آداب  
خورشید صفت فرخ سیر بادشاہ جو سراپا جہاں عدل و انصاف اور روح ادب ہے۔  
فلک قدری باقبالش مسلم شہنشاہی بذات او شرفیاب  
اس کے اقبال کی بدولت آسمان کا پایہ بلند مسلم ہے اور اس کی ذات سے شاہنشاہی کو شرف و  
بزرگی حاصل ہے۔

بعقد آورد مکنوں گوہری را کہ شد از رشک آں مہ بر فلک آب (۲۸۰)  
ایک ایسے پوشیدہ موتی کو اس نے اپنے رشتہ میں پرویا (شادی کی) کہ جس کے رشک سے  
چاند بھی آسمان پر پانی پانی ہو گیا ہے۔

۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۸ء میں سادات بارہہ نے اسے تخت سے اتار کر پہلے قید کیا پھر مار ڈالا۔ اس  
مناسبت سے بیدل نے ایک رباعی کہی جو اس کے حزن و غم کی ترجمان ہے۔

کہ چہ با شاہ گرامی کردند صد جور و جفا از رہ خامی کردند  
چو از خرد بختسم فرمود سادات بوی نمک حرامی کردند (۲۸۱)  
سادات نے شاہ گرامی قدر پر جو مظالم ڈھائے تم نے اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کیا، عقل  
بے باب اس کی تاریخ کا طلب گار ہوا تو اس نے کہا: سادات نے اس کے ساتھ نمک حرامی کی۔

یہاں توجہ طلب امر یہ ہے کہ بیدل کے فرخ سیر کی بہ نسبت سادات سے زیادہ اچھے روابط  
تھے۔ یہی اس نے سادات کے کردار پر تنقید کی اس لئے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ فرخ سیر کے ساتھ  
وہ روابط زیادہ خلصانہ تھے۔



ان بیانات سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ بیدل کا اپنے عہد کے امراء اور افسران بالا سے تعلق کی زندگی کا ایک اہم باب ہے۔

### عاقل خاں رازی:

رقعات کا یہ غور مطالعہ واضح کرتا ہے کہ بیدل کا سابقہ سب سے پہلے نواب عاقل خاں رازی سے تھا۔ جیسا کہ حالات کے ضمن میں گذرا۔ رازی کا تعلق خراسان کے سادات اخواف سے تھا۔ بیدل کا جن دنوں دکن کے صوبہ دار کی حیثیت سے وہاں قیام تھا، رازی بخشی دوم کے عہدے پر تھے۔ اس کے ہمراہ تھا اور اس کے ہاتھوں بہت سے کارہائے نمایاں انجام پائے (۳۸۵) اس کے بعد کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۰۶۸ھ/۱۶۵۳ء حارس قلعہ دولت آباد

۱۰۶۹ھ/۱۶۵۸ء شاہزادہ معظم کے رکاب میں

۱۰۷۲ھ/۱۶۶۱ء عہدے سے سبکدوشی کی درخواست اور ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ کی تعیین

۱۰۷۴ھ/۱۶۶۳ء دہلی میں غسٹخانہ کے داروغہ

۱۰۷۷ھ/۱۶۶۶ء منصب دو ہزاری پانچ سو سات ہزاری کے عہدے پر فائز

۱۰۷۸ھ/۱۶۶۷ء داروغہ ڈاک چوکی

۱۰۷۹ھ/۱۶۶۸ء سبکدوشی

۱۰۸۶ھ/۱۶۷۵ء سبکدوشی کے عالم میں وظیفہ دو ہزار روپیہ سالانہ

۱۰۹۰ھ/۱۶۷۹ء خشکییری تن

۱۰۹۱ھ/۱۶۸۰ء ناظم صوبہ دار الخلافہ دہلی

۱۱۰۸ھ/۱۶۹۶ء اوقات (۳۸۶)

بیدل کی نواب موصوف سے ملاقات کی تفصیل گزر چکی ہے یہاں صرف ملاقات کی نوعیت پر روشنی ڈالی جائے گی۔

رقعات میں نواب عاقل خاں کے نام بیدل کے نو خطوط ملتے ہیں۔ ان کے مضامین کے بغور سے معلوم ہوتا ہے بیدل کے ۱۰۷۶ء میں ان سے رابطہ قائم ہونے کے بعد جبکہ رازی دہلی میں غسٹخانہ کے عہدے پر فائز تھے۔ دونوں کے تعلقات آئے دن بہتر اور وسیع تر ہوتے گئے حتیٰ کہ ان کے تمام افراد تک اس کا دائرہ پھیل گیا۔ ان روابط کے کئی پہلو تھے ان میں معنوی اور ادبی

## نواب اور امراء

بیدل کے بعض نوابوں اور امیروں سے روابط عام دوستی کی سطح سے بہت اوپر اٹھ چکے تھے۔ معاصر و غیر معاصر تذکرہ نگاروں نے امراء کی بیدل سے ارادت و عقیدت کا تذکرہ کیا ہے علاوہ ان کے رقصات کی بڑی تعداد نوابوں کے نام ہے۔ اس کے دور آخر کے ایک تذکرہ نگار آزاد بلگرامی لکھتے ہیں ”چوں مرزا خود را از در اغنیاء کشید، حق تعالیٰ امراء عصر را بر آستان او فرستاد۔ از او آخر عہد خلد مکاں، تا اوائل جلوس فردوس آرامگاہ محمد شاہ ارکان ہر سلطنت بخدمت اومی رسیدند۔ و مراتب نیاز بہ تقدیم می رسانیدند۔“ (۳۸۲)

مرزا (بیدل) نے امراء اور رؤسا کے آستانے سے خود کو دور رکھا اس لئے خدائے تعالیٰ نے امراء عصر کو خود ان کے آستانے پر پہنچا دیا۔ خلد مکاں (اورنگ زیب) کے عہد کے اوائل سے لے کر فردوس آرامگاہ محمد شاہ کے جلوس کے اوائل تک ارکان سلطنت اس کی خدمت میں پہنچتے اور نیاز مندی کا اظہار کرتے رہے۔

بیدل کے ایک معاصر تذکرہ نگار سراج الدین علی خاں آرزو لکھتے ہیں:

”امراء و عمدہ ہر احق سبحانہ تعالیٰ بر در او فرستاد۔“

خدائے تعالیٰ نے امراء اور اعلیٰ افسران کو اس کے آستانے پر پہنچا دیا بیدل کا ایک شاگرد بندر ابن داس خوشگو لکھتا ہے:

”نواب قطب الملک سید عبداللہ خاں بارہہ وزیر اعظم بادشاہ و نواب نظام الملک آصف جاہ

کہ وکیل مطلق بود از دوستان ایشان است ..... و دیگر اکثر خورد و بزرگ شہر سرشام

بخدمت می رفتند و انواع فیضہا می داشتند۔“ (۳۸۳)

بادشاہ کے وزیر اعظم قطب الملک نواب سید عبداللہ خاں بارہہ اور نواب نظام الملک آصف جاہ جو ہندوستان کے وکیل مطلق ہیں ان کے احباب کے زمرے میں داخل ہیں۔ ان کے علاوہ شہر کے دیگر چھوٹے بڑے حضرات بھی سرشام ان کی خدمت میں آتے اور طرح طرح کے فیوض و برکات حاصل کرتے ہیں۔

پہلو سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

۱۰۷۸ء میں اپنی پہلی مثنوی ”محیط اعظم“ ان کی خدمت میں پیش کیا اس کے بعد اپنی دوسری مثنویاں ”طلسم حیرت“ جسے ۱۰۸۰ء میں لکھی اور ”طور معرفت“ جسے لگ بھگ ۱۰۹۹ء میں لکھی۔ ہدیے کے طور پر بھیجیں۔ اس سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ دونوں کے درمیان ادبی مسائل پر تبادلہ خیال کا سلسلہ جاری تھا۔ رازی جو شاعرانہ ذوق رکھنے کے علاوہ تنقیدی شعور کا بھی حامل تھا بیدل کے بہترین ناقد تھا اس بنا پر بیدل کی ادبی شاہکار کی تخلیق اور اس کی حوصلہ افزائی میں اس نے اہم کردار کیا ہے خوشگو لکھتا ہے:

”ہر گاہ شعر میرزا احسن و تحسین فرمود، مرزا بری خاست و تسلیم بجای آورد۔“ (۳۸۷)

جب کبھی وہ بیدل کے کلام کی داد دیتا مرزا اٹھ کر تسلیم بجالاتا تھا۔ خوشگو مزید لکھتا ہے: ”تسلیم بجالانے سے بیدل کا مقصد رازی کے روحانی مقام و مرتبے کا احترام دکھانا تھا۔ خوشگو کا مزہ تو یہ ہے کہ بیدل نے تصوف سے متعلق جن افکار و خیالات کا اظہار اپنے کلام میں کیا ہے وہ درحقیقت خاں رازی کی صحبت سے استفادے کا نتیجہ تھے (۳۸۸)۔ یہ بیان نہ صرف مبالغہ آرائی پر مبنی ہے بلکہ خلاف واقعہ بھی ہے کیونکہ بیدل کے تفصیلی حالات بتاتے ہیں کہ تصوف کا سارا مصلحہ اس نے روحانی اساتذہ کی خدمت میں اور صوفیا کی کتابوں کے مطالعہ سے حاصل کیا تھا چنانچہ خود کو ان ”خویش نگاہ حضرات“ کا ممنون اور مرہون قرار دیتا ہے۔

عاقل خاں رازی سے بیدل کے تعلقات کی نوعیت کے بارے میں بیدل کے رقعہ اور قطعات سے دو اہم نکتے سامنے آتے ہیں اول یہ کہ بیدل بڑی حد تک ان کے ناقدانہ شعور و شاعرانہ ذوق کا قائل تھا۔ اس نے طلسم حیرت کا ایک نسخہ اسے پیش کیا تھا۔ رازی نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے تحسین آمیز کلمات لکھے۔ بیدل نے شکریہ کے ایک خط میں جواب لکھا:

”فیض اندوز معنی کہ طبع تجلی شہود بہ پسند و سعادت عنوان کلامی کہ بہ تحسین زبان حق

ترجمان پیوند۔“ (۳۸۹)

وہ ”معنی“ فیض اندوز ہے جس کو چنا بعلی کی طبع تجلی شہود پسند کرے اور وہ کلام سعادت عنوان ہے جس کی جناب عالی کی زبان حق ترجمان تحسین کرے۔

اسی طرح محیط اعظم بھیجے وقت ایک خط میں لکھتا ہے:

”حصول سعادت این اشعار موقوف و رود و لیتی است کہ بہ منظور مطالعہ تو اندر گردانید و عروج

رتبہ ایں افکار و ابستہ زماں سعادت کی کہ بقول اصفا تو اندر رسانید۔“ (۳۹۰)

ان اشعار کی سعادت کا حصول اس دولت (خط) کی آمد پر موقوف ہے جو مطالعہ کے بعد سبائے اور ان افکار کا عروج مرتبہ اس زمانہ سعادت سے وابستہ ہے جب اس پر توجہ فرمائی جائے۔

اور ”طور معرفت“ کو پیش کرتے ہوئے کہتا ہے:

”آگر در جناب غلہ انتساب بقبول برگ سبزی پیر زو گلدستہ آرای یک عالم فرق افتخار است

و اگر بہ آبیاری نگاہ مرحمت ریشہ داری قابل نمود گرد و طوبی اعتبار۔“ (۳۹۱)

اگر غلہ انتساب نواب کی بارگاہ میں یہ حقیر تحفہ قبول کئے جانے کا اہل ہے تو ایک جہاں فرق کے لئے وہ گلدستہ آرا ثابت ہوگا اور اگر نگاہ مرحمت کی آبیاری سے ریشے کی طرح قابل نمائش ہوتا ہے تو جیسی عزت و اعتبار کا حامل ہوگا۔

گویا رازی کا شاعرانہ ذوق بیدل کے نزدیک کسی ادب پارہ کی خوبی و خامی کی پرکھ کا معیار تھا۔ نور الحسن انصاری مرحوم رازی کے ذوق سلیم کے بابت لکھتے ہیں:

”ان بھاری مصروفیات کے باوجود رازی نے نظم و نثر میں جو ممتاز تصانیف چھوڑی ہیں اس

سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شعر و ادب سے انہیں والہانہ وابستگی تھی۔ تصوف کے رموز پر بھی ان

کی گہری نظر تھی ان کا شمار مثنوی معنوی کے بہترین مفسروں میں ہوتا تھا۔“ (۳۹۲)

ایک غزل میں بھی عاقل خاں رازی کی تصوف سے دلچسپی اور خصوصیت سے مثنوی کی شرح کی پراسے صاحب اسرار توحید سے خطاب کیا ہے۔

عید مردم گو برو عید من اکنون میرسد  
بہ شوی شب کہ خورشید من اکنون میرسد

دستگاہ عیش جاوید من اکنون میرسد  
بد از نیم بید ماغ یاس نتوان زیستن

نوںہال باغ امید من اکنون میرسد  
مردم در سایہ اش بنشینم و ساغر کشم

جام می در دست جمشید من اکنون میرسد  
آرد خواہد کلاہ ناز بر گردون گلند

”صاحب اسرار توحید“ من اکنون میرسد  
مغ خواہد گشت (بیدل) شبہ وہم دوئی

علاوہ ازیں بیدل نے اپنے قطعوں میں خاں موصوف کو ”حضرت انسان“ ”قدوہ انسان“

”میر گاہ صاحب عرفان“ اور ”پیوندن سخن سخاں“ وغیرہ خطاب و القاب سے یاد کیا ہے جو ان کے انسانی

ادبی مقام و مرتبے کو واضح کرتے ہیں۔

اے بغفلت خفنگاں نور نظر سامان کئید  
حق شناسی را چراغ دیدہ ایماں کئید

اے غفلت کی نیند میں مدہوش لوگو! نور نظر کا سامان پیدا کرو اور حق شناسی کو دیدہ ایماں کا

پیش نماز۔



طواف خانہ گر مقصود صاحب خانہ نیست سر بدیواری زبید و کعبہ ہا ویراں کعبہ  
گھر کے طواف سے مقصد اگر صاحب خانہ نہیں ہے تو سردیوار سے ٹکراؤ اور کعبہ کو ویراں کر دو۔  
مدعا نیست کہ اے بیدار نشان جہل کیش دیدہ بکشاید و طوف حضرت انسان کعبہ  
ارے نا سمجھ مقصد یہ ہے کہ آنکھیں کھولو اور ”حضرت انسان“ کا طواف کرو۔  
فاش تر گوئیم اگر توفیق بخشید یاوری سجدہ ای نذر جناب فیض عاقل خاں کعبہ  
میں اور واضح الفاظ میں کہہ رہا ہوں کہ اگر خدا توفیق دے تو ایک سجدہ جناب فیض مآب عاقل  
خان کی نذر کرو۔

خاک آں درگاہ اکسیر بہار دیگر است جسم اگر افسردہ است آنجا برید و جاں کعبہ  
اس درگاہ کی خاک بھی دوسری بہار کے لئے اکسیر ہے، جسم اگر افسردہ ہو جائے تو وہاں جاں  
اسے تازہ کرو۔

ہستم صرف دعای دولت جاوید اوست ای ملا یک برمن از آئین کنوں احسان کعبہ  
میری ہمت اس کی اقبال جاوید کی دعائیں مصروف ہے اے فرشتو! آئین کہہ کر مجھ پر احسان کرو۔  
ان اشعار میں بیدل نے شاید عاقل خاں رازی کے مخالفوں کو خطاب کیا ہے۔ نور انصاری  
انصاری مآثر عالمگیری ص ۱۹۵ اور بدیع بیضا ص ۱۰۳ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”سرخوش کے ایک ہجو یہ قطعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۹۸-۱۰۹ھ / ۸۷-۱۶۸۵ء میں  
انہیں اضافہ ہزاری ملا تھا۔“ (۳۹۳)

اس لئے قیاس کیا جاتا ہے کہ سرخوش رازی کے ہجو گوئیوں میں تھا اور بیدل کا روئے سخن اس کی  
اور اس کے ہم مسلکوں کی طرف ہو سکتا ہے۔ خوشگو لکھتا ہے:

”خود را یکی از اغوات و اقظاب زمانہ می دانست۔“ (۳۹۵)

رازی خود کو اپنے زمانے کا غوث اور قطب سمجھتا تھا۔ یہ بیان بھی اسی قسم کے رجحان طبع کی  
نشاندہی کرتا ہے۔ بیدل نے اپنے تمام تر زور قلم سے رازی کا دفاع کیا ہے۔ عاقل خاں کے نام ایک  
خط میں لکھتا ہے کہ آپ کی انسان دوستی اور مردم نوازی کی بنا پر آپ سے درخواست ہے کہ شیخ  
علاؤ الدین متوکل نام کے ایک شخص کی فریادری کریں جو کنارہ گیری کے باوجود ناسازگار حالات سے  
دوچار ہے:

”وسعت آغوشی در ہای رحمت جرأت آموز قطرہ بیدست و پامی گردد کہ شیخ علاؤ الدین  
متوکل بعلمت بی انصافی شرکا، باوجود حق انزوا، مصدر رعب و تشویش کلی است۔ اگر حسب الامر

منوبی از آستان معدلت آشیای، با اطلاع احوال موسی الیہ، فاروق حق و باطل گردد،

و مراحمیکہ سایہ یکن مفارق غرباست بعید غواہد بود۔“ (۳۹۶)

رحمت کے دروں کی کشادہ آغوشی بیدست و پا قطرہ کے لئے جرأت آموز ہے کہ شیخ علاؤ الدین  
بے انصافی کے سبب گوشہ گیری کی ریاضت کے باوجود مکمل طور پر مشقتوں سے گھرا ہوا  
حسب حکم آستانہ معدلت آشیای سے تعلق رکھنے والا کوئی مخلص موصوف کے حالات کی اطلاع  
بلاں میں فرق کر دے تو ان مراحم سے جو غرباء کی پیشانیوں پر سایہ یکن ہو بعید نہ ہوگا۔

ان باتوں کے علاوہ ان کے تعلقات کا ایک سماجی اور حمایتی پہلو بھی تھا۔ ایک خط میں بیدل  
نے کی سرپرستی کا تذکرہ اس طرح کیا ہے:

”پرتو آثار ربوبیت، دامن التفات بہ کیفیت معطوف ندارد کہ جز وضع عبودیت از غفلت حق

گذاری می توان برآمد۔“ (۳۹۷)

آثار پرورش کا پرتو دامن التفات کو ایسی کیفیت کی طرف متوجہ نہیں کرتا ہے کہ شیوہ بندگی کے  
طریقہ سے حق گذاری کی شرم سے عہدہ برآ ہو سکتا۔

۱۰۷۹ھ / ۱۶۹۸ عیسوی میں رازی نے ملازمت سے کنارہ کشی کر لی ۱۰۸۶ھ ۱۶۷۵ء تک یہی  
حالت رہی۔ کنارہ کشی کے دوران بارہ ہزار روپیہ سالانہ انکا وظیفہ مقرر ہوا۔ ایک دوسرے خط میں  
رازی لکھتا ہے ”از طلب سواری و عذر انزوا بعاقل خاں“ بیدل نے ایک رباعی کے ذریعہ یہ واضح  
کیا ہے کہ گوشہ نشینی اگر خدائے تعالیٰ کی طرف زیادہ انہماک کی وجہ سے ہے تو سمجھنا چاہئے کہ عقلمند خواہ  
مست ہو خواہ جلوت میں حق سبحانہ تعالیٰ کی ذات کی طرف ہر حال میں متوجہ رہتا ہے اور اس سے  
بے خبر نہیں رہتا ہے۔

تہمت کین غفلت نمی شود یعنی در بزم محو خلوت نمی شود  
نی خواہی نظر ز عالم بستن کثرت بہ تکلف تو وحدت نمی شود (۳۹۸)  
عقل آدمی پر کبھی بھی غفلت کے گھات میں بیٹھنے کا الزام نہیں لگتا ہے۔ یعنی بزم میں محو خلوت  
ہوتا ہے۔ دنیا سے کب تک آنکھیں بند رکھنی چاہتے ہو کثرت تیرے تکلف سے وحدت نہیں بن  
سکتی۔

دوسرے خطوط میں عاقل خاں رازی کے داماد شکر اللہ خاں کے ذوق طبع اور اخلاق حمیدہ کا  
تذکرہ ہے۔ (۳۹۹)

۱۱۰۹ھ ۱۶۹۶ء میں رازی نے دنیا سے کوچ کیا۔ اس کی وفات حسرت آیات کی مناسبت سے

بیدل نے ایک مرثیہ کہا جس میں اس نے اپنے غم انگیز جذبات کا جس طرح اظہار کیا ہے اس کے تعلقات کی نوعیت پر روشنی پڑتی ہے۔

وای پیوند سخن سنجان نماند  
تکیہ گاہ صاحب عرفان نماند  
ہائے افسوس سخن نچوں کا سر پرست اور صوفیوں کی تکیہ گاہ نہ رہا۔

رفت از آفاق لطف عدل و داد  
برکت دین، قدوۃ انسان نماند  
دنیا سے عدل و انصاف کا لطف جاتا رہا دین کی برکت اور انسان کا پیشوا رخصت ہو گیا۔  
قطب اقطاب حقایق بار بست  
ساکلی در کشور امکاں نماند  
حقائق کا قطب الاقطاب یوریا بستر باندھ کر راہی عدم ہوا کشور امکاں میں اب کوئی زندہ نہ رہا۔

مجمع استاد بی شیرازہ شد  
رابط اقلیم ہندوستان نماند  
استاد کا مجمع بکھر گیا ملک ہندوستان کو جوڑ کر رکھنے والا اب نہ رہا۔

ہادی انوار لطف از دیدہ رفت  
مہدی حجابہ عاقل خاں نماند (۵۰۰)  
انوار لطف کا ہادی آنکھ سے جاتا رہا۔ مہدی حجابہ عاقل خاں نہیں رہا۔ (۱۱۰۸ھ)

شکر اللہ خاں خاکسار:

نواب شکر اللہ متخلص بہ خاکسار کا تعلق سادات خوف سے تھا وہ عاقل خاں رازی کا داماد تھا۔  
قول شیر خاں لودی، نواب موصوف بہت سے ظاہری اور معنوی کمالات کے حامل تھے۔ ”گاہ حق میں گوش حق نیوش، خاطر حقیقت ز اور سینہ معرفت خیز“ ان کی چند نمایاں خصوصیات ہیں۔ ان کی تہذیب میں ایک شرح مثنوی مولانا روم ہے جس میں بہت سے عارفانہ نکات کو انہوں نے ایسے انداز میں بیان کیا ہے جو عام سمجھ سے باہر ہیں۔ خاکسار شاعرانہ ذوق کے بھی حامل تھے۔ ان کا کلام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی شاعری کا انداز نہایت شیریں اور دلکش ہے۔ (۵۰۱)

بقول ڈاکٹر نور الحسن انصاری خاکسار کے غیر مرتب کلام کا ایک مجموعہ باکلی پور پنڈت لالہ بھیر سنگھ محفوظ ہے۔ اس کا بڑا حصہ غزلیات پر مشتمل ہے جس میں تین چھوٹی چھوٹی مثنویاں بھی شامل ہیں۔ صاحب مخزن الغرائب کے مطابق بے لطف ہیں۔ ڈاکٹر انصاری مزید لکھتے ہیں۔

خاکسار ایک جامع شخصیت کے مالک تھے ان کا ذوق تصوف بہت رچا ہوا تھا جیسا کہ شرح مثنوی سے معلوم ہوتا ہے، نقد ادب کا ان میں غیر معمولی ملکہ تھا۔ ناصر علی کی شاعری کے بارے

”فرق در حسن معنی و خوبی سخن کردن بسیار مشکل است و باز خوبی سخن را بر حسن معنی ترجیح دادند خیلی قوای متمیزہ می خواہد۔ حسن معنی از خوبی سخن است و خوبی سخن از حسن معنی۔ خوبی سخن کہ عبارت از عبارات شیریں و الفاظ رنگین و استعارات نمکیں و اشارہ خوش آئیں باشد ایں ہمہ از حسن معنی است زیرا کہ بہ ضبط کلام و تناسب الفاظ و استعارہ و اشارہ بہ اعتبار معنی می باشد نہ باعتبار الفاظ محض بقصد ازین عبارات ایں خواہد بود کہ مطالب اعلیٰ اگر بہ الفاظ نامناسب بیان شود لفظی ندارد۔ پس دریں صورت ظہور ایں معنی نقصان شد کہ چنانچہ شاید بہ اظہار نرسد۔ اگر معنی عالی بہ الفاظ زبوں بہ معرض بیان آید اور احسن معنی نمی توان گفت۔ چہ حسن خاصہ صورت است و صورت معنی الفاظ است۔ ہر گاہ لفظ زبوں باشد اطلاق حسن براو چہ طور درست آید؟ ہمیں قسم اگر الفاظ خوب بہ مطلب سہل مشتمل گردد خوبی سخن نتوان نام کر“ (۵۰۳)

”حسن معنی“ اور ”خوبی سخن“ میں امتیاز کرنا بہت مشکل کام ہے، پھر خوبی سخن کو حسن معنی پر ترجیح دینا غیر معمولی صلاحیت کا تقاضا کرتا ہے۔ حسن معنی سخن کی خوبی سے ہے اور خوبی سخن حسن معنی سے۔ لہٰذا نام ہے عبارات شیریں، الفاظ رنگین، استعارات نمکیں اور اشارہ خوش آئیں کا۔ یہ حسن معنی کی خصوصیات ہے اس لئے کہ ضبط کلام۔ مناسب الفاظ و استعارے و اشارہ کے استعمال کے اعتبار سے ہی ہے نہ کہ محض الفاظ کے اعتبار سے۔ اس پوری بحث کا مقصد یہ ہے کہ اعلیٰ مضامین اگر نامناسب الفاظ میں ادا ہوں تو ان میں کوئی لطف پیدا نہیں ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں معنی کے ظہور میں یہ کمی کہ جس طرح چاہئے اس طرح اس کا اظہار نہیں ہوا۔ بلند معانی اگر پست الفاظ میں ادا ہوں تو اسے حسن معنی نہیں کہا جاسکتا کیونکہ حسن شکل و صورت کی خصوصیت اور معنی کی صورت ”الفاظ“ ہیں لفظ اگر بہت ہوگا تو اس پر حسن کا اطلاق کیونکر درست ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اگر اچھے الفاظ میں آسان مطلب کو بیان کیا گیا تو اسے خوبی سخن کا نام نہیں دیا جاسکتا ہے۔

اس طویل اقتباس کو نقل کرنے سے مقصد یہ ہے کہ بیدل کے شکر اللہ خاں کے ساتھ تعلقات کے رتبے پہلو پر بحث کے دوران اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔

شکر اللہ خاں بہ قول غلام علی آزاد بلگرامی اور نگ زیب کے دربار میں سہرند (سرہند موجودہ)، پور اور میوات کے صوبہ دار کے عہدے پر فائز تھے۔ (۵۰۳) مآثر عالمگیری سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مختلف سالوں میں مختلف مقامات پر فوجدار کے عہدے پر فائز تھے۔

۱۰۹۰ء/۱۶۷۹ء میں فوجدار سرہند

۱۰۹۲ء/۱۶۸۱ء فوجدار شاہجہاں آباد

۱۰۹۴ء/۱۶۸۳ء فوجدار سکند آباد

۱۰۹۸ء/۱۶۸۶ء فوجدار نواحی جہان آباد (۵۰۵)

نواب موصوف کے نام اپنے کئی خطوط میں بیدل نے سہارنپور کا تذکرہ کیا ہے۔ (۵۰۶) لئے یقین ہے کہ شکر اللہ خاں سہرند سے پہلے سہارنپور میں مامور تھے اور یہ تقرری ۱۰۸۵ء کے ۱۰۹۰ء سے پہلے رہی ہے۔ بیدل کے تفصیلی حالات کے ضمن میں دونوں کے درمیان تعلقات اور نوعیت پر بحث ہو چکی ہے۔

نواب موصوف سے بیدل کی دوستی انتہائی خلوص پر مبنی تھی بلکہ یہ کہنا بے جانا ہوگا کہ بیدل کی کسی اور سے نہیں تھی۔ آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

”سیرانواب شکر اللہ خاں کہ خود با جمیع اہل بیت محو اعتقاد مرزا بود نیز او مخلص خاص اس خاندان است۔“ (۵۰۷)

خصوصاً نواب شکر اللہ خاں اپنے تمام گھرانے کے ساتھ مرزا سے کامل رادت رکھتے تھے اور بیدل بھی اس خاندان کا مخلص خاص تھا۔ عبدالوہاب افتخار لکھتے ہیں:

”خصوصاً نواب شکر اللہ خاں و شاہ خاں مخلص دل معتقد مرزا بودند۔“ (۵۰۸)

خصوصیت سے نواب شکر اللہ خاں اور شاہ خاں خلوص دل سے مرزا کے ارادتمندوں میں تھے۔ خطوط کی روشنی میں نواب موصوف سے بیدل کا تعلق ایسا گہرا لگتا ہے کہ دونوں کی سوانح میں ایک دوسرے سے چولی دامن کا ساتھ رکھتی ہے۔ جیسے دونوں دولا زم ملزوم ہیر و کی طرح دارالحفاظہ کے ادبی اسٹیج پر سرگرم عمل ہوں۔

ان کے روابط دوستی کی حد سے بڑھ کر اس نقطے تک پہنچ چکے تھے کہ بیدل کو نواب موصوف کے خاندان کا ایک فرد تصور کرنا چاہئے۔ یہ روابط مختلف قسم کے سماجی، اخلاقی، ادبی، فکری، نفسیاتی اور خاندانی پہلوؤں کو شامل ہیں، ان میں ہر ایک ایک دوسرے کے شاعرانہ ذوق اور تنقیدی صلاحیتوں سے آزادانہ استفادہ کرتا نظر آتا ہے۔ اسی کے ساتھ دونوں ایک دوسرے کو احترام و عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان وجوہ سے ان کے روابط پر تفصیلی روشنی ڈالنی ضروری ہے۔

رقعات بیدل مطبوعہ نو لکھنؤ میں ۲۷۹ خطوط اور مطبوعہ کابل میں ۲۸۹ خطوط ہیں ان کے

تالیف محمد امین میں ۱۱ خطوط ہیں اور دو خطوط صحائف شریف میں ہیں۔ اس طرح کل خطوط کی ۳۰۶ ہو جاتی ہے۔ ان میں ۳۳ خطوط صرف شکر اللہ خاں کے نام ہیں لیکن شکر اللہ خاں بھی اول نواب شکر اللہ خاں خاکسار۔ دوم ان کے بڑے لڑکے نواب شکر اللہ خاں ثانی ہیں جن کو ۱۶۹۱ء میں باپ کے انتقال کے بعد باپ کا خطاب ملا (۵۰۹)۔ بیدل نے اپنے بعض خطوط میں شکر اللہ خاں کے استعمال کر کے اس کو شکر اللہ خاں اول (باپ) سے الگ کر دیا ہے (۵۱۰) لیکن خطوط کی بڑی اس فرق کی رعایت نہیں رکھی گئی ہے۔ ان میں تفریق کرنے کا واحد ذریعہ خطوط کے مضامین ہیں۔ معیار پر صرف بیس خطوط شکر اللہ خاں ثانی کے نام نظر آتے ہیں اور باقی ایک سو سولہ (۱۱۶) شکر اللہ خاں اول کے نام ہیں۔ غلام حسن مجددی ڈاکٹر عبدالغنی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”رقعات کی بڑی تعداد نواب شکر اللہ خاں اور ان کے لڑکوں کے نام ہیں۔ ۹۳ خطوط شکر اللہ خاں کے نام ہیں ۴۸، ان کے بیٹے میر عنایت اللہ خاں شاہ خاں، ۳۶ خطوط ان کے بڑے لڑکے میر لطف اللہ خاں شکر اللہ خاں ثانی کے نام ہیں، لیکن راقم السطور کے خیال میں ان کا دعویٰ اشتباہ سے خالی نہیں ہے۔ (۵۱۱)

بہر حال ان خطوط کی بڑی تعداد کا شکر اللہ خاں اول کے نام ہونا دونوں کے گہرے مخلصانہ تعلق کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ خطوط مختلف مضامین پر مشتمل ہیں اور دونوں کے ہمہ جہتی تعلقات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ راقم السطور نے ان کی اس طرح دستہ بندی کی ہے۔

۱۔ خطوط ملاقات کے اشتیاق سے وابستہ، ۱۹ خطوط مختلف مناسبتوں سے مبارک باد بھیجنے سے وابستہ، ۵ خطوط مختلف تسلی و تعزیت سے وابستہ، ۱۱ خطوط مختلف ہدایا اور تحائف سے وابستہ، ۶ خطوط معذرت سے وابستہ، ۴ خطوط جنگ سے وابستہ، ۱۰ خطوط دعائے صحت و سلامتی سے وابستہ، ۱۰ امور اور حالات سے وابستہ، ۱۳ احسان کی شکر گزاری سے وابستہ، ۷ شکر اللہ خاں کے شاعرانہ کلام کے تحسین سے وابستہ، ۶ خطوط مخلصانہ روابط سے وابستہ، ۱۳ خطوط شعر و شاعری اور شاعری سے وابستہ، ۶ خطوط خمد اپنے حالات سے وابستہ۔

بعض خطوط کئی مضامین پر مشتمل ہیں۔ ان خطوط کی روشنی میں ان کے روابط کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

ادبی اور اخلاقی پہلو:

۱۰۸۰ء میں ۱۶۶۹ء کے آس پاس نواب موصوف سے بیدل کا تعلق قائم ہونے کے بعد ان کی

ہا ہی دوستی روز بروز ترقی کرتی گئی۔ نواب موصوف کے اخلاق حمیدہ سے بیدل اتنا متاثر ہوا کہ

کے اور عاقل خاں رازی کے نام اپنے متعدد خطوط میں اس کا اعتراف کیا ہے۔ ماقبل میں لکھتا ہے۔  
نام ایک خط میں لکھتا ہے۔  
”عاجز نواز! یہ یمن عاطفیکہ ہمہ جاشامل حال فقر است، توجہ خان صاحب اخلاص صاحب  
مقناطیس دل شکر منزل گردید ورشتہ الفت بی اختیاری بر طبیعت وحشی پیچید۔“ (۵۱۲)  
عاجز نواز! ان مہربانیوں اور عنایتوں کی برکت سے جو ہر جگہ فقراء کے حال پر دل چڑھتا  
خان صاحب اخلاص مناقب کی مخصوص توجہ دل شکر منزل کے لئے مقناطیس ثابت ہوئی کہ خدا  
دھاگے نے طبیعت وحشت نصیب کو بے اختیار اپنے سلک میں پر لیا۔  
ایک دوسرے خط میں جو شکر اللہ خاں کے نام ہے، لکھتا ہے:  
”اگر بقدر شکر احسان زباں کشاید بستن لب صرفہ نموشی نمی بیند۔“ (۵۱۳)  
آپ کے احسانات کے بقدر اگر شکر گزاری کے لئے لب کشائی کریں تو لب کشائی کرنا  
کا کوئی فائدہ نظر نہیں آئے گا۔  
ایک دوسرے خط میں لکھتا ہے:  
عمری بفنون نظم مائل گشتم چندی با نثر نیز  
دیم کرم تو سخت بی پایاں است عاری ماندم ز شکر و بیاد  
ایک مدت تک اصناف شاعری میں طبع آزمائی کرتا رہا کچھ دنوں نثر نگاری میں مگھل  
رہا۔ جب دیکھا کہ تیری عنایتوں کی کوئی حد نہیں ہے تو شکر گزاری سے عاجز ہو کر بیدل  
شکر اللہ خاں کے بیٹے عنایت اللہ خاں کے نام ایک خط میں لکھتا ہے:  
”مہربانیہای خان صاحب الطاف مناصب از عالم تقریر بیرون است۔“ (۵۱۵)  
جناب خان صاحب الطاف مناصب کی مہربانیاں بیان سے باہر ہیں۔  
نواب موصوف سے اپنے غیر معمولی تعلق کا تذکرہ ایک خط میں اس طرح کرتا ہے  
ما را زخیال تو جدائی چه خیال است آئینہ ما ذره خورشید مجمل  
در آب و گہر فاصلہ جز نام نہ باشد از عالم نزدیکی و دوری چه سال است  
آپ سے جدائی تو دور رہی، جدائی کا خیال بھی ہمارے صفحہ ذہن پر نہیں آتا۔ سال  
دل کے لئے آپ کی حیثیت ذرہ اور خورشید کی سی ہے (جس طرح خورشید کی چمک سے  
ہے اسی طرح آپ کے دم سے میرا وجود ہے)۔ آب و گہر میں صرف نام کا فرق ہے نہ

بذل مجیدہ ام چون اشک گراز دیدہ ہا اتم  
دو عالم آستان تست اگر رستم کجا رستم (۵۱۷)  
تیری جگہ میرے دل میں ہے، وہ خلوت ہے تو یہ جلوت۔ آنسوؤں  
میں تیرے سجدے کا شوق پیش پیش رہتا ہے تیرا آستانہ ہی دونوں جہاں ہے اگر  
یہ عالم شمس گشتا ہے:  
عاجز نواز! حوال بیدلان منظور جناب بی نیاز بست ہوا ی آں آشیان فیض نشان از  
عاجز نواز! حوال بیدلان منظور جناب بی نیاز بست ہوا ی آں آشیان فیض نشان از  
عاجز نواز! حوال بیدلان منظور جناب بی نیاز بست ہوا ی آں آشیان فیض نشان از  
عاجز نواز! حوال بیدلان منظور جناب بی نیاز بست ہوا ی آں آشیان فیض نشان از

یہ عالم شمس گشتا ہے:  
عاجز نواز! حوال بیدلان منظور جناب بی نیاز بست ہوا ی آں آشیان فیض نشان از  
عاجز نواز! حوال بیدلان منظور جناب بی نیاز بست ہوا ی آں آشیان فیض نشان از  
عاجز نواز! حوال بیدلان منظور جناب بی نیاز بست ہوا ی آں آشیان فیض نشان از  
عاجز نواز! حوال بیدلان منظور جناب بی نیاز بست ہوا ی آں آشیان فیض نشان از

ایں زمان باید ز قاصد نام او پرسیدہ سوخت (۵۱۹)  
اب گویا آب و گہر دا شمیم  
اپنے روابط کی نوعیت کو واضح کرتے ہوئے بیدل نے دو جگہ ”رابط آب“  
سے وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ وہ خود تو پانی ہے اور نواب موصوف موتی کے  
پانی میں ہوتا ہے لہذا نواب ہمیشہ اس کے دل کی گہرائی میں بسا ہوا ہے۔  
پانی کا نہ کہ بے محل نہ ہوگا کہ بیدل نے اپنی کلیات میں بہت سے قطعے نواب شکر اللہ  
خاں کے کرمات کے خیر مقدم میں کہے ہیں۔ ان قطعات سے مجموعی طور پر یہ تاثر پیدا ہوتا  
ہے کہ نواب شکر اللہ خاں ایک عرصہ کے بعد بیدل کی ملاقات کے لئے اس کے گھر آتا تو اس کی خوشی  
تو انسانی قلمی توانائی اور زور بیان نواب موصوف کی ستائش اور اس کے  
بعد اس کے صفحہ ذہن پر نہایت خوبصورت اور آبدار اشعار  
سے لبریز ہوتے ابھر کر صفحہ قرطاس کی زینت بنتے۔ اس بنا پر دعویٰ کیا  
جاسکتا ہے کہ نواب موصوف کے علاوہ کسی اور سے اس درجہ عشق و محبت اور تعلق و یگانگت کا

ظہار نہیں کیا۔ دوسری طرف یہ اشعار اس کی پیکر تراشی پر غیر معمولی قدرت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ بعض اشعار ملاحظہ ہوں۔

خاف صاحب من، قبله من، نظر من  
صد شکر کہ گل کرد بسامان کمالات  
خوش باش کہ انوار ازل گرم ظہور است  
عمریت چو آئینہ چمن ساز امیدم  
یارب کہ بعد نشہ اقبال ببالد

دریای کرم، جوش معارف  
درباغ وفا نخل سعادت  
از روی تو ای مہر جلی  
تا پرتو دیدار زند گل  
ای بال و پر بیدل بی بال

ای دل نفست صبح شد آہنگ ثنا کن  
امروز کہ آں ابر کرم از سفر آید  
ای جہبہ حیرت زدہ محو چہ خیالی  
افسوس کہ دل نیز ندارم من بیدل

ای غنچہ چمن کرد گلست  
از خولیش برون آ طرب نشو  
باکعبہ مقابل شدہ ای سجدہ  
تا گویش این جنس نثار کف

باز از دل بسوی دیدہ مای آئی  
می خرامی تو مہمن ناز تحیر دارم  
دیدہ تا دل ہمہ گلچین بہار آغوش  
کو مکان و چہ زمان کز تو توان یافت تہی

ای دل و دیدہ فدایت ز بای  
گوئی از بہر من بی سر و پای  
چشم بد دور عجب عقدہ کشائی  
ہمہ دم باہمہ کس در ہمہ جانی

شکوہ جلوہ ات جز در فضای دل نمی گنجد  
مروت صرف ایجاد کرم فیض خداداد  
تہی از سجدہ شوق سر موی نمی یابم

جہاں پر گردد از آئینہ تا خالی شد جہاں  
ادب تعمیر بنیادت، ضیا آہر بنیادت  
سرپا در چنین می غلطم از پادسرایت

بانی شاہ مرتضی مکر غلاہری شود..... یعنی طور تحریر فلانی در مراسلات شکر اللہ خاں و  
کارکنان کہ نسبت شاگردی دارند بی حتمی و دناہ فی نیست۔ فقرار ابا این ہمہ انکسار،  
قد جوہر فقر خفاختن است و آبروی اعتبار درویشی بجا کہ انداختن۔“ (۵۲۱)

شاہ مرتضی کی زبانی ہا یہ معلوم ہوا..... شکر اللہ خاں اور شاہ کر خان کے ساتھ مراسلات میں  
شاہ مرتضی نے اس کی توجیہ کرتے ہوئے جواب دیا کہ اول تو شکر اللہ خاں اسکا شاگرد نہیں ہے،  
میر نے میری سرپرستی کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے اسے شاگرد نہیں کہہ سکتے۔ دوم یہ کہ  
میر نے اسکا شاگرد ہونے کا انداز نامہ نگاری بیدل کی نسبت اس  
کے بویست کی نشاندہی کرتی ہیں۔ پھر خود بیدل کو نامہ نگاری کا کون سا انداز اپنانا چاہیے۔

میر نے اس کی توجیہ کرتے ہوئے جواب دیا کہ اول تو شکر اللہ خاں اسکا شاگرد نہیں ہے،  
میر نے میری سرپرستی کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے اسے شاگرد نہیں کہہ سکتے۔ دوم یہ کہ  
میر نے اسکا شاگرد ہونے کا انداز نامہ نگاری بیدل کی نسبت اس  
کے بویست کی نشاندہی کرتی ہیں۔ پھر خود بیدل کو نامہ نگاری کا کون سا انداز اپنانا چاہیے۔

میر نے اس کی توجیہ کرتے ہوئے جواب دیا کہ اول تو شکر اللہ خاں اسکا شاگرد نہیں ہے،  
میر نے میری سرپرستی کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے اسے شاگرد نہیں کہہ سکتے۔ دوم یہ کہ  
میر نے اسکا شاگرد ہونے کا انداز نامہ نگاری بیدل کی نسبت اس  
کے بویست کی نشاندہی کرتی ہیں۔ پھر خود بیدل کو نامہ نگاری کا کون سا انداز اپنانا چاہیے۔

میر نے اس کی توجیہ کرتے ہوئے جواب دیا کہ اول تو شکر اللہ خاں اسکا شاگرد نہیں ہے،  
میر نے میری سرپرستی کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے اسے شاگرد نہیں کہہ سکتے۔ دوم یہ کہ  
میر نے اسکا شاگرد ہونے کا انداز نامہ نگاری بیدل کی نسبت اس  
کے بویست کی نشاندہی کرتی ہیں۔ پھر خود بیدل کو نامہ نگاری کا کون سا انداز اپنانا چاہیے۔

میر نے اس کی توجیہ کرتے ہوئے جواب دیا کہ اول تو شکر اللہ خاں اسکا شاگرد نہیں ہے،  
میر نے میری سرپرستی کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے اسے شاگرد نہیں کہہ سکتے۔ دوم یہ کہ  
میر نے اسکا شاگرد ہونے کا انداز نامہ نگاری بیدل کی نسبت اس  
کے بویست کی نشاندہی کرتی ہیں۔ پھر خود بیدل کو نامہ نگاری کا کون سا انداز اپنانا چاہیے۔

میر نے اس کی توجیہ کرتے ہوئے جواب دیا کہ اول تو شکر اللہ خاں اسکا شاگرد نہیں ہے،  
میر نے میری سرپرستی کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے اسے شاگرد نہیں کہہ سکتے۔ دوم یہ کہ  
میر نے اسکا شاگرد ہونے کا انداز نامہ نگاری بیدل کی نسبت اس  
کے بویست کی نشاندہی کرتی ہیں۔ پھر خود بیدل کو نامہ نگاری کا کون سا انداز اپنانا چاہیے۔

میر نے اس کی توجیہ کرتے ہوئے جواب دیا کہ اول تو شکر اللہ خاں اسکا شاگرد نہیں ہے،  
میر نے میری سرپرستی کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے اسے شاگرد نہیں کہہ سکتے۔ دوم یہ کہ  
میر نے اسکا شاگرد ہونے کا انداز نامہ نگاری بیدل کی نسبت اس  
کے بویست کی نشاندہی کرتی ہیں۔ پھر خود بیدل کو نامہ نگاری کا کون سا انداز اپنانا چاہیے۔

میر نے اس کی توجیہ کرتے ہوئے جواب دیا کہ اول تو شکر اللہ خاں اسکا شاگرد نہیں ہے،  
میر نے میری سرپرستی کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے اسے شاگرد نہیں کہہ سکتے۔ دوم یہ کہ  
میر نے اسکا شاگرد ہونے کا انداز نامہ نگاری بیدل کی نسبت اس  
کے بویست کی نشاندہی کرتی ہیں۔ پھر خود بیدل کو نامہ نگاری کا کون سا انداز اپنانا چاہیے۔

میر نے اس کی توجیہ کرتے ہوئے جواب دیا کہ اول تو شکر اللہ خاں اسکا شاگرد نہیں ہے،  
میر نے میری سرپرستی کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے اسے شاگرد نہیں کہہ سکتے۔ دوم یہ کہ  
میر نے اسکا شاگرد ہونے کا انداز نامہ نگاری بیدل کی نسبت اس  
کے بویست کی نشاندہی کرتی ہیں۔ پھر خود بیدل کو نامہ نگاری کا کون سا انداز اپنانا چاہیے۔

اس میں شک نہیں کہ بیدل مدح و ستائش میں کبھی بے جا مبالغہ آرائی سے کام لیتا ہے۔ موصوف کے سلسلے میں اس کی ستائش کا محرک خلوص و لہجیت پر مبنی دوستی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ایسی تھی کہ بعض معاصرین اس سے حسد کرنے لگے۔ رقعات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بیدل ایک شخص نواب کے ساتھ بیدل کے مبالغہ آمیز تعریف پر مبنی مراسلات و مکاتبات پر اعتراض کیا کرتا تھا۔

عالم تسلیم میں بغیر کسی تنگ و دو کے سکون و جمعیت خاطر حاصل ہے۔ اور عجز و بے بسی کے کو  
میں بغیر کسی دوڑ بھاگ کہ آب و دانہ میسر ہے۔ شکر خاں کے نام ایک خط میں لکھتا ہے:

”باوجود جمعیت اسبابیکہ از توجہ آں کامروای مسکن، درہمہ حال ہمہ جا حاصل  
است۔“ (۵۲۵)

اُس کامروای مسکن کی توجہ سے جو اسباب و سامان میسر ہیں اس کی وجہ سے ہر جگہ اور  
میں جمعیت خاطر حاصل ہے۔

اس لئے قیاس ہے کہ تعریف کا اصل محرک یہی امر رہا ہوگا اگرچہ پوری سرگزشت اس میں  
نشاندہی نہیں کرتی ہے۔ لہذا بیدل کی حاجت روائی کو ان کی انتہائی دوستی کی ایک علامت سمجھنا بہتر ہے۔  
سماجی پہلو:

ظاہر ہے دوستی جب ایسی ہو کہ دونوں ایک جان دو قالب کی حیثیت رکھتے ہوں تو پھر ایک کی  
چیز نہیں رہ جاتی جسے ہم سماجی پہلو کے عنوان سے یاد کریں۔ یہاں بیدل خاندان کا ایک فرد بلکہ اس  
بھی بڑھ کر نظر آتا ہے۔ بیماری و تندرستی، امن و جنگ، شادی و غمی غرض ہر اچھے برے حالات میں اس  
خاندان کا برابر کا شریک ہے۔ نواب شکر اللہ جب بیمار پڑے تو بیدل کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود بیمار ہے۔  
”عصر ذات تقدس آیات، از مخالفت آب و ہوائی فصول امکان، تغیر اعتدال مینداد۔ نس  
بی پر وبالان آشیان نیاز، طش فرسای این ہواست۔ وزبان عجز تو آماں قانون  
اکسار، در یوزہ آہنگ این دعا:

خداوند! غبار کلفت آں ذات نہ پسندی بغیر از عافیت تمثال این مرآت پسندی  
حباب و موج بسیارست در دریای امکانت ازاں گوہر بجز جمعیت اوقات نہ پسندی  
نواب موصوف کے گھر کا کوئی فرد جب دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو وہ صدمہ گویا خود بیدل  
پہنچتا ہے۔ اس غم انگیز واقعہ سے اس کا دل بھر آتا ہے۔ ایک طرف وہ اگر ٹپلی دیتا ہے تو دوسری طرف  
فلسفیانہ انداز سے صبر کی تلقین بھی کرتا ہے۔

”آہ امروز از ورق گردانی رنگ ظہور نسخہ اسرار الفت معنی نایاب  
در کنار دیدہ شوخی داشت غلطان گوہری ناگہان چون اشک از مرگاں چکید آب  
دیدہ ما را چو شمع کشتہ باید گشت داغ کان فروغ بینش اکنون در نظر باخوب  
از مرآت تحقیق پوشیدہ نیست کہ آدمی در جمیع اوقات و احوال حیرت زدہ کا گاہ اعتبار

است۔ اگر مرثگان می کشاید عبرت اندوز شکست رنگیہاست، و اگر چشم می پوشد داغ فرصت  
تماشا۔ در مزرعہ ندامت، جز دانہ اشک چہ باید کاشت۔ و بردوش شکست دل، غیر از نالہ چہ  
می توان برداشت۔ بہر صفت مجبوریم و در ہر صورت معذوریم۔“ (۵۲۷)

آہ رنگ ظہور کی ورق گردانی سے اسرار الفت کا معنی آج نایاب بن گیا۔ آنکھ کے کنارے  
سننے والا ایک موتی شوخی کر رہا تھا اچانک آنسو کی طرح پلکوں سے ٹپکا اور پانی بن گیا۔ کیونکہ وہ آنکھ کی  
دشمن اب خواب و خیال کی بات ہو گئی تھی، بجھی ہوئی شمع کی طرح ہماری آنکھ کو بھی داغ ہو جانا تھا۔

آئینہ تحقیق سے یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ انسان تمام اوقات و حالات میں کارگاہ اعتبار کا ایک  
نمونہ ہوا ہے۔ آنکھ کھولتا ہے تو شکست رنگی کی عبرت اسے حاصل ہوتی ہے اور آنکھ بند کرتا ہے تو مشاہدہ  
نعمت کا داغ دائمی رہتا ہے اور کشت ندامت میں دانہ اشک کے سوا کیا بویا جاسکتا ہے اور شکست  
دل کے دوش پر نالہ کے سوا کس کا بوجھ اٹھایا جاسکتا ہے بہر صفت ہم مجبور ہیں اور بہر صورت معذور۔

اسی طرح جنگ میں کامیابی، منصب میں اضافہ، عید و بقر عید اور لڑکی کی شادی کی مناسبت  
بے شمار مبارکباد نامے بیدل نے بھیجے ہیں جو مادہ تاریخ پر بھی مشتمل ہیں اور ان میں غیر معمولی خوشی  
و مسرت کا بھی اظہار کیا ہے۔ بطور مثال کچھ ذکر کئے جاتے ہیں۔

امروز کہ وقت طوف مقصود رسید خلقی محمل بجانب کعبہ کشید  
ما را کہ سراغ تو بدل یافتہ لم ناچار بگرد خویش باید گردید  
نواب موصوف کبھی مختلف لوگوں کے حالات بیدل سے دریافت کرتے اور ان کے بارے  
میں بھی بری معلومات بیدل کو ہوتی وہ نواب کو لکھ بھیجتا (۵۳۱) بعض اوقات بیدل خود اپنے حالات  
کو لکھ کر بھی اپنے ضعف و نقاہت کا تذکرہ کرتا اور کبھی کسی سفر کی روداد سناتا۔ (۵۳۲)

اس کے مقابلے میں نواب موصوف زیادہ تر تھکے خائف مثلاً قند و نبات، گدڑی، روغن گل،  
بازم، شیشہ عرق گلاب، مربہ، جاڑے کے لباس، آموں کی ڈلیا، کبل سیاہ، خربوزہ وغیرہ بیدل کو  
بھیجتے تھے۔ بیدل ان تمام تحایف کو صمیم قلب سے قبول کرتا اور نواب کے محبت آمیز سلوک پر اس کا  
دل شکر یہ ادا کرتا۔ (۵۳۳) کبھی اس طرح ان چیزوں کی تعریف کرتا کہ ایک معمولی چیز بھی اس کے زور  
سے اہم ہو جاتی اور اس وقت قاری اس کشش میں گرفتار ہو جاتا کہ اس چیز کو اہم سمجھے یا اس رنگین،  
میرس اور موزوں و مناسب تعبیر کو۔ اس شکر گزاری کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

رسم پردازان، تکلف می کنم بیدل و گرنہ معنی الفت عبارت بر نمی دارد  
قدردانان نعمت خوشی، در ادای شکر نیز لب کشودن نداشتہ اند تا بقوام شربت حلاوت ہمت



سستی نہ خندد..... ہر چند تلخ کام زاویہ مہاجرت را، بہ عنایت قد و نبات علاج فرمودہ اند، حلاوت طبع دیدار پرست، بحسرتی آب نگر دیدہ کہ بی مشاہدہ گرمیہائی التفات بصورت قوای تواند پیوست۔“ (۵۳۳)

بیدل رسم پرستوں کی طرح تکلف سے کام لے کر ہم محبت کا دم بھرتے ہیں، ورنہ محبت کا علم عبارت میں نہیں سما سکتا ہے۔

نعت ”غوشی“ کے قدرداں شکر گزاری کے لئے لب کشائی کی جرأت نہیں کرتے تاکہ عذبت شربت حلاوت کے قوام میں سستی نہ آنے پائے۔ گوشہ تنہائی کے تلخ کام کا اگرچہ قد و نبات طبع علاج کیا ہے پر طبع دیدار پرست کی حلاوت اس تمنا میں پانی پانی نہیں ہوتی کہ توجہ عالی کی حرارت مشاہدہ کئے بغیر ہی وہ قوام کی صورت اختیار کر لے۔

شکر گزاری کا یہ انداز بتاتا ہے کہ دونوں کے درمیان دوستانہ تعلقات کی نوعیت تقریباً حسی حد تک تھی۔ نواب موصوف صاحب کی ہر ایک ادا اس کی نگاہ میں ساری مصروفیات سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اس کی معمولی پیشکش کی بھی بیدل اس طرح تعریف کرتا ہے گویا نواب سے زیادہ اس کی قدر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ گدڑی کی شکر گزاری میں لکھتا ہے۔

”سجان اللہ اگر گدڑی نیست، برہوس کدہ خیال بافان مجمل و دیباہی غفلت کہ می خندد۔ و اگر پارہ دوزی ایں صورت دارد، بحسرت آباد التفات پرستان اطلس و زلفیت، آشفتنی حرص کہ می پیوندد۔“ (۵۳۵)

نواب موصوف سے اپنے والہانہ تعلق کا تذکرہ بیدل دوسری جگہ اس طرح کرتا ہے: کردہ ام سر مشق حیرت سر و موزون ترا تاکہ می خوانم بلند بیہای مضمون ہر چہ می بینم سراغی از خیالت می دہد ہر دو عالم یک سرز انوست مجنون ترا (۵۳۶) ترے سر و موزون (قد) کو میں نے حیرت کا سر مشق بنایا ہے جب تک تیرے مضمون کی جہالت کا مطالعہ کرتا رہوں گا۔ جو کچھ دیکھ رہا ہوں تیرے خیال کا نشان و پتہ دیتا ہے، دونوں جہالت مجنوں کے لئے ایک سرزانو ہے۔

بیدل کے اس والہانہ قلبی روابط کے جواب میں نواب موصوف بھی بیدل سے لگا تار ملامت کا سلسلہ جاری رکھتا تھا اور بیدل اس سے غیر معمولی لطف لیا کرتا تھا، لکھتا ہے:

”تو اتر نواز شامہ، جانہای تازہ، ایثار قالب انتظار فرمودہ وی فرماید و تسلسل مرحمت نامہ بر لبی نفسان زاویہ مجھوری، ساغر نفس می پیاید۔“ (۵۳۷)

نواز شامے کے تسلسل سے قالب سراپا انتظار میں تازہ بہ تازہ جان آرہی ہے اور مرحمت نامہ کے اتر سے زاویہ مجھوری میں بڑے بے نفس لوگوں (جن کی سانس اکھڑ چکی ہے) کو ساغر نفس کا دور مہیا ہے۔

ادبی پہلو:

نواب موصوف سے بیدل کے تعلقات کا ادبی پہلو سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ بیدل کے معمولی شاعرانہ ذوق کا حال تھا دریائے شاعری میں ہر وقت غرق رہا کرتا تھا اگر کوئی چیز اس کو زیادہ متاثر کر سکتی تھی تو وہی ادبی ذوق و شاعرانہ افتاد طبع جو اس کے ذوق سخن اور افتاد طبع سے متعلق ہو۔ حسن اتفاق سے یہ خصوصیت اس کو نواب شکر اللہ خاں کی شخصیت میں نظر آئی جو اخلاق حمیدہ و بہت و بسالت کے ساتھ ساتھ شاعرانہ ذوق اور ناقدانہ فکر کا حامل تھا۔ اس سلسلے میں شکر اللہ خاں نے بیدل کا حوالہ شروع میں دیا جا چکا ہے۔ علاوہ ازیں بیدل نے خود بھی عاقل خاں رازی اور خود شکر اللہ خاں کے نام اپنے متعدد خطوط میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ عاقل خاں کے نام اپنے خط میں جس کا عنوان ہے ”تخمین اشعار شکر اللہ خاں معروض داشتن بہ عاقل خاں“ لکھتا ہے:

”اکثر ابیات بکفایتی جلوہ گراند کہ اگر سامع بوجد پیش آہنگی نہ نماید پس ماندہ خجلیہای بیہ ردیت۔“ (۵۳۸)

زیادہ تر اشعار ایسی کیفیت کے حامل ہیں کہ اگر سننے والا وجد میں نہ آئے تو اس کا مطلب ہوگا کہ بیدل کے پہلو میں درویش نہیں ہے۔

شکر اللہ خاں کے نام ایک خط میں لکھتا ہے:

”مطالعہ سواد غزلیات، کیفیت صحرای در نظر جلوہ داد، تا از سلسلہ شور جنون بر آید۔ و تا مل عنصر با میات، طرح چار سو بہ تخیل آراست کہ تحیر مدتہای خواہد تا دکان مژگان فرامی نماید۔“ (۵۳۹)

مطالعہ غزلیات نے ایک صحرا کا سماں نگاہوں کے سامنے باندھ دیا ہے کہ شور جنون کی زنجیر سے آزاد آجائے اور مطالعہ رباعیات نے قوت تخیل پر چاروں طرف کا ایسا نقشہ کھینچا کہ عرصے تک دکان مژگان کی دکان فرامی نہ کرے گی۔

یہ خط میں نواب کے طبع رسا اور ذوق عالی کی تعریف اس طرح کرتا ہے:

نامہ را در زمین کہ جستہ جستہ قدم شمر دست لہ تقدیر مطلق عنانی کماست۔ و بیش از ایں رسائی

قدرت اندیش محال۔“ (۵۳۰)

حس زمین میں قلم دھیرے دھیرے گام فرسائی کرتا ہے وہاں اس طرح مطلق العنانی کا اندھا کمال ہے اور قوت فکر یہ کہ اس سے آگے رسائی محال ہے۔

نواب کے تنقیدی شعور اور صلاحیت کی اس طرح تعریف کرتا ہے:

”عروج اقبال سخن منحصر است در آں مرتبہ کہ طبع صاحب دلی سرور لطافتش تواند گردید و با نگاہ صاحب نظری، بر تامل معنیش تواند پیچید۔ الحمد للہ صاحب قدردان ما، با فکار این بی سرو پا تو جہی می فرماید، و بلطف عیم تحسین می فرماید۔“ (۵۳۱)

کسی کلام کا عروج اصلی اس بات پر منحصر ہے کہ کسی صاحب دل کی طبیعت اس کے محاسن مطالعہ سے سرور ہو سکے یا کسی صاحب نظر کی نگاہ اس کے معنی پر غور و فکر کرنے میں پیچ و تاب لگے۔ الحمد للہ ہمارے قادر الکلام نواب صاحب مدظلہ اس بے سرو پا کے افکار و خیالات پر توجہ کرتے ہیں۔ اپنے لطف و مہربانی سے اس کی داد تحسین دیتے ہیں۔ ایک خط میں شکر اللہ خاں کے کمالات کو نہایت واضح الفاظ میں لکھتا ہے:

”واہب حقیقی در ذات فیض آیات صاحب ما، توفیقی و دیعت گذار شدہ کہ در پیچ حالتی از مرآت اختیار افعال و اعمال غیر از حسن مراتب کمال مرئی نمی توان یافت، جای آن دارو کہ دلہای مخلصان بخیاں و شہود خود نیارد۔ و از معمای تصور و ضاع و اطوار جزیمای در جات خیر مظهر نمی پیوند، و سزاوار است کہ طبایع خیر اندیشان، بسجود تامل خود پردازد۔“ (۵۳۲)

واہب حقیقی نے ہمارے محترم نواب صاحب کی ذات فیض آیات کو ایسی توفیق عطا فرمائی ہے کہ کسی بھی حالت میں افعال و اعمال کے اختیار کے آئینے میں حسن مراتب کمال کے علاوہ کسی اور بات کی رعایت نہیں رکھتے۔ بجا طور پر اس امر کا موقع ہے کہ مخلصوں کا دل اپنے خیال میں مصروف نہ ہو۔

اسی ذوقی اور طبعی ہماہنگی کی بنا پر بیدل دوسروں کی بہ نسبت نواب موصوف سے زیادہ قریب آتا ہے اکثر اوقات وہ اپنے نتائج فکر تبصرہ و تنقید کیلئے اس کی خدمت میں بھیجا کرتا تھا۔ دوسری طرف نواب موصوف وہ واحد شخص معلوم ہوتا ہے جو بیدل کے کلام کی غیر معمولی تحسین کرتا اور اس کی بے حوصلہ افزائی کرتا تھا جو بالآخر بعض تصنیفات خصوصاً ”طور معرفت“ اور ”گل زرد“ کی تخلیق کا باعث بنا۔

دونوں کے درمیان اپنی تخلیقات کے تبادلے کا سلسلہ آخر دم تک جاری رہا۔ بیدل نے اپنی مشنوی طلسم حیرت بھیج کر نواب موصوف کا تعارف حاصل کیا پھر اپنا دیوان اس کی خدمت میں پیش کیا۔ نواب موصوف نے اس کا ایک انتخاب تیار کر کے بیدل کو اس کی اطلاع کی۔ بیدل نے جواب میں لکھا:

”سجدہ شکر را بر جبین نیاز، بار منجاست کہ اجزای پریشان مقال دور گردان بساط حضور را بر شہ نظر تامل، شیرازہ پیرائی اقبال تحسین می فرماید..... چھ در داغ معنی سراغ، بریں خرف ریزہا، کلفت صداع کشد، تا شرم تامل عرقی بعرض گوہر آرد، و بچہ وقت شوق حقیقت ذوق، بریں کلام آشفتگی نظام پیچہ، تا سہی اندیشہ اش ناچار قابل ربط بشمارد۔“ (۵۳۳)

سجدہ شکر کے لئے بندہ کی پیشانی پر احسان کا بوجھ ہے کہ دور گردان بساط حضور (بیدل) کے اجزائے پریشان کا بہ غور مطالعہ کر کے اس کی شیرازہ بندی کرتے ہوئے تحسین فرماتے ہیں۔ (نواب) کا داغ معنی سراغ کہ قدردان ٹھیکروں پر دوسری زحمت مول لیتا ہے تاکہ شرم تامل گوہر کے نے پر عرق آلود ہوا اور شوق حقیقت ذوق کتنی پریشانیوں سے اس کلام آشفتگی نظام پر مغز ماری کرتا ہے۔ اس کے فکر کی کوششوں سے مجبور اس میں ربط پیدا ہو جائے۔

دوسرے خط میں اسی انتخاب کے بابت کہتے ہیں:

”مقبول فیض ازل صاحب طبع معانی کہ از اقبال تو جہش، نیاز بی بضاعتان، ہوا احتیازی نازد وہ بمن التفاتش، اجزای بی سرو پایاں، آئینہ انتخاب می پردازد۔ اگر از ہجوم این ہمہ خطا، بفکر شک افتد، در آن نسخہ یقین تو ہم شک چہ احتمال دارد۔ و اگر سہواً القلمی گمان برد، فطرت سراز نقص ادراک برمی آرد۔ مگر آنکہ لطف کریم بہانہ جوست، ہر کرا پسندید پسندید و ہر چہ را برگزید برگزید۔“ (۵۳۴)

مقبول فیض ازل اور صاحب طبع معانی جن کی توجہ کریمانہ سے مجھ بے بضاعت کی نیاز عزت پر ناز کرتی ہے اور اس کے التفات کی برکت سے (مجھ) بے سرو پا (بیدل) کے اجزائے کلام کا انتخاب تیار ہوتا ہے۔ ان سب خطا کو سامنے رکھنے سے اگر شک میں پڑنے کا احتمال ہو تو اس کا تین میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اور اگر سہواً القلمی کا گمان ہو تو اس کی فطرت قوت ادراک کی سے ابا کرتی ہے۔ بابت یہ ہے کہ لطف کریم بہانہ جو ہے جس کو چاہا پسند کیا اور جسے چاہا انتخاب کیا۔ جب کبھی دونوں کو دہلی میں باہم زندگی گزارنے کا اتفاق ہوتا اور افادہ و استفادہ کے لئے وقت انگو ملتا۔ بیدل ان لمحوں کو حاصل زندگی تصور کر کے غنیمت سمجھتا:

”فیض صحبہا از معتمات حاصل زندگی مشاہدہ می نماید۔“ (۵۳۵)

ان ہی دنوں نواب موصوف نے مشنوی طلسم حیرت کے ذیلی عناوین مقرر کئے۔ ایک خط میں لکھتا ہے:

”دراں ایام خان سعادت عنوان، با کشف مطالب طلسم حیرت عنوانہا مقرر نمود۔“ (۵۳۶)

۱۶۸۷ھ/۱۰۹۹ء میں جب بیدل نواب موصوف کے ساتھ میوات کی سیاحت کر رہا تھا تو گلاب کی حوصلہ افزائی اور تحریک پر اس نے مثنوی ”طور معرفت“ لکھی چنانچہ عاقل خاں کے نام اپنے ایک خط میں لکھتا ہے:

”در ایں ایام، بوساطت تعلیم خان صاحب حقایق مراتب، و تتبع آن مرجع عرفاں معالی مناصب، از بہارستان عالم موزونی، مستفیض، بگلشت حقیقی بود۔“ (۵۴۷)

”معنی نواز! طور معرفت از ہجوم دیدہ انتظار، سامان یک عالم چراغان است۔ و بہوای ثار آن کلیم ایمن، حقیقت صد ہزار گوہر معنی بدامن۔“ (۵۴۸)

معنی نواز ”طور معرفت“ دیدہ انتظار کے لئے ایک نیا چراغاں کا سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس کلیم ایمن پر نچھاور کرنے کی خواہش میں لاکھوں گوہر معانی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ نظم ”گل زرد“ جو ڈیڑھ سوا شعرا پر مشتمل ہے خان موصوف کو پیش کرتا ہوا لکھتا ہے:

”چند روز است در بہارستان اندیشہ ”گل زرد رنگ“ آرام می بازو۔ و بارائش بساط شکست رنگی پر دازو۔ هنوز از چمن افکار، منتخب آب و رنگی کہ فراہم آوردہ است، قریب یکصد و پنجاہ گل زینت دامن تحریر کردہ۔ اقبال رنگینہای این گلستانہ، منتظر نگاہ معنی میں است، و معراج خرمیہای این گلبن، موقوف مطالعہ بہار آفرین۔“ (۵۴۹)

چند دن ہوئے فکر کی بہارستان میں ”گل زرد رنگ“ آہستہ آہستہ کھل رہا ہے۔ اور بساط شکست رنگی کی آرائش میں مشغول ہے۔ افکار و خیالات کے چمن سے جو منتخب آب و رنگ اب تک فراہم کیے ہیں تقریباً ایک سو پچاس پھول کی شکل میں دامن تحریر کی زینت بنے ہیں۔ اس گلستانے کی رنگینی کا اقبال (جناب عالی) کی نگاہ معنی پناہ کا منتظر ہے اور اس گلبن کی شادابی کا معراج (جناب والا) کے بہار آفرین پر موقوف ہے۔

شکر اللہ خان بھی بیدل کی نثر و نظم کو ایک دوسرے میں بدل کر تفضیل طبع کا مظاہرہ کرتے اور اپنے ذوق و استعداد کی نمائش بھی کرتے تھے۔ بیدل ایک خط میں لکھتا ہے:

”سعادت مضمون نظمیکہ در آجناب بارتجہ نثر بمعنائی نماید۔ و کرامت روش نثریکہ در آں بارگاہ ہمایونیکہ بر آید۔ اگر نظم است یکلظم از کربستہای خدمت دعا است و اگر نثر است، از بساط آریایں وسعت حمد و ثناء۔“ (۵۵۰)

اس نظم کے مضمون کی سعادت کا کیا پوچھنا جو جناب والا کی بارگاہ میں نثر کی ہم معنائی کرے اور اس نثر کی کرامت کا کیا کہنا جو اس بارگاہ میں نظم کی ہمایونیکہ اختیار کرے۔ اگر نظم ہے تو یک

دعا کے کربستوں میں ہے اور اگر نثر ہے تو حمد و ثناء کی وسعت بساط آراؤں میں ہے۔ کسی بیدل کی کوئی منظوم تخلیق نواب موصوف کو بہت پسند آئی تو بیدل نواب کی قدردانی کا یہ بیان بجالاتا ہے:

”اشارات قدسی بشارت، فکر غریبیکہ مطلعش منظور طبع معنی پسند افتادہ، دعا گوئی خاکسار را بنوید حصول سعادت سر بلند ساخت۔“ (۵۵۱)

اشارات قدسی بشارت نے اس غزل کی فکر میں جس کا مطلع طبع معنی پسند کو بھلا لگا۔ دعا گو بنوید حصول سعادت کی نوید سے سرفراز کیا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بیدل کے کلام کی تحسین اور اس کی حوصلہ افزائی بیدل کی شعری طبیعت تھی کہ برجستہ گوئی کے لئے ایک قوی محرک ثابت ہوئی۔ چنانچہ اسی خط میں لکھتا ہے:

”بہتی چند بدیہ عرض نیاز پرداخت، آشفتہ بیانی شاہد اضطراب اندیشہ و عذر خواہ طبیعت تردد پیشہ، مقبول نظر صلاح اثر باذ۔“ (۵۵۲)

یہ سارے اقتباسات مجموعی طور پر اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ نواب شکر اللہ کی غیر معمولی سہولت اور حوصلہ افزائی اور دوستی کے نتیجہ میں بیدل کی ادبی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع ہو گیا تھا نیز حقیقی ادبی سرمایہ کی تخلیق میں اس نے اہم رول ادا کیا ہے۔

انہیں وجہ سے نواب موصوف کا تذکرہ کسی قدر طویل ہو گیا۔ افسوس کہ یہ تعلق جسے بیدل نے ”ربط آب و گوہر“ کی گرانقدر تعبیر سے یاد کیا ہے، صرف بارہ سال تک قائم رہ سکا۔ نواب کی وفات ۱۱۰۸ھ/۱۶۹۶ء میں ہوئی اور اگرچہ ان کی وفات کے بعد ان کے لڑکوں سے بھی ایسی ہی تعلق رہا مگر نواب موصوف سے تعلق کی نوعیت اور تھی۔ چنانچہ اس جائگاہ حادثہ کا اس کی بہت گہرا اثر ہوا۔ ان کے بڑے لڑکے شکر اللہ خاں ثانی کے نام اپنے ایک خط میں اس نے

”از دست رفتن دامن دولتی کہ سلسلہ موافقتش دوازدہ سال محرک عشرت آہنگی ساز انفاص چشم عبرت یکبارہ بر روی ادبارتہائی و بیکسی کشود۔ نہ صحبت مشفق کہ علاج تفرقہ دل

توان پرداخت۔ نہ لطافت حرکتی کہ بشغل سیر و سفر طرح آوارگی توان انداخت۔ ہر نفس

موج، نردبان خیالی می آرآید، تابا بصورت اندکی از خود بر آید، و پیش نمی رود۔ ہر ساعت

بہان شوق، غبار شکست رنگ بگردون می برد، تابا بس وحشت بالی در خون کشاید، میسرنی شود۔ نصف دل بہ پہلو نشستہ۔ و آشوب دماغ در سر شکستہ۔ بشہہ تشنگی، اگر آبی تاب تصور آرد،

طوفان قیامت استقبال دارد و بوم گرمگی، اگر لقمہ بکام اندیشہ می گذارد و خشکیهای نزع گوی افشارد۔ یادغانان آئینہ دار یک عالم تشویش خیال۔ وحشت حاضران، چہرہ پرداز ہزار رنگ گفت و ملال۔“ (۵۵۳)

اس دامن دولت کے ہاتھ سے جاتے رہنے کے سبب جس کی رفاقت کا سلسلہ بارہ سال تک ساز انفس کی عشرت آہنگی کا محرک رہا چشم عبرت یکا یک تنہائی اور بے بسی کے ادبار پر دوا ہوئی۔ نہ کسی شفیق کی محبت دستیاب ہے، جس سے قلبی اضطراب کا علاج ہو سکے نہ کسی حرکت میں کوئی لطف ہے نہ سفر کی مشغولیت میں آوارگی کی داغ بیل ڈالی جاسکے۔ ہر سانس صبح کی طرح ایک خیالی بیڑی پر ہے تاکہ اس شکل میں تھوڑی دیر بخود ہو جائے پر آگے بڑھنا اسے نصیب نہیں ہوتا۔ ہر لمحہ شوق کی لہر نکلتی رنگ کا غبار آسمان پر اڑائے لئے جاتا ہے تاکہ اس وحشت کے ساتھ اپنا بازو خون میں رنے سے اسے یہ میسر نہیں ہوتا۔ ضعف دل پہلو نشین ہو گیا اور آشوب دماغ سر میں سما گیا۔ تنگی کے شے میں پانی لب تصور تک لانے کی کوشش کرتا ہے طوفان قیامت اس کا استقبال کرتا ہے اور گرمگی کے دہم میں اگر لقمہ فکر کے حلق میں رکھنے کی جرأت کرتا ہے نزع کی خشکیاں گلا گھونٹنے دیتی ہیں۔ غائب ہستیوں یاد دنیاے تشویش خیال کا آئینہ دار ہے اور حاضرین حضرات کی وحشت ہزاروں طرح کی نقش آغوش میں لئے ہوئے ہے۔

دوسرے خط میں لکھتا ہے:

”تائفس باقیست، نمی دانم چہا خواہم کشید و تا دیدہ بازست حیرانم کہ چہ می باید دید۔ موری در قلم افتادہ را، شاعر آشنائی است۔ و ذرہ باد بردہ را، جمعیت ہماں بیدست و پائی، تسلیم اضطراب بست و رضای اختیار است۔ مطلع دیدار یکہ فردوس از گنجیناں بہارش بود، این زمان در آتش نشاندہ اویم۔ و چراغ صحتیکہ دیدہ در فروغش با ہزار انوار می جوشد، الحال در داغ دلش می جویم۔“ (۵۵۴)

جب تک سانس چل رہی ہے نہ معلوم کیا کیا پریشانیاں اٹھانی پڑیں، اور جب تک آنکھ کھلی ہے حیران ہوں کہ کیا کیا دیکھنا پڑے جو چٹائی دریا میں گرمگی اسے مجبوراً تیراکی سے نا آشنا کی ہوگی اور جس ذرے کو ہوا اڑالے لگئی اس کے لئے اس کا سکون لازمی غارت ہوگا اور تسلیم و رضا کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ وہ مطلع دیدار، جس کی بہار کے گل چینوں میں فردوس بھی تھا اس وقت اس نے مجھے آگ میں رکھا ہے اور وہ چراغ محبت، کہ آنکھ اس کی روشنی میں ہزاروں انوار کا مشاہدہ کرتی تھی اس وقت میں اس کو داغ دل میں تلاش کر رہا ہوں۔

اور ایک مرثیہ میں کہتا ہے:

کاں جمال کرم در جہاں نماند  
ہمہ صفات زکا، صد ہزار حیف  
ہمہ این چہ فتنہ بود کہ در عالم نگون  
فنا متاع جہاں جملہ پاک برد  
ہمہ گر یہ بکہ زہر جمع جوش زد  
جہاد نالہ بس است آبیار درد  
ہمہ بیکسی بخاک گلن جعد و نوحہ کن  
شرم حزن و آب بایمائی احتیاج  
ہمہ بسم بسال و زمان نصب می کند  
ہمہ صفا کشان قدح یاس می کشند  
طاؤس جلوہ ریز دریں آشتیاں نماند  
کان نور آفتاب وفا جاوداں نماند  
جز نام زان محیط مصور نشان نماند  
جنسی ز دستگاه زبان در دکان نماند  
جز دجلہ در ممالک ہندوستان نماند  
از گلبن وفا بنمو جز خزاں نماند  
امروز بر مزار زمیں، آسماں نماند  
ای انفعال! مشفق ما این زمان نماند  
آہی کہ آں صبح سپہر آستان نماند  
چندی بجیب چاک زن اکون کہ خاں نماند  
(۵۵۵)

ہائے افسوس کہ وہ جمال کرم اب دنیا میں نہیں رہا۔ اس آشتیاں میں وہ جلوہ دکھانے والا اب نہ رہا۔ اپنی تمام تر صفات ستودہ کے ساتھ وہ نور آفتاب وفا ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔ آہ کیا آزمائش کی گھڑی تھی..... اس محیط مصور کے نام کے سوا کوئی نشان اس کا باقی نہ رہا۔ سیلاب فنا دنیا کے تمام تر اسباب و سامان بہالے گیا۔ دکان میں دستگاه زیاں کی کوئی جنس باقی نہیں رہی۔ ہر طبقے کی آہ طوفان گرمی نے اس قدر جوش مارا کہ ہندوستانی علاقوں میں دجلہ کے سوا کے کوئی اور دریا باقی نہ رہا۔ بلبل! درد کی آبیاری کیلئے آہ و نالے کافی ہیں گلبن وفا سے خزاں کے سوا کبھی کسی اور چیز کی نشوونما نہیں رہی۔ اے بیکسی! سر پر خاک اڑا اور ماتم کر آج مزار زمیں پر آسماں باقی نہیں رہا۔ حزن و غم شرم سے ہندوستان کی ایماں سے اندامت ہمارا شفق و مہربان دوست اب نہ رہا۔ میرا ہر مصرع سال اور زمانے کی بین کرتا ہے۔ آہ وہ صبح سپہر آستان اب نہ رہا۔ بیدل صاف ستھری شربل پینے والے مایوسی کا جام پیتا ہے ہیں اب جبکہ شکر اللہ خاں اس دنیا میں نہیں رہے تو کچھ دنوں غم سے اپنے گریباں چاک کر۔ کہی آمد پیام دوستان رفتہ زین محفل مگر از نقش پائی بشنوم آواز پا اینجا لطف اللہ خاں مخاطب بہ شکر اللہ خاں ثانی:

شکر اللہ خاں کے تین لڑکے تھے۔ لطف اللہ خاں، عنایت اللہ خاں اور کرم اللہ خاں۔ ان تینوں کے بابت غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

”میر لطف اللہ شکر اللہ خاں، پراسوت کہ خطاب پدر مخاطب گردید۔ وظیف دیگرش میر عنایت اللہ شا کر خان و دیگر میر کرم اللہ عاقل خاں۔“ (۵۵۶)

میر لطف اللہ شکر اللہ خاں کا بڑا لڑکا ہے جو باپ کے خطاب سے مخاطب ہوا۔ دوسرے لڑکے میر عنایت اللہ شا کر اور میر کرم اللہ عاقل خاں ہیں نواب موصوف کے ان تینوں لڑکوں سے بیدل کیسے والہانہ اور مخلصانہ تعلقات تھے اور بیدل کو کتنی محبت ان سے تھی اس کا اندازہ درج ذیل رباعی سے کیا جاسکتا ہے جو ان کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

شکر امروز در بہار وفاق رنگ و بوی و شکفتگی بہم اند  
ای خدا فضل کن کہ ایں گلہا ہمہ لطف و عنایت و کرم اند (۱)  
”اگرچہ از محمد یانیم، پرستش ثالث ثلثہ ایمانیست و ہر چند از وحدت انیم شہود مراتب اشیا عرفانی۔“ (۵۵۷)

خدا کا شکر ہے کہ آج موسم بہار میں حسن اتفاق سے رنگ و بو اور شکفتگی سب ایک جگہ آتے ہیں۔ اے خدا ان پر اپنا فضل فرما کہ یہ پھول سراسر لطف و عنایت اور کرم ہیں۔  
اگرچہ میں محمدی (محمد ﷺ) کا ماننے والا یا امتی (ہوں) پر ان تینوں کی پرستش میر ایمان ہے۔  
اگرچہ میں وحدتی (وحدت الوجود کا قائل) ہوں پر مراتب اسماء کا شہود میر اعرافان ہے۔  
رقعات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بیدل کو نواب شکر اللہ خاں سے جیسا انصاری والہانہ تعلق تھا ان کے پس ماندوں کے ساتھ بھی ویسا ہی تعلق رہا البتہ ان تینوں میں پہلے صاحبزادہ عنایت اللہ خاں شا کر سے نسبتاً زیادہ رہا۔

لطف اللہ خاں مخاطب بشکر اللہ خاں کے نام بیدل کے خطوط کی تعداد بقول ڈاکٹر نور الحسن انصاری ۳۶ ہے۔ لیکن میرے خیال میں صرف اکیس معلوم ہوتی ہے۔ ان خطوط کی مضامین کے لحاظ سے درج ذیل دستہ بندی کی جاسکتی ہے۔

۲ خطوط مخلصانہ روابط سے متعلق، ۲ خطوط شعر و سخن سے وابستہ۔ ۲ دو خطوط جنگ کے حالات سے وابستہ۔ ۸ خطوط اپنے حالات سے وابستہ، ۳ خطوط مبارکباد پر مشتمل، ۳ خطوط تعزیت اور تسلی سے وابستہ اور ایک خط شیوہ تسلیم و رضا کے اختیار کرنے سے وابستہ۔

لطف اللہ خاں کے ساتھ بیدل کے قلبی تعلق کا اندازہ درج ذیل خط سے کیا جاسکتا ہے:

”فراموشی جہودات آستان چہ احتمال دارد۔ نقش پیشانی بہ شستن رفتی نیست، بر مرکز تسلیمی کہ دارد، نشستہ است۔ و جہدہ دائمی کہ داشت ہچماں پیوستہ۔“ (۵۵۸)

آستانہ (نواب) پر سجدہ گزاری کی فراموشی کا سوال کیا پیدا ہوتا ہے پیشانی کے نقوش دھونے مٹنے والے نہیں۔ مرکز تسلیم (دل) اس کے پاس ہے اور دائمی سجدہ جو اس سے متعلق ہے بدستور ہے۔

دوسری جگہ کہتا ہے:

تو کہ ہر کہ قدر ذات داند باید دل و جان در قدمت افشاند  
منظر اقبال تو چشم بیدل کوراست ہر آنکہ در دلت نہ نشاند (۵۵۹)  
تو وہ ہستی ہے کہ جس کو تیری شخصیت کی قدر معلوم ہوگئی وہ اپنا دل و جان تجھ پر نچھا کر دے گا۔ وہ ہستی کہ بیدل کی آنکھ بڑے عروج و اقبال کی منتظر ہے وہ اندھا ہے جو تجھ کو اپنے دل میں بندھے۔

نواب لطف اللہ خاں کے ساتھ بھی بیدل کے مختلف طرح کے روابط ہیں ان میں سماجی پہلو برے پہلوؤں پر فوقیت رکھتا ہے۔ بیدل کا نواب موصوف کے ساتھ برتاؤ تمام اچھے برے حالات میں ایسا ہی نظر آتا ہے جو اس کے باپ کے ساتھ تھا۔ اس تعزیتی خط کے علاوہ جو نواب موصوف کے انتقال کی مناسبت سے بیدل نے لکھا اور جس میں اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے لطف اللہ خاں کے انتقال کی مناسبت سے بھی ایک تعزیت نامہ بھیجا اور اس کی مزاج پر سی کی ہے۔

”بیدل نواز من! ازیں سوم جاکا کہ آتش بر دلہای خیر خواہ ریختہ، چہ تحریر نماید اگر ہمہ تن دندان ندامت شود، از عہدہ یک لب گزیدن بخل است و ہر چند سراپا کف افسوس بر آید در عرض یک سودن دست منفعول۔“ (۵۶۰)

بیدل نواز! اس جان لیو اگر مہوا کے بابت جس نے خیر خواہوں کے دلوں میں آگ لگا دی ہے یا تحریر کریں اگر سر اسر دندان ندامت ہو جائے ایک مرتبہ کے ہونٹ کاٹنے سے بھی شرمندہ رہے۔ ہند سراپا کف افسوس ہو جائے ایک دفعہ کے ہاتھ گھسنے میں بھی منفعول ہو جائے۔

شکر اللہ خاں ثانی کے پہلے بچے کی ۱۱۰۴ھ ۱۶۹۲ء میں ولادت اور دوسرے بچے کی ۱۱۰۹ھ ۱۷۰۰ء میں ولادت کے موقع پر مبارکباد بھیجیں جس کا ہر فقرہ مادہ تاریخ پر مشتمل ہے۔ ”خرمیاہی بہار ہنری ہای عہد شاہنشاهی، الخ۔“ (۵۶۱)

الحمد للہ امروز چمن فضل حق چہرہ پرداز یک عالم طرب خوش است۔

آنجا کہ رموز چرخ و اختر خوانند و ز صفحہ کون خط محور خوانند  
سال ایجاد ایں تجلی مطلع دانایاں صحت کشور خوانند (۵۶۲)

اسی طرح خاں موصوف کو ۱۱۱۳ھ/۱۷۰۲ء میں میوات کی حکومت ملنے پر ایک مبارکبادی خط لکھا جس کا فقرہ مادہ تاریخ پر مشتمل ہے۔

”مناصب حکومت میوات، علو کشتن درجات، بجناب جلالت منقبت مقصد الخ۔“ (۵۶۳)

اسی سال میں لطف اللہ خاں کو شکر اللہ خاں ثانی کا خطاب ملا بیدل نے ایک قطعہ کے ذریعہ اس کی مبارکباد دی۔

میر لطف اللہ نور چشم شکر اللہ خاں  
بے نیازی را بذات نسبت موج و محیط  
شاہ عالمگیر شکر اللہ خاں کر دوش خطاب  
معنی تحقیق اقبال رسائی خواستم  
زنده آں رودی کہ موجش وصف دریا آب داد  
آن بہار معرفت، آں شمع آگاہی نور  
شرم را باطنیت او الفت آب و د  
نور جو بالہ ہماں خورشیدی گر دوش  
سالش از ہر مصرع ایں بیت دیدم ہوا  
شاد ویں جوئی کہ از وی زندہ شد اسم  
(۱۱۱۳ھ) (۵۶۴)

۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء میں اعظم شاہ اور معظم شاہ کے درمیان جنگ چھڑی اس موقع پر یہ تینوں بیدل معظم شاہ کی طرف سے لڑ رہے تھے پہلے حملے میں اعظم شاہ کی فوج غالب ہوتی نظر آئی اس وقت بیدل کا سارا اضطراب اور اس کی تشویش تینوں کی سلامتی کے لئے تھی۔ شاہ عالم کی کامیابی بھی اس وجہ سے اسے منظور تھی کہ ان بھائیوں کی جاں سلامت بچ جائے۔ بیدل ان کو تسلی دیتا ہوا لکھتا ہے:

”انشاء اللہ در اندک فرصتی، صورت حالش واقع است۔ و بیک مژہ توجہ حصول خواص آن نافع۔“ (۵۶۵)

انشاء اللہ جلد ہی صحیح صورت حال سامنے آئے گی۔ جب اعظم شاہ مارا گیا تو دوسرے بھائی لکھتا ہے:

”نفس کار عالم برہواست۔ و مطلوب بیدلان سلامت شام۔“ (۵۶۶)

دنیا کا نظم و نسق ہوا پر قائم ہے (یعنی جدھر کو ہوا کا رخ ہوا یا خدا کی مشیت ہوئی اس کے مطابق حالات سامنے آتے ہیں) لیکن بیدل کے منظر نظر تہا رہی سلاحتی ہے۔

یہ سارے مآخذ اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ بیدل کا شکر اللہ کے پسماندوں سے گہرا دل تعلق اور جذباتی لگاؤ تھا۔

۱۱۲۱ھ/۱۷۰۹ء میں بہادر شاہ کی کاغذ کش کے ساتھ جنگ کے بعد شکر اللہ خاں بہادر شاہ کے ہمراہ نہایت کامیابی کے ساتھ حیدرآباد سے واپس آیا تو بیدل نے انتہائی مسرت کا اظہار کیا۔

۱۱۲۲ھ/۱۷۱۰ء میں معز الدین شاہ نے نواب موصوف سے فرمائش کی کہ وہ ایک ندیم کی حیثیت سے اس کی صحبت میں بیٹھا کرے اس نے بیدل سے مشورہ کیا تو اس نے جواب میں لکھا:

”ما یہ تعظیم عرفا برتر از آنست کہ شاہان آرزوی مجالست شان نمایند۔“ (۵۶۸)

عارفوں کی تعظیم کا معاملہ اس سے کہیں اعلیٰ ہے کہ سلاطین اس کی ہم نشینی کی تمنا کریں۔

اس خط سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شکر اللہ خاں ثانی اہم امور میں باپ کی طرح بیدل سے مشورہ لیا

تھا نیز یہ کہ بیدل اس کو عارفوں کے زمرہ میں شمار کرتا ہے۔ دوسری بات خود بیدل بھی اپنے حالات

ب کھاتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ چار مہینے تک مختلف امراض میں گرفتار رہا۔ اس سلسلہ میں لکھتا ہے:

”قبلہ حاجات بی تعداد من! چہار ماہ است کہ باوجود زمینگیری و در سراقام بیمار یست و در

اختیار بقا و فنا بچھاں بی حس و عاری۔“ (۵۶۹)

میرے لاحد و دو حاجات کے قبلہ! چار مہینے سے معذوری کے باوجود میں انواع و اقسام کی

بیماری کشی ہو گئی ہے اور بقا و فنا کے اختیار میں اسی طرح بے حس و بے جاں پڑا ہوا ہوں۔

دوسری جگہ لکھتا ہے:

”در فراہم آوردن اسبابیکہ رابطہ سلسلہ زندگی دیدہ ایم، نعمات آشتی و پرامندگی نیز از

ہاں ساز عشرت آہنگ شنیدہ ایم۔“ (۵۷۰)

جن اسباب کی فراہمی کو ہم نے سلسلہ زندگی کا رابطہ تصور کیا ہے اسی کے ساز عشرت آہنگ سے

منزل کے لئے بھی سنائی دیئے ہیں۔

۱۱۲۱ھ/۱۷۰۹ء میں بیدل کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اس نے عبدالخالق رکھا۔ شکر

اللہ ثانی کے نام ایک خط میں اس کو اس کی اطلاع کی اور اس پر حیرت کا اظہار کیا ہے:

”بیدل نواز من! در ایں ایام امتداد ورق گردانی نسخہ فرصت، نقشی در صحایف انفاس، مایل

سیاہی نکد اشته و از مسودہ ہای مشقی او ہام یک قلم سواد توقع برداشتہ۔ خامہ صنع رقم قدرتی بر مطالعہ

تامل رسانید۔ و سطر ندرتی قرین طومار حیرت گردانید۔ در معنی مضمون تازہ ایست از در سگاہ

دعاسبقان آخشاں۔ و عبارت جدیدی از افکار سپاس آہنگاں بارگاہ تعظیم انتساب۔ جبین

اکسار بر خط تسلیم می گذارد و آداب سجدات مبارکباد بجا آورد۔“ (۵۷۱)

ان دنوں نسخہ فرصت کی لگا تار ورق گردانی نے صحیفہ نفس میں ایک نقش کو مکمل بہ سیاہی نہیں چھوڑا

تو ت واہمہ کے تمرینی مسودہ سے یک قلم امید کی روشنائی ختم نہیں کی۔ فطرت کے قلم نے ایک

تکریر کے مطالعہ کا موقع فراہم کیا۔ ایک نادر سطر کو طومار حیرت سے ہم آغوش کیا۔ معنوی لحاظ سے



وہ ایک تازہ مضمون ہے۔ جو جناب والا جیسے دعا گو حضرات کی درگاہ سے رونما ہوا اور ایک نئی مہارت ہے جو بارگاہ تعظیم انتساب کے سپاس آہنگ افکار و خیالات سے سرزد ہوئی۔ عاجزی کی پیشانی سلیم خط پر نکلتا ہے اور مبارکباد کے مجذوبوں کے آداب بجالاتا ہے۔

یہ تو تھاماجی پہلوان کے تعلقات کا۔ جہاں تک ادبی پہلو کا تعلق ہے تو مضامین خطوط و پیش نظر رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شکر اللہ خاں ثانی اگرچہ ادبی ذوق کا حامل نہ تھا پر اس سے بالکل غافل بھی نہ تھا۔

بیدل کی تحریر کے سمجھنے میں شاید اسے کچھ دشواری ہوئی تھی اس لئے ایک خط میں جناب کے کہ نواب موصوف کی قوت فہم پر تنقید کرے اس نے خود اپنی تحریر کی پیچیدگی اور ابہام کا اعتراف کیا ہے:

”نفس پردازی تکلف عبارات، در جناب آئینہ قباب، ہنگامہ ساز گرد و کدورت مباد۔ و طنباب تصرفہای طبیعت، در بارگاہ نزاہت پناہ، بساط آشفستہ دماغی مچیناد۔“ (۵۷۲)

عبارتوں میں تکلف کی نفس پردازی جناب آئینہ قباب میں گرد و کدورت کا ہنگامہ خیز ثابت نہ (تکلف آمیز عبارت نواب کی فہم کے لئے موجب زحمت نہ ہو) اور طبیعت کے تصرفات میں طنباب بارگاہ نزاہت پناہ میں آشفستہ دماغی کا فرش نہ بچھائے۔ (تفنن طبع پر مبنی میری رنگین نگاری نواب موصوف کے لئے وحشی آشفستگی کا باعث نہ بنے۔)

اس کے علاوہ ایک مفصل خط جس کا عنوان ہے ”در قباحۃ الفاظیکہ اکثر در اشعار یافتہ میشود“ (۵۷۳) (اشعار میں کثرت سے پائی جانے والی قباحۃ الفاظ کے بیان میں) نواب کو کلمہ خط میں مکمل طور پر شاعری کی خصوصیات پر بحث کی گئی ہے۔ بیدل کی شاعری پر بحث کے دوران اس سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اسی خط سے معلوم ہوتا ہے کہ شکر اللہ خاں ثانی شاعری کے سلسلے میں بیدل سے کچھ استفادہ کرتا تھا اگرچہ خود شاعری نہیں کرتا تھا۔

### میر عنایت اللہ شا کر خان:

نواب شکر اللہ خاں کا دوسرا لڑکا میر عنایت اللہ مخاطب بہ شا کر خاں باپ کی زندگی میں اکثر ان کے ہمراہ رہا کرتا تھا۔ ۱۰۹۹ھ میں وہ زیب النساء کا خانساں مقرر ہوا اور ۱۱۰۳ھ میں دیوان تنویر عہدے پر فائز رہا۔ (۵۷۴)

۱۱۰۴ھ میں وہ شا جہاں آباد دہلی کا صوبیدار مقرر ہوا۔ بیدل نے اس مناسبت سے ایک

مبارکباد نامہ جو تاریخی مادوں پر مشتمل ہے کہا ہے:

”اقتدار بہار ملک و مال، دستگاہ علامت جاہ و جلال، اجلال و عشرت جاودانی، حکومت مبارک شا جہاں آباد خاں صاحب کو اکب مبارکباد۔“ (۵۷۵)

جیسا کہ پچھلے صفحات میں ذکر ہوا شا کر خاں کے ساتھ بیدل کے روابط دوسرے بھائیوں کی نسبت زیادہ خلصانہ تھے صاحب تذکرہ بے نظیر کا قول پہلے نقل کیا گیا ہے اس کے علاوہ شا کر خاں کے بیدل کے خطوط کی تعداد ۴۸ ہے یہ تعداد اس دعویٰ کی توثیق کرتی ہے۔

ان ۴۸ خطوط میں سے ۲۰ خطوط بیدل کے شا کر خاں کے لئے غیر معمولی اشتیاق اور تعلق خاطر سے وابستہ ہیں چند ملاحظہ ہوں:

خاک می شد از جدائی آن جان جهان  
مغذور گرمی داشت رنگ طاقی  
از نم خلعت همان چوں آب در سنگ نہان  
خاک جانی سنگ بردل بست و من بی اختیار  
جز یاس ز اسباب چہ اندوختن است  
آفرینش بیکی نظر دوختن است  
افروختن نیست ہمہ سوختن است  
نی روی تو در چراغ کا شائہ ما  
ت و پاگم کردہ شوق تماشا ی توام  
اگلند یارب سرافتادہ در پای توام (۵۷۶)

”آثار محبت کیفیت نقش نہ بستہ کہ بیدست اندازی غبار نارنگ تغیر گیرد۔ و اطوار و فاقش نہ

نشاندہ کہ بی قطع سلسلہ نفس، صورت شکست پزیرد۔“ (۵۷۷)

آثار محبت نے ایسی کیفیت کی نقش بندی نہیں کی جو غبار فنا کی دست اندازی کے بغیر بدل سکے۔ و اطوار و فاقہ ایسی نقش نشانی نہیں کی کہ سلسلہ نفس کے قطع کے بغیر شکست کی صورت اختیار کر سکے۔ یعنی موت یا سلسلہ نفس کے ختم ہونے کے بعد ہمارا تمہارا تعلق محبت ختم ہوگا جب تک بقید حیات ہیں ممکن نہیں کہ ہمارا قلبی تعلق اور محبت ختم ہو۔

بیدل کی محبت کا یہ سلسلہ صرف نواب موصوف تک محدود نہ تھا بلکہ ان کے بچوں تک سرایت کر چکا تھا۔ شا کر خاں کا لڑکا میر مبارک اللہ ابھی بہت ہی چھوٹا تھا اور لکھتے وقت بیدل کا کبھی قلم اور کبھی لکھنا اس کے ہاتھ سے چھین لیتا تھا بیدل ان لمحات کو نہایت والہانہ جذبات سے لبریز الفاظ میں یاد کرتا ہے۔

”میر مبارک اللہ صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ گا ہی یاد این متحیر کردہ باشند، فقیر را خود فراموشی ایشان کچھ تدبیری امکان ندارد، ہر گاہ تحریر عریضہ می پردازد، کاغذ از دست گرفتن ایشان بیاد می آید و قلم از چنگ اختیار می راید۔“ (۵۷۸)

اور آخر میں ایک غزل ملاحظہ ہو جو ان کے باہمی گہرے تعلق اور محبت کی نشاندہی کرتی ہے۔  
 آہمی آنکھ باتوشش جہت اقبال رو بروست ہر جاتوئی، تجلی نصرت بہانہ جوست  
 اخفای نور مہر بعالم چہ ممکن است کوری بچشم حاسد خفاش طبع اوست  
 پوشیدہ نیست جوہر غیرت درین بساط سیمای مرد از عرق سعی شستہ روست  
 خوش باش و شادزی کہ درین عرصہ خیال تو باغ جاودانی واین جملہ رنگ و بوست

در حقیقت یہ تعلق، یہ عشق، یہ لگاؤ اور یہ خلوص بیدل کے ساتھ شاکر خاں کے انتہائی محبت آمیز برتاؤ اور سلوک کا نتیجہ تھا۔ ۱۰۹۶ھ میں جب متھرا سے مستقل بود و باش کے لئے بیدل دہلی آیا تو باپ اور بیٹے یعنی شکر اللہ خاں اور شاکر خاں دونوں نے بیدل کی درخواست برائے مکان کو نہ صرف منظور کیا بلکہ دو روپیہ یومیہ وظیفہ بھی مقرر کر دیا۔ اس سے پہلے بھی شاکر خاں اکثر بیدل کی مالی مدد کرتا اور اس کی ضرورتیں پوری کرتا رہا ہے۔ لکھتا ہے:

”ہر چند اسباب مایحتاج این احتیاج کسوت، از کار گاہ لطف عیم بخواست مہیاست“ (۵۸۰)

اگرچہ اس محتاج کی ضروریات کا رگاہ لطف عیم سے بغیر کسی مطالبہ کے فراہم ہیں۔

”باوجود جمعیت اسبابیکہ از توجہ کامروای مساکن در ہمہ حال بہمہ حاصل است۔“ (۵۸۱)

اسباب کی طرف سے قلبی سکون و اطمینان کے باوجود جو اس کامروائے مساکن کی توجہ سے ہر حال میں اور ہر جگہ فراہم ہے۔

باپ کے انتقال کے بعد شاکر خاں نے حسن سلوک کا وہی انداز بدستور باقی رکھا بلکہ اس کی حمایت و سرپرستی میں اضافہ کر دینا چاہا۔ چنانچہ جب وہ دکن میں تھا تو بادشاہ سے بیدل کے لئے ایک جاگیر حاصل کر کے اس کو اطلاع کی۔ بیدل نے اگرچہ اسے قبول نہ کیا پر شکریہ کا خط اس کو لکھا:

”با آنکہ لاد جمع اسباب از عطای عیم مہیاست، ظہور این جنس فعلہا نیز کہ متصور خیال عجز

مال نیست، صورت وقوع می آراید۔ ودعا گوی خود را مورد اقسام شفقت می فرماید۔ غیر از

سپاسیکہ در ادای حق آن عاریست، چہ خدمت افزاید۔ و جز بہوای استدعای علو مناصب و

عروج مراتب صوری و معنوی چہ کف کشاید۔ الحاصل احسان احسان تست باقی ہمہ

حرف۔“ (۵۸۲)

باوجودیکہ تمام اسباب معاش نواب کی عام بخشش سے مہیا ہیں اس قسم کی عنایتوں کا ظہور بھی جس کا خیال عجز مال کو تصور بھی نہیں ہو سکتا ہے وقوع پذیر ہوتا ہے اور اپنے دعا گو پر وہ مختلف قسم کی

بخشش کرتا ہے۔ اس شکریہ کے سوا جس کے حق کی ادائیگی سے خاکسار عاجز ہے مزید کیا خدمت انجام دے اور مناصب کی بلندی اور صوری اور معنوی مراتب کے عروج کی خواہش کے سوا کس چیز کے لئے چاہتا ہو سکتا ہے۔ غرض احسان تو تمہارا احسان ہے باقی سب کہنے کی باتیں ہیں۔

شاید کسی کے صفحہ ذہن پر یہ اعتراض ابھرے کہ حاجت روائی کی وجہ سے بیدل نے شاکر خاں کی تعریف کی ہے اور اس سے تعلق اور لگاؤ کا اظہار کیا ہے لیکن شکر اللہ خاں کے تذکرہ کے ضمن میں ہم کے ایک شخص کا جو قول نقل کر کے اس پر تفصیلی بحث کی گئی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کا تعلق صرف خلوص اور بیدل کے کلام کی قدر دانی اور تحسین پر مبنی تھا۔ چنانچہ بیدل خود کہتا ہے:

جہدنگ و بوی قطرہ از عمان پرس عزم شبنم ز نیر تاباں پرس

تا مرجع بیدل بہ یقین فہم کنی از شکر اللہ خاں و شاکر خان پرس

(۵۸۳)

قطرہ کے تنگ و پوکے قدر دریائے عمان سے پوچھو، شبنم کے عزم و ارادہ کی اہمیت نیر تاباں سے بیدل کا مرجع اگر یقینی طور پر معلوم کرنا چاہو تو شکر اللہ خاں اور شاکر خاں سے پوچھو۔

اسی مخلصانہ تعلق کی بنا پر بیدل اس خاندان کا فرد معلوم ہوتا ہے جو خوشی و غم اور دکھ سکھ ہر حال میں نواب کا شریک و سہم ہے۔ ان مبارکبادیوں کے علاوہ جو اس نے شاہجہان آباد دہلی کے گورنر

کے عہدہ پر اس کی تقرری اور میواتیوں پر اس کی بالائری کی مناسبت سے اس نے بھیجے ہیں (۵۸۴)

شاکر خاں اور شکر اللہ خاں ثانی دونوں بھائیوں کے درمیان جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں بیدل نے اس کو مٹانے میں خاندان کے ایک بزرگ کا رول ادا کیا ہے۔ ایک خط میں شاکر خاں کو لکھتا ہے:

”مشاہدہ بعضی احوال کہ اثر اختلاف از منہ و املکہ متقاضی ظہور اوست آنقدر پایدار نیست۔

کدورت جز صفای تصور اصلا جائز نباید داشت۔ و عنان اختیار این تماشا بر خریمہای تسلیم و

رضا و اباید گذاشت۔“ (۵۸۵)

بعض حالات کا مشاہدہ جن کا ظہور زمان و مکان کے اختلاف کا نتیجہ ہوتا ہے زیادہ پائیدار نہیں ہے خلوص و صفائے قلب کے سوا کدورت کو اپنے پاس پھینکنے بھی نہیں دیجئے اور اس تماشا کے اختیار

کے لئے تسلیم و رضا کی خوشیوں کے حوالے کر دیجئے۔

شاکر خاں کے لڑکے کی وفات کے موقع پر بیدل نے ایک تعزیت نامہ بھیجا جو فلسفیانہ انداز میں تسلیم و رضا کے مضمون پر مشتمل ہے:

”اگر کینفس اختیار در قبضہ تصرف مای گذاشتند، چوں آفتاب، ہنچہ بر فلک می نازدیم و اگر

ایک حباب مہلت، بکام جمعیت مابود، چوں آسمان برکلاہ بی نیازی می نازیدیم۔ دوش مزدور  
جز باخیدن سری ندارد۔ وگردن غیر تسلیم از چچ جیبی سر برنی آرد۔“ (۵۸۶)

اگر لکھ بھر کے لئے بھی اختیار کی باگ ڈور ہمارے سپرد ہوتی تو آفتاب کی طرح ہم بھی آسمان  
پر بچہ مارتے اور بلبلہ کے برابر بھی ہمیں مہلت ملی ہوتی تو آسمان کی طرح کلاہ بے نیازی پر ناز کرتے۔  
مزدور کو اپنا کاندھا جھکانے کے سوا کسی اور بات کا خیال بھی نہیں آتا اور گردن کو تسلیم و رضا کے سامنے  
ہو جانے کے سوا گریباں سے سراٹھانے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔

شا کر خاں بھی اپنے باپ کی طرح تحفہ تحائف اور ہدیے جیسے گزری پارچہ، آموں اور خربوزہ  
کی ٹوکری، روغن بادام اور روغن گل وغیرہ بیدل کو بھیجا کرتا تھا اور بیدل ان کو شکریہ کے ساتھ قبول  
کرتا تھا۔ (۵۸۷)

اب دونوں کے تعلقات کے بعض ادبی پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ خطوط کے مضامین  
پیش نظر رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شا کر خاں اگرچہ شاعر نہیں تھا تاہم شاعرانہ ذوق اور صلاحیت سے  
بے بہرہ بھی نہ تھا۔ خصوصاً نثر بڑی رنگین اور متین لکھا کرتا تھا۔ بیدل نے اس کے انداز تحریر کی اس  
تعریف کی ہے:

”امروز از عبارت بیدل نواز نامہ، کیفیتی بر طبع قاصر پر تو انداخت کہ اگر از متانش دم زند نفس  
بر رگ یا قوت، بار چمکین می تواند فروخت، و اگر رنگینی تامل نماید، خیال از دیدہ تادل، بہار  
می تواند اندوخت۔“ (۵۸۸)

بیدل نواز نامہ کی عبارت سے ایسی کیفیت طبع قاصر پر طاری ہوئی کہ اگر اس کی متانت کا تذکرہ  
کریں تو سانس رگ یا قوت پر چمکین کا بار لا دے اور اگر اس کی رنگینی پر غور و فکر کریں تو قوت مخیلہ دیدہ  
سے لے کر دل تک بہار اندوزی کرے۔

اس کے باوجود ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بیدل کی نثر کو وہ مشکل تصور کرتا تھا۔ چنانچہ بیدل نے  
اپنی تحریروں کی پیچیدگی اور ابہام کا خود اعتراف کر کے اس سے معذرت چاہی۔

”پر صریح است کہ نامہ ہائیکس در کسوت پیچیدگی بال کشاست۔ و تحریر ہائیکلم در صورت  
ایجاز پرواز نما۔“ (۵۸۹)

واضح رہے کہ خطوط سراسر لباس پیچیدگی میں بال کشائی کر رہے ہیں اور تحریریں یک قلم ایجاز کی  
شکل میں پرواز کر رہی ہیں (میری تحریروں میں پیچیدگی اور ایجاز کی خصوصیات پائی جاتی ہیں)۔

بعض خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ شا کر خاں بیدل سے استفادہ کرتا تھا اور بیدل اس کی

وابستہ بعض اہم نکات اس کو بتایا کرتا تھا مثلاً ایک خط میں لکھتا ہے کہ نور خاں نام کا ایک شخص لفظ  
”ت“ کے ”ت“ سے ڈھائے ہوئے کے عدد نکالتا تھا۔ بیدل نے نور خاں اور اس کے پیروں کی زبردست  
پہنائی کی اور اس کو جاہلوں بلکہ گدھوں کی صف میں شمار کیا ہے:

”طہایج را دریں ایام آشوب، اختلائی در ہم فشرده کہ تقید یان ہرزہ خیالی، جز غبار کو چہ ہای  
کون خری بتجن، شغل مستحسن در پیش ندارد۔ از بجا ست تا ی خط ”جنت“ را کہ در تحریر رخ  
و غیرہ غیر از ”تی“ محسوب می باشد عدد ”ہی“ می شمارند۔ پیش ازیں نیز اساتذہ مورخ  
ایطالیقہ، بمطالعہ رقوم شکستہ، طعن شاعری کردہ اند کہ الف را کج گفتہ و نقطہ در ”پی“ نہفتہ۔  
غریب اتفاقی ست کہ خراں را مستعد در سگاہ علوم باید فہمید۔ و خراسان را مملو آثا ر موشگانی  
باید اندیشید۔ بہمہ حال، ورق صحبت جہلا گرداندنی ست۔ و بکوری خفا شان خطوط شعاع  
آفتاب خواندنی۔“ (۵۹۰)

ان پر آشوب دنوں میں لوگوں کی طبیعتوں میں ایک بدظمی پیدا ہو گئی ہے کہ ہرزہ خیالی کے  
فنا حضرات کے پاس گدھوں کے گوبر کی گلیوں کی گرد چھاننے کے سوا کوئی اچھی مصروفیت نہیں ہے۔  
”جنت کی ت“ سے جو کتابوں کی کتابت میں ”ت“ کے سوا کچھ اور نہیں شمار کیا جاتا ہے۔ ”ت“ کا عدد  
تلتے ہیں۔ اس سے پہلے بھی اس گروہ کے مورخ اساتذہ حضرات شکستہ تحریروں کے مطالعہ کے بعد  
شاعر طعن کرتے رہے ہیں جس نے ”الف“ کو ”کج“ پڑھا اور ”پی“ میں نقطہ چھپا رکھا۔ عجیب وغریب  
انتق ہے کہ گدھوں کو در سگاہ علوم کا با استعداد طلباء سمجھا جائے اور ریچھوں کو موشگافی کی خصوصیات کا  
تصور کیا جائے۔ بہر حال جاہلوں کی صحبت کا ورق اس لائق ہے کہ اس کو پلٹنا چلا جائے اور  
پکا دڑوں کی کوری کے باوجود آفتاب کی کرنیں اس لائق ہیں کہ ان کے خطوط کا مطالعہ کیا جائے۔

شا کر خاں کی تصانیف کی شکل کی کوئی چیز دستیاب نہیں ہے۔ البتہ ”کلمات طیبات“ اور ”احکام  
طیبی“ کے تذکرہ کے ضمن میں ڈاکٹر نور الحسن انصاری لکھتے ہیں:

”کلمات طیبات اور احکام عالمگیری اور نگ زیب کے ان مکاتیب کے مجموعے ہیں جو اس  
کے معتمد سکرٹری عبا بیت اللہ خاں نے مرتب کئے (مآثر الامراء ۲/۸۲۹)۔ عنایت  
اللہ خاں علم و فضل اور ریاست و نجابت کی بنا پر بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔  
اور نگ زیب اس کے طرز تحریر کا شیدائی تھا۔ ان مکاتیب کی تدوین کے علاوہ مآثر عالمگیری کی  
تالیف بھی اسی کی سرپرستی میں ہوئی ہے۔ (مآثر الامراء ۲/۸۳۱)

کلمات طیبات ان رقعات پر مشتمل ہے جو اورنگزیب نے وقتاً فوقتاً اپنے سکرٹری کو لکھے تھے۔

ملک رقتات پر اورنگ زیب کے دستخط ہوتے تھے اور سرکاری کام تھا کہ انہیں مفصل خط کی شکل دے (تاریخ المراءۃ/۲/۸۳۱) احکام عالمگیری ان احکام پر مشتمل ہے جو اورنگ زیب نے عنایت اللہ خاں کی معرفت بھیجے تھے۔ ان پر اورنگ زیب کا دستخط نہیں تھا بلکہ سرکاری خود ہی مفصل خط لکھ کر خدمت میں پیش کرتا تھا۔ (تاریخ المراءۃ/۲/۸۳۱) (۵۹۱)

کرم اللہ خاں مخاطب بہ عاقل خاں:

کرم اللہ خاں مخاطب بہ عاقل خاں شکر اللہ خاں کے سب سے چھوٹے صاحبزادے کا نام ہے۔ وہ ایک حد تک شاعرانہ ذوق کا حامل تھا اور اپنا تخلص عاشق اختیار کر رکھا تھا۔ بقول خوشگودہ بیدل سے مشق سخن کرتا تھا اور اس کے شاگردوں میں اسے جانشینی کا مقام حاصل تھا۔ بہادر شاہ کے عہد میں اسے لاہور کی دیوانی کا عہدہ ملا ہوا تھا اور وہاں سے خط و کتابت اور مراسلات کے ذریعہ بیدل سے استفادہ کرتا تھا۔ ۱۱۱۴ھ ۱۷۰۲ء میں اسے عاقل خاں کا خطاب ملا۔ بیدل نے اس مناسبت سے ایک تہنیت نامہ جو مادہ تاریخ پر مشتمل ہے کہا۔ اس کے ہر فقرہ سے ۱۱۱۴ھ نکلتی ہے۔

”پیشگاہ کرم انتساب، جم کو اکب فیاض، کرم اللہ خاں بمنصب خانی مبارکباد۔“ (۵۹۲)

بیدل کا عاقل خاں سے تعلق بھی اس کے باپ اور بھائیوں کی طرح مخلصانہ رہا ہے۔ خان موصوف کے نام بیدل کے ۱۶ خطوط ہیں ان میں چار مبارکباد اور اظہار مسرت سے وابستہ ہیں، تین اشتیاق ملاقات، تین تعزیت اور دو تحائف بھیجنے اور دو شعر و سخن سے وابستہ ہیں۔ یہ سب اس کی ہمہ جہت روابط کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ۱۰۸۵ھ میں کرم اللہ خاں کی شادی کے موقع پر بیدل لاہور میں تھا وہاں سے اس نے تاریخ شادی اور لاہور سے اپنی واپسی پر مشتمل ایک تاریخ اس کے پاس بھیجی:

”کلک آرزو سلک، بہ عرض این مطلع میمنت نگار تاریخ زمان درود است۔“

جنت عیش و طرب خادماں ہمد بزم کرم اللہ خان (۱۰۸۵ھ)

(۵۹۳)

۱۱۱۸ھ ۱۷۰۶ء میں کرم اللہ خاں کے ہاں لڑکی اور لڑکے کی پیدائش کی مناسبت سے جو ایک ہی ہفتہ میں پیش آئی بیدل نے کہا:

”دمیدن طرب ماہ و آفتاب مبارک۔“ (۵۹۴)

اعظم شاہ اور معظم شاہ کے درمیان جنگ جانشینی میں تینوں بھائی معظم شاہ کی طرف سے لڑ رہے تھے۔ بیدل نے بہادر شاہ کی میاں بی کی مناسبت سے کرم اللہ خاں کے نام ایک خط میں مبارکباد پر مشتمل

یہ مادہ تاریخ نکال کر بھیجا جس کا تذکرہ پہلے ہوا۔ اسی خط میں نواب سے اپنے غیر معمولی تعلق کا اظہار اس طرح کرتا ہے:

”پیدا است کہ مارا در پیج حالتی، مشغول امری دیگر نداشته اندونی دارند۔ وغیرہ از تخم مہر یکہ روشن است در طینت اخلاص سرشت نکاشته اندونی کارند۔ ہر نوید یکہ از حدیقہ شگفتگی آن ذات مجوش می رساند از اس رمز ہای تصویر نمی توان کرد کہ فردوس برنگ آمیزی بہارش، بساط گلر وشی تواند چید۔“ (۵۹۵)

ظاہر ہے کسی بھی صورت میں ہم کو کسی اور امر نے مشغول رکھا ہے نہ رکھے گا اور طینت اخلاص سرشت میں محبت کے سوا کسی اور چیز کا تخم بویا ہے نہ بویے گا۔ ہر وہ خوشخبری جو اس ذات کے باغ کی فصل سے کان تک پہنچتی ہے اس سے حاصل ہونے والی مسرت کا وہ عالم ہے کہ اس کے رمز کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ فردوس اس کی رنگ آمیزی میں گلر وشی کا بساط بچھائے گا۔

دوسرے خط میں لکھتا ہے:

”گاہی لغزش خامہ راء عصای طریقہ توکل می پندارد، تا بہوای آن آستان خود را بجای تواند

رساند۔ گاہی دامن قاصد راء، وسیلہ امیدی می انگار و تا بخیاں آن سر راہ غبار حیرتی تواند

افشاند۔“ (۵۹۶)

کبھی لغزش خامہ کو شیوہ توکل کا عصا تصور کرتا ہے تاکہ اس آستان کی خواہش میں خود کو کسی مقام تک پہنچا سکے۔ اور کبھی قاصد کے دامن کو وسیلہ امید قرار دیتا ہے تاکہ اس کے تصور میں سر راہ حیرت کی غبار افشانی نہ کر سکے۔

ایک اور خط میں لکھتا ہے:

”حصول آرزو ہا از حدیث و عجز مراتب بید لیہا ہمہ جایش۔ اگر قدم براہ می گذارد، سراز

زالونی تواند برداشت۔ و اگر سر بہ پیش می آگند، اعتماد بر قدم نمی تواند گذاشت۔“ (۵۹۷)

اشتیاق ملاقات حد سے کہیں زیادہ ہے پر بیدل کی عجز و بے بسی ہر جگہ آڑے آتی ہے اگر قدم اٹھاتا ہے تو سر زانو سے نہیں اٹھا سکتا اور اگر سر اٹھاتا ہے تو قدم پر بھروسہ نہیں کیا سکتا۔

یہ تعلق اور گرویدگی اور یہ عشق و شگفتگی نواب موصوف کے اخلاق حمیدہ اور اس محبت آمیز سلوک کا نتیجہ ہے جو وہ بیدل کے ساتھ کرتا تھا۔ چنانچہ بیدل نے اپنے متعدد خطوط میں اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے:

”لله الحمد از ساز محاسن اوضاع شفقت انتفاع، آنچہ بتر می یابد، نازش گوش خیریت نبوش

است۔ واز عالم حامد اطوار مکرمت ایثار، ہرچہ تامل می رسد، مفرح ہوش جمعیت۔“ (۵۹۸)  
اللہ کا شکر ہے شفقت آمیز حالات کے محاسن کے ساز سے جو راگ سنائی دے رہا ہے وہ گوشِ خیریت نیوش کیلئے مایہ ناز ہے اور اخلاق مکرمت آثار کی خوبیوں کی بابت جو باتیں سامنے آ رہی ہیں وہ ہوش جمعیت کے لئے فرح بخش ہیں۔

”اگر مایہ صحتی ست، یا درام شفقت و اقبال ست۔ و اگر دستگاہ جمعیتی، تصور اخلاق مرحمت اشتمال۔“ (۵۹۹)

اگر صحبت کی کوئی چیز قابل اعتناء ہے تو جناب والا کی مراحم امیرانہ اور شفقت کریمانہ کی یاد ہے۔ اور اگر سکون و جمعیت کا کوئی سہارا ہے تو مرحمت آمیز اخلاق کا تصور۔

اس کے مقابلہ میں بیدل کا سلوک بھی بالکل اسی طرح کا محبت انگیز اور خلوص آمیز تھا۔ نہ صرف رقعات میں بلکہ عملی زندگی میں بھی وہ اس کا مظاہرہ کرتا رہتا تھا۔ چنانچہ خوشگو لکھتا ہے:

”نواب ذوالفقار خاں کہ مبلغ دو صد اشرفی بخدمت مرزا نیاز گدرا نیدہ بود ہمہ آزار با عاقل خاں بخیدہ بودند کہ در آن وقت از طرف خرچ معسر بود۔“ (۶۰۰)

ایک دفعہ نواب ذوالفقار خاں نے دو سو اشرفیاں مرزا کی خدمت میں بطور نذرانہ کے بھیجیں۔ بیدل نے ساری رقم اٹھا کر لطف اللہ خاں عرف عاقل خاں کو بھیج دی جو اس زمانہ میں مالی مشکلات سے دوچار تھا۔

جہاں تک ان کے تعلقات کے ادبی پہلو کا تعلق ہے خوشگو اور بیدل کے بیانات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے دو بڑے بھائیوں کی بہ نسبت اسے شعر و شاعری سے کچھ زیادہ تعلق تھا اور بڑی حد تک شاعرانہ ذوق کا حامل تھا۔ خوشگو لکھتا ہے:

”غزلی در شکوہ دیر رسی خطوط بخدمت مرزا فرستادہ بود۔ آنجناب بعد مطالعہ فرمودند: فکر عاشق ہمہ معشوقانہ افتادہ و او خود پایہ فکر از ماہم گذرانیدہ، لیکن چون خاطرش عزیز است موافق استدعائش اصلاح لفظی در مطلع او ہم باشد مطلع ایں است۔“

خطوط کے تاخیر سے پہونچنے پر اس نے شکایت کے طور پر مرزا کو ایک غزل روانہ کی تھی۔ مرزا نے مطالعہ کے بعد فرمایا: عاشق کی فکر سراسر معشوقانہ ہے اس نے اپنے فکر کا پایہ ہم سے کہیں بلند کر دیا ہے لیکن چونکہ اس کی دلداری عزیز ہے اس لئے حسب استدعا مطلع میں معمولی لفظی اصلاح کر دی۔ یہ ہے:

یادی ز ما نمی کند آن آشنای ما از مادرش پر است کہ خالی ست جای ما (۶۰۱)

(وہ میرا آشنا دوست مجھے یاد نہیں کرتا، اس کا دل ہم سے بھرا ہوا ہے یا ہماری جگہ اس میں خالی ہے)۔ مرزا صاحب نے لفظ (آشنائے ما) کی جگہ (بے وفائی ما) کر دیا۔

بیدل کے خط سے بھی واضح ہوتا ہے کہ عاقل خاں نے ایک غزل اسے بھیجی تھی۔ بیدل نے اس کی بے انتہا تعریف کرتے ہوئے لکھا:

”بمطالعہ غزل معارف مثل، خمستانی بجوش آوردہ کہ زبان شکستہ بیان، از ساغر تقریرش، خط بر کیفیات لغزش متان کشید۔ و نگاہ حیرت عنوان، ہماشای تحریرش، سررشتہ مستی تا سر مژگاں رسانید۔“ (۶۰۲)

غزل معارف مثل کے مطالعہ نے ایک ایسے خمستان میں ابال پیدا کر دیا کہ زبان شکستہ بیان نے اس کے ساغر تقریر سے شرایوں کی لغزش پا کی کیفیت پر خط کشی کر دی (یعنی بہت زیادہ کیف پرور کر دیا ہے) اور نگاہ حیرت عنوان نے اس کی تحریر کا تماشا دکھ کر مستی کا سررشتہ پلکوں کے سر تک پہونچا دیا (انتہائی وجد آور ہے)۔

تبصرہ کا یہ انداز بتاتا ہے کہ عاقل خاں ایک نہایت عمدہ غزل گو شاعر تھا اس کے باوجود دوسرے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیدل کی نثر کو آسانی سے نہیں سمجھ سکتا تھا۔ بیدل اس کو دوسرے انداز سے بیان کرتا ہے:

”تکلف وضع عبارات، محل معنی تحقیق مباد۔ و تصنع طرز تحریر تصنیع اوقات حضور میناد۔“ (۶۰۳)

عبارتوں کی پر تکلف شکل خدا کرے معانی تحقیق کے سمجھنے میں خلل انداز نہ ہو اور طرز تحریر کا تصنع باب دالا کی تصنیع اوقات کا سبب نہ بنے۔

افسوس کہ بارخ ادب کا یہ نو نہال جلد ہی مرجھا گیا اور عین جوانی کے عالم میں ۱۱۲۳ھ میں خدا کو راہ ہو گیا۔ بیدل جو اسے دل کی گہرائیوں سے چاہتا تھا اس کی وفات کی خبر سن کر اتنا رنجیدہ ہوا کہ اس کی آنکھیں اٹھلبار ہو گئیں۔ (۶۰۴)

### قیم خاں فدائی:

قوم خاں فدائی، عاقل خاں رازی کا لڑکا، شکر اللہ خاں کا نسبتی بھائی اور لطف اللہ خاں، شکر خاں اور کرم اللہ خاں کا ماموں تھا۔ اس کا تذکرہ اصولی طور پر اس کے باپ کے تذکرہ کے فوراً بعد کرنا تھا مگر بیدل کے اس سے تعلقات کے نوعیت کے لحاظ سے اس خاندان کے آخر میں اس کا تذکرہ

کچھ جاتا ہے۔ قیوم خاں کے نام اپنے ایک خط میں بیدل پورے خاندان کی تعریف اس طرح کرتا ہے:

”لہذا الحمد از تہذیب اخلاقیہ شایستہ اس خاندان کرم آستان است، آنچہ می شنود، گوش محمد نیوش، ذخیرہ سعادت می انپارد۔ و از حسن اطواریکہ خاصہ این سلسلہ جہان تخیر است، ہرچہ بسبح می رسد، امید جمیعت نصیب غنیمت برمی دارد۔“ (۶۰۵)

اس خاندان کرم عنوان کے شایان شان جس تہذیب و اخلاق کا چرچا سنا کرتا تھا الحمد گوش محمد نیوش (تعریف سننے والا کان) اس سے سعادت کی ذخیرہ اندوزی کر رہا ہے اور اس سلسلہ جہاں تخیر کے مخصوص حسن اوصاف کی بابت جو کچھ کان میں پہونچا کرتا تھا اس سے پر برکت سکون و جمیعت خاطر کی امید وابستہ ہے۔

اس اقتباس کا تذکرہ شروع میں بھی کیا گیا ہے۔ اب تک اس خاندان کے ہر ایک فرد کے حالات تفصیلی طور پر ذکر کئے گئے ہیں۔ اس خاندان سے بیدل کے وسیع اور ہمہ جہتی تعلقات اس کے اس دعویٰ کی توثیق کرتے ہیں جس کا اس خط میں ذکر کیا گیا ہے۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ بیدل درحقیقت اس خاندان کے اوصاف پسندیدہ اور اخلاق حسنہ کا عاشق و شیدا تھا۔

پتہ نہیں چلتا کہ قیوم خاں کس عہدہ پر فائز تھا لیکن ایک خط سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱۱۹ھ میں جنگ جانشینی کے وقت وہ بہادر شاہ شاہ عالم کی طرف سے لڑ رہا تھا۔ قیوم خاں نے اس زمانہ میں بیدل کی طرف سے یاد آوری میں غفلت برتنے کی شکایت کی۔ بیدل نے اسے تسلی اور خدائے تعالیٰ سے اس کے لئے سلامتی کی دعا کی:

”در جمیع احوال سلامت ذات تقدس آیات دلیل شکر ایزدیت۔“ (۶۰۶)

تمام حالات میں ذات تقدس آیات کی سلامتی شکر خدا کی دلیل ہے۔ قیوم خاں کے نام بیدل کے خطوط کی تعداد رقعات بیدل مطبوعہ نولکشور میں پانچ ہے اور ایک خط مجمع الانشاء تالیف محمد امین میں پایا جاتا ہے۔ اس طرح ان خطوط کی کل تعداد چھ ہوتی ہے۔

ان خطوط کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ بیدل کے قیوم خاں سے روابط بھی ہمہ جہتی تھے۔ دیکھ سکتے اور غم و خوشی ہر حال میں بیدل اس کا شریک دکھائی دیتا ہے۔ ۱۱۲۲ھ میں قیوم خاں کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اس موقع پر بیدل نے ایک تاریخ کہی:

”طلوع نیر رتبہ و اقبال، آثار افسردہ جاہ و جلال، آرائش مجلس عزت الخ۔“ (۶۰۷)

قیوم خاں اکثر و بیشتر تحفہ تحائف مثلاً آم وغیرہ بیدل کو بھیجا کرتا تھا۔ بیدل شکر یہ کے طور پر لکھتا ہے:

”ار سال انبہ ہای منتخب کہ ہر یک از لذت سر بستہ، نوید ذوقی تمام داشت، تلخکامان زاویہ بیدلان، از دل تازبان، بچا ہنہای حصول شکر پناشت۔“ (۶۰۸)

منتخب آموں کے ارسال نے جن میں سے ہر ایک لذت سر بستہ سے ذوق تمام کی خوشخبری ملتا ہے، زاویہ بیدلان میں مقیم تلخ کاموں (خود بیدل اور اس کے احباب مراد ہیں) کو دل سے زبان شکر کی چاشنی سے پر کر دیا۔

ان کے تعلقات کے ادبی پہلو کا جہاں تک تعلق ہے بعض خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ قیوم خاں ایک صاحب ذوق آدمی تھا۔ وہ شاعری بھی کرتا تھا اور دلنشین نثر بھی لکھتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے ایک نزل بیدل کو بھیجی، بیدل نے اس کی تحسین کرتے ہوئے لکھا کہ وہ سدا اسی قسم کے تحفوں کے انتظار میں رہتا ہے:

”لہذا الحمد امرو ز سامان بخش جمیعت مجوران و رود اتفاقی غری ست کہ مغزل فطرت فلکی را، در مقابل ہمواری عباراتش بیچ و تاب رسیدن است و بآبداری طراوتہای معانیش، مومج گوہر را خاک گردیتی لیسیدن۔ فیض تسلسل این جنس ادوار تہمت تحلیل میناد۔“ (۶۰۹)

بجز اللہ آج مجبوروں کو سکون خاطر بہم پہونچانے والی چیز ایک ایسی غزل کی اتفاق آمد ہے کہ فطرت فلکی کے مغزل (عاشقانہ غزل) کو اس کی عبارتوں کی ہمواری کے سامنے بیچ و تاب کھاتے ہی بنے گی۔ اور اس کے معانی کی تازگی کی چمک دمک کے مقابلہ پر مومج گوہر کو گردیتی کی خاک سے لت پت بنے بغیر چارہ نہیں۔ خدا کرے اس قسم کے تحائف کی آمد کا سلسلہ بند نہ ہو۔

اسی طرح اس نے اپنا انشاء نامہ بیدل کے پاس بھیجا اور بیدل نے اس طرح اپنے تاثرات کا اظہار کیا:

”لہذا الحمد ورود افکار معانی انوار، چراغ کلبہ بی برگ و نوار امداد و غنی می فرماید۔ و کشاد نامہ شفقت شامہ، بروی بستگیہای دل مایوس، در امید کی کشاید۔ تو اتریاد آور یہاں ہمیم۔ بایں مرثدہ تسلی نواست کہ شخص نسیان مال سابق اعتبار، بدرس فراموشی می رساند و تجدید مرام قدیم، بایں تازگی نوید رسان کہ بہار مدعای رنگ اقبال گردانند فی داند۔“ (۶۱۰)

افکار معانی انوار کا ورود بجز اللہ کلبہ بے برگ و نوا کے چراغ کو روغن فراہم کر رہا ہے۔ شرفقت شامہ کی کشاد دل مایوس کے بندھوں پر امید کا دروازہ وا کرتی ہے۔ عام یاد آوری کا تسلسل خوشخبری کی تسلی دے رہا ہے کہ نسیان مال سابق اعتبار شخص کو فراموشی کا درس دے اور مرام دیرینہ کی تجدید اس تازگی کی نوید پہونچا رہی ہے کہ رنگ اقبال کی بہار مدعا منصرف ہونا نہیں جانتی۔



ان خطوط سے قیوم خاں کی نثر و نظم کی تحریف تو واضح ہے ہی اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بیدل کے لئے عالم تنہائی اور خلوت میں جو چیز خوشی کا سبب ثابت ہوتی تھی وہ شاعری کے علاوہ دوستوں کے ساتھ نامہ نگاری اور منشور و منظوم تخلیقات کے تبادلے تھے۔

عبدالقیوم خاں کی وفات ۱۲۳۳ھ ۱۷۱۷ء میں ہوئی۔ بیدل نے اس مناسبت سے سے درج ذیل

قطعہ کہا ہے:

عبدالقیوم خاں دریا ہمت چوں کرد ازیں سرای فانی رحلت  
تاریخ و فائش بحساب تحقیق شد: گوہر مقبول محیط رحمت (۱۱۲۳ھ) (۶۱۱)

میر عبدالحئی:

میر عبدالحئی، محمد عسکری حسین مؤلف ”صحائف شریف“ کے مطابق عاقل خاں رازی کا بیٹا اور بیدل کا ایک مخلص دوست تھا یہ بڑی صلاحیتوں کا مالک تھا بیچہ اجل نے اسے مہلت نہ دی کہ اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر سکے اور عین جوانی کے عالم میں دنیا سے کوچ کر گیا۔ محمد عسکری نے میر عبدالحئی کے نام بیدل کے دو خطوط کا تذکرہ اپنی کتاب صحائف شریف میں کیا ہے جو بیدل کے رفعت کے کئی کئی مضامین یا قلمی مجموعہ میں نظر نہیں آئے اس لئے ان کو یہاں جوں کا توں نقل کیا جاتا ہے۔

”نیاز یکہ در معبد اندیشہ با معنی تسلیم می ساخت بمقتضای بی طاقی از صورت خطاب جبہ فرسا، و دعائیکہ در پردہ نفس با ساز طلبیدن بی پرداخت، بحکم بی اختیاری در کسوت نامہ بال کشا۔ آبلہ پایان راہ مقصود را ذکر کعبہ طلب ہم جمعیت وصال است و عاجز کفایان عالم شہود را خیال دولت و دیدار نیز آئینہ داری منصب کمال۔ تا حضور وصل دریدہ مشتاق بود، دل فراغی داشت از حیرت بیانیہای خط۔“

وہ نیاز جس نے فکر کی عبادت گاہ میں معنی ”تسلیم“ کے ساتھ ہماہنگی پیدا کر لی تھی اپنی ناتوانی کے حسب اقتضا خطاب کی شکل میں جبہ فرسائی کر رہی ہے اور وہ دعا جو پردہ نفس میں ساز طلب میں مشغول تھی بے اختیاری کے حسب اقتضا معمولی لباس میں بال کشائی کر رہی ہے۔ راہ مقصود کے آبلہ پا حضرات کو کعبہ طلب کا ذکر بھی وصال کا سا سکون عطا کرتا ہے اور عالم شہود کے عاجز کف (در ماندہ و بے بس) حضرات کے لئے دولت دیدار کا خیال بھی منصب کمال کا آئینہ دار ہوتا ہے جب تک وصل کا شہرہ مشتاقوں کی آنکھ کے لئے ایک درس ثابت ہو ان کو خط کی حیرت بیانی سے فراغت حاصل ہو چکے گی۔  
مرا ایں غنچہ صد سالہ بغیر دل کشود امشب نمی دامن گذار باد از کوی کہ بود امشب

”حیرانم نسیم کد ام جانب نخلہ سہای خوش وقتی است کہ دماغ آرزو مندوں دریافت والا خدمت را عطر آگس دارد۔ و شمیم کد ام طرف غالیہ پیر تصور می بست کہ مشام حاجتمندان عالی حضور را عنبریں (کند)۔ فی فی تو تیا ی غبار موکب صاحب و قبلہ قدردان است کہ دیدہ ردی انتظار را روشنی افزا است۔ و نور قدوم خداوند مہربان است کہ گراں گوشاں ندای ترانہ بہجت را سماع کشا۔ جان را نشانی دیگر است و دل را اختلاطی در سر۔ الحمد للہ کہ دیرین دعای ملتجیان بدرجہ اجابت رسید و ہمین تمنا بحصول پیوست۔ الحال نیاز نظر یا انداز نامہای نیست انشاء اللہ اگر حیات باقیست فردا بہلا زمت استقبال دیدہ افروز و سعادت اندوز می شود۔“ (۶۱۲)

آج رات میرا یہ صد سالہ غنچہ دل کے بغیر ہی کھل اٹھا۔ مجھے نہیں پتا کس کی گلی سے آج رات ہوا گذری تھی۔

حیران ہوں باد نسیم کس طرف خوش وقتی کی نخلہ سا (خوشبول رہی ہے) جس نے جناب والا کی خدمت میں حاضری کے مشتاقوں کا دماغ عطر آگس کر دیا اور شمیم کس طرف غالیہ پیری کا تصور کئے ہے جس نے حضور عالی کے حاجتمندوں کے مشام کو عنبریں کر دیا ہے۔ نہیں نہیں یہ صاحب و قبلہ قدردان کی سواری کے غبار کا سرمہ ہے جو انتظار کی ردی آنکھ کی روشنی بڑھانے والی ہے اور خداوند مہربان کے قدوم کا نور ہے جو علم ترانہ بہجت کی آواز او نچا سننے والوں کے کان کھول کر رکھ دینے والی ہے۔ جان کے لئے ایک اور نشاط اور دل کئے اور لذت۔ الحمد للہ کہ التجا کرنے والوں کی قدیم دعا اجابت کے درجہ پر پہنچی اور یہ تمنا حاصل ہوئی۔ اس وقت تو خط بھیج کر جناب والا کی نگاہ میں پیش ہے۔ انشاء اللہ اگر زندگی رہی تو حاضر خدمت ہو کر آنکھوں کی روشنی میں اور سعادت میں اضافہ کرے گا۔

یہ دونوں خطوط بیدل سے میر عبدالحئی کے تعلقات پر پوری طرح روشنی ڈالتے ہیں۔ اس کے وہ عنایت اللہ شاکر خان بن شکر اللہ خان کے نام اپنے ایک خط میں بھی بیدل نے میر عبدالحئی کی نوازشوں کا تذکرہ کیا ہے۔

”مہربانیہای خان صاحب الطاف مناصب و التفاتہای میر صاحب کرم مناقب از عالم تقریر برون است۔ گاہی بمقتضای بی اختیاری سری بہ سہار پوری کشد و بیاد گرامی صحبت خود را از فیض منقبت ایشان دلی می دہد۔“

اس اقتباس سے جس کو اس سے پہلے شکر اللہ خاں کے سلسلے میں نقل کیا چکا ہے اور سارے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے لکھا گیا تھا کہ خان صاحب الطاف مناقب، سے مراد شکر اللہ ہیں کیونکہ

انہوں نے ایک دور اپنی ملازمت کا (۱۰۹۰ ہجری سے پہلے) سہارنپور میں وہاں کے صوبیدار کی حیثیت سے گزارے۔ اسی خط سے معلوم ہوتا ہے کہ میر عبدالحی نے اپنے برادر نسبتی شکر اللہ خاں کے ہمراہ کچھ دنوں سہارنپور میں قیام کیا۔ بیدل جب ان کی ملاقات کو گیا تو دونوں نے اس کو اپنی عنایتوں سے نوازا اور خوب خوب ضیافت کی۔

افسوس کہ میر عبدالحی ۱۱۰۰ ہجری میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ بیدل نے اس کے سانحہ ارتحال کے موقعہ پر اس طرح مادہ تاریخ نکالی۔

در غم و اندوہ این تاریخ دل خون گشت و گفت آہ در گلزار امکان میر عبدالحی نماز

### مرزا کا مگار خان:

میرزا کا مگار خاں عمدۃ الملک مرزا جعفر خاں کا لڑکا تھا۔ مرزا جعفر کا شمار اورنگ زیب کے مقتدر امراء میں ہوتا تھا۔ ۱۰۶۸ھ ۱۶۵۷ء میں جب اورنگ زیب دارا شکوہ کے تعاقب میں پنجاب پہنچا مرزا جعفر خاں مالوہ کی صوبہ داری کے عہدے پر فائز تھا۔ اس وقت اس کے دونوں بیٹے نامدار خاں اور کامگار خاں باپ کے ساتھ مالوہ بھیجے گئے پھر ۱۰۷۳ھ ۱۶۶۲ء کے آس پاس وزیر اعظم کے عہدے پر فائز ہوا اور ایسا قیاس کیا جاتا ہے کہ میرزا کا مگار بھی پاب کے ہمراہ دہلی یا اکبر آباد واپس ہوا۔ بعض غلط فہمیوں کو دور کرنے کیلئے جن سے خوشگو کو سابقہ پڑا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کا مگار کے مختلف سالوں میں مختلف مناصب پر فائز ہونے کی تفصیل پیش نظر ہے۔

۱۰۶۸ھ ۱۶۵۷ء خلعت لے کر باپ کے ہمراہ مالوہ گیا۔

۱۰۷۲ھ ۱۶۶۱ء اس کا باپ دہلی آیا اس لئے قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ بھی دہلی آیا ہوگا۔

۱۰۷۴ھ ۱۶۶۳ء ہزار و دوسو سوار کے عہدے پر فائز ہوا اور کامگار خاں کا خطاب ملا۔

۱۰۷۵ھ ۱۶۶۴ء قیاس کیا جاتا ہے کہ باپ کے ہمراہ رہا ہے جو اس وقت وزیر اعظم کے عہدے پر

فائز تھا۔

۱۰۷۹ھ ۱۶۶۸ء داروغہ ڈاک چوکی۔

۱۰۸۰ھ ۱۶۶۹ء اس کے باپ کا انتقال ہوا اور شہزادہ نے اسے خنجر مرصع وغیرہ سے نوازا۔

۱۰۸۱ھ ۱۶۷۰ء امیر الامراء کے پاس سے رخصت حاصل کی۔

۱۰۸۶ھ ۱۶۷۵ء پانصدی دو ہزار یا پانصد ہزار کے عہدے پر فائز ہوا۔

۱۰۸۷ھ ۱۶۷۶ء منصب سے برطرف ہوا۔

۱۰۸۹ھ ۱۶۷۸ء بیوتاتی کی خدمت اس کے حوالہ ہوئی۔

۱۰۹۰ھ ۱۶۷۹ء دارالخلافہ دہلی کا قلعہ دار ہوا۔

۱۰۹۳ھ ۱۶۸۱ء اورنگ آباد میں بخشی سیوم کے عہدے پر فائز ہوا۔

۱۰۹۴ھ ۱۶۸۲ء آختہ بیگی کے عہدے پر فائز ہوا۔

۱۰۹۶ھ ۱۶۸۴ء داروغہ جلوہ بنا۔

۱۰۹۷ھ ۱۶۸۵ء داروغہ غسل خانہ ہوا۔

۱۰۹۸ھ ۱۶۸۶ء خانساں مال۔

۱۰۹۹ھ ۱۶۸۷ء خلعت، اسپ اور سہرا اور دس ہزار روپے سے نوازا گیا۔

۱۱۰۱ھ ۱۶۸۹ء اعظم شاہ کے محل کے خادموں کو شاہجہاں آباد پہنچایا۔

۱۱۱۱ھ ۱۶۹۹ء دو ہزار پانصدی کا اضافہ ہوا۔

۱۱۱۴ھ ۱۷۰۲ء ناظم صوبہ اڑیسہ ہوا۔

۱۱۱۵ھ ۱۷۰۳ء اکبر آباد کا قلعہ دار ہوا۔ (۶۱۳)

رقعات میں مرزا کا مگار کے نام بیدل کا ایک خط ہے۔ اس کے علاوہ چوتھے عنصر میں اکبر آباد میں بیدل نے ایک ادبی مقابلہ کا تذکرہ کیا ہے جو مرزا کا مگار کے اشارہ پر منعقد ہوا تھا وہاں بیدل نے مرزا کا مگار کے اخلاق حمیدہ کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔

یہ ادبی مقابلہ بیدل کے قیام اکبر آباد کے دوران ۱۰۸۱ھ تا ۱۰۸۳ھ ۱۶۷۰ء تا ۱۶۷۳ء میں پیش آیا۔ اس کا تذکرہ بیدل کے حالات کے ضمن میں ہو چکا ہے۔

بیدل کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دنوں کے درمیان انتہائی مخلصانہ روابط قائم تھے:

”منظور ابرار میر کا مگار، کہ بدلیل سعادت ازلی، اوقات گرامی مصروف خدمت فقرا

داشت۔ و در احترامیکہ لایق حال این طایفہ است و بر مقبولان جناب صمدیت واجب،

دقیقہ ای فروغی گذاشت۔ بہ حکم احسن اعتقاد، فقیر را نیز ازین فرقه تصور فرمودہ، و در ادای

شرایط التفات، مبالغہ ہائی نمود و رعایت آئین شفقت، بقدر وسع در لایق فرمود۔“ (۶۱۵)

بھلے مانسوں کا منظور نظر میر کا مگار، جس نے اپنی ازلی سعادت کی بنا پر اپنا قیمتی وقت فقیروں کی خدمت کے لئے وقف کر رکھا ہے اور اس احترام میں جو اس گروہ کے شایان شان ہے اور مقبولان بارگاہ کے لئے ضروری ہے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے۔ اسی حسن ارادت کے مطابق خاکسار کو بھی اسی بے میں شمار کرتا تھا اور بہت زیادہ میرا خیال رکھتا تھا اور اپنی شفقت و مہربانی کے پاس و لحاظ میں

حتی الامکان کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا تھا۔

اس ادبی مقابلہ کے آخر میں ایک غزل کے ذریعہ اس ادبی مقابلہ کے محرک کامگار خاں اخلاق حمیدہ کو اس طرح بیان کیا ہے:

پیش چشم جلوہ فرماید بچندیں اقتدار  
شوخ گردی ز راہ میرزای کامگار  
مرزا کامگار کے راستہ سے گرد کی شوخی مختلف انداز سے میری نگاہوں کے سامنے جلوہ گر ہوئی۔  
خادم اہل صفا، مخدوم ارباب وفا  
ناظر حسن ازل، منظور فضل کردگار  
اہل صفا کا خادم، ارباب وفا کا مخدوم، حسن ازل کا ناظر، اور فضل کردگار کا منظور۔

آنکہ در اندیشہ عرض تمنا پیش او  
تا نفس بر دل رسانی رفتہ گیر از دل  
جس کے سامنے عرض تمنا کی فکر میں جب تک جب تک سانس دل تک پہنچے دل سے

جاتا رہتا ہے۔  
آرزوی نظم و نثری داشت طبع روشنش  
شوق گرد انگینت تا این جلوہ ہا شد آشکار  
اس کے طبع روشن میں نظم و نثر کی خواہش پیدا ہوئی تو شوق نے گرد انگیزی کی تا آنکہ یہ جلوہ آشکار ہوئے۔

عالم موہوم پیہم شوخی نیرنگ نیست  
می دہد اینجا نفس صبح قناعت درین  
وہی دنیا نیرنگیوں کی لگا تار شوخی کا نام نہیں ہے۔ سانس یہاں صبح قناعت سے ہم آغوشی کرتی ہے۔  
ذره ہا از پر زدن خورشید انشا کردہ اند  
سخت سامان چراغاں داشت این مشت غبار  
ذروں نے اپنی پرواز سے آفتاب ایجاد کر دیئے ہیں اس مٹھی بھر غبار کے پاس چراغاں بہت سے سامان تھے۔

مدعا این بود کز گرد خیال انگینت  
دیدہ غفلت نگاہ چند گرد سرمہ  
مقصد یہ تھا کہ خیال انگیزی کی گرد سے دیدہ غفلت نگاہ میں کچھ سرمہ لگ جائے۔

دوستاں را خواب گل زین گرد مژگاں پرورست  
حاسد اینجا سوش الماس گو در دیدہ کار (۶۱۶)  
اس گرد سے احباب کے حق میں خواب گل مژگاں پرور ہے (انہیں بے انتہا لطف آئے گا) اور

حاسدوں سے کہہ دو کہ آنکھوں میں میرے کا برادہ بھر لیں۔

حیرت ہوتی ہے کہ اس قدر قرب اور خلوص کے باوجود خان موصوف کے نام بیدل کا صرف ایک خط پایا جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کے روابط زیادہ تر مجلسی صحبتوں اور وہ بھی اکبر آباد اور دہلی تک محدود رہے ہیں۔ اس خط کا عنوان ہے ”عذرنا رسیدن باستقبال میرزا کامگار و نوید مقدم ایشاں“۔

کے مضمون سے معلوم نہیں ہوتا ہے کہ کس تاریخ میں کہاں لکھا گیا۔ بیدل جس کو کامگار کی تشریف آوری کی خبر تھی بعض مجبور یوں کی وجہ سے اس کے استقبال کو نہیں پہنچ سکا۔ پھر اس نے گھوڑے پر سوار ہو کر اس کی ملاقات کو جانا چاہا مگر زین کے گم ہو جانے کے باعث یہ بھی ممکن نہ ہوا۔ اس بنا پر اس نے افسوس ظہار کیا اور یہ امید ظاہر کی کہ وہ خود اس کے گھر آئے گا:

”پہ تحصیل سعادت صحبت، کہ بہشت ہوا خواہاں عالم عقیدت است، اگر سایہ وار قدم از  
جبین سازد رواست۔ و اگر چوں شبنم بدیدہ پرواز نماید بجا۔ اما بنگم نارسا میہا، کہ سدر راہ آرزو  
مباد، از زمین گیری چارہ نیست ازل“۔ (۶۱۷)

بیدل کے حالات کے تذکرہ میں جیسا کہ پچھلے صفحات میں گذرا بندر بن داس خوشگوار نے لکھا ہے کہ اعظم شاہ کو اپنا استعفا پیش کرنے کے بعد بیدل بہار اور اڑیسہ روانہ ہوا اور وہاں سے میر کامگار کے حسب ہدایت ہندوستان پہنچا اور کچھ دنوں اکبر آباد میں قیام کیا۔ (۶۱۸)

مرزا کامگار کی مختلف عہدوں پر تقرری واضح کرتی ہے کہ خوشگوار غلط فہمی ہوئی کیونکہ مرزا کامگار ۱۱۱۴ھ ۱۷۰۲ء میں اڑیسہ کا ناظم مقرر ہوا۔ جبکہ بیدل کی مسافرتوں کی ترتیب بتاتی ہے کہ ۱۰۷۶ھ ۱۶۶۵ء میں دہلی اور شامی ہند آنے کے بعد وہ دوبارہ اڑیسہ نہیں گیا اور کم از کم خود خوشگوار کے بقول ۱۰۹۶ھ ۱۶۸۳ء سے آخر دم تک بیدل نے دہلی میں مستقل قیام کیا اور لگاتار ۳۶ سال وہاں گزارے۔ (۶۱۹)

امیر الامراء سید حسین علی خاں:

بقول آزاد بلگرامی سید عبداللہ خاں، سید حسین علی خاں اور سید نور الدین خاں یہ تینوں بھائی بہرہ کے سادات اور ہندوستان کے شرفاء میں شمار کئے جاتے تھے خصوصاً اول الذکر دونوں بھائی اونچے عہدوں پر فائز تھے۔ بڑے بھائی سید عبداللہ خاں کو قطب الملک کا خطاب ملا ہوا تھا اور فرخ سیر کے دربار میں وزیر اعظم کے عہدہ پر فائز ہوا جبکہ سید حسین علی خاں امیر الامراء کے منصب پر فائز تھا۔ دونوں بھائی اخلاق حمیدہ، اوصاف پسندیدہ اور شجاعت و بسالت کے پیکر تھے۔ اور ملکی نظم و نسق میں انہوں نے اہم رول ادا کیا۔

سید حسین علی خاں کو اورنگ زیب کے عہد میں خان دوراں کا خطاب ملا۔ اس کے بعد اورنگ آباد کی حراست کا کام ان کے سپرد ہوا۔ اعظم شاہ اور معظم شاہ کے درمیان جنگ جانشینی کے وقت تینوں بھائی شاہ عالم معظم شاہ کی طرف سے اس کے لڑکے معز الدین شاہ کے لشکر میں لشکر کی ہراولی کا وظیفہ نبام دے رہے تھے اور بڑی دلیری سے داد شجاعت دیتے ہوئے تیسرا بھائی نور الدین خاں اس

ہر کے میں جاں بحق ہوا۔ اول الذکر دو بھائی زخمی ہوئے۔ حسین علی خاں کو پہلے اجیر کی صوبہ داری پھر الہ آباد کی صوبہ داری سپرد ہوئی (۶۲۰)۔

رقعات بیدل مطبوعہ نولکشور و کابل و تہران میں ایک خط تو واضح طور پر حسین علی خاں کے نام ہے۔ ”بہ حسین علی خاں بہادر در جواب استدعای اشعار و تمثیل مصرع“ باقی سات خطوط حسین قلی خان بہادر کے نام ہیں جن میں پانچ اپنے مضمون کے لحاظ سے چھین قلیج خان نظام الملک آصف جاہ کے نام معلوم ہوتے ہیں مگر کاتب کے سہو سے چھین قلیج خان ہر جگہ حسین قلی خاں ہو گیا۔ مرزا کے زمانے میں حسین قلی خان نام کا کوئی امیر نہ تھا اس لئے یہ خطوط یا تو امیر الامرا حسین علی خاں کے نام ہیں یا چھین قلیج خان نظام الملک کے نام ہیں۔ جیسا کہ آگے چل کر نظام الملک کے سلسلے میں واضح کیا گیا خطوط کے مضامین اور نواب نظام الملک کے حالات سے ان کی ہم آہنگی کی بنا پر یہ خطوط اور دوسرے دو خطوط جو صرف خاندوران کے نام ہیں اصل میں چھین قلیج خان کے نام ہیں جو سہو کاتب سے حسین قلی خان ہو گیا۔ اس طرح ایک خط جو صاف طور پر حسین علی خاں کے نام ہے وہ بھی اپنے مضمون کے لحاظ چھین قلیج خان کے نام معلوم ہوتا ہے۔ صرف ایک خط جس میں دکن سے اکبر آباد آنے کا تذکرہ ہے اور وہ بھی حسین قلی خان کے نام ہے واضح کرتا ہے کہ امیر الامرا حسین علی خاں کے نام ہے آزاد بلگرامی اسی خط کا حوالہ دے کر بیدل کے سید حسین علی خاں سے روابط پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

”مرزا کا امیر الامرا حسین علی خاں سے بھی گہرا تعلق تھا۔ جس زمانے میں امیر الامرا دکن کے علاقہ کا نظم و نسق سنبھالے ہوئے تھا مرزا نے شاہجہاں آباد سے یہ اشعار اس کو لکھ بھیجے: اے نشہ پیمانہ قدرت بچہ کاری ہستی اثری یا پئی تاراج خماری اے پیمانہ قدرت کے نشہ! کس کام میں جئے ہو؟ وجود کا کوئی اثر ہے یا اسے تاراج کرنے میں مست ہو۔

می در قدحی، گل بسری، جام بدستی رنگ چینی، موج گلی، جوش بہاری پیالے میں شراب، سر پر پھول اور ہاتھ میں جام لئے ہو، یا چمن کا رنگ، پھول کی موج، یا موسم بہار کا اہال بنے ہوئے ہو۔ (۶۲۱)

ان کے نام دو خطوط سمجھ سکتے ہیں کہ بیدل کی قدر افزائی کے علاوہ انہوں نے اس کی حمایت اور سرپرستی بھی کی تھی جو علامت ہے ان کے اعلیٰ روابط کی۔ بیدل اس کے احسانات کی شکر گزاری میں لکھتا ہے:

”سبحان اللہ حضرت حق را خاصا مندمتاز با یقائے رعایت بے زبان عرض احتیاج و مامور

بامداد بے دست و پایاں تھیر مزاج۔ جرأت شکر عطیات ہم از جناب کبریا مسکت نمودن است، تا بے نوائی بتقدیم عجز بیانی تو اند پر داخت۔ و با ظہار سپاس کرامت ہماں از حضرت اودتمس گردیدن، تا بیدلی طرح ثنائی تو اند انداخت۔“ (۶۲۲)

سبحان اللہ خدائے جل جلالہ کے کچھ خاص بندے ایسے بھی ہیں جو ایسے لوگوں کا خاص طور سے خیال رکھتے اور مدد کرتے ہیں جو اپنی ضروریات اپنی زبان سے نہیں بیان کرتے اور معذور و مجبور ہیں اور مزاج۔ عطیات کی شکر گزاری کی جرأت کے لئے بھی خدائے جل جلالہ سے ہی درخواست کرنی ہے تاکہ بے کس اپنی عجز بیانی کو اس کے حضور پیش کر سکے اور بیدل تعریف و ستائش کی طرح ڈال سکے۔

سید میر قاسم عرف قدرت اللہ قادری نے ایک واقعہ لکھا ہے جس سے بیدل کے بیان کی توثیق ہوتی ہے۔ مرزا نے جب شیوہ فقر کو اپنا اصول زندگی بنایا تو ایک دن راستہ میں امیر الامراء سے اس کی ملاقات ہوئی اگرچہ وہ اس کے دیرینہ آشنا تھے لیکن نواب موصوف کے سر پر اس وقت ایک مخصوص قسم کی دستار تھی جس کو ”دستار گاہی پر کالہ سوتی“ کہتے تھے اس لئے مرزا اس کو نہ پہچان سکا اور عالم دارنگی میں آنے کے باعث اس کو سلام کرنے میں پہل بھی نہ کر سکا۔ نواب نے اسے پہچان لیا اور اس کے گھر اس کا پیچھا کیا۔ آخر اپنی پاکی پر سوار کر کے اسے اپنے گھر لایا اور تین دن تک اس کے ساتھ اپنی محبت کا سلسلہ جاری رکھا۔ رخصت کرتے وقت سواری اور دو لاکھ روپے کی پیش کش کی۔ مرزا نے نواب کے اخلاق کی بنا پر اسے اس وقت تو قبول کر لیا لیکن آبروئے فقر کی پاسداری نے اسے واپس کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس لئے انتہائی دانشمندی سے درخواست کی کہاں فقیر کا غریب خانہ اور کہاں یہ خیر رقم؟ اسے امانت کے طور پر اپنے پاس ہی محفوظ رکھئے، ضرورت پڑنے پر جناب والا سے لے لیں گے۔ (۶۲۳)

ہمیں نہیں معلوم یہ واقعہ کس حد تک درست ہے لیکن چونکہ بیدل نے خود ہی اس کے احسانات کا اعتراف کیا ہے اس لئے ہم دوسرے مراجع کی بنا پر اس کی تصدیق یا تردید کی ضرورت نہیں محسوس کرتے۔ اس قسم کے محبت آمیز سلوک کی بنا پر بیدل اسے بہت چاہتا تھا۔ دوسرے خط میں بھی جس کا عنوان ہے ”بہ حسین علی خاں بہادر ہنگام آمدن ایشان از دکن بہ اکبر آباد و شہ ای از آگاہی وفات فرزند البند“ اسی احسان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

”دست دعای فقراء در مقابل احسان بے ریا آں ہمہ سامان بلندی نداد کہ از سرنگو نیہای نارسائی بر آید۔ و زبان ثنائی بے نوائیاں در برابر الطاف عمیم آں قدر سرما یہ اقتدار نمی یابد کہ بال تحریک نفس کشاید۔“ (۶۲۴)

”بیدل کی لاہور کی طرف فرار“ کے زیر عنوان لکھا جائے گا۔

سید عبداللہ خاں:

امیر الامراء سید حسین علی خاں کے حالات میں ضمننا سید عبداللہ خاں کا حال بھی ذکر ہوا ہے۔ اگرچہ رفاقت میں عبداللہ خاں کے نام بیدل کا کوئی خط نہیں پایا جاتا تاہم بیدل کے اس سے تعلقات متعلق خوشگو لکھتا ہے کہ نواب موصوف نے بیدل کو دو تین بار اپنے یہاں آنے کی دعوت دی۔ بیدل نے اس کی دعوت قبول کی اور اس کے گھر گیا۔ مرزا پر نظر پڑتے ہی نواب موصوف اپنی کرسی سے اٹھ باہر، سامنے آکر گر جھوٹی سے اس کا استقبال کرتا اور معافتہ کرتا حتیٰ کہ اپنی تکیہ اور مسند بھی اس کے لئے لی کر دیتا (۲۶۷)۔ اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ خاں اپنی تمام تر منصبی بزرگی کے باوجود بیدل اور اس کے کلام کی بے انتہا قدر کرتا تھا اور انتہائی احترام کا اظہار کرتا تھا۔

نظام الملک:

میر قمر الدین خاں نظام الملک شہاب الدین خاں کا بیٹا تھا۔ شاہجہاں کے وزیر سعد اللہ خاں کی لڑکی سے شادی کرنے کے بعد ان کو غازی الدین بہادر فیروز جنگ کا خطاب عطا ہوا۔ اورنگ زیب کے عہد میں میر قمر الدین پر بادشاہ کی نظر عنایت ہوئی اور وہ چار ہزاری کے منصب پر فائز ہوئے اور انہیں چچن خاں کا خطاب ملا۔ بہادر شاہ کے عہد میں انہیں ”خاندورواں“ کا خطاب ملا، جہاندار شاہ کے زمانے میں ”نظام الملک“ کا خطاب ملا۔ محمد فرخ سیر کے پہلے سال جلوس میں بیچ ہزاری کے منصب کے علاوہ دکن کی صوبہ داری بھی انہیں دی گئی۔ محمد شاہ اول کی سلطنت کے اوائل میں دکن کے بعض حصوں پر اور اس کے انتقال کے بعد پورے دکن پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ ۱۹ ربیع الاول ۱۱۳۳ھ / ۱۷۲۰ء میں سید عبداللہ خاں کے انتقال کے بعد نظام الملک وزیر اعظم کے عہد پر فائز ہوئے۔ ۱۱۳۴ھ / ۱۷۲۱ء میں جب شاہجہاں آباد آئے تو محمد شاہ نے حسب ہدایت خلعت وزارت کے علاوہ ”آصف جاہ“ کا خطاب بھی ملا۔ (۲۱۸)

نواب نظام الملک سے بیدل کے روابط نیز ان کی شعر گوئی پر روشنی ڈالتے ہوئے خوش گو لکھتا ہے:

”بہادر شاہ کے زمانے میں وہ خاندورواں کے خطاب سے مشہور تھے جب اسد خاں اور ذوالفقار خان سے ان کی نہ بھی تو شاہجہاں آباد میں گوشہ نشین ہوئے۔ گوشہ نشینی کے زمانہ

آپ کے مخلصانہ احسانات کے مقابلہ پر ہم فقیروں کا دست دعا اس قدر سامان رفعت نہیں رکھتا کہ اپنی نارسائی کی سرگونی کے دائرہ سے باہر آئے اور آپ کی عام عنایتوں کے مقابلہ پر ہم بے نواؤں کی زبان شا اس قدر مایہ ور نہیں کہ تحریک نفس کے لئے بال کشائی کرے (تعریف کرنے کے لئے لب کشائی کرے)۔

اس اعتراف نامہ کا ایک ایک لفظ نواب کی مخلصانہ عنایت کے اعتراف اور بیدل کے جذبہ ممنونیت سے بھرا ہوا ہے اور اسی کے ساتھ نواب کے احسانات کے بوجھ تلے دبے جانے کا احساس بھی ہے اس لئے گمان نہیں ہوتا کہ بیدل نے نواب کی پیشکش کو ٹھکرا دیا ہو۔ اسی خط میں نواب کے بیٹے کی وفات کے موقع پر بیدل لکھتا ہے:

”بیدل نواز من دریں ایام از کدورت ذات تقدس آیات آنچہ بسمع دعا گور سید لب گزیدن فرصت عرض دگر ندارد۔“

ہر جا غم عشق، شمع بیداد افروخت حیرت ہمہ را زبان و دل برہم دوخت ناموس و فاء، چہ سحر دارد یارب کاشش بہ نیستاں زد و جز نالہ سوخت (۲۱۵) بیدل نواز! ان دنوں ذات تقدس آیات کی کدورت کے بارے میں اس دعا گو کے کان تک جو خبر پہنچی ہے فرصت لب گزینی اس پر کچھ اور عرض کرنا مناسب نہیں سمجھتی۔

غم عشق نے جہاں بھی ظلم و جبر کی شمع روشن کی حیرت نے سب کے زبان و دل درہم برہم کر دیے۔ خدا یا ناموس و فاء میں جانے کیا جادو چھپا ہے کہ اس نے پورے نیستاں میں آگ لگا دی پر آہ و نالہ کے سے سوا کچھ نہ جلا۔

نواب کی دکن سے دہلی واپسی پر اس کا پر جوش خیر مقدم کرتا ہوا کہتا ہے:

باز از دل پھوی دیدہ مای آئی اے دل و دیدہ فدایت ز کجای آئی دیدہ تا دل ہمہ چچن بہار آغوش است چشم بد دور عجب عقدہ کشای آئی (۲۱۶) پھر ہمارے دل سے آنکھ کی طرف تو گامزن ہے۔ اے وہ ہستی کہ دل و دیدہ تجھ پر فدا ہے کہاں سے گرم خرام ہے۔ آنکھ سے لے کر دل تک سب بہار آغوش تجھیں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چشم بد دور، عجب عقدہ کشا بن کر تو آرہا ہے۔

نہایت افسوس کے ساتھ لکھا جاتا ہے کہ امیر الامراء کی اواخر زندگی میں محمد فرخ سیر کی گرفتاری سے وابستہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے بیدل کو اتنا متاثر کیا کہ چند سالہ گہرے مخلصانہ روابط پر اس نے پانی پھیر دیا اور اس نے اعلانیہ کہہ دیا ”سادات بہ وی نمک حرامی کردند“۔ اس واقعہ کو آگے چل کر

میں وہ علوم متداولہ کی تحصیل میں لگ گئے اور شعر و شاعری کے میدان میں طبع رواں کی جولانی دکھانے لگے۔ حضرت مرزا بیدل کے مشورے سے تقریباً دو ہزار اشعار پر مشتمل ایک دیوان غزل کا مرتب کیا جب کبھی مرزا کے گھر آتے مرزا استقبال کے شرائط بجالاتے، اپنے ساتھ ساتھ اندرون خانہ لے جاتے، رکی بات چیت کرتے اور انواع و اقسام کے کھانے میں بیضہ مرغ کا حلوا انہیں بہت پسند تھا۔ مرزا سے اس کی فرمائش کرتے۔ رخصت ہونے کے وقت جب مرزا قدما کی کتابیں جیسے کیمیائے سعادت اور نجات وغیرہ ان کو پیش کرتے تو کہتے اس قسم کی کتابوں کے ذخیرے میرے گھر میں موجود ہیں آپ اپنی تعنیفات کے تبرکات عنایت کیجئے چنانچہ مرزا کے دستخط سے کتابیں اپنے ساتھ لے جاتے۔ نثر بہت صاف اور شستہ لکھتے تھے اور انتظامی اور سیاسی مصروفیات کی کثرت کے باوجود بسا اوقات شاعری بھی کرتے تھے۔ دیوان کا بڑا حصہ انہوں نے اپنے استاد مرزا بیدل کی نظر سے گزارا۔ شاکران کا تخلص ہے اور اس وقت چونکہ آصف جاہ کا خطاب ملا ہوا ہے اس لئے آصف تخلص کرتے ہیں۔“ (۶۲۹)

نظام الملک کے نام بیدل کے خطوط خوشگو کے بیان کی توثیق و تائید کرتے ہیں۔ ان خطوط سے مجموعی طور پر بیدل کے ساتھ نواب کے وسیع سماجی و ادبی اور دوستانہ روابط کا پتہ چلتا ہے۔

”رغبات بیدل کے مطبوعہ نسخوں میں چین قلیج خاں کے نام بیدل کا صرف ایک خط پایا جاتا ہے۔ سات خطوط حسین قلی خاں کے نام ہیں اور دو خطوط مطلق خان دوراں کے نام ہیں۔ ان کے علاوہ چار خطوط نظام الملک کے نام ہیں۔ چونکہ بیدل کے زمانے میں حسین قلی خاں نام کا کوئی امیر نہیں تھا اس لئے یہ خطوط یا تو چین قلیج خاں کے نام ہیں یا حسین علی خاں امیر الامرا کے نام ہیں جو سہو کا تب سے حسین قلی خاں ہو گیا ہے۔ بیدل کے دونوں ہی امرا سے خوشگوار تعلقات تھے۔ اس لئے یہ طے کرنے کے لئے کہ حسین علی خاں کے نام کے پانچ خطوط اور خاندوران کے نام دو خطوط حقیقت میں کس امیر کے نام ہیں ہمیں ان کے مضامین کا مطالعہ کرنا اور نواب نظام الملک آصفجاہ اور امیر الامرا حسین علی خاں کے حالات زندگی سے ان کا موازنہ کرنا ہوگا۔ تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ حسین علی خاں بیدل کے قدردانوں اور محسنوں میں تھا مگر شاعر نہ تھا جبکہ حسین قلیج خاں نظام الملک قدردان اور محسن ہونے کے ساتھ شاعر بھی تھا۔ غلام علی آزاد نے تصریح کی ہے:

”درغشات مرزا چندر قہ کہ بنام قلیج خان است عبارتست از نواب آصفجاہ کہ خطاب قدیم

اوست۔“ (۶۳۰)

مرزا کے رغبات میں جو چند رقعے قلیج خاں کے نام ہیں اس سے مراد نواب آصف جاہ ہیں جو ان کا قدیم خطاب رہا ہے۔

ظاہر ہے آزاد کی نظر رغبات بیدل کے ان قلمی نسخوں پر ہے جو راقم السطور کے گمان غالب کے مطابق اس وقت آصفجاہ کی ذاتی لائبریری میں موجود تھے کیونکہ اس وقت تک کوئی مطبوعہ نسخہ سامنے نہیں آیا تھا اور آزاد کا بیان ہے کہ فقیر کی نواب آصفجاہ موصوف سے خاصی لمبی صحبتیں رہی ہیں۔ (۶۳۱) اس لئے آزاد کے بیان پر اعتماد کر کے ان خطوط کو نواب چین قلیج خاں نظام الملک کے نام سمجھنا چاہئے اس کے علاوہ نواب موصوف کے مفصل حالات کے پیش نظر جن کا ذکر اوپر ہوا واضح ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ شاعر تھے بلکہ بقول آزاد بلگرامی موزوں طبع ہونے کے ساتھ ایک ضخیم دیوان کے مالک بھی تھے۔ (۶۳۲) جبکہ نواب حسین قلی خاں خوش ذہن اور شعر فہم تھے شاعر نہ تھے۔ (۶۳۳) نواب آصفجاہ اکثر اپنے نتائج فکر بغرض اصلاح بیدل کے پاس بھیجا کرتے تھے اور ان سے درخواست کرتے کہ اپنی تازہ ترین تخلیقات ان کو بھیجیں۔ چنانچہ ایک خط میں جس کا عنوان ہے ”ارسال دیوان و مثنوی، بہ چین قلیج خاں حسب الاستدعا ای ایشان (چین قلیج خاں کو ان کے حسب فرمائش دیوان و مثنوی کا ارسال) اس طرح دونوں کے بیچ تخلیقات کے تبادلے اور ایک دوسرے کی تخلیقات کی قدردانی کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ یہ خط اس طرح ہے:

”ورود سعادت انشاء نامہ، زبان شکر بیان را، سر مشق آداب شاگردانید، دل سپاس مشاغل را مدرس کتب دعا۔ خواہش طبع معنی آفریں نسخہ ہای بیدلی را، بقدر کشائش اوراق بال حسرت قبول می بخشد۔ امید کہ بنارسامیہا طرز مضامین، غلت پرداز نہ بیند، و تحقیق ہای وضع عبارات، غم پیشانی انفعال نہ چیند۔“ (۶۳۳)

انشاء نامہ (خط) کے ورود مسعود نے زبان شکر بیان کو آداب شا کی مشق کرائی اور دل سپاس مشاغل کو کتب دعا کا قاری بنادیا (دل سے دعا کرائی) نواب کے طبع معنی آفرین کی خواہش بیدل کی تخلیقات کو اوراق بازوئے حسرت کی کشائش کے بقدر قبول کی عزت عطا کرتی ہے امید کہ انداز مضامین کی نارسائی کو پیشانی نہ اٹھانی پڑے، اور وضع عبارات کی خشکی کو پیشانی کی نمی کی شرمندگی نہ سہنی پڑے۔ اس خط میں آگے لکھتے ہیں:

”مطالعہ افکار گوہر ثار، چشم تامل را آشنائی نور یقین بخشد۔ واجب حقیقی سر رشته این کلام را بہ شہود عالم تحقیق برساناد۔ وہابین وسیلہ عالمی را مستفیض معنی ہدایت گرداناد۔“

افکار گوہر ثار کا مطالعہ چشم تامل کو نور یقین بخشا ہے۔ واجب حقیقی کلام کے سر رشته کو عالم تحقیق



تک پہنچائے اور اس کے ذریعہ ایک عالم کو معنی ہدایت سے مستفیض فرمائے۔

درج ذیل خطوط سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ نواب بیدل کے کلام کا قدر دان تھا جو دیوان اور مثنوی وغیرہ اسے بھیجے تھے اس پر پسندیدگی کی مہر لگائی اور ساتھ ہی اپنے اشعار بھیج کر ان پر اصلاح کا طالب رہتا تھا۔

”لقد الحمد نياز فقرای بیدل، آیینہ داری قبول آن جناب حسن اقبالی پرداخته کتفه آریان  
بساط عجز را به آن وسیله تا حشر قدر بی بضاعتی باید شناخت۔ از مقیدان سلسلہی کرم تا شیریم،  
و مسخر اخلاق آفاق تغیر۔ بہ تحقیق پیوست کہ: فتراک صیدا لکن مابی شکار نیست۔ آثار مرادم  
در تامل اشعار کمالات انوار اشعاری داشت۔ حاشا کہ قلم متانت رقم، در طریق ثبات لغزشی  
پیدا، یا مهمم اغرائی بر آید۔ مگر بہ مقتضای کم مشق و بی پروایی، در این ہمہ مضامین طراوت  
آئین، و دوسر نقطہ تشنہ وضوح بود، کہ معروض دانشمیش، بہ شادابی کلک تسلیم سلک امداد جرأت  
فرمود۔ تا بید فضل، مفتی ایجاد بی رتبہ کمال رساناد؛ و بیدلان مشتاق را بمنون سماع در جات  
معارف گرداناد۔“ (۲۳۵)

الحمد للہ خاکسار بیدل کا نیاز جناب والا کے قبول کی آئینہ داری میں حسن پذیرائی میں مصروف ہوا کہ بساط عجز کے تحفہ آرا کو اس کے ذریعہ تاحشر اپنی بے بضاعتی کی قدر کرنی چاہئے..... جناب والا کے اشعار کمالات انوار پر غور و فکر کرنا آپ کے مرام امیرانہ کی نشانی ہے۔ حاشا کہ قلم متانت رقم کی ثابت قدمی میں کوئی لغزش آئے یا بہکنے کی تہمت اس پر لگے مگر کم شقی اور لا پرواہی کے حسب اقتضایں تمام مضامین طراوت آئین میں صرف دو تین نقطے وضاحت طلب تھے جن کے عرض کرنے کی جرأت کلک تسلیم سلک کی شادابی کی بدولت ممکن ہو سکی۔

(یہ خط رقعات بیدل مطبوعہ نوکلشور میں حسین قلی خاں کے نام ہے لیکن اس کا مضمون سراسر بتاتا ہے کہ چمن قلی خان کے نام ہے۔)

”شکر فضل ایزد بہ جای آورد کہ اجزای محقر بیداران بہ بمن نعمت قبول فیض اندوز حصول کلیت گردید؛ و اوراق بی سیاق آشفگان در پرتو نگاہ معنی پناہ، سررشتہ بہ وصول شیرازہ دوام رسانید۔ مضارب قانون این مراحم حرکات ازلی داشت کہ امروز گوش منتظران را بہ زمزمہ آگاہی نواخت و آثار مراتب این اکرام بالقوہ طبعیت اسرار کہ بالفعل طرح اشفاق ربوبیت انداخت۔ ورود افکار خورشید انوار پیوستہ مستہر آیات جہاگیری، و طلوع معنی قدرت، ہموارہ فی نقاب جلوہ آفاق تسخیری۔“ (۶۳۶)

خدا کی عنایتوں کا شکر بجالاتا ہوں کہ بیدل ناچیز کی تخلیقات (دیوان اور مثنوی) قبول فیضِ نندرز کے نشہ کی برکت سے پایہ کمال کو پہنچیں اور آشفستہ حال بیدل کے اوراق بے سیاق نے نواب کی ہمتی پناہ کے پرتو میں اپنا سراشیر ازہ دوام تک پہنچایا..... نواب کے افکار خورشید انوار کلام کا دوسرا آیات جہانگیری سے مشہور ہوا۔

ایک اور خط میں جس کا عنوان ہے ”مطالعہ اشعار نواب واصلاح آں و داخل دیوان نمودن کہ  
فقر گزاشیہ بودند۔“

چین فلیج خان بہادر کے خط کا جواب ان کے کلام کے مطالعہ اور اصلاح نیز ان کو داخل دیوان  
نے کے سلسلے میں جس کو فقیر کے پاس رکھ چھوڑا تھا۔ بیدل نے نواب کے کلام میں بعض الفاظ کی  
تیم و تاخیر سے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ خوشگو کے بیان سے مکمل طور پر ہما ہنگ ہے۔ خوشگو لکھتا ہے:

”بمشورت حضرت میرزا ابیدل دیوان غزل بقدر دو ہزار بیت مرتب فرمود۔“ (۶۳۷)

حضرت بیدل کے مشورے سے دو ہزار اشعار پر مشتمل اپنا دیوان غزل مرتب کیا تھا، خط

حفظ ہو:

”سایه گستری‌های سعادت باور و افکار هدایت‌انوار به تازگی چراغ خلوت حضور گردید و بر لمعات از دیادشکرو سپاس‌فروغ عقیدتی دیگر بنشید۔ آئینه این عبارات حقایق نمودار و شمع این منجم آفتاب‌نیا۔ در بعضی الفاظ تقدیم و تاخیری درکار داشت قلم نیاز بر سر خط تحریر وجود گذاشت به مقتضای موضوع شناسی یک قلم به اجزای دیوان بلاغت عنوان پیوست و هر یکی به کرسی مراتب مناسب‌نشت۔“ (۶۳۸)

ہماری سعادت کی سایہ گستری افکار ہدایت انوار کے درود کے ساتھ ابھی ابھی خلوت حضور کا ان کا ثابت ہوئی اور شکر و سپاس گزاری میں اضافے کی چمک پر اسے دوسری عقیدت کا فروغ بخشا۔ عبارتوں کا آمینہ حقائق نما ہے اور اس انجمن کی شمع آفتاب نظیر ہے۔ بعض الفاظ میں تقدیم و تاخیر کی درود تھی قلم نیاز تحریر کے سرخط پر سجدہ ریز ہوا موقع محل کے حسب اقتضا یک قلم دیوان بلاغت عنوان کے اجزائے وابستہ ہوا اور ہر ایک شعر مناسب درجے کی کرسی پر براجمان ہوا۔

یہ خط بھی حسین قلی خاں کے نام ہے جبکہ مضمون صاف بتا رہا ہے کہ چین قلیج خاں کے نام ناچا ہے۔

درج ذیل خط سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نواب آصف جاہ جو اس زمانے میں شاکر تخلص کرتے تھے۔ باوجودیکہ بعض اشعار میں کچھ رد و بدل کیا

ہے نیز اس شعر کو اپنی جگہ دیوان فصاحت کا منتخب قرار دیا۔ دوسری طرف نواب نے بیدل کی نظم و نثر پر اپنی پسندیدگی کا جواظہار کیا اس کا تذکرہ کرتا ہے:

”ضمن مطالعہ نواز شامہ، اندیشہ سجود ریشہ، فہم ہر گل معنی کہ پرداخت، جز کیفیات رنگ و بوی بہارستان کمال شناخت، خاصہ در زمین غزل نظر کشا، کہ ربط ہموار لیش، اندکی بچش داشت، وغیرہ طبع سلیم و فکر متین، براکثر طبائع احتمال لغزش می گماشت ع ”آفریں بر طبع معنی آفریں“ در بیتی چند تغیر بعضی لفظ فضولی خیال وقت مال بود، و گرنہ ہر یکی بر مقام خود دیوان فصاحت تصور باستی نمود۔

صاحب مائل افکار نیست ورنہ معنی بر مزاجش بار نیست  
گر ہمہ مضمون عنقا بستن است پیش طبعش آنقدر دشوار نیست (۶۳۹)  
نوازش نامہ کے مطالعہ کے دوران اندیشہ سجود ریشہ جس گل معانی پر غور و فکر میں مشغول ہوا اسے بہارستان کمال کے رنگ و بو کی کیفیات کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ خصوصاً اس غزل نظر کشا کی زمین میں جس کی روانی اور ہمواری کو نبھانا ایک حد تک پیچیدہ عمل ہے اور طبع سلیم اور فکر متین کے سوا اکثر طبائع سے اس میں لغزش ہو جانے کا احتمال رہتا ہے۔ آفریں بر طبع معنی آفریں۔ بعض اشعار میں غیر ضروری الفاظ کو بدلنے کا خیال ذہن میں آیا ورنہ ہر ایک شعر اپنی جگہ پر ایک دیوان فصاحت کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہمارے نواب صاحب کی توجہ اپنے فکر و اندیشہ کے اظہار پر اتنی نہیں ہے ورنہ کوئی معنی اس کے مزاج کے لئے بار خاطر نہیں ہے۔ اگر سراسر انوکھے اور نادر مضامین کو ہی اختیار کرنا چاہیں تو اس کے ذوق شاعرانہ کے لئے کوئی مشکل کام نہیں۔

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب کی اکثر کوشش رہتی تھی کہ بیدل کی غزلوں خصوصاً مشکل زمین میں کبھی گئی غزلوں کی پیروی کرے۔ اسی قسم کی ایک غزل اس نے برائے اصلاح بیدل کے پاس بھیجی تھی۔ بیدل نے جواب میں لکھا کہ مشکل زمین میں غزل کے اندر روانی اور ہمواری کو برقرار رکھنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ فقیر کی مشکل زمین میں غزل گوئی کے لئے ذوق سلیم اور فکر متین درکار ہے اور آپ چونکہ اس کے حامل ہیں اس لئے اس ذمہ داری سے نہایت خوبی سے عہدہ برآ ہوئے الایہ کہ بعض اشعار میں غیر ضروری الفاظ بدلنے کی ضرورت پڑی۔

یہ خط بھی حسین قلی خاں کے نام ہے جبکہ اس کے مضامین بتاتے ہیں کہ حسین قلی خاں کے نام ہے۔ ذیل میں استاد اور شاگرد کی غزل کا مطلع دیا جاتا ہے۔

بیدل:

نہ رسیدی فہم خود، رہ عزم دگر کشا  
بجہانی کہ نیستی، مژہ بر بند و در کشا (۶۴۰)  
شاکر:

خن خوب بیدلت، شدہ شاکر چہ دلشیں  
نرسیدی فہم خود، رہ عزمی دگر کشا  
ایک دوسرے خط میں نظام الملک کی غزل کی اس طرح تعریف کرتا ہے:

”غزل تازہ چہدر افسون معنیہای برجستہ داشت کہ قطعہ غزال بکل نیز در قاصد مژدہ

رسانیش بال پرواز کشاد، بمضمون آمد آمد، وادروانی شوق داد۔“ (۶۴۱)

تازہ غزل میں کس قدر برجستہ معانی کا جادو بھرا ہوا ہے کہ غزال بکل کے ایک گلہ نے قاصد کے لئے اس کی مژدہ رسانی کے باعث اپنے بال پرواز کھول دیئے اور آمد آمد کے مضمون کی بدولت روانی شوق کی داد دی ہے۔

ان خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ نظام الملک بیدل کا شاگرد تھا۔ آزاد بلگرامی اور عبدالوہاب افشار نے اپنے تذکروں میں اس کو بیدل کا شاگرد ہی لکھا ہے۔

”نواب نظام الملک طاب ثراہ در شعر خود را شاگرد میرزا بیدل می گفت۔“ (۶۴۲)

”نواب نظام الملک شاعری میں خود کو میرزا بیدل کا شاگرد کہتا تھا۔“

”نواب آصف جاہ خود را از تلامذہ اومی شمرد۔“ (۶۴۳)

”نواب آصف جاہ خود کو اس کے تلامذہ میں شمار کرتا تھا۔“

یہ تو بیدل کے ساتھ نظام الملک کے ادبی روابط کا پہلو تھا جہاں تک ان کے درمیان سماجی اور دوستانہ روابط کا تعلق ہے اس سلسلے میں آزاد لکھتا ہے:

”جب کبھی مرزا نواب کے گھر تشریف لاتے تو نواب آگے بڑھ کر ان کا استقبال کرتے اور اپنے مسند پر بیٹھتے۔“ دوسری طرف بقول خوشگو جب کبھی نواب مرزا کے گھر تشریف لاتے مرزا استقبال کے شرائط بجالاتے اور اپنے ساتھ اندرون خانہ لے جاتے، رکی بات چیت کرتے اور انواع و اقسام کے کھانوں میں بیضہ مرغ کا حلوا انہیں بہت پسند تھا، مرزا سے اکثر اس کی فرمائش کرتے۔ رخصت ہونے کے وقت جب مرزا قدمی کتابیں کیمائے سعادت اور نجات وغیرہ ان کو پیش کرتے تو کہتے اس قسم کی کتابوں کے ذخیرے میرے گھر میں موجود ہیں آپ اپنی تصنیفات کے برکات عنایت کیجئے۔ چنانچہ مرزا کے دستخط سے کتابیں ان کے ساتھ لے جاتے۔

ایک خط میں لکھتا ہے:

”نفس گداختہ آداب ستائش، بکدام جرأت لب کشاید کہ از عہدہ خجالت برآید۔ مارا در جمع احوال، منفعل داشته اند۔ تقریر نارسائی معنی تحریر عبارت است۔ و تحریر ناتوانی مضمون عدم استعارت۔“ (۶۳۳)

آداب ستائش کا یہ نفس گداختہ (بیدل) کس بوتے پر لب کشائی کرے کہ خجالت و ندامت کے عہدہ سے باہر آئے۔ تمام احوال میں آپ نے ہمیں شرمندہ کر رکھا ہے۔ معنی کی نارسائی کا بیان بھی تحریر عبارت ہے اور مضمون کی ناتوانی کی تحریر بھی عدم استعارت ہے۔

اس لئے اگر اس کے استقبال یا رخصت کرنے کے لئے وہ اپنے غریب خانہ سے باہر نکلا تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ درج ذیل قطعہ جو اس کے استقبال کے وقت کہا ہے نواب سے بیدل کے غیر معمولی مخلصانہ روابط کے لئے محبت آمیز جذبات کا آئینہ دار ہے:

بیار بادہ کہ بوی بہار جان آمد	فروغ مہر ازل چین قلیج خان آمد
بیسر کشور ما از نوید اقبالش	سعادت آمد و امن آمد و امان آمد
بچرخ برد ہوا خواہ او پیام مسج	ازاں نشاط کہ آن عمر جاودان آمد
بخاک خفت حسودش فروز از قارون	شکوہ او چھدر برخشاں گران آمد
زمین ز گرد خرامش چہ ناز خرمن کرد	کہ ہر قدم تہ پای من آسمان آمد
جبین سجدہ شوقش بلندی می خواست	دمیدن عرق شرم نردبان آمد
مقیم گوشہ زانوی انتظارم داشت	ہفتی کہ بچشم من ایں زمان آمد
نداشت بیدل ما طاقت زیارت او	کرم نمود و بدرمان صحتگان آمد (۶۳۵)

ایک دفعہ بیدل تین مہینے تک بیمار رہا جس کی وجہ سے اتنی نقاہت اسے ہو گئی کہ نواب کے رخصت کرنے کے مراسم میں شریک نہ ہو سکا۔ مصعیاب ہونے کے بعد اس نے ایک معذرت نامہ لکھا:

”در ہمیں روز ہا سہ ماہ، دعا گوئی بیدل را، عارضہ دست بہم داد، کہ جلد بدن از بیداری، بر پوست پیاز خشک نی چر بید۔ واستخوانہا از بے مغزی، بہم سبکی نی بی نفس، ہی گردید۔ زمانیکہ حضرت ایشان ہمعنان فتح و ظفر، عازم سفر بودند، مایہ ہوش ایں بیہوش آنقدر فراہم نبود کہ بہ تحریر عرض و داع، مصدع باریابان می گردید۔ و پس از آمد ادعای شعور، نارسائی طاقت آستان بوس ہمان از دور زمین خیال می بوسید۔ لہذا الحمد للہ و دیعت انفس، جو ہم زندگی سرگرم فرصت شماریت۔“ (۶۳۶)

انہی دنوں تین مہینے بیدل دعا گو کو ایسا عارضہ لاحق ہوا کہ بدن کی کھال اپنی ناقدری کی وجہ سے

خشک پیاز کے چھلکوں پر غالب نہیں آتی تھی اور ہڈیاں مغز سے خالی ہونے کی وجہ سے بانسری کی بمشکل ہو کر سانس نہیں لے پا رہی تھیں۔ جس وقت جناب عالی کامیابی سے ہمکنار ہو کر عازم سفر تھے اس وقت اس بیہوش کو اتنا ہوش بھی نہ تھا کہ رخصت نامہ لکھ کر باریابی حاصل کرنے والوں کے زمرہ میں شامل ہوتا اور ہوش آنے کے بعد اتنی ہی نقاہت تھی کہ دور سے ہی آستانہ بوسی کی جاسکتی تھی۔ بھگوان اس وقت زندگی کے توہم میں سانس کی ودیعت فرصت شماری میں سرگرم کار ہے (یعنی میں مصعیاب ہو گیا ہوں)۔

سادات کے ہاتھوں فرخ سیر کے قتل کے بعد سادات کے خلاف درج ذیل رباعی:

دیدنی کہ چہ با شاہ گرامی کردند صد جور و جفا از رہ خامی کردند  
تاریخ چو از خرد بچستم فرمود سادات بوی نمک حرامی کردند  
کہنے کی وجہ سے لاحق تشویش کی بنا پر لاہور فرار کر گئے اور وہاں سے صحیح سلامت واپس آنے کے واقعہ کا تذکرہ ایک خط میں اس طرح کرتا ہے۔

”قبلہ گاہا، براین نفس پر در اشغال دعائیز سرائیہ غریبی پیش آمد، اما گذشت آنچہ گذشت و بہ احیای مجدد تمیز گشت۔ عرض تفصیل آن مصدر سامعہ مبارک است۔ بالفعل آن مقدار تواناست کہ با اظہار رسم عبودیت، عذر بی دست و پائی می تواند خواست رع

لیتقد رہا در عدم، بیدل بہ یادت زندہ است

قبلہ گاہ! دعاؤں میں مصروف اس نفس پر در کو بھی ایک انوکھے واقعہ سے سابقہ پڑا لیکن جو کچھ گذرنا تھا گذر گیا اور از سرنواس کے بیان کا موقع نہیں ہے اس کا تفصیلی بیان سامعہ مبارک کے لئے درود سر کا سبب ہوگا۔ سردست اتنی قوت جسم میں ہے کہ رسم عبودیت کے اظہار میں بے دست و پائی کا عذر کیا جاسکتا ہے۔

عدم میں بھی بیدل عدم تیری یاد ہی میں اس قدر زندہ ہے۔

بیدل اگر چہ گوشہ نشین تھا لیکن جو لوگ اس سے خلوص اور محبت سے پیش آتے تھے ایسا لگتا ہے کہ بیدل بھی ان سے اسی انداز سے ملتا تھا اور ان کے دینی و دنیوی وجاہت کے مطابق ان کی دوستی نباہتا تھا۔ خود کہتا ہے:

بہ دل گفتم کدا میں شیوہ دشوارست در عالم نفس در خود تنید و گفت پاس آشنایم  
میں نے دل سے پوچھا دنیا میں سب سے مشکل کام کیا ہے؟ تو سانس نے طش میں آکر کہا  
”دوستی کا نباہنا۔“

نواب کے نام اپنے ایک خط میں بیدل نے اپنے ایک مخلص دوست مرزا احسن ایجاد کے لئے سفارش کی ہے۔

”صافی عقیدت و خلوص ارادت سرچشمہ زلال اتحاد، میر محمد احسن ایجاد، آئینہ داری نیاز  
بیدل چہرہ کشای امتیاز محفل حضور باد۔“

صفائے عقیدت و خلوص ارادت سرچشمہ زلال اتحاد مرزا محمد احسن ایجاد و نیاز بیدل کی آئینہ  
داری کے ساتھ محفل حضور کے امتیاز کا چہرہ کشا ہو۔ بیدل نے یہ خط ایجاد کی سفارش میں اس کی معرفت  
روانہ کیا ہے۔

خوشگو کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیدل کی سفارش کامیاب رہی۔ وہ لکھتا ہے:  
”در عہد بہادر شاہی بملازمت نظام الملک رسید و از طرف نواب در سرکار پادشاہزادہ عظیم  
الشان برسم و کالت ماند۔“ (۶۳۹)

بہادر شاہ کے زمانے میں نظام الملک کی ملازمت سے وابستہ ہوا اور نواب کی طرف سے  
شاہزادہ عظیم الشان کے دربار میں وکیل مقرر ہوا۔

آزاد بکگرمی لکھتے ہیں ۱۱۳۲ھ ۱۷۱۹ء میں نظام الملک نے بیدل کو دکن آنے کی دعوت دی  
لیکن اس نے درج ذیل شعر کے ذریعہ دہلی چھوڑ کر دکن جانے کے سلسلے میں معذرت کر دی۔

دنیا اگر دہند نہ جہنم ز جائے خویش من بستہ ام حنائی قناعت پپای خویش (۶۵۰)  
دنیا بھی دیں اگر تو نہ جاؤں گایاں سے میں مہندی لگائی میں نے قناعت کی پاؤں میں  
ایک خط میں جس کا عنوان ہے ”در جواب مکتوب خان دوران کہ از حالات عبور آہا نوشتہ  
بودند“ (خان دوراں کے خط کا جواب جس میں انہوں نے دریا پار کرنے کے حالات لکھے تھے)۔

دریا پار کرنے کے حالات کا تذکرہ نظام الملک کے حالات سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے آزاد  
بکگرمی لکھتے ہیں:

”غره رجب ۱۱۳۲ھ عبور دریائے زردا نمودہ قلعہ اکبر از طالب خاں و شہر برہانپور از محمد انور  
خان برہانپوری صلح بدست آورد۔“

۱۱۳۲ھ کو نظام الملک نے دریائے زردا پار کر کے قلعہ اکبر طالب خاں سے اور شہر برہانپور نور محمد  
خاں سے صلح و آشتی کے ساتھ اپنے قبضے میں کیا۔ لگتا ہے یہ حالات نواب نے بیدل کو لکھے تھے۔ بیدل  
نے اس کا جواب اس طرح دیا:

آب دریائست، استقبال اشک بیدل است تاز گرد راہ شویہ پای رنگین تو را  
”مقتضای مخلصان نوازی، ہرچہ از آنجناب بہ منصفہ تحریر می آرد، از عالم ظہور فضل است۔“

آئینہ داری حضور ایٹان در بصورت تمثال عرض داشت است۔ تأیید ایزدی در ہمہ جاو

ہمہ حال مظفر و منصور و یاد آور بیدلان مجھو دارد۔ غیر از حسرت قدم بوس ہرچہ نگارد۔  
افسوس۔ والسلام“

بیدر یا کا پانی نہیں ہے بلکہ بیدل کے آنسوؤں کو خوش آمدید کہنا ہے تاکہ تیرے پائے رنگین میں  
نے گرد راہ کو وہ دھوئے۔

مخلص نوازی کے حسب اقتضا جناب عالی کی طرف سے جو کچھ بھی منصفہ تحریر میں آئے وہ ظہور  
فضل کی دنیا سے تعلق رکھتا ہے۔ اس صورت میں جناب عالی کی آئینہ داری نے واقعات کے تمثال کو پیش کیا  
ہے۔ ہر جگہ اور ہر حال میں تأیید الہی سے مظفر و منصور ہیں اور بیدل کو جو مجبوری حاصل ہے قدم بوسی کی  
حسرت کے سوا جو لکھے قابل افسوس ہے۔

### قابل خاں منشی:

واقعہ استغنی کے ضمن میں قابل خاں منشی کا حال تفصیل سے ذکر ہوا۔ وہ اورنگ زیب کے دربار  
کا ایک امیر تھا جس پر بادشاہ کی نظر عنایت رہتی تھی اور اسے میر منشی کا عہدہ ملا تھا لیکن شاہی خدمت  
کی انجام دہی میں کچھ کوتاہیوں کے سبب وہ برطرف کر دیا گیا اور اس کی ساری جائیداد ترقی کر لی گئی۔

قابل خاں منشی سے بیدل کے تعلقات کی بابت کوئی زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ اس  
خط سے، جس میں استغنی کا قصہ بیدل نے لکھا ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیدل کا قریبی دوست تھا کیونکہ  
بیدل اس کو ”مہربان فقراے بیدل“ سے خطاب کرتا تھا جو اس کے تعلقات کی نوعیت پر روشنی ڈالتا  
ہے۔ قابل خاں نے بیدل سے قصہ استغنی کا خلاصہ دریافت کیا تھا بیدل نے جواب میں لکھا:

”مہربان فقرای بیدل! ورود حسب الامر جلیل القدر، خاک در ماندہ را، بعروج اقبال فلکی  
نواخت۔ و از آبلہ زیر قدم فرسودہ را، بساط عزت ثریائی پرداخت۔ ملخصی از ماجرای حیرت

ایما معروض داشتن است۔ و منشی از دیوان عزت عنوان دانگاشتن۔“ (۶۵۳)

مہربان من! جناب والا کے گرامی نامہ کی آمد نے اس در ماندہ بیدل کو اقبال فلکی کے عروج پر  
پہونچا دیا اور زیر قدم فرسودہ آبلہ ”بیدل“ کو ثریا کی عزت کی بساط پر لاکھڑا کیا۔ ”ماجرائے حیرت ایما“  
کا خلاصہ پیش خدمت ہے اور دیوان عزت عنوان کا ایک انتخاب زیر تحریر ہے۔

اس خط کی اہمیت اس بنا پر ہے کہ وہ اعظم شاہ کی خدمت میں بیدل کی مدت ملازمت اور استغنی  
کے مسئلہ محل کرنے میں اہم رول ادا کرتا ہے جیسا کہ اپنی جگہ پر تفصیل سے اس کا تذکرہ ہوا۔

## مرزا فضائل:

میر ہادی فضائل خاں شہزادہ اعظم شاہ کا دیوان (وزیر مالیات) تھا ۱۰۹۴ھ/۱۶۸۳ء میں گرفتار ہوا لیکن بعد میں میرنشی کے عہدہ پر فائز ہوا۔ ۱۱۱۳ھ/۱۷۰۲ء میں انتقال کے وقت بیوتات (گھریلو اخراجات کے محاسب) اور خانماں کے عہدہ پر فائز تھا۔ (۶۵۳)

ایسا لگتا ہے کہ اعظم شاہ کے دربار میں خدمت کے دوران بیدل سے فضائل خاں کا تعلق ہوا۔ رقعات میں اس کے نام دو خطوط ہیں جو اس کے سماجی اور دوستانہ تعلقات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مرزا فضائل کا باپ میر محمد فاضل بیدل کے بہت قریبی دوستوں میں تھا اور ایسا لگتا ہے کہ بیدل اس کے لڑکے کو بھی اتنا ہی چاہتا تھا۔ باپ کے انتقال کے وقت مرزا فضائل بہت غمگین تھا۔ بیدل نے اس مناسبت سے ایک مفصل تعزیت نامہ اسے لکھا جس میں اس نے انسانی وجود کو موضوع بنا کر اس کی سست بنیادی اور بودے پن کو فلسفیانہ انداز میں اس طرح بیان کیا:

چار دیوار عناصر اعتبار طلسمی است بی بود۔ و چار سوی انجمن گیر و دانهی خالی از متاع نمود۔  
نہ بر بنای اس طلسم، چون گرد باد، اعتماد داری، و نہ در شکست این دیوار، چوں رنگ، مایہ  
اختیاری۔ اگر نور تامل آئینہ پرداز دیدہ آگہی گردد، ذرہ تا آفتاب، بال پرداز عبرت است و  
قطرہ تا محیط گرد جلاں وحشت۔

رنگی از عشرت ندارد نو بہار باغ دہر زین چمن باید چو شبنم، چشم تر برداشتن  
چشم تا واکردہ ایم، از خولش بیرون رفتہ ایم شعلہ مارا قدم بودست سر برداشتن (۶۵۵)

ہستی کے عناصر کی چار دیواریں (آب و آتش، خاک و باد) ایک طلسم بے بود ہیں اور انجمن گیر و داری کی چاروں سمتیں متاع نمود سے خالی ایک تخیل ہیں۔ اس طلسم کی بنیاد پر گولہ کی طرح اعتماد نہ کرنا اور اس دیوار کی شکست و ریخت پر رنگ کی طرح تیرا کوئی اختیار نہیں ہے۔ نور تامل اگر دیدہ آگاہی کے لئے آئینہ پرداز ہو جائے (بصیرت کی آنکھ سے اگر غور کرو) تو ذرہ سے لیکر آفتاب تک ہر چیز عبرت آموز ہے اور قطرہ سے لے کر سمندر تک جولان وحشت کی گرد ہے (وحشت انگیز ہے)۔

باغ و دہر کی تازہ بہار میں عیش و عشرت کا کوئی رنگ نہیں ہے اس چمن سے شبنم کی طرح با چشم تر نکل جانا چاہئے۔

جب سے آنکھیں کھولی ہیں خود آپ سے بیگانہ ہو گئے ہیں۔ ہمارے شعلہ کے لئے سراٹھانے کی ایک طرح کا قدم ہے۔

اس کے بعد میر محمد فاضل کے بارے میں لکھتا ہے:

”معنی آگاہ! در تحریر واقعہ فروغ انجمن سعادت، آبروی آئینہ سیادت، آرام گزین سایہ نخل

رحمت، راحت اندوز باطن دریای مغفرت، میر صاحب قدسی خاصیت، چہ پردازد کہ از طوفان کاری اشک خامہا، کاغذ، چوں پردہ چشم حجاب، دریائی ست۔“ (۶۵۶)

معنی آگاہ فروغ انجمن سعادت، آبروئے آئینہ سیادت، آرام گزین سایہ نخل رحمت، راحت اندوز باطن دریائے مغفرت، میر صاحب قدسی صفت کے واقعہ وفات حسرت آیات کی بابت کیا لکھیں

”میر صاحب کی طوفان کاری کے سبب کاغذ پر بلبہ کی آنکھ کی طرح ایک دریابن کر رہ گیا ہے۔ دوسرے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ بیدل نے مرزا فضائل سے غمگینی کی فرمائش کی تھی۔ غمگینی کو کہتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیدل کو موسیقی سے بھی لگاؤ تھا اور کبھی کبھی اس سے لطف لیا کرتا تھا۔ چنانچہ اس کی بعض غزلوں میں موسیقی کی دھن پوری طرح کارفرما نظر آتی ہے۔

”مخلص نواز! اگر حسن بیساختہ غمگ، بارائش گیسوی تار، سلسلہ پیرای نعمات وفاق گردیدہ  
باشد، بی نوائمان محفل آرزو را، صدا داری موصول مقامات سرور گردانند کہ نفس متردد، چون  
کمانچہ مقید خراش سینہ است۔ و نگاہ منتظر چوں موی چینی، محو کاسہ چشم۔ مضرب شوق را  
متحرک و زمزمہ تنار امتضاعدا نگارند۔“ (۶۵۷)

مخلص نواز! اگر غمگ کا بیساختہ حسن گیسوئے تار کی آرائش میں نعمات وفاق کا سلسلہ پیرا ہو (دوست کی نفی چھیڑے) تو محفل آرزو کے بے نواؤں کو آواز کی طرح مقامات سرور تک پہنچانے کی زحمت کریں کیونکہ نفس متردد کمانچہ (ایک قسم کی سازگی) کی طرح خراش سینہ کا پابند ہے اور نگاہ منتظر موی چینی کی طرح کاسہ چشم میں محو ہے۔ مضرب شوق کو متحرک اور زمزمہ تمنا کو متضاعد تصور کریں۔

## مرزا محمد نعیم:

اورنگ زیب کے عہد میں ۱۰۹۵ھ میں دار الخلافہ کا دیوان تھا۔ (۶۵۸) بہادر شاہ کے دربار میں بخشی کے عہدہ پر فائز تھا۔ بیدل سے اس کے غائبانہ اور خوشگوار تعلقات تھے۔ اور اس کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا تھا۔ بیدل نے اس کے اخلاق کریمانہ کی اس طرح تعریف کی ہے:

”معنی نسبائیکہ طریقہ اخلاق اشفاق غائبانہ مرغی داشتہ اندومی دارند۔ و مراتب التفات و  
عطوفت، بیواسطہ دید، بجا آورده اندومی آرنند۔ اسرار ”ہو منون بالغیب“ ذات حقایت  
آیات ایشان فہمید نست۔ یاد آور یہاں بیدلان، دلیل فراموشی حق مباد و توجہ باحوال فقرا،  
غفلت غنی مطلق میناد۔“ (۶۵۹)



معنوی نسبت کے حامل افراد جنہوں نے غائبانہ طریقہ سے اپنے اخلاق و عنایات کا خیال رکھا اور ہمیشہ رکھتے ہیں اور بغیر ملاقات کے اپنی توجہات کریمانہ کا سلسلہ جاری رکھے اور سدا رکھتے ہیں ان کی ذات حقیقت آیات کو یومنون بالغیب کے اسرار سمجھنا چاہئے۔ خدا کرے بیدل کی یادآوری خدا فراموشی کی دلیل نہ بنے اور فقراء کے حال پر توجہ غنی مطلق سے غفلت کا سبب نہ بنے۔

خط کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ بیدل کی رنگین نگاری، حسن اخلاق اور استغنا اور بی نیازی سے متاثر ہو کر مرزا نعیم نے مراسلات کے ذریعہ اس کا تعارف حاصل کیا اور غائبانہ تعلق قائم ہونے کے بعد اس پر اپنی عنایتیں کرنی شروع کر دیں۔ مرزا نعیم کبھی کبھی بیدل سے فرمائش کرتا تھا کہ اس کی طرف سے اس کے دوستوں کو خط لکھ دیں۔ رقعات میں ایک خط ایسا ملتا ہے جو مرزا نعیم کی طرف سے میر سیف الدین کو لکھا گیا۔ (۶۶۰)

ایک خط میں بیدل نے اپنے ایک شاعر اور مخلص دوست مرزا سہراب رونق کے لئے اس سے سفارش کی ہے جس کا تذکرہ اپنی جگہ پر آئے گا۔ (۶۶۱)

### مرزا سلیمان

مرزا سلیمان کے بابت ولیم ہیل لکھتا ہے کہ وہ عہد عالمگیر کا ایک وزیر تھا اور اسے فضائل خاں کا خطاب ملا ہوا تھا۔ ۱۱۰۱ھ/۱۶۸۹ء میں اس کی وفات ہوئی۔ محمد افضل سرخوش نے اس کی وفات کی مناسبت سے درج ذیل مادہ تاریخ نکالا:

شد شیخ سلیمان بسوی دار فنا وارست ز فتنہ ہستی بے سرو پا (۶۶۲)

ولیم ہیل کے بیان کو اگر صحیح مانیں تو ممکن ہے یہ وہی فضائل خاں ہو جس کو بیدل نے اپنے دو خطوط میں مرزا فضائل خاں سے خطاب کیا ہے اور اس کا تذکرہ ابھی حال میں گذرا۔ لیکن اس احتمال کو قبول کرنے میں دشواری یہ ہے کہ مرزا فضائل کا نام میر ہادی تھا اور اس کی وفات ۱۱۱۳ھ/۱۷۰۲ء میں ہوئی جبکہ یہاں فضائل خاں کا نام مرزا سلیمان ہے اور اس کی وفات ۱۱۰۱ھ/۱۶۸۹ء میں ہوئی اس لئے غالب گمان یہ ہے کہ یہ دو الگ الگ شخصیتیں ہیں۔

رقعات میں ایک خط مرزا سلیمان کے نام ملتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بیدل کے مخلصانہ تعلقات تھے اور اس نے اس کی حمایت و سرپرستی بھی کی ہے، اس کے اخلاق کریمانہ سے متاثر ہو کر بیدل نے اس سے ملاقات کے اشتیاق کا اظہار کیا۔

”ہر چند غبار بی سرو پا، در ہوا بی دامن مقصود، سراپا پیش بود، بی توجہی نسیم اقبال، امداد جراتی

نفرمود، در گرہ انتظار، از امید شکستگی، چنی را فراہم دارد۔ و بشکر نعمای آن صبح بہار اخلاق و احسان، نفس می شمارد۔“

دریا و توام نیست غم از کلفت امکان گردیکہ بود در رہ گلشن ہمہ رنگ است (۶۶۳)

بیدل کا بے سرو پا غبار اگرچہ دامن مقصود ہاتھ آنے کی خواہش میں سراپا پیش بنا ہوا ہے پر نسیم اقبال کی بے توجہی نے اس کی جرأت کا موقع نہ دیا۔ شکستگی کی امید میں ایک پورا چمن گرہ انتظار میں فراہم ہے اور اس صبح بہار اخلاق و احسان کی شکر گزاری میں نفس شکاری کرتا ہے۔

تیری یاد میں مجھے غم روزگار کا کوئی دکھ نہیں۔ گلشن کے راستہ کی گرد بھی سراسر رنگ کی حامل ہوتی ہے۔

مرآت و اردات کا مصنف شاہ محمد شفیع وارد، بیدل کے حالات کے ضمن میں لکھتا ہیں:

”مختصر در صحبت مرزا سلیمان خالوی حقیقی سلطان محمد معز الدین خلف شاہ عالم ابن عالمگیر سالہا بسر برد بعد وفات مرزا سلیمان در سلک ملازمان اعظم شاہ ابن عالمگیر منسلک گشتہ بیت الغزل دیوان اعتبار گردید۔“ (۶۶۳)

بیدل نے پہلے سلطان محمد معز الدین ابن شاہ عالم ابن عالمگیر کے حقیقی ماموں مرزا محمد سلیمان کی صحبت میں سالوں گزارے۔ اس کی وفات کے بعد اعظم شاہ ابن عالمگیر شاہ کے ملازموں کی صف میں شامل ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیدل اعظم شاہ کی ملازمت سے پہلے مرزا سلیمان کی صحبت میں رہا ہے اور اس کے حسن و سلوک سے بہت متاثر رہا ہے۔ اس کی تفصیلی بحث پہلے گذر چکی۔

### شیخ محمد ماہ:

شیخ محمد ماہ عرف خیر اندیش خاں کبوتر اٹاؤہ کا صوبیدار تھا۔ خوشگو کے بقول بیدل کا ایک دوست میر محمد احسن ایجاد اس سے وابستہ تھا (۶۶۵)۔ شیخ محمد ماہ کے نام رقعات میں بیدل کے دو خطوط ملتے ہیں۔ ایک کا عنوان ہے ”جواب نامہ شیخ محمد ماہ در بے اختیاری خدمت قضا“۔ (شیخ محمد ماہ کے خط کا جواب خدمت قضا کو قبول کرنے میں اس کی بے اختیاری کے بابت۔

اس خط سے شیخ کے ساتھ بیدل کے تعلقات کی نوعیت پر روشنی پڑتی ہے۔

ز چاک سینہ آہی می نویسم کتاخم حرف ماہی، می نویسم

محبت نامہ پرداز ست امروز شرر بر برگ کاہی می نویسم (۶۶۶)

اپنے چاک سینہ سے آہ لکھ رہا ہوں میں کتان (ایک قسم کا باریک کپڑا جس کے بارے میں



مشہور ہے کہ چاندنی رات میں ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے) ہوں۔ ماہ کا حرف لکھ رہا ہوں آج محبت نامہ لکھنے میں مصروف ہوں۔ گھاس کی پتی پر شرکالفظ لکھ رہا ہوں۔

مضمون خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے درمیان انتہائی مخلصانہ روابط قائم تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ جب خدمت قضا اس کے حوالہ ہوئی اس میں جن لغزشوں کا احتمال تھا اس کی بنا پر محمد ماہ نے بیدل سے مشورہ کیا کہ اس خدمت کو قبول کیا جائے یا نا منظور کر دیا جائے۔ بیدل نے جواب دیا:

”ممکنہاں صدر تحقیق، بوفور لباس عبارات، رنگ معنی برنی گردانند۔ وقیمان سر منزل تحقیق، بشمار مراتب ادہام، عروجی و نزولی بہم نمی رسانند۔ از عالم اسباب ہر چہ بی اختیار پیش آید، اقبال دولت از لیست۔ و از تماشا گاہ ظہور، آنچہ بی تکلف رونماید، لطیفہ جہان بخلی۔ یکلقم محکوم قضا نیم و یکسر مقید تسلیم و رضا۔“ (۶۶۷)

صدر تحقیق کے مسند نشیں لباس عبارات کی کثرت سے رنگ معنی نہیں بدلتے اور سر منزل تحقیق کے مقیم مراتب ادہام کو شمار کر کے عروج و نزول کے معاملہ میں خلط ملط نہیں کرتے (تحقیق کی منزل پر پہنچنے والے اپنا ظاہری چولا بدلنے سے باطنی حیثیت نہیں بدلا کرتے اور عروج و نزول اور بلندی و پستی میں نہیں الجھتے)۔ عالم اسباب سے جو کچھ بلا ارادہ سامنے آئے وہ دولت ازلی کا اقبال ہے۔ اور تماشا گاہ ظہور سے جو کچھ بے تکلف ہاتھ آئے وہ جہان بے خللی کا لطیفہ ہے۔ ہم سراسر قضا کے محکوم ہیں اور شیوہ تسلیم و رضا کے پابند۔

گویا بیدل نے اسے مشورہ دیا کہ چونکہ ہم قضا و قدر کے محکوم اور شیوہ تسلیم و رضا کے پابند ہیں اس لئے ضروری ہے کہ جو سعادت و اقبال بغیر کوشش اور ارادہ کے عالم اسباب سے ہاتھ آئے اس کو انتہائی احسان مندی کے جذبہ سے قبول کریں۔ البتہ ایک امکا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اپنی موہوم ہستی اور اعتبار سے ایسا تعلق قائم نہ کریں کہ اس کا ظاہری رنگ بدلنے سے اپنی زندگی کے پاکیزہ اصول بھی بدل دیں۔

ما بہاریم و دریں حیرت سرا جلوہ ما غیر رنگی بیش نیست  
گر رویم از خود کجا خواہیم رفت وحشت اینجا عذر لنگی بیش نیست  
در بخود سازیم جای غیرت است قید ہستی نیز تنگی بیش نیست  
ہر چہ بر آئینہ ما ریختند گر ہمہ حسن است رنگی بیش نیست  
سر خوش تسلیم باید بود و بس گرچہ اینہم و ہم تنگی بیش نیست (۶۶۸)

ہماری حیثیت ایک بہار کی ہے اور اس حیرت سرا دنیا میں ہمارا جلوہ ایک رنگ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا ہے۔

اگر ہم خود آپ سے باہر جانا بھی چاہیں تو کہاں جائیں گے؟ یہاں وحشت ایک عذر لنگ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

اور اگر آپ سے سمجھوتہ کر لیں تو یہ غیرت کا مقام ہے۔ ”قید ہستی“ ایک رنگ و عار سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

ہمارے آئینہ پر جو کچھ بھی ڈالا جاتا ہے اگر وہ سراسر حسن ہی ہو تو اس کی حیثیت ایک رنگ سے زیادہ نہیں ہے۔

پس شیوہ تسلیم و رضا پر خوش اور مطمئن رہنا چاہئے اگرچہ یہ بھی ایک وہم سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

### مرزا زین العابدین:

زین العابدین کی بابت صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۰۹۷ھ میں شولا پور کا قلعہ دار اور فوجدار تھا، پھر داروغگی کے عہدے پر فائز ہوا تھا۔ (۶۶۹) اس لئے ممکن ہے بیدل سے اس کا تعلق اس وقت قائم ہوا ہو جب وہ بھی اعظم شاہ کے دربار سے وابستہ تھا۔

شکر اللہ خاں کے نام بیدل کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ زین العابدین کا نواب موصوف سے ایک طرح کا تعلق تھا اور شاید کسی وقت اس سے کوئی ناشائستہ حرکت سرزد ہو گئی تھی اس کے باوجود شکر اللہ خاں اس کے ساتھ سلوک کرتا رہا۔ بیدل نے شکر اللہ خاں کے اخلاق کی تعریف کرتے ہوئے اس کو اس نکتہ پر متوجہ کیا کہ اگر کوئی کم ظرف ہے تو اس کی کم ظرفی ایک کریم اور فیاض آدمی کی راہ میں روڑا نہ بننے پائے۔

”در باب شاہ زین العابدین وغیر آں، کہ امثال ما اینجا صلاں مزرع ایجاد اند، از عالم اخلاق

[آنچہ] ظہور پیوست وی پیوند، غیر از آثار رافت حقیقی نیست، اجر وقوع این مرام از حق

بجن خواہد بود۔“

شاہ زین العابدین وغیرہ کی بابت کہ ہم جیسے لوگ مزرعہ ایجاد کی لا حاصل شخصیتیں ہیں آپ کے عالم اخلاق سے جو برتاؤ سامنے آیا اور آثار رہتا ہے وہ حقیقی رافت و مہربانی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس کا ثواب خدا سے یقیناً آپ کو مل کر رہے گا۔

افراط حقیقت است و اعیان تفریط این جملہ مرکب، آن ہمہ فیض بسیط  
کم ظرفی ما فیض ترا مانع نیست گر قطرہ بود قطرہ، محیط است محیط (۶۷۰)

افراط حقیقت ہے اور اعیان تفریط یہ سب مرکب ہیں اور وہ سب بھی بسیط۔ ہماری کم ظرفی

تیری فیض رسانی کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں ہے، قطرہ اگر قطرہ رہتا ہے تو سمندر بھی سمندر ہی رہتا ہے۔  
رقعات میں زین العابدین کے نام چار خطوط ہیں۔ سب کے سب بیدل سے دوستانہ روابط پر  
روشنی ڈالتے ہیں۔ ایک خط میں لکھتا ہے:

”تا نفس انقطاع نمی پذیرد، رشتہ اخلاص زنا رگ گردن آرزوست۔“ (۶۷۱)

سانس جب تک چل رہی ہے اخلاص کا رشتہ گردن آرزو کا جینو ہے (یعنی خلوص کا جینو گردن  
میں پڑا رہے گا۔)

اسی خط میں لکھتا ہے:

ایک طرح کی بھلکی اور بچینی تمام لوگوں کی زندگی میں پائی جاتی ہے اور اس سے نجات آسان  
نہیں۔ ضمنی طور پر وہ اپنے حالات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔

”اہل زندگی راتا کشاکش نفس باقیست، بستگی ابواب تردد محال ست۔ و تار شتہ عمر بیچ و تاب  
دارد، کمند پریشانی را چین کوتاہی وہم و خیال۔“ (۶۷۲)

زندوں میں جب تک سانس کی کشاکش کا سلسلہ باقی ہے پریشانیوں کے دروازوں کا بند ہونا  
محال ہے اور جب تک زندگی کے دھاگے میں بیچ و تاب موجود ہے پریشانی کی کمند پر بل پڑنا ایک وہم و  
خیال ہے۔

ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ نے کوئی چیز بطور تحفہ بیدل کو بھیجی تھی اور بیدل نے  
اس کو شکریہ کے ساتھ قبول کیا۔

”سپاس این عطیہ کہ نفس حاشیہ نعینان خیال احسان مال ست بکدام عبارت  
واگذار۔“ (۶۷۸)

اس عطیہ کا شکریہ کہ خیال کے حاشیہ نشینوں کا سانس احسان مال ہے (میں بیدل ممنون ہوں)  
کن الفاظ میں ادا کروں؟

تیسرا خط اشتیاق ملاقات کی نشاندہی کرتا ہے اور چوتھے خط میں بیدل مکتوب الیہ کی یاد آوری پر  
اپنی مسرت اور خوشی کا اظہار کرتا ہے۔

امروز بعد عمری، دلدار یاد ما کرد شرم تغافل آخر حق وفا ادا کرد  
خاک رحیم، مارا آسان نمی توان دید مرغان خمید چشم آہنگ پیش پا کرد (۶۷۴)

آج ایک عرصہ کے بعد ہمارے محبوب نے ہمیں یاد کیا، شرم تغافل نے آخر وفا کا حق کر دیا۔ ہم  
خاک راہ ہیں ہم کو آسانی سے نہیں دیکھا جاسکتا، جب آنکھ نے پیش قدمی کا ارادہ کیا تو پلکیں جھک گئیں۔

پانچواں خط زین العابدین کی طرف سے مرزا محسن کو لکھا گیا ہے۔ یہ خط واضح کرتا ہے کہ بیدل  
کے دوست احباب خصوصاً امراء بیدل کے انداز تحریر سے اتنا متاثر تھے کہ وہ اس سے درخواست کرتے  
تھے کہ ان کی طرف سے ان کے دوستوں کو خط لکھا جائے۔ دوم یہ کہ زین العابدین کو مرزا محسن سے  
غیر معمولی ارادت تھی ممکن ہے یہ وہی مرزا محسن ذوالقدر ہوں جس کو خوشگلو نے بیدل کے ان قدیم  
دوستوں کے زمرہ میں شمار کیا ہے جن کے بچپن سے بڑھاپے تک بیدل کے مخلصانہ روابط رہے۔

### نواب ذوالفقار خاں:

امیر الامراء نواب ذوالفقار خاں نواب آصف الدولہ اسد خاں کا بیٹا اور نامور امراء میں تھا جو  
جہاندار شاہ ابن شاہ عالم بہادر شاہ کے زمانہ میں امیر الامراء کے عہدہ پر فائز ہوا۔ محمد فرخ سیر نے جب  
جہاندار شاہ پر فوج کشی کی تو اسے شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ ذوالفقار خاں کو اس جرم میں کہ فرخ سیر کے  
باپ اور بھائی کے قتل میں اس کا بھی ہاتھ تھا، اس نے جہاندار شاہ کے ساتھ اسے بھی قتل کر دیا۔

نواب ذوالفقار خاں سے بیدل کے روابط کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات دستیاب نہیں  
ہو سکیں۔ خوشگلو کا بیان ہے کہ ایک دفعہ ذوالفقار خاں نے دوسواشرنی مرزا بیدل کو بھیجی، بیدل نے وہ رقم  
عادل خان ابن شکر اللہ خاں کو بھیج دی جو اس زمانہ میں مالی مشکلات سے دوچار تھا۔ (۶۷۵) قطعات کے  
مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاندار شاہ اور اس کے بھائیوں کے درمیان جنگ جانشینی میں ذوالفقار  
خاں کی کامیابی کے وقت بیدل نے ایک مبارکباد نامہ اس کو بھیجا:

آنها کہ بصد کمال ملتمس است و ز نور یقین شاں جہاں مقبوس است  
تاریخ ظفر حقیقت نصرت جنگ گفتند کہ ذوالفقار خاں مارا بس است (۶۷۶)  
وہ لوگ جو سیکڑوں کمال سے متصف ہیں اور جن کے نور یقین سے دنیا روشنی حاصل کر رہی ہے  
انہوں نے نصرت جنگ کی تاریخ حقیقت ظفروں کہی ”ذوالفقار خاں مارا بس است“۔

یہ دونوں واقعات بتاتے ہیں کہ خان موصوف سے بیدل کے تعلقات انتہائی دوستانہ تھے۔  
قلعہ سنگار فتح کرنے میں ذوالفقار خاں کی کامیابی کی مناسبت سے بھی بیدل نے ایک قطعہ کہا ہے:

ہزار شکر کہ امروز خان نصرت جنگ شکست قلعہ سنگار بر سر میواں  
رساند از دو ترنم پردہ تاریخ ”فتوح عید طرب“ ”گوش ہدیہ رمضان“

۱۱۱۵ھ (۶۷۷)

ہزاروں شکر ہے کہ آج خان نصرت جنگ نے قلعہ سنگار کو میواتیوں کے سر پر دے پٹکا، دو

مجلوں سے پردہ تارخ نکالا (فتوح عید طرب، گوش ہدیہ رمضان)۔

دیوان بیدل میں ایک غزل ذوالفقار خاں کی اس فتح کے موضوع پر پائی جاتی ہے جو درج ذیل ہے:

دل فتح و دست فتح و نظر فتح و کار فتح  
دستت بہا زوی نسب مرتضی قوی  
یک غنچہ غیر گل، نتواں یافت تا ابد  
گردوں چو زخم کھنہ کند چار پارہ اش  
ہر جا بعزم رزم بہالد ارادہ ات  
یارب جو آفتاب بہر جا قدم زنی  
چند آنکہ چشم کار کند گل دمیدہ گیر  
آغوش خری پھدر باز کردہ کی  
یکبار اگر رسد بزباں نام نصرت  
تا حشر ای سحاب چن ساز بیدلاں  
گلجوش ہر نفس زونت صد ہزار فتح  
تیغ ترا ہمین حسب ذوالفقار فتح  
در گلشنی کہ کرد هتش آبیار فتح  
گر با دل عدوی تو سازد دوچار فتح  
مژگاں مشکوونی نکشد انتظار فتح  
گرد رہت چو صبح کند آشکار فتح  
چوں آسمان گرفتہ جہان در کنار فتح  
کافاق، از تو باغ گل است ای بہار فتح  
ہشتاد و ہشت و چار صد آرد شمار فتح  
بر مزرع امید دو عالم بہار فتح (۶۷۸)

نواب سیف الدولہ عبدالصمد خاں (ناظم):

(۱۷۱۳ء تا ۱۷۲۶ء)

نواب سیف الدولہ عبدالصمد خاں عہد اورنگ زیب کا ایک بااثر امیر تھا جس کو اس وقت شش صدی اور اس کے بعد ہزار پانصدی کا عہدہ اور عبدالصمد کا خطاب بھی ملا تھا۔ جہاندار شاہ اور اس کے بھائیوں کے بیچ جنگ جانشینی کے وقت وہ جہاندار شاہ کی طرف سے لڑ رہا تھا اور کامیابی کے بعد اس کو ہفت ہزاری کا منصب اور عالی جنگ کا خطاب ملا۔ عہد فرخ سیر میں ۲۲ فروری ۱۷۱۳ء میں ہفت ہزاری و صوبیدار لاہور کے منصب پر فائز ہوا۔ (۶۷۹) عبدالصمد خاں حضرت عبداللہ احراری کی اولاد سے تھا اور خود زاہد متقی اور عابد شب زندہ دار تھا، دن اس کا گھوڑے کی پشت پر دشمنان اسلام سے شمشیر زنی میں بسر ہوتا اور رات مصلی عبادت پر۔ خدا نے اس کی دعاؤں کو شرف قبولیت بخشا اور اسلامی آبادیوں کو نذر آتش کرنے والے بندہ بیراگی کا جادو خانوادہ نقشبند کے اسی درویش شمشیر زن کے مساعی کے سامنے باطل ہو گیا۔ (۶۸۰)

بیدل کے نواب موصوف سے تعلقات کے بارے میں زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ اس

رباعی کی شہرت کے بعد جس میں بیدل نے سادات بارہہ پر فرخ سیر کے قتل کی وجہ سے نمک حرامی کا نام لگایا تھا، بیدل دہلی سے لاہور فرار کر گیا اور وہاں نواب عبدالصمد کے پاس پناہ گزیں ہوا۔ نواب اس کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آیا (۶۸۱)۔ اس واقعہ کا تذکرہ آئندہ صفحات میں کیا جائے گا۔

لاہور میں بیدل کے ساتھ نواب موصوف کا تقریباً ڈیڑھ سالہ برتاؤ واضح کرتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان پہلے سے دوستانہ تعلقات قائم تھے۔

نواب غیرت خاں بہادر صلابت جنگ:

نواب غیرت خاں بہادر صلابت جنگ کے سلسلہ میں خوشگونی صرف اتنا لکھا ہے کہ وہ بیدل کے دوستوں میں تھا اور اس کی وفات کے وقت اس کے پاس موجود تھا۔ خوشگونی بیدل کی وفات سے متعلق جو حالات لکھے ہیں وہ انہیں کی زبان سے سن کر لکھے ہیں (۶۸۲)۔ آثار عالمگیری سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اورنگ زیب کے امرا میں تھا، ۱۰۸۵ھ میں اسے خلعت، شمشیر اور اسب عطا ہوا، ۱۰۸۷ھ جوہور کا فوجدار ہوا، ۱۰۸۹ھ میں جوہور میں یا اس کے دوران سفر اس کی قیام گاہ پر بجلی گری جس میں کئی آدمی جان بحق ہو گئے اور خود غیرت خاں کے صرف پاؤں کو نقصان پہنچا۔ (۶۸۳)

خان بہادر لعل محمد خاں:

خان بہادر لعل محمد خاں کے نام بیدل کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک اچھے عہدہ پر فائز تھا اور بیدل کے مخلص احباب میں تھا۔ آثار عالمگیری کے مطابق وہ ۱۰۸۰ھ میں حسن علی خاں اللہ وردی خاں کی طرف سے مقرر کا حاکم تھا (۶۸۳)۔ بیدل کا ایک شاعر دوست عاشق ہمت مالی مشکلات سے دوچار تھا، وہ اجمیر سے اسلام آباد (مٹھرا) آیا اور خان موصوف کی تعریف میں ابوطالب آملی کی زمین میں ایک قصیدہ کہا۔ بیدل نے اس کی حمایت و سرپرستی کی سفارش خان موصوف سے کی۔ اس واقعہ سے دونوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت اور کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے (۶۸۵)۔ اور شکر اللہ خاں کے نام بیدل کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ خان بہادر موصوف نے جس کے لئے بیدل ”چراغ محفل اخلاق“ کی تعبیر استعمال کرتا ہے کسی ناخوشگوار واقعہ کے نتیجے میں جس سے شاید اس کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچی، خود کشی کر لی۔ بیدل نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے شکر اللہ خاں کو لکھا:

”جمعیت ناقد رواں شنبہ مرگ صاحب دلان بی باشد و اطاعت ناقصان دلیل فانی کامل

صلتان۔ در ہمہ حال زندگی موہوم بقبول تحکم دونان نمی ارزد۔“ (۶۸۶)

ناقد ردانوں کی ماتحتی صاحب دل حضرات کے لئے شکجہ مرگ کی حیثیت رکھتی ہے اور ناقصوں کی اطاعت کامل صفت لوگوں کے لئے فائدہ کامل ہے۔ بہر حال اس موہوم زندگی کو زیب نہیں دیتا کہ دنی اور پست فطرت لوگوں کے حکم کو بادل ناخواستہ قبول کرے۔ چنانچہ ایک جگہ کہتا ہے:

پیر و خلق دنی بودن ز غیر تہاست دور شیر مرداں را نباید بر طریق میش رفت شفیق نے تذکرہ شام غریباں میں شاہ محمد شفیع وارد کے حوالہ سے لعل محمد خاں کے بارے میں درج ذیل معلومات فراہم کی ہیں۔ وہ لکھتا ہے:

”پس از استغلام از مت بیدل (از ان مقام قدم بوادی سفر گذاشت۔ پس از قطع منازل در بلدہ متھر ابرکنار دریای جمن اقامت گزید۔ لعل محمد نامی حاکم آن مکان نایب حسن علی خان بہادرالہ وردی خان از قدم میرزا اطلاع یافتہ در دلوئی و خاطر داری کو شید۔ میرزا نیز دلدادہ صحبت او شد اتفاقاً سلطان عالمگیر کہ در دکن بود لعل محمد را بحضور خود طلبید۔ لعل محمد موجب حکم پادشاہ جبراً و قہراً رو بہر دکن آورد و در عرض راہ سمد عزیمت بصوب اقلیم عدم جلو ریز ساخت۔“ (۶۸۷)

اعظم شاہ کے دربار سے استعفی کے بعد بیدل وہاں سے سفر پر روانہ ہوا۔ چند منزلیں طے کرنے کے بعد متھر میں دریائے جمن کے کنارے اس نے قیام کیا۔ وہاں کے حاکم لعل محمد نے جو حسن علی خاں بہادر اللہ وردی خان کا نائب تھا، مرزا کے درو کی خبر پا کر اس کی دلجوئی اور خاطر داری کی کوشش کی۔ مرزا بھی اس کی صحبت کا شیدا ہو گیا تھا۔ اتفاق سے سلطان عالمگیر جو اس وقت دکن میں تھا لعل محمد کو اپنے پاس طلب کیا۔ لعل محمد نے حسب حکم پادشاہ جبراً و قہراً دکن کا سفر کیا اور راستہ ہی میں اس کی عزیمت کا گھوڑا راہی ملک عدم ہوا۔

اس بیان سے چند باتوں پر روشنی پڑتی ہے اول یہ کہ استعفی کے بعد بیدل متھر اروانہ ہوا۔ دوم یہ کہ لعل محمد خاں کا مہمان ہوا، سوم یہ کہ اس کی خود کشی کا سبب جس کا تذکرہ بیدل کے خط میں مبہم ہے عالمگیر کا اس کو اپنے پاس باز پرس کے لئے بلانا تھا۔ پہلے نکتہ پر ہم استعفی کے واقعات کے ضمن میں بحث کر چکے ہیں۔

بیدل نے جو خط شکر اللہ خاں کو لکھا ہے اس میں ایک طرح سے اورنگ زیب پر طعن کیا کیونکہ اس کے لئے ”ناقد“، ”ناقص“ اور ”دون“ الفاظ استعمال کئے ہیں۔



## شعراء وادباء

بیدل کے شاعروں اور ادیبوں سے تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر نور الحسن انصاری مرحوم لکھتے ہیں:

”بیدل کے مکتوب الہیم میں مشہور ہمعصر شعراء اور ادیبوں کے نام نظر نہیں آتے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ناصر علی اور سرخوش وغیرہ سے ان کی معاصرانہ چشمک تھی۔ شیخ عبدالعزیز عزت، ایزد بخش رسا اور رفیع خاں باذل کے نام البتہ چند خطوط ہیں۔“ (۶۸۸)

بیدل کے تفصیلی حالات کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ معاملہ ایسا نہیں تھا۔ ان مشہور شاعروں کے علاوہ جن کا تذکرہ ڈاکٹر انصاری نے کیا ہے بیدل نے اپنے متعدد خطوط میں دوسرے مشہور شاعروں کا نام اجمالی اور ضمنی طور پر لیا اور ان کے لئے سفارشیں کی ہیں مثلاً رفیع خاں باذل کے نام ایک خط میں میر محمد زمان راسخ اور ان کے دوستوں کی سفارش کرتا ہوا لکھتا ہے:

”درین نشاکہ روی توقع عالمی متوجہ التفات آجناب است، آئینہ اسرار سیادت، میر محمد رفقای ایشاں، کہ از صفا کیشاں این روزگار اند، تمنای حصول سعادت ملازمت دارند۔ مگر رم روی تو جہی اگر جلا بخش احوال شان باشند، متشال نتائج از مرآت ثواب محو نخواہ بود۔“ (۶۸۹)

اس اثنا میں کہ ایک عالم کی امیدیں آپ کی ذات سے وابستہ ہیں، اسرار سیادت کے آئینہ میر محمد اور ان کے احباب جو اس دور کے صفا کیش اور مخلص لوگوں میں ہیں خدمت میں حاضری کی تمنا رکھتے ہیں۔ اپنی مخصوص توجہ کی گرم جوشی سے اگر ان کے مالی حالات کی اصلاح فرمائیں تو آئینہ ثواب سے نتائج کی صورت محو نہ ہوگی۔ (یعنی ضرور ثواب ملے گا)۔

میر محمد زمان اور اس کے ساتھیوں کو بیدل نے ”صفا کیشوں“ کی صف میں شمار کیا ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کے رفقاء سے کون شعراء مراد ہیں۔ خوشگو نے میر محمد زمان راسخ کے حالات کے ضمن میں لکھا ہے:

”میر، میرزا (بیدل) و حاجی اسلم سالم و حکیم شیخ حسین شہرت در مہجرات بلشکر شاہی باہم

مطرح بودہ اند۔“ (۶۹۰)



میر، مرزا بیدل، حاجی اسلم سالم، حکیم شیخ حسین شہرت گجرات میں لشکر شاہی میں باہم دوست تھے۔

اور اعظم شاہ کے احوال کے ضمن میں لکھا ہے:

”میرزا بیدل و میر محمد زمان رانخ و حاجی اسلم سالم و حکیم شیخ حسین شہرت شعرائی درگاہ اویند۔“ (۶۹۱)

مرزا بیدل اور میر محمد زمان رانخ و حاجی اسلم سالم اور حکیم شیخ حسین شہرت اس کے دربار کے شعراء ہیں۔

اس لئے یقیناً سالم، شہرت اور رانخ وغیرہ بیدل کے صفا کیش احباب میں ہیں اور بعض دوسرے خطوط میں عاشق ہمت، مرزا اسہراب رونق اور محمد احسن ایچا دوغیرہ کے نام بھی آئے ہیں۔ چونکہ اس کے علاوہ کوئی اور ماخذ ہمارے پاس نہیں ہے کہ ان صفا کیشوں کا پتہ لگائیں اس لئے ہمارا قیاس ہے کہ ان کے علاوہ دیگر معروف شعراء بھی ہوں گے جن کے بارے میں خوشگو معلومات فراہم نہ کر سکا ہو۔ ذیل میں ہم ان کے احباب کی تفصیلی فہرست پیش کرتے ہیں:

عبدالعزیز عزت:

بیدل کے احباب میں مولانا عبدالعزیز عزت واحد شخص نظر آتے ہیں جنکے استاد ہونے کا اعتراف خود بیدل نے کیا ہے۔ اس لئے مناسب ہوگا کہ ان کا نام سرفہرست آئے۔

مولانا عزت کا تذکرہ بیدل کے حالات کے ضمن میں ہو چکا ہے یہاں رقعات کی روشنی میں بیدل سے ان کے تعلقات کی نوعیت پر تھوڑی سی بحث کی جائے گی۔

بقول محمد ساقی، مولانا عبدالعزیز عزت ملا عبدالرشید اکبر آبادی کے صاحبزادہ تھے۔ ان کا اصلی وطن ہرات تھا، وہاں سے ہجرت کر کے اکبر آباد (آگرہ) آئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ مولانا عزت کو تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، حکمت، فلسفہ، منطق غرض جملہ علوم متداولہ میں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ ۹ ذی الحجہ ۱۰۸۰ ہجری ۱۶۶۹ء کو ہمت خاں اور بختا ور خاں نے اورنگ زیب سے ان کا تعارف کرایا اور جلد ہی وہ چہار صدی ہفتاد سوار کے منصب پر فائز ہو گئے۔ اس کے علاوہ خلعت، پنج سر اسپ (پانچ راس گھوڑے) شمشیر، جھدر (ایک قسم کا خنجر) اور پالکی مع جملہ سامان کے بطور اعزاز کے ان کو عطا کئے گئے۔ چوتھے دن ترقی کر کے عرض کمر کے داروغہ کی خدمت پر مامور ہوئے پھر چکھہ سر ہند کے فوجدار مقرر ہوئے۔ ۱۰۸۵ھ ۱۶۷۴ء میں دلاور خاں کا خطاب ان کو ملا۔ ۲۷ شعبان ۱۰۸۵ھ ۱۶۷۴ء میں

جب کہ وہ ہفت صدی دو صد سوار کے منصب پر فائز تھے بادشاہ کی خدمت میں آمد و رفت میں کوتاہی برتنے کے سبب ملازمت سے برطرف کر دیئے گئے۔ انہوں نے بادشاہ سے درخواست کی کہ ان کو لاہور بھیج دیا جائے۔ لاہور پہنچنے کے بعد انہوں نے بختا ور خاں کو ایک غزل بھیجی جو ان کے وارداتِ قلب کو بیان کرتی ہے:

ز درد دل چہ نوایم کہ جوش بیتابی ست ز شوق جان چہ نگارم کہ نامہ سیمابی ست  
درد دل کا کیا تذکرہ کریں کہ جذبات کے ابال میں قرار نہیں، شوق جان کا ذکر کیا کریں کہ تحریر سہابِ صفت ہے۔

شب خیال فراق کہ ریخت خونِ دلم کہ تارا شکِ گلابی و دیدہ عنابی است  
کس کی جدائی کے خیال نے میرے دل کا خون کیا، کہ آنسوؤں کے تار گلابی رنگ اور آنکھ عنابی رنگ کی ہو گئی ہے۔

چگونہ شرح دہم حال دل کہ بیتابم زیاد تاب رخس دل کتان مہتابی ست  
میں جو مضطرب ہوں اپنے دل کا حال کس طرح بیان کروں، اس کے چہرے کی چمک کی یاد سے دل چاندنی رات کا کتان کا کپڑا بنا ہوا ہے (کتان ایک باریک قسم کا کپڑا ہے جسے ٹسر کہتے ہیں اور جس کے بارے میں مشہور ہے کہ چاندنی رات میں ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔)

نشستہ ام دریں بحر تا خدا چہ کند بکشتی کہ زیک قطرہ آب گردابی ست  
اب اس دریائے اضطراب میں ایسی کشتی میں بیٹھا ہوں جو پانی کے ایک قطرہ سے بھنور بن کر تہ میں ڈوب جانے والی ہے۔

نمائد صورت راز دلم نہاں عزت کہ دیدہ صفحہ تصویر رنگ بیخوابی ست  
عزت! میرے راز دل کی صورت اب نظروں سے اوجھل نہیں رہی کیونکہ آنکھ رنگ بے خوابی کی سفید تصویر بنی ہوئی ہے۔

مولانا عزت کی وفات ۱۰۸۸ھ ۱۶۷۷ء میں ہوئی۔ (۶۹۲)  
خوشگو لکھتا ہے:

”وآں وقت (ہنگام ملازمت در خدمت اعظم شاہ) مشقِ سخن در خدمت شیخ عبدالعزیز عزت می گذرانید۔“ (۶۹۳)

اس وقت یعنی اعظم شاہ کی ملازمت کے دوران بیدل شیخ عبدالعزیز عزت کی خدمت میں مشقِ سخن کرتا تھا۔

لیکن جیسا کہ پچھلے صفحات میں لکھا گیا یہ دعویٰ شبہ سے خالی نہیں ہے کیونکہ ایندیش رسا کے سے پوری طرح واضح ہے کہ بیدل اس کے ذریعہ مولانا عزت سے آخر رمضان یا اول شوال ۱۰۸۵ء میں متعارف ہوا ہے۔ اور اس وقت تک بیدل سرکاری ملازمت کو خیر باد کہہ چکا تھا۔ رسا کے خطوط کو پیش نظر رکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ بیدل کو سرہند یا لاہور میں مولانا عزت سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ رقعات میں مولانا موصوف کے نام بیدل کے چار خطوط ہیں۔ ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ بیدل نے کچھ وقت اپنا مولانا موصوف کی خدمت میں گزارا ہے اور اسے خوشی سے یاد کرتا ہے۔ یاد آں عیش کہ عیش رائگانی داشتیم سجدہ ای چوں راستاں بر آستانی داشتیم آرام کے ان دنوں کی یاد آتی ہے جو مجھے مفت حاصل تھے اور سچے آدمیوں کی طرح جناب اللہ کے آستانہ پر سجدہ کرتا تھا۔

پھر اپنے مخلصانہ روابط کی طرف اشارہ کرتا ہوا لکھتا ہے:

مانیم و جہہ و سجود و رضائے دوست اندیشہ فراق و ہوای وصال چیست (۱۰۸۳)  
ہم ہیں، پیشانی ہے، سجدہ ہے اور رضائے دوست ہے۔ یہاں جدائی کا اندیشہ اور وصال کی تمنا بے معنی سی بات معلوم ہوتی ہے۔

ایک خط میں خدمت میں حاضری سے محرومی کی شکایت کی ہے اور اپنے نیاز مندانہ تعلق کا اظہار اس طرح کیا:

”از غیبت دولت حضور چہ کلفتها کہ در آئینہ طبیعت مشاہدہ نہ نمودہ نمی نماید۔ و از زخم تصور چہ درہای حسرت کہ بروی دل نکشودہ نمی کشاید۔“ (۱۰۹۵)

دولت حضور کی غیبت (خدمت میں غیر حاضری) کے نتیجہ میں کیا زحمتیں اٹھائیں ہیں جو آئینہ طبیعت کے مشاہدہ میں نہ آئیں اور نہ آتی ہیں اور زخم تصور کی بدولت حسرت کے وہ کیا دروازہ ہیں جو دل پر واندہ ہوئے اور نہ ہوتے ہیں۔

اور اب وہ خط جو بیدل کی شاگردی اور عزت کی استادی کو ظاہر کرتا ہے ملاحظہ ہو:

”سا لکا و اصلا! دوسہ مصرع سادہ کہ الحال، دل سودا مال، طرح کردہ و لکھ و داد سلسک، در احاطہ دام مسطر! درود طبع دارد کہ در در سگاہ اصلاح آراہ سلسک گو ہر کمال گردد۔“

میرے سالک و واصل! دو تین سیدھے سادے مصرعے جن کو اس وقت دل سودا مال نے نظم کیا ہے اور لکھ و داد سلسک نے دام مسطر میں گرفتار کیا ہے، حاضر خدمت ہیں۔ امید کہ مطالعہ اصلاح آراء کی در سگاہ میں گو ہر کمال کا ہر شتہ ہوں گے۔

دل اگر محو مدعا گردد درد در کام ما دوا گردد  
طعمہ درد اگر رسد در کام ہر گمس ہمسر ہما گردد  
محو اسرار طرہ اورا رگ گل دام مدعا گردد  
گر سگالہ وداع سگ ہوں کرہ دل گہر ادا گردد (۱۰۹۶)

ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک دفعہ استاد عزت سخت بیمار پڑے، بیدل نے ان کی صحت یابی کے لئے خدا سے دعا کی اور اپنے خلوص و ارادت کا اظہار کیا (۱۰۹۷)۔ ممکن ہے یہ آخری خط ہو اور ۱۰۸۸ء/۱۶۷۷ء کے آس پاس لکھا گیا ہو جب مولانا کسی مرض میں گرفتار ہو کر خدا کو پیارے ہوئے۔ بیدل نے انکی وفات کے موقع پر ایک مرثیہ کہا جو بڑی حد تک بیدل کے ان سے والہانہ قلبی تعلق، عقیدت اور ارادت کو واضح کرتا ہے نیز ان کے مقام و مرتبے کی تعیین کرتا ہے:

آن شیخ فی الحقیقت، آن ہادی طریقت آن نور قرب مولی، آن شمع دین خاتم  
کز حق خطاب او بود عبدالعزیز عزت یعنی کمال عزت بر طینتش مسلم  
در گلشنی کہ می رفت ذکر بہار خلقتش بوی گل از خجالت می بست نقش شبنم  
بیتاب ذرہ او انوار مہر عظمت موج قطرہ او جوش محیط اعظم  
در دیدہ تمنا لطفش فروغ بینش بر زخم بینوائی جودش نوید مرہم  
دست نوال اورا در پلہ کرامت امواج صفحہ بحر نقشش بروی درہم (۱۰۹۸)

دوسرے قطعہ میں کہتا ہے:

شیخ زمانہ، عمدہ دین، عزت جہان کز باغ دہر رفتن او رنگ عیش برد  
عمری دلیل فطرت ارباب فضل بود یعنی طریق معنی اخلاق می سپرد  
آخر درین زیانکدہ نیستی متاع نقد نفس بکیہ آسودگی شمرد  
شد خاک پیکرو بفلک رفت جان پاک صافش عروج کرد وہ پستی نشست درد  
عمر عزیز او چہل و ہشت سال بود شہ سال رحلتش؛ چہل و ہشت سالہ مرد (۱۰۸۹)

اسی طرح تیسرے قطعے میں انکی وفات کا مادہ تاریخ یوں نکالا ہے:

بیدل ز دل طلب کرد تاریخ رحلت او آمد ندا کہ بردند نور از چراغ عالم (۱۰۹۹)  
لیکن محمد ساقی نے انکی رحلت کی تاریخ چھریج الاول ۱۰۸۸ء/۱۶۷۷ء لکھا ہے۔ (۷۰۰)



## ایزدبخش رسا:

ایزدبخش رسا مولانا عبدالعزیز عزت کا شاگرد تھا۔ شروع میں وہ شیعہ مذہب تھا۔ مولانا عزت کی صحبتوں کے زیر اثر سنی ہو گیا۔ اسی مناسبت سے اس نے ایک عرصے تک اپنا تخلص سنی رکھا لیکن بیدل سے ملاقات کے بعد اس کے مشورہ کے مطابق اپنا تخلص 'رسا' اختیار کیا۔ اورنگزیب کے عہد میں اکبر آباد کے بیوتات سے لے کر داروغہ خزانہ اور صوبیدار کے مختلف عہدوں پر فائز رہا۔ پاکیزہ شاعرانہ ذوق کا حامل تھا اور نثر بھی دلکش لکھتا تھا۔ اس کی تصانیف میں ایک رسالہ "کشف النطا" کی شرح ہے جسے مولانا عزت نے تشبیح کی رد میں لکھا تھا۔ دوسرا خط کا مجموعہ "ریاض الوداد" ہے۔ (۷۰۱)

ان خطوط کی روشنی میں جو رسا کے نام بیدل نے لکھے ہیں نیز بیدل کے نام جو رسا نے لکھے ہیں یہ کہا جاسکتا ہے کہ دونوں کے درمیان مخلصانہ روابط برقرار تھے اور دونوں ایک دوسرے کے قدردان تھے۔ ریاض الوداد میں جس کا ایک قلمی نسخہ پٹنہ کی خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہے، بیدل کے نام رسا کے دو خطوط ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا عزت کے نام جو دو خطوط ہیں ان میں بیدل کا تذکرہ ضمنی طور پر آتا ہے، انہیں خطوط کی اساس پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایزدبخش کا ۱۰۸۵ھ میں بیدل سے تعارف ہوا۔

"ہمد ہم شہر صدر ۱۰۸۵ھ بیدل ہمہ دل را دیدم و از دل نہادش پرسیدم"۔ (۷۰۲)

"۷۰۱ھ مذکور ۱۰۸۵ھ بیدل سراپا دل سے ملاقات ہوئی اور دل سے اس کی خیریت دریافت کی"۔ ایسا نہیں ہے جیسا کہ ڈاکٹر عبدالغنی نے لکھا ہے۔ "ابھی بیدل فوج میں ملازم نہیں ہوئے تھے اور نہ انہیں کوئی منصب ہی ملا تھا کہ ایک معاصر شاعر ایزدبخش رسا کی ان سے ملاقات ہوئی اور رسا نے بیدل کی شخصیات کا اثر ایک ہی لفظ کے ذریعہ عمدگی سے بیان کر دیا اپنے ایک رقعہ میں لکھتے ہیں: بیدل ہمہ دل را دیدم"۔ (۷۰۳)

کیونکہ جیسا کہ اس سے پہلے ثابت کیا گیا، بیدل کی مدت ملازمت تقریباً ۳۵ یا ۳۶ سال یعنی ۱۰۸۰ھ تا ۱۶۶۹ھ تا ۱۰۸۳ھ تا ۱۶۷۲ھ کے درمیان ہے۔ اس لئے بیدل کی رسا سے ملاقات ملازمت سے استعفیٰ کے بعد ہوئی ہے۔

بیدل کے بارے میں رسا کے کیا تاثرات تھے اس کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے۔ مذکورہ بالا اقتباس کے علاوہ جو بیدل کی پرکشش شخصیت سے رسا کے غیر معمولی تاثر کو واضح کرتا ہے بیدل کے نام اپنے ایک خاص خط میں اس بنا پر کہ بیدل نے ایک مہینہ تک اس کو خط نہیں لکھا اپنے اضطراب اور اشتیاق اور اپنی مخلصانہ ارادت مندی کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

"خلاصہ آب و گل، میرزا عبدالقادر بیدل! صابا خدا! اظہار اشتیاقیکہ در یک شہر علت نامہ حصول ملاقات نباشد، مفقوسی تکلیف است و لب از آسمقوله برستن برخلاف نفس الامر۔ ز آہ شعلہ سیمادرد پیدا ست زبان مضربا طنبور دل ماست ہمہ حال مشتاقیم۔ و اشتیاق بر موعود زیادہ از حد داریم"۔ (۷۰۴)

خلاصہ آب و گل، مرزا عبدالقادر بیدل میرے صاحب اور میرے مخدوم! اشتیاق کا اظہار کہ ایک مہینہ کے دوران خط کے ذریعہ حصول ملاقات کا شرف حاصل نہ ہو سکا تکلیف دہ ہے اور اس بات سے لب بندی نفس الامر کے خلاف ہے۔ میرے آہ شعلہ صفت سے درد نمایاں ہے، زبان میرے دل کے طنبور کا مضربا ہے۔ بہر حال ہم مشتاق ہیں اور ملاقات کے وعدہ پر حد سے زیادہ اشتیاق رکھتے ہیں۔ شاید اسی خط کے جواب میں بیدل نے نامہ نگاری میں تاخیر کی اس کی شکایت کو دور کرنا چاہا۔ لکھتا ہے:

"و تقصیر غفلت بیدلان، ہر چند ازان عالم نیست کہ بسی عذرا ز کجہ انفعال توان رست اما امید غو با قیست۔ تاوان بی پروائی نامہ برگردن افتادہ است، از قبول چارہ نیست۔ از یاد گرامی لقا، در هیچ حاتی غافل تصور نفرمایند۔ و بجرم عدم نامہ پردازی، طومار شکوہ و اعتراض نہ کشایند"۔ (۷۰۵)

بیدل کی غفلت کی کوتاہی ہر چند کہ اس عالم کی چیز نہیں ہے کہ عذر کر کے شرم کے کھنجے سے آزاد ہو جائے لیکن غفوی امید بہر حال باقی ہے، خط لکھنے میں لا پرواہی کا تاوان میری گردن پر ہے، جسے قبول کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ ملاقات کی گرامی یاد سے کسی بھی حال میں آپ مجھے غافل نہ تصور کیجئے اور خط نہ لکھنے کے جرم میں گلہ و شکایت کا دفتر نہ کھولئے۔

دوسرے خط میں بیدل کے طبع موزوں کو رسا نے شاعر کے کلام کے حسن و قبح کو پرکھنے کی کوئی قرار دیا ہے اور اس بنا پر اکثر اپنا کلام نقد و تبصرہ کے لئے اس کے پاس بھیجتا تھا۔ اس خط میں اس نے بیدل کے لئے کچھ شایستہ القاب استعمال کئے جو ایک معاصر کی نظر میں اس کے شاعرانہ مقام کو واضح کرتے ہیں۔

"دعای کہ در گز مین اجابت ریشہ دوانیدہ، و سلامی بسلاط طوبی سر کشیدہ۔ تھہ کامل عیار یست کہ ہر چہ نہ سنجیدہ طبع رسای اوست، از حسن قبول معراست۔ و آنچه نہ پسندیدہ فکر والای او، از زبور لطف مبرا۔ یعنی اورنگ نشین کشور نازک خیالی، نقطہ انصاف تمنغای اعتبار افکار عالی، نیر اعظم آسمان کمال، فرمانروای عالم خیال، خلاصہ آب و گل، میرزا عبدالقادر

بیدل، کہ دل مشتاقان دارالقرارش باد، وازنا موزونی زمانہ، غبار کراہتی، بردامن وسعت  
مشرقی سینا۔“ (۷۰۶)

ایک دعا ہے جس کی جڑیں اجابت کی گلزمین میں گہری چلی گئی ہیں اور ایک سلام ہے سلامت  
طوبی کی طرف سر اٹھائے ہوئے وہ (بیدل) ایک مکمل معیاری تختہ ہے کہ جو چیز اس کی طبع رسا پر پوری  
طرح نہ اترے وہ حسن قبول سے عاری ہے اور جو چیز اس کے فکر والا کو پسند نہ پڑے وہ زبور لطف سے  
خالی ہے۔ یعنی کشور نازک خیالی کے اور نگ نشیں جس کا نقطہ انصاف بلند و اعلیٰ افکار و خیالات ہیں آسمان  
کمال کے نیر اعظم، عالم خیال کے فرمانروا، خلاصہ آب و گل مرزا عبدالقادر بیدل کہ مشتاقوں کا دل اس کا  
دارالقرار ہو اور زمانہ کی ناسازگاری کے باعث کسی ناخوشگوار واقعہ کی گرداس کی وسیع المشرقی کے دامن  
پر نہ جئے۔

رسا کے اسی خط کے جواب میں بیدل نے شاید درج ذیل خط لکھا:

”یاد آور یہاں بیدلان رسا، دور پیا نہای الطاف بی انتہا خوشا طریق عالم اشفاق، کہ اگر  
دوستان ہمہ معرہ بر روی ہم کشا بند، بہر از زبان شاہد واستودن اند، و ہر چند لبی بہ پرش  
یکدیگر تحریر کرد، ہند، مصدقہ دفتر بہار اخلاق کشودن۔ خاصہ شفقیکہ بواسطہ زبان خامہ دستگاہ  
ظہور گیرد۔ و برابطہ سواد نامہ، وسعت الثقافت یزدیاد یاد ماکردی حضور حق فراموش  
مباد۔“ (۷۰۷)

رسا کی بیدل کی یاد آوری گویا لا محدود عنایتوں کے پیمانہ کا دور ہے۔ محبت و شفقت کا یہ عالم بھی  
کیا خوب ہے کہ احباب اگر باہم ایک دوسرے کو اسی طرح دیکھا کریں تو ہزاروں زبان سے ایک  
دوسرے کی تعریف کریں اور جب ایک دوسرے کی مزاج پر سی کے لئے اپنے لب ہلائیں، بہار اخلاق کا  
پورا دفتر کھول کر رکھ دیں۔ خصوصاً وہ مہربانی جو قلم کی زبان سے منصفہ شہود پر نمایاں ہو رہی ہے اور خط کے  
مضامین کے ذریعہ ہماری طرف متوجہ ہے۔ تو نے مجھے یاد کیا خدا کے حضور میں حاضری کا خیال تیرے  
ذہن سے نہ نکلے؟ اس کے بعد رشتہ کے اشعار پر تبصرہ کرتا ہے لکھتا ہے۔

”معنی ایجاد امن! آ نکہ خوشی نہای ہر مصرعہ ازین غزل چون موج گوہر در آغوش ہم یکدست  
طوفان نمود است، اما حسن مطلع، فی الحقیقت، گوہری بعرض آورد کہ با صفای آبش، محیط را  
در غبار ساحل نشستن است۔ و جو ہر معنی نشان دادہ کہ پر تو خوشیش، آفتاب را، احرام داغ  
تخمر بستن۔ آرزوی مشتاق را ہیوستہ شظیر این قسم عواطف شمارند۔“ (۷۰۸)

میرے معنی ایجاد! باوجودیکہ اس غزل کے ہر مصرعہ کی شوخی موج گوہر کی طرح طوفان جیسی

نمود سے یکساں طور پر ہم آغوش ہے لیکن حسن مطلع نے تو درحقیقت ایسا پیش بہا گوہر پیش کیا کہ اس کی  
صفائی و پاکیزگی، لطافت و نزاکت اور آب و تاب کے سامنے سمندر کو بھی غبار ساحل میں فرو ہو جانے  
کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اور ایسا جو ہر معنی بیان کیا ہے کہ اس کی شوخی کے پر تو کے سامنے آفتاب کو بھی  
داغ تخمر کا احرام باندھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ مشتاق کی آرزو کو سد اسی قسم کی عنایتوں کا چشم براہ  
تصور کریں۔ ایک اور خط میں لکھتا ہے۔

”ارسال نتائج افکار رسا، طبیعت افسردہ را، از کلفت نشینی نجات بخشد۔“ (۷۰۹)

رسا کے نتائج افکار کے ورود نے طبیعت افسردہ کو گوشہ کلفت میں بیٹھنے سے آزاد کر دیا۔

یہ سارے خطوط اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ ان کے تعلقات گہرے اور مخلصانہ تھے،  
ان کے بیچ ادبی تخلیقات کے تبادلے کا سلسلہ بھی جاری تھا اور دونوں ایک دوسرے کے شاعرانہ ذوق  
کے قایل اور نتائج فکر کے قدر داں تھے۔ رسا نے بیدل کے تنقیدی ذوق اور معیار کی بھی تعریف کی ہے  
اور اسی خط میں بیدل نے رسا کے حسن مطلع کی ایسی تعریف کی ہے جو بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ حسن  
عبارت اور بلندی مضامین کے درمیان حسین امتزاج پیدا کرنا دوسرے الفاظ میں لفظی اور معنوی  
خوبیوں میں مطابقت اور ہم آہنگی قائم کرنا ایک ایسا نظریہ ہے جس کو ادب کے نقاد اپنے اپنے مخصوص  
انداز سے بیان کرتے رہے ہیں لیکن بیدل اس کے بارے میں ایک نہایت واضح اور غیر مبہم تصور پیش  
کرتا ہے۔ اس کے نزدیک لفظی خوبیوں سے مراد اس کی انتہائی صفائی، پاکیزگی، شستگی اور لطافت سے  
ہے جیسا کہ موتی کے اندر ہوتی ہے وہ بھی ایسا موتی جس کی صفائی اور پاکیزگی کے مقابلہ پر سمندر کو بھی  
غبار ساحل میں ناپید ہو جانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہ جائے۔ اور معنوی خوبیوں سے مراد اس کی ایسی  
غیر معمولی شوخی ہے کہ سورج کو بھی اپنی تمام تر شوخ کرنوں کے باوجود اس کے مقابلہ پر داغ حسرت  
سہنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہ جائے۔

یہ موضوع بہت دلچسپ ہے اور بڑی اہمیت کا حامل ہے ”بیدل کے نقطہ نظر سے غزل کی  
خصوصیات“ کے زیر عنوان بیدل کی غزل پر بحث کے دوران اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

دوسرے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ رسا کی نامہ نگاری کا انداز جو سراسر الفت و محبت اور خلوص و  
ارادت سے بھرا ہوتا تھا بیدل کے تار داغ کو چھیڑ کر اس میں ایک انتہائی کیفیت پیدا کر دیتا تھا اور  
اسے جلد اور بہتر جواب دینے پر مجبور کر دیتا تھا۔

”غبار افسردہ را تا بمی بحرکت نیارد، پر افشانی در اندیشہ راہ ندارد۔ و بیدل معذور را، تا

مکتوب مشفق، آئینہ داری ہماید، بر غفلتجہای دوری چشم نمی کشاید۔



باکمال اتحاد، از وصل مہوریم ما ہجو ساغر، می بلب داریم و مہوریم ما بحر در آغوش و موج ما ہمان محو کنار کار ما عاشق بی پرواست معذوریم ما“ (۱۰ء) غبار افسردہ کو جب تک با نسیم نہیں چھیڑتی قوت اندیشہ میں پرواز کرنے کی صورت نہیں پیدا ہوتی ہے اور بیدل معذور کی جب تک کسی مہربان اور شفیق دوست کا خط آئینہ داری نہیں کرتا دوری کی غفلتوں پر اس کی آنکھ نہیں کھلتی۔

کمال اتحاد کی بنا پر ہم وصل سے مجبور ہیں، ساغر کی طرح ہم سے بلب بھی ہیں اور محو بھی ہیں۔ سمندر آغوش میں ہے اور ہماری لہریں ساحل پر محو ہیں۔ ہمارا سابقہ عشق بے پروا سے ہے ہم معذور ہیں۔

### رفیع خاں باذل:

رفیع خاں باذل کا شمار ایک کہنہ مشق، صاحب تلاش اور بلند فکر شاعروں میں ہوتا ہے، اس کی دو تصانیف ”معارج النبوة“ نثر میں اور ”حملہ حیدری“ نظم میں پائی جاتی ہیں۔ باذل گوالیار کے قلعہ دار کے عہدے پر فائز تھا۔ (۱۱ء) رقصات میں باذل کے نام بیدل کا ایک خط ہے جو ان دونوں کے تعلقات کی نوعیت پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیدل کے مخلص احباب میں تھا اور اس کا بڑا احترام کرتا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان نامہ نگاری کا سلسلہ جاری تھا۔ بیدل نے اس کی تاخیر سے نامہ نگاری کی شکایت کی ہے اور اپنے اشتیاق کا اظہار کیا ہے۔

”ساغر بی غمار فضل الہی، وجوہ ربی غبار فیض لا یتناہی، دماغ آرای آن نشاء رفیع الشان و غار اندوز آن باذل سنج احسان باد۔ ہر چند سیر طاقت بیدلاں، نفس وار، دل تا زبان بیش نیست، در پرداز دعای احبہ شور و صحرای امکان را، گرد بال افشانی نالہ می پندارد..... مدتی می گذرد بی وصول مہر حضور شبنمی است بوئے نشین گداز تشویر، واشک چکیدہ زمین گیر سجدہ تعذیر۔ باری در پردہ ساز بیہوشی تحیر، نوای این مدعاست۔ دور مقام عجز نارسائی، تسلی زمزمہ این تمنّا:

گر من نخواہم گل از وصل چید بر دوستان نالہ خواہد رسید (۱۲ء)

فضل الہی کا ساغر بے غمار فیض لا یتناہی کا جو ہر بے غبار اس نشہ رفیع الشان کا دماغ ارا اور اس سنج احسان کا غار اندوز ہو۔ اگرچہ بیدل کی طاقت کا سلسلہ نفس کی طرح دل سے زبان تک ہی محدود رہتا ہے احباب کے لئے دعا گوئی کی مصروفیت میں صحراے امکان کے شور کو نالے کی بال افشانی کی گرد

تصور کرتا ہے۔ ایک عرصہ ہوا مہر حضور کے حصول کے بغیر بیدل ایک شبنم ہے جو گداز خجالت و پشیمانی کا بوئے نشین (کھٹالی میں بیٹھنے والا) ہے اور ایک اشک چکیدہ ہے جو سجدہ سیاست و سزا کا زمیں گیر ہے۔ تحیر کی بیہوشی کے ساز کے پردے میں اس مدعا کی آواز پوشیدہ ہے اور عجز نارسائی کے مقام میں اس تمنّا کے ذمے کی تسلی نہاں ہے۔

اگر میں وصل کا پھول نہ توڑ سکا تو دوستوں تک نالہ ضرور پہنچے گا۔

اس خط کے آخر میں باذل کو میر محمد زمان راسخ اور اس کے احباب جو بقول خوشگو حاجی محمد اسلم سالم کشمیری، شیخ حسین شہرت، مرزا محمد احسن ایجاد وغیرہ ہیں کے حالات پر توجہ دینے کی درخواست کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ لوگ خاکسار کے مخلص احباب ہیں اور آپ سے ملاقات کے خواہاں ہیں اگر اپنی مخصوص توجہ اور عنایت سے انکی مالی حالت کی اصلاح فرمائیں تو اللہ تعالیٰ آپ کو اسکا اجر عطا فرمائیے گا۔

”دریں نشاکہ روی توقع عالمی متوجہ التفات آجناب است، آئینہ اسرار سیادت میر محمد

رفقہای ایشاں، کہ از صفا کیشان این روزگار راند، تمنای حصول سعادت ملازمت دارند، مگر

روی تو جمی اگر جلا بخش جو ہر حال شان باشند، تشرال نتائج از مرآت ثواب محو خواہد

بود۔“ (۱۳ء)

نامہ نگاری کا یہ انداز واضح کرتا ہے کہ باذل بیدل کے بے تکلف احباب میں تھا نیز یہ کہ بیدل کو اس کے خلوص پر اتنا اعتماد تھا کہ اس کی اساس پر اس نے اپنے احباب کی سرپرستی اور حمایت کی درخواست کی۔ اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بیدل کے دل میں اپنے احباب کی مالی امداد اور حاجت روائی کا کتنا خیال رہتا تھا۔

### میر محمد زمان راسخ:

میر محمد زمان راسخ بقول خوشگو ایک نازک خیال، بلند تلاش، پیچیدہ گو اور صاحب طرز شاعر تھا۔ علوم متداولہ سے اچھی طرح واقف تھا۔ اعظم شاہ کے دربار میں ایک اچھے منصب پر فائز تھا۔ خوشگو کا بیان ہے کہ راسخ کے بیدل سے مخلصانہ تعلقات تھے اور شاہزادہ جب گجرات میں تھا تو میر محمد زمان راسخ، مرزا بیدل، حاجی اسلم سالم اور حکیم شیخ حسین شہرت شاہی فوج میں ایک ساتھ نشست و برخاست رکھتے تھے۔ (۱۳ء)

رقعات میں راسخ کے نام بیدل کا اگرچہ کوئی مستقل خط نہیں ہے، لیکن رفیع خاں باذل کے نام ایک خط میں جس کا تذکرہ اوپر ہوا، راسخ کا بھی تذکرہ ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق بیدل

کے ”صفا کسان روزگار“ یعنی مخلص احباب سے تھا۔ اس لئے یقیناً ان دونوں کے درمیان خلوص پر مبنی دوستانہ تعلقات رہے ہیں۔

### حاجی اسلم سالم:

سالم کا شمار بھی مشہور شاعروں میں ہوتا ہے، کہتے وہ کشمیری برہمن زادہ تھا۔ شیخ محسن فانی نے اس کو حلقہ بگوش اسلام کیا۔ وہ شاعرانہ ذوق کا حامل تھا اور اپنے کلام میں بلند افکار و خیالات پیش کرتا تھا۔ کچھ دنوں اعظم شاہ کی خدمت میں رہا اور کافی اثر و رسوخ پیدا کیا۔ بقول خوشگو شاہزادہ کے گجرات کے قیام کے دوران بیدل سے اس کا تعارف ہوا اور ان کے درمیان باہم محبتیں رہیں۔ حج کے بعد سالم جب دہلی واپس ہوا تو بیدل سے خلوص کی بنیاد پر اس کی ملاقات کے لئے اس کے گھر گیا، شعر و شاعری کا تذکرہ چھڑا، بیدل نے اپنی کلیات کے چند اشعار اس کو سنائے۔ سالم نے کہا ایسے اشعار سنائیے جو حال میں کہے ہوں تاکہ آپ کی شاعرانہ پیش رفت کا اندازہ ہو سکے۔ خوشگو کا بیان ہے کہ بیدل سے سالم کی گفتگو کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیدل کے بے تکلف احباب میں تھا۔ بیدل بھی سالم کی اہمیت کا قائل تھا اور اس کا دیوان لے کر کئی رات دن مطالعہ کیا جبکہ اپنی ساری زندگی بیدل نے اپنے معاصر شاعروں میں سے کسی کا دیوان اتنی توجہ و انہماک سے نہیں پڑھا۔ (۷۱۵)

اگرچہ سالم کے نام بیدل کا کوئی خط رفاقت میں نہیں ہے لیکن اس جملہ ”میر محمد زمان راسخ و رفٹائے او“ کی بنیاد پر جس کا تذکرہ باذل کے نام اپنے خط میں بیدل نے کیا ہے کہا جاسکتا ہے کہ وہ بھی بیدل کے صفا کیش احباب میں شامل تھا۔ خوشگو کا بیان اس خیال کی تائید کرتا ہے۔

### حکیم الممالک شیخ شہرت حسین شہرت:

شہرت ایک سخن شناس شاعر اور حاذق حکیم تھا وہ ظاہری اور باطنی خوبیوں کا مالک تھا۔ اس نے دانشمندی کو دور ویشی اور آزاد نشی کو امیری کے ساتھ ایک جگہ جمع کر دیا تھا۔ موصوف کے بہت سے معاصر شاعروں سے جس میں بیدل بھی ہیں خوشگو اور تعلقات تھے۔ گجرات میں اعظم شاہ کی خدمت کے دوران اس کی ملاقاتیں اور محبتیں رہی ہیں (۷۱۶) جیسا کہ گذرا شہرت کا تعلق بیدل کے مخلص احباب میں تھا۔

### میر محمد احسن ایجاد:

میر محمد احسن ایجاد کا شمار ان شاعروں میں ہوتا ہے جن سے بیدل کے بہت ہی گہرے مخلصانہ

اور دوستانہ روابط تھے۔ ایجاد کا تعلق سرہند کے ایک علاقہ ”سامانہ“ کے صحیح النسب سادات سے تھا۔ اس کا نسب سید نور الدین مبارک غزنوی تک پہنچتا ہے۔ اس کے ایک مورث اعلیٰ نے دہلی سے اندری اور وہاں سے قصبہ سامانہ میں سکونت اختیار کی۔ علوم متداولہ کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ اپنے وطن سے دہلی آیا کچھ دنوں مرزا بیدل کے ساتھ رہا پھر چٹکھ اٹاؤہ کے حاکم خیر اندیش خاں کی ملازمت میں آکر زندگی گذاری۔ شاہ عالم بہادر شاہ کے عہد میں نظام الملک آصف جاہ کی ملازمت سے وابستہ ہوا۔ نواب کی اس پر خاص عنایتیں رہیں۔ اس کی طرف سے شہزادہ عظیم الشان کے دربار میں وکالت کے فرائض انجام دیتا رہا۔ پھر خود شہزادہ کی ملازمت میں چھ صدی کے منصب پر فائز ہوا۔ محمد فرخ سیر کے زمانے میں بھی بادشاہ کی نظر کرم اس پر رہی۔ معنی یاب خاں کا خطاب ملا اور شاہنامہ نویسی پر مامور ہوا۔ بادشاہ کو ہفتہ وار اپنی پیشرفت دکھاتا جس کا ایک ہزار روپیہ انعام اور شرف امتیاز اسے ملتا ۱۱۳۳ھ میں اکبر آباد میں اس کا انتقال ہوا۔ (۷۱۷)

خوشگو کا بیان ہے کہ اپنا کلام وہ بیدل کی نظر سے گذارتا تھا اور مخلص بھی اسی سے حاصل کیا۔ (۷۱۸)

رفیع خاں باذل کے نام بیدل کے ایک خط میں میر محمد زمان راسخ کے رفقاء کے ضمن میں اس کے مخلص اور صفا کیش دوست ہونے کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ چچین قلیج خاں کے نام اپنے ایک خط میں بیدل نے ایجاد کیلئے امداد کی سفارش کی:

”صفا عقیدت و خلوص ارادت، سرچشمہ زلال اتحاد، میرزا محمد احسن ایجاد بآئینہ داری نیاز بیدل، چہرہ کشای امتیاز حصول باد۔“ (۷۱۹)

صفائے عقیدت و خلوص ارادت سرچشمہ زلال اتحاد میرزا محمد احسن ایجاد نیاز بیدل کی آئینہ داری کے ساتھ امتیاز حصول کا چہرہ کشا ہو (نیاز بیدل کی عکاسی کے ساتھ حصول ملاقات سے کامیاب ہو) یہ اقتباس جس کا ہر جز و جملہ خلوص کی منہ بولتی تصویر ہے واضح کرتا ہے کہ بیدل احباب کی دلداری اور ہمدردی میں جو کچھ کر سکتا تھا اس میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا تھا۔ اس خط کا عنوان ہے ”بہ چچین قلیج خاں بہادر مصحوب مرزا احسن ایجاد و سفارش ایشاں“ (چچین قلیج خاں بہادر کے نام مرزا احسن ایجاد کی معرفت ان کی سفارش میں) عنوان بتاتا ہے کہ بیدل نے یہ خط ایجاد کی سفارش میں اسی کی معرفت روانہ کیا لہذا ایسا لگتا ہے کہ یا تو ایجاد نے خود اپنے حالات بیدل سے بیان کیئے ہوں گے یا خود بیدل نے اس کے ناگفتہ بہ حالات دیکھ کر اس کی مالی امداد کی سفارش کی ہو۔



### میر عظیم اللہ بیخبر:

بیخبر کا شمار مشہور شاعروں میں ہوتا ہے۔ بقول آزاد بلگرامی وہ اپنا تخلص بیخبر بجا طور پر کرتا تھا کیونکہ باخبر بیخبر ہوتا ہے حضرت لسان الغیب حافظ شیرازی کے درج ذیل قول پر اس کا عمل تھا۔  
مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ورنہ در مجلس رندان خبری نیست کہ نیست (۷۰)  
بیخبر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیدل کے بے تکلف احباب میں تھا۔ بارہا بیدل سے اس کی ملاقاتیں ہوئیں۔ ان کی باہمی گفتگو کے انداز سے شوخی و طرافت اور بذلہ سنجی کی خصوصیات نمایاں ہیں۔ اس بنا پر بیدل ان کی صحبت سے بہت محفوظ ہوتا تھا اور اس کو اپنا ہم مشرب اور بخیال تصور کرتا تھا۔ بیخبر اپنے تذکرہ سفینہ بیخبر میں لکھتا ہے:

”فقیر را کہ اتفاق دید وادید ایشان افتاد۔ تھا کہ در کمال غلق و مزہ و درد و شوق یافتم۔ تاکہ نشستہ بودم، سوای اشعار متقاضی شوق و فقر دیگر بزبان نراند۔ بندہ گفتم کہ ضیافت طبع کمتر میں می فرماید۔ گفتند: ای صاحب! بعد مدتی ہیجوشا ہر گز را غنیمت یافتہ ایم۔“ بعد ازاں سہ بیت فقیر کہ در ذکر بمقام خود ہا خواندہ شدہ نقل گرفتہ برخاست رخصت فرمودند۔ ایات اگر چہ قابل ایراد یا بیجا نیست اما درین مذکور نہ نوشتن ہم ملائم نہ دانست:

لےقدر ہرزہ چپ و راست دویدن عیب است چاک کن سینہ خود را، سر راہی دریاب بلند افتد جو مقطع پست سازد حسن مطلع را کشد پائین محفل قدر من بالا نشینا زرا خون شرم بیخبر ز دست تہی جامہ فقر رنگ باید کرد برین بیت عزیزی گفت: میرزا صاحب! حسن این شعر معلوم نہد؟ فرمودند: در فقر مرتبہ ایست کہ خدا ہر کرا خواہ نصیب کند۔“ (۷۱)

فقیر کو بارہا ان کی ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ سچی بات یہ ہے کہ میں نے ان کو انتہائی خلیق، اہل درد اور صاحب شوق پایا۔ جب تک ان کے پاس بیٹھا رہا صرف وہی اشعار سناتے رہے جن میں شوق و ذوق اور فقر کا مضمون ہوتا۔ میں نے کہا خاکسار کی ضیافت طبع فرما رہے ہیں۔ کہنے لگے اے صاحب! ایک عرصہ کے بعد آپ جیسے ہم خیال کی صحبت کو غنیمت سمجھتا ہوں اس کے بعد فقیر کے تین اشعار کو جو اپنے مقام پر لکھے جائیں گے نقل کر کے اٹھے اور مجھے رخصت کیا وہ اشعار اگرچہ یہاں ذکر کئے جانے کے لائق نہیں ہیں پر یہاں ان کا نہ لکھنا بھی مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

لےقدر ہرزہ چپ و راست دویدن عیب است چاک کن سینہ خود را، سر راہی دریاب بلند افتد جو مقطع پست سازد حسن مطلع را کشد پائین محفل قدر من بالا نشینا زرا

خون شرم بیخبر ز دست تہی جامہ فقر رنگ باید کرد اس شعر پر ایک عزیز نے کہا مرزا صاحب اس شعر کا حسن معلوم نہ ہو سکا۔ انہوں نے کہا فقر میں ایک مقام وہ آتا ہے جسے خدا جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔  
اویماق مغل میں عبدالقادر خاں نے بیخبر کا ایک شعر نقل کیا ہے جو واضح کرتا ہے کہ بیدل اور بیخبر کے درمیان بذلہ سنجی کا سلسلہ چلتا تھا۔  
ندائم تاچہ حق دانستہ پر باطل کنی خود را تو گر صاحب دلی، ظالم! چرا بیدل کنی خود را (۷۲)  
میں نہیں سمجھتا کس چیز کو حق سمجھا کہ خود کو باطل کا پوٹ شمار کرنے لگا۔ اگر صاحب دل ہے تو ظالم خود کو تو بیدل کیوں کہتا ہے۔

### شیر خان لودی:

شیر خان لودی ایک مشہور ادبی شخصیت ہے جس کو شاعر سے زیادہ تذکرہ نگار کی حیثیت سے شہرت حاصل ہوئی۔ لودی بھی بیدل کے احباب میں تھا۔ اس کا باپ علی امجد خاں لودی بنگال میں شاہ شجاع کا ملازم تھا۔ شیر خان نے وہاں ملا فرخ حسین ناظم ہراتی سے استفادہ کیا۔ لیکن ۱۰۶۸ھ ۱۶۵۷ء میں اس کے انتقال کے بعد شیر خان کا تعلیمی سلسلہ ختم ہو گیا۔ ناظم سے صرف فارسی عربی کے چند مختصر رسالے پڑھے تھے۔ ۱۰۸۴ھ میں اس کے باپ کی وفات ہو گئی۔ ۱۰۸۷ھ میں اس کے بھائی عبداللہ خاں نے کابل کے کوہستانی علاقہ میں جام شہادت نوش کیا۔ ان دونوں واقعات سے اس کے دل کو سخت صدمہ پہونچا۔ ان تلخ یادوں کو فراموش کرنے کی غرض سے اس نے خود کو تذکرہ مرآۃ الخیال کے لکھنے میں مصروف کر دیا۔ ۱۰۹۰ھ ۱۶۷۹ء میں شیر خان نواب شکر اللہ خاں کے متوسلین میں داخل ہوا۔ شکر اللہ خاں اس زمانہ میں چکلہ سرہند کا فوجدار تھا (۷۳)۔ اس لئے ممکن ہے جب شیر خان لودی شکر اللہ خاں کی خدمت میں زندگی گزار رہا تھا بیدل سے اس کی آشنائی ہوئی ہو اور ان دونوں کے درمیان دوستانہ روابط قائم ہوئے ہوں۔ اگرچہ رقعات میں بیدل نے نہ تو براہ راست اس کو خط لکھا نہ لکھنا نہ ضمناً کسی خط میں اس کا تذکرہ کیا ہے مگر اپنے تذکرہ میں بیدل کے حالات قلمبند کرنے کے بعد لودی نے اس کی توثیق کی غرض سے اس کے پاس بھیجا اور بیدل نے اس کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک غزل کے ہمراہ اسے واپس کر دیا۔ اس سے واضح ہے کہ دونوں کے درمیان دوستانہ تعلق قائم تھا۔

### میرزا محمد امین عرفان:

محمد امین عرفان ابن اسرار بیدل کے مخلص احباب میں تھا جو ادبی تعلق رکھنے کے علاوہ

بیدل کا شخص ارادتمند بھی تھا۔ موصوف نے مجمع الانشاء کے نام سے ایک کتاب تالیف کی ہے جس میں مشہور اگلے اور معاصر ادیبوں کے خطوط کے بہترین نمونے عنوان وار جمع کر دیئے ہیں۔ ۱۱۳۶ھ میں اسے مکمل کیا۔ اس کتاب میں بیدل کے گیارہ خطوط ایسے ملے جو اس کے رفعات کے کسی بھی مطبوعہ یا قلمی نسخہ میں نہیں ملے۔

اس مجموعہ میں محمد امین نے کچھ اپنے خطوط بھی شامل کر دیئے ہیں جس میں ایک خط بیدل کے نام ہے جس کا عنوان ہے ”لمؤلفہ۔ مرزا بیدل در طلب طلسم حیرت و محیط اعظم۔“ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ بیدل نے اسے دو خطوط بھیجے تھے جس پر امین نے انتہائی خوشی اور ارادتمندی کا اظہار کیا اس خط میں بیدل کے لئے جو القاب و آداب اس نے استعمال کیئے ہیں ان سے معاصرین کی نظر میں اس کا کیا مقام تھا واضح ہوتا ہے۔

”صدر سرور محمور گرامی نامہ کرامت نشان، از جناب فیض آف، ہادی طریق صواب، حرب معمار دلہا کی خراب، فہرست مجموعہ کائنات، بیت الغزل قصیدہ موجودات، چارہ فرمای فرمائندگان عالم آب و گل، میرزا عبدالقادر بیدل سلمہ اللہ عز وجل، جو ہر مراد در سلک آرزو کشید، و بیاد اشفاق قدیم پر داخستہ، ذریعہ انبساط و افتخار گردید۔“  
بوسیدم و بر مردم دیدہ کشیدم (۷۳)

جناب فیض آف ہادی طریق صواب، ویران دلوں کے معمار، مجموعہ کائنات کی فہرست، قصیدہ موجودات کے بیت الغزل، عالم آب و گل کے فرو ماندوں اور عاجزوں کے چارہ فرما مرزا عبدالقادر بیدل سلمہ اللہ عز وجل کے گرامی نامہ کرامت نشان کے صدور نے جو ہر مراد سلک آرزو میں کھینچا اور قدیم عنایتوں و شفقتوں کی یاد میں مشغول ہو کر، انبساط و افتخار کا ذریعہ بنا۔

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ بیدل اس کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا تھا نیز اپنی صحبت سے استفادہ کا موقع بھی اسے دیتا تھا۔ بیدل کے انداز گفتگو نے اسے بڑی حد تک اپنا والہ و شیدہ بنا دیا تھا۔

”اگرچہ بمقتضای شفقت و ارادت معنوی، دولت ملازمت روحانی، کہ دولت جسمانی ما نفس نمی تواند شد، ہمہ وقت حاصلست، توجہ باطن فیض موطن، آنا فنا رونق بخش بزم دل صداقت منزل۔ لیکن طبیعت خور کردہ حضور تر بیت گنجور، و مبدم ساغر لیریز شوق می پیا پید۔ و پیتا نہ آرزوی مکالمہ زبانی کہ عبارت از صحبت سراپا الفت، وحشت نسیان و آشنا دوست [است] می نماید۔“ (۷۵)

اگرچہ معنوی شفقت و ارادت کے حسب اقتضا روحانی صحبت کی دولت جس کے لئے جسمانی

صحت رکاوٹ نہیں ہو سکتی تھی سدا حاصل ہے اور باطن فیض موطن کی توجہ آنا فنا بزم دل صداقت منزل کے لئے رونق بخش ہے لیکن حضور تر بیت گنجور (جناب عالی) کی صحبت کی عادی طبیعت رہ رہ کے شراب شوق کی پیمانہ کشی کر رہی ہے اور بیتابی سے زبانی گفتگو یعنی صحبت سراپا الفت وحشت نسیان و آشنا دوست کی تمنا کر رہی ہے۔

اس کے بعد اس نے مثنوی طلسم حیرت، محیط اعظم اور اپنے بیاض کی ایک نقل بھیجی کی فرمائش کی ہے۔

”اگر عرض ارادت، ہمدارج اجابت ارتقا نماید، امید است کہ از طلسم حیرت بر آید۔ و شناور محیط اعظم گشتہ گوہر مقصود چنگ آرد۔ و اگر نقل بیاض خاص، کہ ہر درقش از خط شکستہ محبوبست مرغولہ مو، و ہر صفہ اش از جدول معشوقست چار ابرو، نیز عنایت شود، توقع است کہ در وحشت تنہائی انیس محفل دل، و جلس مجمع جان بود کہ از اندوہ و شادی جہان، بیگانہ نمودہ بمبداء آشنائی بخشد۔“

آنا کہ خاک را بنظر کیما کنند آیا بود کہ گوشہ چشمی بما کنند (۷۶)  
اگر ارادت کی پیشکش اجابت کے مدارج تک پیش رفت کرے تو امید ہے کہ وہ طلسم حیرت سے پوری ہوگی اور محیط اعظم کا تیراک بن کر گوہر مقصود حاصل کرے گی اور بیاض مخصوص کی نقل بھی جس کا ہر درق خط شکستہ کی وجہ سے ٹھنکریا لے بالوں والے محبوب کی خصوصیات کا حامل ہے اور جس کا ہر صفہ جدول کی وجہ سے چار ابرو والے معشوق کی کیفیات کا حامل ہے عنایت ہو جائے تو امید ہے کہ وحشت تنہائی میں وہ انیس محفل دل اور جلس مجمع جان ثابت ہو۔ جو دنیا کے غم و خوشی اور دکھ سکھ سے بے نیاز کر کے مبداء کی آشنائی عطا کرے۔ جو لوگ اپنی نظر سے خاک کو کیما بنادیتے ہیں کیا ممکن ہے کہ ایک گوشہ چشم سے ہمیں بھی دیکھ لیں۔

اس خط سے چند نکتے سامنے آتے ہیں اس لئے مکمل طور پر نقل کر دیا گیا۔ اول یہ کہ بیدل کے ارادتمند اور قدرداں اس کی ادبی تخلیقات خصوصاً منظوم تخلیقات کے مطالعہ کے نہایت مشتاق رہتے تھے جیسا کہ نظام الملک اور حسین علی خاں کے بارے میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ وہ کس طرح فرمائش کر کے منگاتے تھے۔ دوسرے یہ کہ بیدل نے اپنے منتخب کلام کی ایک مخصوص بیاض تیار کی تھی خوشگونی بھی اس کا تذکرہ کیا ہے اور اپنے تذکرہ میں اس بیاض سے منتخب اشعار نقل کئے ہیں۔ اسی قسم کا ایک نسخہ اس نے آندرام غلط بھی دیا تھا۔ تیسرے یہ کہ بیدل خط شکستہ بہت خوبصورت لکھا کرتا تھا۔ چنانچہ برٹش میوزم میں بیدل کی ایک بیاض ”بیاض بیدل“ کے نام سے محفوظ ہے۔ اس کا تذکرہ بیدل کی شاعری پر



بحث کے دوران آئے گا، اس کے ایک صفحہ کی نقل اس کتاب میں شامل ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیدل کے خوبصورت خط شکستہ کا بہترین نمونہ ہے اور محمد امین نے بجا طور پر اسے ”معشوق مرغلہ موو محبوب چہار ابرو“ سے تشبیہ دیا ہے۔

رقعات میں مرزا محمد امین عرفان کے نام بیدل کا اگرچہ صرف ایک خط ہے لیکن خط کا مضمون یہاں ہے کہ بیدل نے اسے کئی خط لکھے۔ بیدل کا ایک خط ”ارسال طور ہمز امجد امین عرفان“ کے زیر عنوان ہے۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ بیدل نے میوات کے ایک علاقہ بیراٹ کی سیاحت کے بعد تقریباً ۱۰۹۹ھ میں مثنوی طور معرفت نظم کی تو عرفان کا خط اسے ملا جو اشتیاق ملاقات کے مضامین سے بھرا تھا۔ جس میں اپنی منظوم تخلیق بھیجنے کی درخواست ہے۔ بیدل نے بھی اسی انداز سے جواب دیتے ہوئے لکھا کہ بیراٹ کے پہاڑی علاقہ کی تفریح کے بعد ایک ارمغان لایا ہے جو جناب والا کی خدمت میں پیش ہے۔ ہچکچس از معنی مکتوب شوق آگاہ نیست ورنہ جای نامہ، پیش یار مارا خواندنت

”چہ نویسد کہ از حقیقت اشتیاق، پردہ تواند کشود۔ وچہ آغاز د کہ تمہید نسخہ تمنا تواند بود۔ از عالم رویداد، غباری فراہم آوردہ است کہ اگر دم زند، دیوار ہا بر روی شوق بری آرد۔ و از حصول اعتبارات، بیچ و تابانی جمع کردہ کہ اگر عرض دہد، حیرت قدم از تحیر خانہ برنی دارد۔

باری از سیر سواد بیراٹ، راہ آوردی کہ قانعان تحف معانی، بھلیلی ازین بیشکش کفایت تصور نماید، نسخہ طور معرفتی است کہ در تقیم عبارتش، مدعای خاص مندرج تو ان یافت۔ و از تخصیص معنیش، بھقیقتی رقص می تو ان شکافت، بخد مت خواہد رسید۔ و سلام نیازی خواہد رسانید۔ ذخیرہ مضامین شوق بسیار است اما فرصت عرض حضوری در کنار“ (۷۲۷) نامہ شوق کے مفہوم سے کوئی شخص واقف نہیں ہے ورنہ خط کی جگہ ہمیں بلانا تھا۔

کیا چیز لکھیں کہ حقیقت اشتیاق سے پردہ اٹھائے اور کس چیز سے آغاز کریں کہ وہ نسخہ تمنا کی تمہید بن سکے۔ روند اسفر کی ایک گرد فراہم کی جگہ اگر دم لے تو دیواروں کو چہرہ شوق پر لا گرائے اور اعتبارات کے کچھ بیچ و تاب اکٹھے کر دیئے ہیں کہ اگر اس کو پیش کرے تو حیرت اپنے تیر خانہ سے قدم نہ اٹھائے۔ بیراٹ کی سیاحت کر کے ایک ایسا تحفہ کہ معنوی تحائف پر قناعت کرنے والے اس قسم کی مختصر پیش کش کو کافی تصور کریں گے، نسخہ طور معرفت کی شکل میں حاضر خدمت ہے۔ اس کی عام عبارت میں کچھ خاص مقاصد پوشیدہ ہیں اور اس کے مخصوص معانی میں ایک حقیقت رقص کر رہی ہے اور سلام نیاز پہونچاے گا۔ مضامین شوق کا ذخیرہ بے انتہا ہے لیکن عرض حضوری کی فرصت درکار ہے۔

بیدل خط کے ضمن میں اکثر اپنی تخلیقات پر ایک طرح کا تبصرہ بھی کر جاتا ہے جو اس کے ادب

پارہ کی تحلیل و تجزیہ میں نیز ان محرکات کے سمجھنے میں جو اس کی تخلیق کی وقت اس کے پیش نظر رہی ہیں بڑی حد تک معاون ثابت ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر دونوں احباب کے خطوط ان کے خوشگوار تعلقات کی نشاندہی کرتے ہیں۔

### محمد عاشق ہمت:

ہمت ایک باذوق شاعر تھا۔ بقول افضل سرخوش شعر میں انوکھے افکار و خیالات پیش کیا کرتا تھا (۷۱۸)۔ بیدل نے اس کو ”چمن طراز فطرت“ کا لقب دیا ہے۔ خان بہادر میاں لعل محمد کے نام جو شکر اللہ خاں کے متوسلین میں تھا، بیدل کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمت اجیر کا باشندہ تھا اور خان بہادر لعل محمد کی سرپرستی کی امید میں اجیر سے اسلام آباد (تھہرا) کا سفر کیا۔ لیکن ناسازگار حالات کے باعث اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا اور صبر و ہیکسبائی کا شیوہ اپنایا۔ پھر اس کی نازک مالی حالت نے اسے مجبور کیا کہ طالب آملی کے قصیدہ کی زمین میں ایک قصیدہ اس کی تعریف میں کہہ کر اس کے قرب کا خواہاں ہو۔ اس طرح وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا۔ بیدل نے ہمت کے سارے حالات لکھ کر لعل محمد خاں سے درخواست کی کہ اس کی حاجت روائی کرے۔ اس مقصد کے لئے اس نے طویل مقدمہ لکھا ہے جس میں حاجتمندوں کے ساتھ سلوک کرنے پر اسے آمادہ کیا ہے۔

”سر مایہ کیسہ گاہ ہستی نقد انفاہی است بی توقف از گنج خانہ غیب ہویت، مدد فرمای جنگ مایگان بازار۔ و بی تشویش ترد و غنا بخش بی بضاعتان چار سوی جہاں آغار۔ شہود آمد و رفت او دلیلی است بر آنکہ این نقد ایثاری ست نہ اند و غنی۔ و دریافت معنی این عطیہ، نیز موافقتی است نہ آموختنی۔ ..... خلاصہ مدعا انتخاب فروش این معنی است کہ چمن طراز فطرت محمد عاشق ہمت، بالغات خان بہادر لقب، محل آرای یک کاروان تمنا گردید، ناقہ امید از اجیر باسلام اباد کشید۔ و از نامساعد تہای زمان اقبال، کہ عوارض ضعف طبیعت خان استغنائشان بود، وصول سر منزل مراد، از وقوع احکام محال شمرده، یاس مطلب را آبروی صبر و توکل نہید ..... متوقع تخمین فطرت معنی تلقین است۔ و محتاج آفرین طبع بہار آفرین۔“ (۷۲۹)

ہستی کی تھیلی کا کل نقد سرمایہ لے دے کہ چند سانس ہے جو خدا کے ان دیکھے خزانہ سے لگاتار بازار کے کم پونجی والوں کو پہنچ رہی ہے اور بغیر کسی تشویش اور فکر مندی کے دنیا کے بے بضاعتوں کو غنا سے ملنا کر رہی ہے۔ اس کی آمد و رفت کا مشاہدہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ نقد دوسروں پر نچھاور کرنے

لئے ہے جمع کرنے کے لئے نہیں ہے اور اس عطیہ کے مفہوم کا سراغ بھی اس کی دین ہے سمجھنے کی چیز نہیں۔ غرض یہ لکھنا منظور ہے کہ جن طراز فطرت محمد عاشق ہمت خان بہادر لقب کے حصول توجہ کے لئے ایک پورے قافلہ تمنا کا محل آرا ہوا ہے۔ امید کی اونٹنی اجیر سے اسلام آباد (مقرر) کھینچ لایا ہے اور زمانہ کی ناسازگاری کے باعث جس کہ وجہ خان استغنا نشان کی طبیعت تھا، ضعف تھی منزل تصور تک رسائی کو ناممکن سمجھ کر مایوسی کو صبر و توکل کی آبر و قرار دیا، امید کہ فطرت معافی تلقین کو دوا تحسین دیں گے اور اس کی طبع بہار آفریں کو شاہاشی دیں گے۔

بیدل کی سفارش کا انداز بتاتا ہے کہ ہمت ایک باذوق شاعر اور بیدل کا ایک مخلص دوست تھا۔ اپنے دوستوں کے لئے نوابوں سے سفارش کرنے سے متعلق بیدل کا یہ تیسرا خط ہے۔

### مرزا سہراب رونق:

سہراب رونق سے متعلق تذکرے خاموش ہیں لیکن بیدل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی مشہور شاعر تھا جو ”نثر شیوا“ اور ”نظم متین“ پر پوری قدرت رکھنے کے ساتھ شجاعت و بابت کی صفت سے بھی موصوف تھا۔ بیدل نے اس کی ان خصوصیات کی تعریف کر کے مرزا محمد نعیم بخشی سرکار بہادر شاہ سے سفارش کی ہے۔

”بہار پیرای معانی، انجمن آرای بساط کتہ دانی، سرخوش نشا مطلق، میرزا سہراب رونق، کہ بالبعہ بطور نثر، نفس صبح را، بغبار خجالت پیچیدن است۔ در حسرت متانت نظم، موج گوہر را، آب از بن دندان چکیدن۔ با آنکہ جوہر شجاعت، چوں تیغ، از ناصیہ اش روشن است۔ و شاہ تہور، چون بادہ، از طبعش مبرہن۔“

معانی کے بہار پیرا، بساط کتہ دانی کے انجمن آراء، نشہ مطلق کے مست مرزا سہراب رونق جس کی نثر کی آب و تاب کے سامنے نفس صبح کو شرم کی غبار میں اٹے رہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں اور جس کی نظم کی متانت کی حسرت میں موج گوہر کو منہ سے رال ٹپکنے کے سوا کوئی راستہ نہیں۔ مزید برآں جوہر شجاعت تلوار کی طرح اس کی پیشانی سے نمایاں ہے اور نشہ تہور شراب کی طرح اس کی طبیعت سے عیاں ہے۔ بیدل جیسا عظیم شاعر اگر کسی کے شاعرانہ ذوق اور ادبی لیاقت کی اس طرح تعریف کرتا ہے تو یقیناً وہ اپنے عہد کا اچھا اور مشہور شاعر رہا ہوگا۔ اگرچہ اس کی کوئی تخلیق ہمارے ہاتھ نہیں لگی۔ ورنہ جیسا کہ رقعات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے خود بیدل کو سخن فہم حضرات کے قحط کی شکایت رہتی تھی اس لئے اس کا قلم اسی وقت کسی کے جوہر کی تعریف کرتا ہے جب واقعی وہ اس کے اندر موجود ہو۔ اس کے بعد

سفارش کرتا ہوا لکھتا ہے:

”بقضا لیکہ شہ ای اذان بعرض رسید، آراستگی تمام دارد۔ شاید آنکہ این قسم روشن طبعی را از مسلکان جناب خورشید انتساب دوری نفرماید۔ و از این عالم بلند فطرتی را، ملازم بارگاہ آسمان جاہ تصور نماید، تربیت ارباب، شمرہ اجر عظیم دارد۔“ (۷۳۰)

وہ ان فضائل و شمائل سے جس کا ایک شہ اوپر عرض ہوا پوری طرح آراستہ ہے۔ اس قسم کے روشن طبع حضرات اس لائق ہیں کہ ان کو اپنے متوسلین کے زمرہ سے نہ نکالیں اور اس نوع کی بلند فطرت شخصیتوں کو اپنی بارگاہ آسمان جاہ کا ملازم تصور کریں۔ ارباب علم و دانش کی تربیت کا بڑا اجر اور ثواب ہے۔ اس حصہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا محمد نعیم مرزا سہراب کی سرپرستی کرتے تھے لیکن دونوں کے بیچ کچھ کشیدگی پیدا ہو گئی تھی اور اس کی وجہ سے محمد نعیم نے سہراب رونق کو اپنی ملازمت سے برطرف کر دیا۔ بیدل کے چونکہ رونق اور نعیم دونوں سے مخلصانہ روابط تھے اس لئے اس نے صلح و صفائی کی کوشش کی۔

یہ چوتھا خط ہے جس میں بیدل نے اپنے ایک دوست کے لئے ایک نواب سے سفارش کی۔ مجموعی طور پر یہ خطوط اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ بیدل کے تعلقات با اثر حضرات خصوصاً نوابوں سے کیسے مخلصانہ اور وسیع تھے نیز یہ کہ وہ لوگ بیدل کا کتنا خیال رکھتے تھے کہ اس کے احباب ان امراء تک رسائی یا ان سے صفائی کدورت کے لئے اس کو بیچ میں ڈالتے تھے اور وہ امراء کے نزدیک اپنے اثر و رسوخ اور اپنے اعتبار و ساکھ کی وجہ سے اس کام کے لئے تیار بھی ہو جاتا اور اس میں کامیاب بھی ہو جاتا تھا۔

### میرزا عباد اللہ و روح اللہ:

مرزا عباد اللہ بقول خوشگو بیدل کے ماموں مرزا ظریف کے صاحبزادے تھے۔ رقعات میں مرزا عباد اللہ کے نام چار خطوط ملتے ہیں۔ چوتھا مرزا عباد اللہ و روح اللہ دونوں کے نام ہے۔ بیدل نے ان خطوط میں ان کو ”اخوان پناہ“ کے لقب سے مخاطب کیا ہے، اس لئے اس بات کا امکان ہے کہ لگے بھائی ہوں اور مرزا ظریف کے صاحبزادہ ہوں۔ ڈاکٹر نور الحسن مرحوم کو غالباً اشتباہ ہوا انہوں نے روح اللہ سے روح اللہ خاں سمجھا جو اورنگ زیب کے ایک امیر کا نام تھا (۷۳۱)۔ لیکن جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ”اخوان پناہ“ مرزا روح اللہ و مرزا عباد اللہ کی ترکیب راقم السطور کے موقف کی تائید کرتی ہے۔ مرزا عباد اللہ کے بارے میں تذکروں میں اس کے سوا کچھ نہیں ملتا کہ وہ بیدل کا ماموں زاد بھائی تھا لیکن رقعات کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ قربات کے علاوہ ان کے درمیان ادبی تعلق بھی قائم



تھا۔ عباد اللہ اور روح اللہ دونوں بھائی شاعرانہ ذوق کے حامل تھے خصوصاً عباد اللہ اپنی غزل غالباً بغرض اصلاح بیدل کو بھیجا کرتے تھے۔ ان خطوط میں بیدل کا انداز بیان اور لہجہ بتاتا ہے کہ وہ ان کے دوستوں میں تھا۔ لکھتا ہے:

”عنایات غزل تازہ بصلہ کرامت نواخت۔ و بشکرافات نوازی مسرور اشارت معنوی ساخت۔ ہر چند آرزو مصروف حصول این دولت بود کہ از واسوختگیهای شعلہ افکار، رقص سپندی، یہ محفل حضور عرض خواہداشت۔ و از نفس سوزیہای چراغ اندیشہ، پر تو تسلیمی دست در پیش خواہد گذاشت اما مطابق امریکہ از اتشال آن چارہ نیست، مسودہ شعری چند بانسہ طور معرفت، کہ لمعات ہیئتیں مشکف تامل خواہد گردید، بمعرض ارسال رسانید، عرض مافی واردات موقوف و رود آن نسخہ شفقت است۔“ (۷۳۲)

تازہ غزل کی عنایات نے صلہ شرافت بخشی اور افادت نوازی کے شکر میں اشارت معنوی سے محفوظ کیا اگرچہ آرزو اس دولت کے حصول میں مصروف تھی کہ شعلہ افکار و خیالات کے کچھ انگارے سپند کے رقص کی طرح جناب والا کی خدمت میں پیش کریں گے اور چراغ اندیشہ کی نفس سوزی سے شیوہ تسلیم و رضا کی جھلک دکھائیں گے لیکن حسب اقتضای قضا و قدر جس سے فرار کی کوئی شکل نہیں ہے چند اشعار کا مسودہ ”طور معرفت“ کے ہمراہ جس کی حقیقت کی آب و تاب غور و فکر کے بعد واضح ہوگی ارسال خدمت ہے بقیہ واردات کا عرض اس نسخہ شفقت کی آمد پر موقوف ہے۔

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بیدل سے درخواست کی تھی کہ اپنا کلام زیادہ سے زیادہ بھیجے لیکن بیدل نے بعض ناسازگار حالات کی وجہ سے طور معرفت کے ساتھ تھوڑی بہت غزلیات بھی بھیج دی۔ اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے درمیان مخلصانہ روابط تھے۔ دوسرے خط میں اسی قسم کے انتہائی محبت و تعلق کا اظہار وہ اس طرح کرتا ہے۔

بجیرت غنچہ ام یعنی بدلتگی وطن دارم خیالی در نفس خون می کند، طرح چمن دارم نمی دانم چه نیرنگ است افسون محبت را کہ خود را ہم تو می پندارم و با خود شن دارم (۷۳۳)

حیرت سے غنچہ بنا ہوا ہوں یعنی دل تنگی میں بسا ہوا ہوں، ایک خیال نفس میں عرق ریزی کر رہا ہے چمن کی اساس رکھ رہا ہوں۔

جانے محبت کے جادو کا کیا کرشمہ ہے کہ خود اپنی ذات کو تمہاری ذات تصور کر رہا ہوں اور آپ سے جو گفتگو ہوں۔

مرزا عباد اللہ کے کسی عزیز کی وفات پر بیدل نے ایک تعزیت نامہ لکھا اور خود کو اس میں برابر کا

شریک و ہم قدم قرار دیا۔

”رنگ جمعیت بر عدم و ہستی مابالی منفشانہ، کہ بحکلف اوہام فراہم تو اس نمودن۔ و ساز راحت بر بقا و فقای ما تو جمعی سرگردہ کہ جز صور قیامت نوای دیگر تو اس ششودن۔ تا خیال زندگی بار دوش است غبار رفتگان بر فرق شعور باید پاشید۔ و تارخت ازیں ورطہ بر بندیم، گوش و اماندگان، بافسانہ عبرت باید خراشید۔“ (۷۳۴)

ہمارے عدم و وجود پر رنگ جمعیت نے ایسی بال افشانی نہیں کی کہ بحکلف و ہمیت اسے فراہم کیا جاسکے اور ساز راحت نے ہماری بقا اور فنا پر ایسی توجہ نہیں کی کہ صور قیامت کے سوا کسی اور چیز کی آوازی جاسکے۔ جب تک زندگی کا تصور بار دوش بنا ہوا ہے گذشتہ احباب کا غبار فرق شعور پر چھڑکنا چاہئے اور جب تک اس بھنور سے اپنا بوریا بستر باندھ کر نہیں نکلتے پس ماندوں کے کان افسانہ عبرت سے بھر دینا چاہئے (عبرت کے واقعات سنا کر ان کی سب خراشی کرنی چاہئے۔)

بیدل کی تعزیت نگاری کا انداز بھی فلسفیانہ ہوتا ہے جیسا کہ بہت سے مقامات میں دیکھا گیا بیدل اس موضوع پر کوئی نیا نکتہ نہیں پیش کرتا بلکہ غم و اندوہ، تسلی و تشفی اور تسلیم و رضا کی فرسودہ باتیں ہی بیان کرتا ہے لیکن کلمات و الفاظ کی ایسی خوش آئند ترکیب استعمال کرتا ہے جس سے اس میں ایک جدت پیدا ہوتی ہے اور وہ نیا نکتہ معلوم ہوتا ہے۔

چوتھے خط سے جس میں دونوں بھائی عباد اللہ اور روح اللہ کو مخاطب کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ بیدل کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا لیکن ان میں سخن فہم حضرات کی تعداد کم تھی اس لئے وہ یا تو کتابوں کے مطالعہ میں یا لکھنے میں مشغول رہتا تھا۔ اس میں ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ دونوں بھائی سخن فہم تھے۔

”از درد تہائی کہ رفیق طبیعت وحشت نصیب است چہ نگارو کہ باوجود کثرت یک عالم آشنا، از قحط سخن فہم، مقیم انجمن تصویر بستن است۔ و بہم صحبتی خواہنا کان بساط غرور، برتر جہان ریکیہای تعبیر گریستن۔ نفس شاری اوقات جمعیت، ایندھ ر مختم می داند، کہ گاہی از زبان خامہ، بادوات گرم سرگوشی می گردد۔ و گاہی بصحبت کتابی ہمدس شوشی می شود۔“ (۷۳۵)

اپنی طبیعت وحشت نصیب کے ساتھی ”تہائی“ کی تکلیف کا عالم کیا تحریر کروں کہ دوست احباب کا ایک وسیع حلقہ ہونے کے باوجود ان میں سخن فہم حضرات کے قحط کے سبب انجمن تصویر میں قیام پذیر ہوں اور بساط غرور اور شچی پر محو استراحت غافل لوگوں کی ہم نشینی میں نت نئے انداز کے ترجمان پر گریہ کننا ہوں۔ اوقات جمعیت کی نفس شماری بس اس قدر غنیمت سمجھتا ہوں کہ کبھی زبان قلم سے

دوا سہم کے ساتھ گرم سرگوشی ہوں (کچھ لکھتا رہتا ہوں) اور کبھی کسی کتاب کی معیت میں خموشی کا ہمدرد ہوتا ہوں (کچھ پڑھتا رہتا ہوں)۔

### قاضی عبدالرحیم:

قاضی عبدالرحیم کے بابت کچھ زیادہ معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔ غلام حسن مجددی کا خیال ہے کہ قاضی موصوف شاہ ولی اللہ صاحب کے والد تھے (۷۳۶) لیکن شاہ ولی اللہ صاحب کے والد شاہ عبدالرحیم کے نام سے مشہور ہیں۔ ملا حامد کے حسب دستور چونکہ فتاویٰ عالمگیری کے مرتبین میں وہ بھی شامل تھے اس لئے ممکن ہے بیدل نے ان کو قاضی سے تعبیر کیا ہو۔ ”انفاس رحیمیہ“ کے تحت شاہ عبدالرحیم کے علمی اور روحانی حالات کے بارے میں جو کچھ ڈاکٹر نور الحسن انصاری مرحوم نے لکھا ہے وہ بیدل کے بیان سے ہم آہنگ معلوم ہوتا ہے اس لئے قیاس ہے کہ یہ وہی رہے ہوں گے۔ انصاری مرحوم لکھتے ہیں:

”شاہ عبدالرحیم شاہ ولی اللہ کے والد ہیں وہ اپنے وقت کے مشہور عالم اور صوفی تھے۔ ہندوستان میں حدیث کی باقاعدہ درس و تدریس کا سلسلہ آپ سے شروع ہوتا ہے۔ ان کی ولادت دہلی میں ۱۰۵۲ھ ۱۶۴۳ء میں ہوئی اور یہیں ان کا انتقال ۱۳ صفر ۱۱۳۱ھ جنوری ۱۷۱۹ء میں ہوا۔ ان کے والد کا نام وجیہ الدین تھا اور وہ اورنگ زیب کی فوج میں ملازم تھے انہوں نے اورنگ زیب کے استاد میر زاہد ہروی اور خواجہ خورد کے سامنے زانوئے تلمذ کیا۔ تصوف کا ذوق والد سے ملا تھا تعلیم کے بعد شاہ عبدالرحیم نے قرآن و حدیث کی تدریس کا کام شروع کیا۔ اپنے ہم سبق ملا حامد کی کوشش سے فتاویٰ عالمگیری کے مرتبین میں شامل کر لئے گئے مگر اورنگ زیب ان کی کسی بات پر ناراض ہو گیا اور وہ اس کام سے سبکدوش کر دیئے گئے۔ شاہ عبدالرحیم بنیادی طور پر صوفی اور عالم دین تھے لیکن شعرو ادب سے وہ بے تعلق نہیں تھے انہوں نے فارسی اور ہندی میں اپنی فارسی شاعری کے کچھ نمونے چھوڑے ہیں۔ (۷۳۷)

رقعات میں قاضی عبدالرحیم کے نام بیدل کا صرف ایک خط ہے۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب موصوف اس عہد کے مشہور عالم و فاضل اور عارف و خدا شناس تھے جن کا لوگ بڑا احترام کرتے تھے۔ بیدل نے ان کے لئے ایک اہم لفظ ”خاصان“ استعمال کیا ہے جس سے لگتا ہے کہ موصوف اپنی علمی لیاقت اور بزرگی کی وجہ سے قاضی کے عہد پر فائز رہے ہوں گے۔ وہ بیدل کے

کلام سے بہت متاثر تھے اسی وجہ سے انہوں نے بیدل کی تخلیقات کی بڑی تعریف کی۔ بیدل نے اسی ارادہ بندی کے ساتھ جو چھوٹے کو بڑوں سے ہوتی ہے جواب دیا اور ان کی شفقت و مہربانی اور قدر دانی کا شکریہ ادا کیا۔ یہ خط اس عنوان سے شروع ہوتا ہے ”جواب مکتوب قاضی عبدالرحیم کہ نظم و نثر در تعریف فقیر انشاء نموده اند۔“ (قاضی عبدالرحیم کے خط کا جواب جنہوں نے خاکسار کی منظوم اور منثور دونوں انداز سے تعریف کی ہے)۔

”یاد فقرا حرکتی است از نقاب ارادت بیخونی۔ در ہر دلیکہ پر تو توجہ آن تافت، خود را آئینہ دار ہماں کیفیت دریافت، خطرات قلوب خاصان کہ ملہم اسرار ربانی اندامی شکر اس شفقت از حق بحق تو اند بود و سائنش وضع محقران نیز غیر رافت حقیقی پردہ اکرام نخواہد کشود، بہمہ حال از عجز پرستانم۔ امداد قدرت کبریا تغافل گرا حوال حیرت مآل مامباد۔ رباعی:

از قد دو تا ندامت ایچینہ ایم در دامن نا امید آویختہ ایم  
بر طاق گذار خواہ در خاک انگلن ماہیچہ سرگوں می ریختہ ایم (۷۳۸)

خاکسار کی یاد ایک ایسی حرکت ہے جو ارادہ خداوندی کے نقاب سے سرزد ہوئی ہے جس دل میں اس کی جھلک پڑتی ہے خود کو اسی کیفیت کا آئینہ دار محسوس کرتا ہے۔ خواص کے دلوں میں جو خطرات اور واردات گذرتے ہیں وہ ربانی اسرار سے ملہم ہوتے ہیں۔ ان عنایتوں کی کما حقہ شکر گذاری خدا ہی کی توفیق سے انجام پا سکتی ہے ناپزیر کے حالات کی تعریف بھی حقیقی مہربانی کے سوا کسی اور چیز سے پردہ اکرام نہیں اٹھائے گی۔ بہر حال ہم تو ایک عجز پرست عاجز و خاکسار انسان ہیں۔ کبریائی طاقت کی امداد ہمارے حیرت مآل حالات کا تغافل گرا ثابت نہ ہو۔

جب سے اپنے قد دو تا (دوہری قامت) سے ندامت و شرمندگی محسوس کر رہے ہیں مایوسی کے دامن سے لٹکے پڑے ہیں۔ چاہے طاق پر بٹھاؤ چاہے زمین پر پھینک دو ہم تو گری ہوئی شراب کے سرگوں جام ہیں۔

یہ خط واضح کرتا ہے کہ قاضی صاحب موصوف شاعرانہ ذوق طبع کے حامل تھے۔

### مرزا خسرو بیگ:

مرزا خسرو بیگ کے بابت مآثر عالمگیری سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ربیع الثانی ۱۰۹۲ھ میں اس نے احمد آباد سے حافظ محمد امین خاں کے سارے اسباب و سامان بادشاہ سلامت اورنگ زیب کی خدمت میں لا کر پیش کئے (۷۳۹)۔ رقعات میں بیدل نے ایک خط تو اسے مستقل لکھا اور دوسرے

خط میں جو شکر اللہ خاں کے نام ہے معنی طور پر اس کا تذکرہ کیا ہے۔ ان دونوں خطوط کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ موصوف بیدل کے مخلص احباب میں تھا جو خصوصیت سے دلکش اور رنگین نثر لکھنے پر قدرت رکھتا تھا۔ اسی لئے بیدل نے اس کے لئے ”خسر و لفظ و معنی“ کا لقب استعمال کیا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ وہ اس کے اسلوب نگارش سے بہت زیادہ متاثر تھا۔

”بارک اللہ امرؤ کہ نامہ خسرو لفظ و معنی ما، بعنوانی آئینہ ورود پرداخت کہ بیدل مشتاق را، در مطالعہ لمعات صفائش، چراغ خلوت اندیشہ افروختن است۔ و بہ نشانی کیفیت حضورش، ذخیرہ ہای انجمن دماغ اندوختن۔ بی تکلف در مقابل نشست این قلم، اگر خط جدا رکوہ باشد، چوں صداسینہ ہوامی خراشد و در برابر لطف عبارات نزاکت، اگر تحریر بوی گل بعرض آرد، خامہ از رنگ خارامی تراشد۔“ (۷۴۰)

قلمت از چہ چمنستان قدح ناز کشید کہ خط از لغزش مستان می اعجاز کشید اللہ برکت کرے کہ ہمارے ”خسر و لفظ و معنی“ کا خط آج اس انداز سے آئینہ ورود میں مشغول ہوا (آیا) کہ بیدل مشتاق کو اس کی پاکیزہ آب و تاب کے مطالعہ کے لئے خلوت اندیشہ کا چراغ جلانا پڑا اور اس کی کیفیت حضور کی نشہ پیمائی کے لئے انجمن دماغ کے ذخیرے فراہم کرنے پڑے۔ بے تکلف اس قلم کی نشست کے مقابلہ پر اگر دیوار کوہ جیسا مضبوط خط بھی ہو تو آواز کے مانند ہوا کے سینہ میں خراش لگا دے اور نزاکت عبارت کے لطف کے مقابلہ پر اگر تحریر پھول کی خوشبو بھی پیش کرے تو قلم سخت پتھر کی رگ کو بھی تراش کر رکھ دے۔ تیرے قلم نے کس چمنستان سے ناز کی قدح پیمائی کی کہ خط مستوں اور شرابیوں کی لغزش سے اعجاز کی میکشی کرنے لگا۔

یہ خط اسلوب نگارش کی ان خصوصیات کو واضح کرتا ہے جو نثر نویسی کیلئے بیدل کے نزدیک پسندیدہ سمجھی جاتی تھیں اس لئے بیدل کے نزدیک ایک فصیح نثر کی خصوصیات کے لحاظ سے اس پر بحث کی جاسکتی ہے۔ راقم السطور نے تیسرے باب ”بیدل ایک نثر نگار کی حیثیت سے“ میں اس پر روشنی ڈالی ہے۔ شکر اللہ خان ثانی کے نام بیدل کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ بہادر شاہ کے دربار میں وہ کسی منصب پر فائز تھا۔ بیدل نے اپنی بعض خود ساختہ دوائیں جیسے اکسیر احمر وغیرہ اس کی معرفت بادشاہ کی خدمت میں پیش کی تھیں جنہیں بادشاہ نے غالباً قبول کیا۔

”قبل ازیں بمعرفت مرزا خسرو بیگ قدری اکسیر احمر نیاز بار یافتگان جناب تقدس

انتساب بادشاہ زادہ عالمیان مآب گردیدہ بود بشرف قبول امتیاز یافتہ باشد۔“ (۷۴۱)

اس سے پہلے مرزا خسرو بیگ کی معرفت کچھ اکسیر احمر جناب شہزادہ تقدس مآب کی خدمت میں

پیش کیا تھا۔ امید کہ شرف قبول سے نواز اگیا ہوگا۔

ملادرویش والہ ہروی:

ملادرویش والہ ہروی عہد شاہجہاں کا ایک اچھا شاعر تھا۔ وہ ناظم بنگال قاسم خان کے عہد میں ہرات سے بنگال آیا، کچھ دنوں بعد وہاں سے اڑیسہ گیا، خوش فکر تھا (۷۴۲)، لغت نامہ دہخدا میں اس کا ایک شعریوں نقل کیا ہے۔

ز بخت بد چہ طمع کردہ ای کہ سازگار آید ز گوش کر چہ توقع کنی کہ سخن شنود (۷۴۳)  
۱۰۷۵ تا ۱۰۷۵ھ ۱۶۶۰ تا ۱۶۶۳ کے دوران جب بیدل کا قیام اڑیسہ میں تھا اور شاہ قاسم ہوالہی کی صحبت سے وہ استفادہ کر رہا تھا، والہ ہروی سے اس کی ملاقات ہوئی۔ شاید موصوف بھی شاہ صاحب کے ارادتمندوں میں تھا، اس موقع پر بیدل کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اس کی طرز شاعری اور اسلوب نگارش سے بہت متاثر تھا۔ لکھتا ہے۔

”روزی جناب حقایق پناہ حضرت شاہ قاسم طاب ثراہ، بخانہ میرزا ظریف پر تو سعادت انداختہ بود و بساط آن تجلی کدہ بانوار مراتب فیض نواختہ معنی نواز طرز نوی ملادرویش والہ ہروی، کہ تمکین عبارات تمینش، برگ خار، خط نخ کشیدی۔ و نزاکت مضامین رنگینش، بر لطافت بوی گل، افسون تبسم و میدی، از غاشیہ داران جنبیت اخلاص بود و از رکاب پرستان موبک اختصاص۔“ (۷۴۴)

ایک دن جناب حقایق پناہ حضرت شاہ قاسم طاب ثراہ مرزا ظریف کے گھر سعادت کی جھلک دکھا رہے تھے (تشریف فرما تھے) اور اس تجلی کدہ کی بساط کو انوار مراتب فیض سے نواز رکھا تھا، طرز نو کے معنی نواز ملادرویش والہ ہروی جنکی متین و استوار عبارت کی تمکینی رگ خار پر خط نخ کھینچتی تھی اور ان کے رنگین مضامین کی نزاکت بونے گل کی لطافت پر قہقہہ لگاتی تھی، سلاح اخلاص کے حاشیہ برداروں اور موبک اختصاص کے رکاب داروں میں تھا۔

منعم خانخاناں:

منعم خانخاناں ایک با ذوق شاعر تھا، اکثر شعر کہا کرتا تھا۔ ”الہامات معنی“ اور ”مکاشفات معنی“ کے نام سے اس نے چند کتابیں بھی تصنیف کی تھیں۔ خان موصوف مختلف ادوار میں سرکار بخشی سے لے کر وزیر اعظم تک کے مختلف عہدوں پر فائز رہا۔ وہ ان تمام خوبیوں کا حامل تھا جن کی ایک لائق

وزیر سپہ سالار کی جاتی ہے۔ منعم خاں بیدل کے احباب کی فہرست میں شامل ہے۔ بہادر شاہ نے اس کی وساطت سے بیدل سے اپنے خاندان کا شاہنامہ لکھنے کی فرمائش کی۔ منعم خاں نے بیدل سے اس کا تذکرہ کیا لیکن مناعت نفس کی وجہ سے اس ذمہ داری کو قبول کرنے سے اس نے انکار کر دیا اور جب اس کی طرف سے اصرار ہوا تو بیدل نے تنگ آ کر یہ لکھ بھیجا:

”اگر خواہ مخواہ مزاج بادشاہ برین پلہ ست، من فقیرم، جنگ نمی توام کرد، ترک ممالک محروسہ

نمودہ، بولایت روم“۔ (۷۳۵)

اگر بادشاہ نے خواہ مخواہ یہی طے کر لیا ہے تو میں ایک فقیر آدمی ہوں لڑ سکتا نہیں ہاں ممالک محروسہ سے ہجرت کر کے ولایت چلا جاؤں گا۔

میر عبدالجلیل بلگرامی:

میر عبدالجلیل بلگرامی بیدل کے ایک عظیم معاصر شاعر اور عالم و فاضل آدمی تھے جو بقول خود ان کے لڑکے سید محمد کے غیر معمولی استعداد اور صلاحیت کے حامل تھے۔ تمام عقلی و نقلی علوم میں یدِ طولی رکھنے کے علاوہ عربی، فارسی، ترکی اور ہندی زبانوں سے پوری طرح واقف تھے اور ان چاروں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ (۷۳۶)

غلام حسن مجددی کا خیال ہے کہ باپ اور بیٹے دونوں کی مرزا بیدل سے صحبتیں رہی ہیں لیکن سید محمد کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ یہ موقع صرف بیٹے کو حاصل ہوا (۷۳۷)۔ ہاں غلام علی آزاد نے ایک واقعہ لکھا ہے جس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید وہ بیدل کی مجلس میں کبھی موجود تھے۔ آزاد کا بیان ہے:

”شخصی مصراعی از بیت میرزا بیدل در مجلسی خواند ”روز سوار شب کند اسپ چراغ پا“

و گفت: کسی می تواند کہ پیش مصرع بہم رساند“ علامہ مرحوم فی البدیہہ انشا کرد: غرہ مشکوکہ ابلیق

ایام رام تست۔ روز سوار شب کند اسپ چراغ پا۔ ازان شخص بی اختیار آفرین سرزد و گفت

:حق نیست کہ مصرع شریف بہ از مصرع میرزا واقع شدہ“ میرزا چنین گفتہ است: باطبع

سرکش اسنمہ رخ وفا مبر۔ روز سوار شب کند اسپ چراغ پا“۔ (۷۳۸)

ایک آدمی نے ایک محفل میں بیدل کا درج ذیل ایک مصرعہ پڑھا ”روز سوار شب کند اسپ چراغ پا“ اور کہا کوئی ہے جو اس کا مصرع اول کہے، علامہ مرحوم نے برجستہ کہا ”غرہ مشکوکہ ابلیق ایام رام تست: روز سوار شب کند اسپ چراغ پا“ اس آدمی نے بے اختیار داد دی اور کہا سچی بات یہ ہے کہ یہ

مصرع مرزا کے مصرع سے بہتر ہے۔

بیدل نے یہ شعریوں کہا ہے:

باطح سرکش ایں ہمہ رخ وفا مبر روز سوار شب کند اسپ چراغ پا  
اگر تسلیم کریں کہ یہ واقعہ بیدل کی مجلس میں پیش آیا تو ممکن ہے بیدل نے اپنی مناعت نفس اور طبی خود داری کی وجہ سے اس کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا اور شاید اسی وجہ سے مخلصانہ روابط ان کے بیچ برقرار نہ ہو سکے۔

صاحب شرافت میں محمد عسکری نے ایک اور واقعہ نقل کیا ہے ایک دن نامور علامہ سید عبدالجلیل بلگرامی کی محفل میں مرزا بیدل مرحوم کے تصوف کا چرچا ہو رہا تھا۔ علامہ مرحوم نے گلستان سعدی کے ایک مصرع پر نہایت رنگین تفسیر کرتے ہوئے بیساختہ کہا:

دی کسی گفت میرزا بیدل خوب گفتہ در تصوف راز  
مصرعی در جواب خواند جلیل بیدل از بے نشان چہ گوید باز (۷۳۹)  
میر محمد علی راتب:

راتب کا نجیب الطرفین سادات سے تعلق تھا، اس نے اپنے والد میر محمد دوست متخلص بہ صانع کی خدمت میں تعلیم حاصل کی۔ مرزا عبدالقادر بیدل، شاہ ناصر علی اور فقیر اللہ آفرین اور دیگر معاصر شاعروں کا ہم مشرب و ہم نشین تھا۔ لمبی عمر پائی، قصبہ سیالکوٹ میں قناعت و سیر چشتی کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا۔ جن غیر مشہور بحروں میں بیدل نے غزلیں کہی ہیں اکثر انہی بحروں میں اس نے نہایت عمدہ غزلیں کہی ہیں۔ (۷۵۰)

محمد فاضل گجراتی آزاد:

آزاد کا احمد آباد گجرات کے علوی سادات سے تعلق تھا اور ستودہ صفت سید تھا۔ شاہ ناصر علی اور بیدل سے اس کی ملاقات رہی ہے، ۱۲۳۸ھ میں بھڑوچ میں اس کا انتقال ہوا۔ (۷۵۱)

مرزا محسن ذوالقدر:

ذوالقدر وہ واحد شاعر ہے جس کی بیدل سے ایام طفولیت ہی سے دوستی رہی ہے اور اس کے ساتھ اس کی نشست و برخاست کا سلسلہ جاری رہا۔ وہ اس کے قدیم احباب میں تھا۔ ”ذوالقدر“ ایک برادری کا نام ہے اور اسی مناسبت سے اس نے اپنا مخلص اسے قرار دیا۔ شروع میں وہ شاہ شجاع کی فوج



میں ملازم تھا۔ شاعرانہ ذوق کا حامل تھا۔ خوشگو نے اسے نوے سال کی عمر میں مرزا بیدل کی صحبت میں دیکھا تھا۔ ”رقعات ملا محمد حسن ذوالقدر“ کے نام سے اس کے خطوط کا ایک مجموعہ بھی ہے۔ (۷۵۲)

جعفر زٹلی:

جعفر بیدل کے معاصر اور آشناؤں میں تھا۔ زٹلی کا شمار ہجو گو بلکہ فحش گو شاعروں میں ہوتا ہے۔ موصوف نے ایک دفعہ بیدل کی تعریف میں ایک مثنوی کہی تھی۔ ایک دن مرزا کی مجلس میں جب اس نے اس کا پہلا مصرعہ پڑھا:

چہ عرفی چہ فیضی بہ پیش تو پھس

بیدل نے وہیں روک کر کہا بس ہو گیا۔ بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے یہاں آنے کی زحمت فرمائی۔ ہم فقراء کی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں اور حضرات اساتذہ کے بارے میں اس قسم کی ناشائستہ باتیں سننا پسند نہیں کرتے۔ اس کے بعد تھیلی سے ایک اشرفی نکال کر اسے دیا۔ خوشگو کا بیان ہے کہ حاضرین مجلس خصوصاً میں نے بیدل سے اجازت چاہی کہ دوسرے مصرعہ میں پھس کا قافیہ معلوم کریں لیکن بیدل نے اس کی اجازت نہیں دی۔ (۷۵۳)

محمد سعید اعجاز:

اعجاز مولانا عبدالرشید عزت کا شاگرد رشید تھا۔ اس کو اپنے استاد سے بے انتہا تعلق اور ارادت تھی اور اکثر ان کی صحبت میں حاضری دیتا تھا (۷۵۴)۔ ایسا لگتا ہے کہ عزت کی خدمت سے استفادہ کے دوران بیدل سے اس کا تعارف ہوا۔ خوشگو اعجاز کو نا صرعلی اور بیدل کا ہم طرح قرار دیتا ہے اور لکھتا ہے کہ وہ بلاشبہ اس فن کا استاد، عمدہ شاعر اور خوش لفظ و خوش معانی ہے۔ معقولات و منقولات میں بھی اسے یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ (۷۵۵)

آقا محمد ابراہیم فیضان:

آقا ایک خوش بیان اور خوش فکر شاعر تھا۔ اسی کے ساتھ وہ معقولات اور منقولات سے بھی بہرہ مند تھا۔ رنگین نثر لکھتا تھا اور خط نستعلیق بہت خوبصورت لکھتا تھا۔ اکثر اپنے گھر پر محفل مشاعرہ منعقد کرتا۔ بیدل اس میں شرکت کرتا اور اس کے ساتھ رنگین صحبتوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا (۷۵۶)۔ رقصات میں مرزا محمد ابراہیم کے نام بیدل کے دو خطوط ملتے ہیں غالب گمان یہی ہے کہ یہ وہی محمد ابراہیم ہے جس کو خوشگو نے آقا محمد ابراہیم فیضان کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ خطوط میں بیدل نے اس کو مقام عرفان کے

حصول پر متوجہ کیا ہے:

”ابواب فیض اقدس کہ مشعر حقیقت روحی است، ہر ذی حیات بی کلیدی مفتوح است تا ساغر بزم دوراں وجود فرصتی دارد مست این نشاء نغمہار باید بود۔ و چشم بر کیفیات این صاف بیدر و غبار کشود۔ مفت جمعیت سرخوشی کہ تشویش خیال باطلش جام تکلف نہ پیاید۔ و غنیمت شوق صاحب دماغی کہ صدای التفات و ہم باطلش نفرساید۔ شعور این نشاء را نتائج بسیار است و حضور این مقام را خواص بی شمار۔ نسق شریعت و سلوک طریقت کہ مادہ انتظام و نشاء کمال ظہور و بطون ست، بوساطت انبیاء و وسیلہ اولیا از شہوداں حقیقت و حصول ہمین معرفت ست۔ و گر نہ معاد و معاش انسان ہم وضع سائر حیوانات می بود۔ و افعال و احوال آدمی جز مطابق طیور و انعام نمی نمود۔ ہادی تحقیق زمرہ آسمانیار از صراط مستقیم ”من عرف نفسه“ مخرف نگردانا و بہ ننگ ضلالت ”من کان فی ہذہ اعمی فہو فی الآخرۃ اعمی“ نرساناد۔“ (۷۵۷)

فیض اقدس کے دروازے جو ”حقیقت روح“ کی طرف رہنمائی کرتے ہیں ہر ذی روح اور جاندار پر بغیر چابی کے کھلے ہیں جب تک بزم دوراں ”وجود“ کے ساغر کو نوش کرنے کی فرصت حاصل ہے، اس نشہ سے مست و مخمور رہنا چاہئے اور اس صاف ستھرے تلچھٹ و گرد و غبار سے پاک شراب پر آنکھیں واؤنی چاہئیں۔ مست و مولا آدمی کو جمعیت خاطر مفت حاصل ہے۔ خیال باطل کی تشویش اسے جام تکلف کا دور نہیں کراتی ہے۔ اور اہل دماغ غنیمت شوق ہے وہم باطن کی صدائے التفات ان کو خوف و ہراس میں مبتلا نہیں کرتی ہے۔ اس نشہ کے ادراک و شعور کے نتائج بے شمار ہیں اور اس مقام میں حاضری کے خواص ان گنت ہیں۔ نسق شریعت اور سلوک طریقت جو ظہور و بطون عالم کے منشا کمال اور مادہ انتظام ہیں، انبیاء اور اولیاء کی وساطت سے اسی حقیقت کا مشاہدہ اور اسی معرفت کے حصول کا نام ہے ورنہ انسان کا معاد و معاش تمام جانوروں کے احوال سے ملتا جلتا ہوتا۔ اور آدمی کے افعال و احوال چرند و پرند کے مطابق ہی انجام پاتے۔ جادہ تحقیق کی طرف ہدایت کرنے والا آسمانیوں کی جماعت کو ”من عرف الخ“ کے صراط مستقیم سے مخرف نہ کرے اور ”من کان فی ہذہ اعمی فہو فی الآخرۃ اعمی“ کی ضلالت کے ننگ و عار تک نہ پہنچائے۔

خواجہ عبداللہ ساقی:

ساقی کا تعلق ملا وجیہ کے خاندان سے تھا۔ اعظم شاہ کی خدمت میں ملازم تھا اور بیدل کے

دوستوں میں تھا۔ ساقی کا وطن اگر چہ لاہور تھا لیکن کچھ دنوں اس نے دارالخلافت دہلی میں بھی قیام کیا۔ مشہور ہے کہ وہ خود بیل خود پسند اور نازک خیال قسم کا آدمی تھا۔ (۷۵۸)

مرزا محمد بقاء:

رقعات میں ”از جانب مرزا محمد بقاء بشکر اللہ خاں“ کے عنوان سے ایک خط ہے۔ اس خط کے مضامین شکر اللہ خاں کو عید کی مبارکبادی اور ان کی صحت و سلامتی کی دعا سے وابستہ ہیں (۷۵۹)۔ غالباً یہ وہی شیخ محمد بقاء سہارنپوری ہیں جو ”مرآت جہان نما“ کے مصنف (۷۶۰) اور بیدل کے دوست اور شکر اللہ خاں کے متوسلین میں ہیں۔ اظہار و ابلاغ پر بیدل کی غیر معمولی قدرت کی بنا پر ممکن ہے انہوں نے اس سے درخواست کی ہو کہ میری طرف سے شکر اللہ خاں کو خط لکھ دیں۔

شیخ علاء الدین متوکل:

عاقل خاں کے نام ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ علاء الدین بیدل کا ایک دوست تھا جو کسی معاملہ میں شرکاء کی بے انصافی کا شکار ہو کر مشکلات سے دوچار ہوا تھا۔ بیدل نے عاقل خاں سے درخواست کی کہ اس کی مشکل دور کرنے کے لئے اپنے اثر و رسوخ کو کام میں لائیں۔ (۷۶۱)

۰۰۰

## بیدل کے شاگرد

معاشرہ کے مختلف طبقے سے بیدل کے وسیع تعلقات کے پیش نظر جن میں کچھ کا تذکرہ پچھلے صفحات میں ہوا ان لوگوں کی تعداد جنہوں نے بیدل کی صحبت سے فیض و برکات حاصل کئے صحیح طور پر نہیں بتائی جاسکتی۔ اسی طرح یقینی طور پر یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ فلاں اس کے دوستوں میں ہے یا شاگردوں میں۔ شیخ احمد علی سندیلوی لکھتے ہیں:

”بہا کس از دامن تربیت مرزا بہر خواستہ اند ذکر آنہا طول دارد۔“ (۷۶۲)

مرزا کے دامن تربیت سے فیض حاصل کر کے بہت سے لوگ ابھرے اور ترقی کی راہ پر گامزن ہوئے ان کا تذکرہ طوالت کا خواہاں ہے۔ میر قاسم عرف قدرت اللہ لکھتا ہے:

”دختری کثیری از انفاش شریفہ اش بہرہ وانی اندوخت۔“ (۷۶۳)

ان کی صحبت سے بہت سے لوگوں نے بہت فائدہ اٹھایا۔ خوشگو کے بیان کی بنا پر، جو بیدل کا قریب ترین شاگرد تھا اور بیدل کے حالات کی طرح ان لوگوں کے حالات بھی جنہوں نے اس کی خدمت سے فائدہ اٹھایا اپنی تذکرہ میں لکھے، ایک حد تک بیدل کے دوستوں اور شاگردوں کے درمیان خط امتیاز کھینچا جاسکتا ہے۔ ذیل میں انہیں شاگردوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

سراج الدین علیخان آرزو:

سراج الدین علیخان آرزو مشہور ادبی چہرہ ہے اور کسی تعارف کا محتاج نہیں، بیدل سے اس کے روابط استاد شاگردی کے روابط معلوم ہوتے ہیں کیونکہ اس نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے:

”فقیر آرزو دوبار بخد مت این بزرگوار، اوّل عہد بادشاہ شہید محمد فرخ سیر رسیدہ و مستفید گردیدہ۔“ (۷۶۴)

فقیر آرزو بادشاہ شہید محمد فرخ سیر کے اوّل عہد میں دو دفعہ اس بزرگوار کی خدمت میں حاضر ہوا اور مستفید ہوا۔ استفادہ کے اعتراف سے اگرچہ لازم نہیں آتا کہ وہ شاگرد رہا ہو کیونکہ استفادہ کا سلسلہ اکثر دوستوں کے بیچ بھی چلتا ہے۔ لیکن لفظ ”بزرگوار“ جو اس نے بیدل کے لئے استعمال کیا ہے واضح کرتا ہے کہ آرزو نے خود کو بیدل کے سامنے ایک نیازمند شاگرد تسلیم کیا۔ اس خیال کی تائید درگاہ قلی خاں صاحب ”مرقع دہلی“ کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ لکھتا ہے:

”روم عرس مرزا بیدل مرحوم بہ نسبت شاگردیش بزم آراء می گردد۔“ (۷۶۵)

مرزا بیدل کے عرس کے دن اس کی شاگردی کی نسبت سے محفل آرائی کرتا ہے۔

آنند رام مخلص:

مخلص لاہور کا باشندہ تھا۔ اس کا باپ ہردی رام بھٹری اپنے عہد کا ایک مشہور آدمی تھا۔ مخلص بھی باپ کی طرح مشہور ہوا۔ اکثر سراج الدین علی خاں آرزو کے ساتھ شعر و شاعری میں مصروف رہتا تھا۔ اس کا شمار نقادوں کی صف میں بھی ہوتا ہے۔ جوانی میں بیدل کا شاگرد رہا ہے۔ (۷۶۶)

آنند رام مخلص کو بیدل نے اپنے دیوان کی ایک نقل عطا کی تھی۔ یہ نسخہ مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے۔ مولانا نے اس کا تعارف مجلہ معارف شمارہ ۱۳۳ میں کرایا ہے۔ اس دیوان کے آخر میں یہ عبارت لکھی ہے۔

”روز چہار شنبہ چہارم شوال سن یک ہزار و نو و ہشت در مقام نارنول بہ تحریر رسید۔ ایں اشعار از دیوان قدیم و جدید بطریق اختصار نوشت تا برائے نسخہ برداشتن دوستان را عذر کاہل قلمی نہ باشد۔ والسلام اور لوح دیوان کی عبارت یہ ہے:

”بہ دستخط حضرت مرزا بیدل علیہ الرحمہ فقیر آنند رام مخلص از نظر مرزا صاحب گذرانیدہ ایں معانی بصحت رسیدہ“۔ (۷۶۷)

بروز بدھ ۱۰۹۸ھ بمقام نارنول قدیم و جدید دیوان سے بطور اختصار یہ منتخب اشعار لکھے تاکہ نقل نویسی کے لئے دوستوں کو کاہل قلمی کا عذر نہ رہے۔ والسلام حضرت مرزا بیدل علیہ الرحمہ کے دستخط کے ساتھ فقیر آنند رام مخلص نے مرزا کی نظر سے گزار کر اس کی توثیق کرائی۔

ان تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ مخلص بیدل کا نہ صرف یہ کہ شاگرد اور ارادتمند تھا بلکہ اس حد تک مخلصانہ تعلق رکھتا تھا کہ بیدل نے اپنے دیوان کی ایک نقل اسے فراہم کی۔

شرف الدین علی پیام:

پیام ایک خوش طبع شاعر تھا، ایک دن رائے رایان مخلص کے گھر میں پیام، آرزو اور محمد عطا متخلص بہ عطا جو بیدل کے شاگردوں میں تھے پہنچے۔ عطا اور پیام دونوں باہم مذاق کر رہے تھے۔ عطا نے پیام سے کہا ’بوسہ بہ پیام خالی از تازگی نیست‘ باوجودیکہ یہ کوئی قابل ذکر بات نہ تھی پیام نے خوشی

میں بیساختہ یہ شعر پڑھا:

دوستاں بکر نیست فکر عطا ہست از نادانستش پیدا (۷۶۸)

عطاء اللہ عطا:

عطا بیدل کا ایسا شاگرد تھا جس کی طبیعت میں ظرافت اور مزاح کا عنصر غالب تھا۔ جب کبھی بیدل کی مجلس میں حاضر ہوتا بیدل جو اکثر توحید سے وابستہ اشعار پڑھا کرتا تھا، رک جاتا اور اس کی خاطر ہزلیات کا سلسلہ شروع کر دیتا اور اکثر کہا کرتا

”استحقاق تتبع و تلمذ دیوان ہزلیات ما عطا دارد۔“

میرے دیوان میں ہزلیات کے تتبع اور تلمذ کا حق عطا کو حاصل ہے۔ بیدل نے اپنا قلمدان اور بیاض اسے بخشا تھا عطا نے اس کے شکریہ میں ایک رباعی کہی:

بیدل شہ اقلیم کمال ہر فن از گوشہ چشم تا نظر داشت بمن  
از روی عنایت قلمدان و بیاض فرمود مرا وزارت ملک سخن (۷۶۹)

رقعات میں ایک خط خطاء اللہ کے نام نظر آتا ہے ممکن ہے یہ عطاء اللہ ہی ہو جو سہو کا تب سے خطاء اللہ ہو گیا۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ بیدل اسے بہت چاہتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ کچھ دنوں جب مرزا کی صحبت سے غیر حاضر رہا تو بیدل کو اضطراب لاحق ہوا اور اس نے یہ خط لکھا:

”وقت است اگر بہ نمی از رشہ آب پیکان، غبار خاطر ایں اند و بگیں فرو نشاند و بساط کلفت

ایں زمیں گیر بہ شیخ خانہ کمان، منور گردانید۔“ (۷۷۰)

ابھی وقت ہے اگر آب پیکان (تیر یا برچی کا پھل) کی نمی سے اس محزون کے غبار خاطر کو فرو کرے یعنی اس کے چہرہ کا دسے دل کی گرد و غبار دبا دیں اور اس عاجز کی بساط کلفت کو شیخ خانہ کمان سے منور کریں (یعنی حاضر ہو کر ہمیں خوش کریں)۔

بندرا بن داس خوشگو:

پروفیسر عطا کا کوئی کے مطابق بندرا بن داس خوشگو، مرزا محمد افضل سرخوش، سراج الدین علی خاں آرزو، لالہ سکھ راج سبقت اور بھوپت رائے بیراگی بے غم کا شاگرد اور شاہ سعد اللہ گلشن اور مرزا عبدالقادر بیدل کا دائمی مصاحب تھا اس کے مظہر، ابرو اور دیگر معاصر شاعروں سے بھی دوستانہ روابط تھے۔ (۷۷۱)

پروفیسر عطا کا کوئی کا دعویٰ مختلف تذکرہ نگاروں کے بیانات پر مبنی ہے جن کا مقدمہ میں انہوں نے تفصیل سے ذکر کیا ہے لیکن خوشگو نے خود ہی اعتراف کیا ہے کہ اپنی زندگی میں ایک ہزار دفعہ سے



زیادہ مرزا کی خدمت میں حاضری دی اور استفادہ کیا:

”فقیر خوشگوار عمر خود زیادہ از ہزار مرتبہ بخند متش مستفید شدہ ہاشم“۔ (۷۷۲)

اس لئے بیدل کی صحبت سے استفادہ کے اس اعترافی بیان کی بنا پر ہم اسے بیدل کے شاگردوں کی صف میں رکھ سکتے ہیں۔ بیدل کی صحبت سے استفادہ کا نتیجہ یہ تھا کہ ”ملفوظات“ کے نام سے اس نے اس صحبت کی یادداشتیں جمع کی تھیں۔ لکھتا ہے:

”فقیر ملفوظاتی نوشتہ کہ اکثر مذکورات آن مجہاد آں داخل است۔“ (۷۷۳)

اگر وہ ملفوظات حاصل ہو جاتے تو بیدل کی زندگی کے بہت سے مبہم پہلو پر بھی روشنی پڑ سکتی تھی۔ خوشگو کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ اس نے بیدل کے حالات بہ نسبت دوسرے تذکرہ نگاروں کے قدرے تفصیل سے لکھے اور اس کی زندگی کے بہت سے واقعات بیان کرنے کے علاوہ امراء، احباب اور شاگردوں سے اس کے روابط پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر سید علی رضا نقوی لکھتے ہیں:

”چون مولف اکثر در خدمت بیدل بود، بنا براین بیانات او در بارہ بیدل مورد اعتماد و موثق

تر از تذکرہ نویسان دیگر می باشد۔ وی توان گفت کہ در بارہ بیدل هیچ کتابی غیر از تالیفات

خود بیدل معتبر تر از این کتاب وجود ندارد۔“ (۷۷۴)

چونکہ مولف اکثر بیدل کی خدمت میں حاضر رہا ہے اس لئے بیدل کے بارے میں اس کے بیانات دوسرے تذکرہ نگاروں کے مقابلہ میں زیادہ قابل اعتماد ہیں اور کہا جاسکتا ہے کہ بیدل کے بارے میں اس کی اپنی تالیفات کے علاوہ اس کتاب سے زیادہ معتبر کوئی اور ماخذ نہیں ہے۔

اسی وجہ سے مشہور محقق قاضی عبدالودود نے بیدل کی جائے پیدائش کے بارے میں خوشگو کے بیان کو ترجیح دیتے ہوئے خاکسار سے کہا کہ چونکہ خوشگو کا بیدل سے براہ راست تعلق رہا ہے اور ہزار بار سے زیادہ اس کی خدمت سے اس نے استفادہ کیا ہے اس لئے اس کے قول پر کہ بیدل اکبر آبادی الوطن ہے زیادہ اعتماد کیا جاسکتا ہے۔

لیکن راقم السطور نے جب خوشگو کے بیانات کا خود بیدل کے بیانات سے موازنہ کیا تو پتہ چلا کہ بیدل کی جائے پیدائش، اعظم شاہ کی خدمت میں مدت ملازمت اور اس کے گجرات میں قیام اور دیگر امور سے متعلق اس کے بیانات غلط فہمی پر مبنی ہیں جیسا کہ اس کتاب کے مطالعہ سے واضح ہوگا۔

میر عبدالصمد سخن:

میر عبدالصمد کا تعلق ایران کے نجیب سادات سے تھا۔ وہ شاعرانہ ذوق کا حامل تھا اور اس کا شمار بیدل کے شاگردوں میں ہوتا ہے۔ اس کا تخلص سخن بھی بیدل ہی کا عطا کردہ ہے۔ سخن کو فارسی زبان و ادب

پر مکمل قدرت حاصل تھی۔ خان آرزو نے اسے بیدل کے شاگردوں کے صف میں شامل کیا ہے (۷۷۵) شاید یہ وہی عبدالصمد ہے جس کو ڈاکٹر انصاری مرحوم نے شیخ عبدالصمد جو پوری کے نام سے متعارف کرایا ہے۔ موصوف وزیر اعظم جعفر خاں کے متوسلین میں تھا اور فن انشاء کے اساتذہ میں شمار کیا جاتا ہے (۷۷۶)۔ عبدالصمد کے نام ایک خط میں بیدل اسے ان دعائیہ الفاظ سے مخاطب کرتا ہے ”رنگینی بہار سخن لایزال باذ“ بہار ”سخن“ کی رنگینی سدا قائم رہے۔ اس لئے قیاس ہوتا ہے کہ یہ وہی عبدالصمد ہوگا۔ بیدل کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ سخن اپنے نتائج فکر بیدل کے پاس بھیجا کرتا تھا۔ بیدل نے اس کی تحسین کی ہے نیز اس کی نامہ نویسی کی تعریف کی ہے:

”وردالافتات نامہ، با اشعار سحر بیانہا، ساغر کیفیتی می پیاید کہ شوق دیدار غیر از شہود جمال چشم با تیا ز [نہ] کشاید۔“

نامہ ات آئینہ دارد کہ تا و امی شود دست گاہ عالم دیدار پیدا می شود (۷۷۷)

سحر بیانی پر مشتمل اشعار کے ساتھ آج گرامی نامہ کا ورود ایسی کیفیت کے ساغر کا دور چلاتا ہے کہ ”شہود جمال“ کے سوکھی اور چیز پر شوق دیدار اپنی چشم و انہیں کر سکتا (ملاقات کے بغیر چین نہیں مل سکتا ہے) تیرا خط ایسے آئینہ کا حامل ہے کہ جب وہ کھلتا ہے تو عالم دیدار کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔

سید محمد ابن عبدالجلیل:

سید محمد ابن عبدالجلیل بلگرامی بیدل کے شاگردوں میں تھا اپنے روزنامچے ”تبرۃ الناظرین“ میں ۱۱۳۳ھ ۱۷۲۰ء کے واقعات کے ضمن میں بیدل کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

”مکاتب الحروف بارہا بخند مت شریفش رسیدہ و از فیض صحبت گرامی اش بہرہ و اندوختہ۔“ (۷۷۸)

راقم السطور بارہا ان کی خدمت شریف میں حاضر ہوا اور ان کی صحبت گرامی سے فیوض و برکات حاصل کئے۔

انہی صحبتوں کی ایک یاد کا تذکرہ سید محمد نے اس طرح کیا ہے کہ ایک رات بیدل کے ایک ہندو شاگرد نے جس کا تخلص رامی تھا اور جو خود کو فارسی اور ہندی دونوں زبانوں کا شاعر سمجھتا تھا، ایک ہندی شعر پڑھا جس کا مضمون مبتذل اور سوقیانہ تھا میں نے اس سے کہا بزرگوں کی ایسی وقیع محفل میں مبتذل شعر نہیں پڑھنا چاہئے۔ غصہ سے آگ بگولہ ہو کر اس نے کہا اچھا تو آپ ہی سنائیے اگر اس سے اچھا شعر آپ کو یاد ہو۔ خاکسار نے مشہور ہندی شاعر چٹنامنی کے کچھ اشعار سنائے۔ بیدل میری طرف متوجہ ہو کر بولے میں ہندی سے واقف نہیں ہوں اس کی وضاحت کرو۔ میں نے شعر کے مضمون کی وضاحت کی تو وہ بہت محفوظ ہوئے اور دیر تک اس کا لطف لیتے رہے پھر رامی کی طرف متوجہ ہو کر بولے

اس قسم کے ہندی اشعار پڑھنے چاہئے جس میں سراسر لطف اور مزہ ہے۔ (۷۷۹)

سید مرتضیٰ قانع:

قانع بیدل کا شاگرد تھا اور صاحب ذوق اور بلند طبع شاعر تھا۔ (۷۸۰)

احمد عبرت:

احمد عبرت بیدل کا بہت ہی لائق شاگرد تھا۔ ناصر علی کے ساتھ ایک ادبی مقابلہ میں عبرت کی کامیابی اس کے شاعرانہ ذوق اور اعلیٰ صلاحیت کو واضح کرتی ہے۔ خانی خان نے اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے:

”گویند چوں ناصر علی سرہندی این غزل را کہ نوشتہ می شود، طرح کردہ در شاہجہان آباد آوازہ انداخت کہ ہر کدام این غزل را جواب تو اندرسانید، اگر در ملک سخن دعویٰ خدائی نماید من بوی ایمان می آورم۔ از اتفاقات، ہچک از صاحب طبعان، لب بجواب کشاد مگر احمد عبرت تخلص کہ از خدمت میرزا عبدالقادر بیدل فیض وافر داشت، بشارہ میرزا غزلی در جواب رسانید۔ شیخ ناصر علی بعد از استماع آن سکوت ورزید۔ شعر طرح از ناصر علی:

تو چوں در جلوہ آئی، مغز جان سیما ب می گردد  
تجلی می کند بر فیکہ آتش آب می گردد (۷۸۱)

کہتے ہیں ناصر علی سرہندی نے درج ذیل غزل کا شعر طرح کے طور پر پیش کیا اور شاہجہان آباد میں ڈنکا پٹوایا کہ جو آدمی اس غزل کا جواب لکھ کر پیش کرے گا اگر وہ کشور شعر میں خدائی کا دعویٰ کرے تو میں اس پر ایمان لے آؤں گا۔ اتفاق سے کسی صاحب طبع نے لب کشائی کی جرأت نہیں کی البتہ احمد عبرت نام کے ایک شاعر نے جس نے بیدل کی خدمت سے بہت فیض اٹھایا تھا، مرزا کے اشارہ پر ایک غزل لکھ کر سنائی شیخ ناصر علی اسے سن کر خاموش ہو گیا۔ ناصر علی کا طرح شعر یہ ہے:

تو چوں در جلوہ آئی، مغز جان سیما ب می گردد  
تجلی می کند بر فیکہ آتش آب می گردد

خوشگو کے مطابق عبرت دار الخلافہ دہلی کا نہایت خوش آواز مغنی بھی تھا۔ وہ سارنگی خوب بجالیتا تھا۔ اس پر بیدل کی خاص توجہ رہتی تھی تا آنکہ وہ ایک خوش فکر شاعر کی شکل میں نمایاں ہوا۔ تخلص بھی بیدل ہی نے اس کو عطا کیا تھا۔ بیدل کی صحبت میں حاضری کی وجہ سے توحید سے تعلق اور اس کا مذاق اس میں بھی پیدا ہوا۔ ۱۲۵ھ ۱۷۱۳ء میں جب اس کی وفات ہوئی تو بیدل دیر تک روتا رہا۔ (۷۸۲)

مرزا بر خوردار بیگ فردی:

فردی ایک خوش فکر اور شوخ طبع شاعر تھا اور بیدل سے شاگردی کی نسبت اسے حاصل تھی۔ (۷۸۳)

شیخ سعد اللہ گلشن:

گلشن ایک مشہور شاعر ہے جس کو علوم ظاہری و باطنی میں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ شیخ عبدالاحد عرف گل محمد وحدت کے مریدوں میں تھا۔ شعر گوئی کی طرف اس کی توجہ اور رجحان کا یہ عالم تھا کہ فکر شعر کے دوران اگر کوئی ملاقاتی حاضر ہوتا تو اسے دیر تک انتظار کرنا پڑتا۔ خوشگو خود کو گلشن کا شاگرد لکھتا ہے۔ فکر شعر میں اس کی اہمیت کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ایک دن ناصر علی نے اسے بتلگیر کر کے کہا ”دور دور شاست ما خود ضعیف شدیم“ یعنی یہ دور تو تمہارا ہے ہم تو اب ناتواں ہو چکے۔ گلشن تخلص بھی بیدل کا عطا کردہ ہے۔ گلشن بیدل کے بارے میں اکثر کہا کرتا تھا: جبکہ وہ تقریباً تیس ہزار اشعار کہہ چکا تھا اور فکر شعر میں ترقی کر رہا تھا ناصر علی کا زوال شروع ہو گیا تھا (۷۸۴)۔ میر غلام علی شیر صاحب ”مقالات اشعراء“ نے گلشن کو بیدل کے شاگردوں کی صف میں شمار کیا ہے۔ (۷۸۵)

حافظ محمد جمال تلاش:

تلاش بیدل کا ایک با ذوق اور بلند طبع شاگرد تھا جس کو تخلص بھی اسی سے ملا ہوا تھا۔ خوشگو سے اس کے مخلصانہ روابط تھے۔ بیدل اس کے اشعار سے لطف اندوز ہوتا تھا۔

بروز عید ہر شاہ و گدا گم می کند خود را  
تورفتی برسند ناز و من از خوشبختی رستم

خانہ زادان وفا را نالہ می باشد مدام  
شیون ایجادست چینی ماتم نفقور را (۷۸۶)

شیخ عظمت اللہ کامل:

کامل مراد آباد کا باشندہ اور بیدل کا شاگرد تھا تخلص بھی اسی کا دیا ہوا تھا اور اس کی شاعرانہ زبان بھی اس نے درست کی (۷۸۷)۔ فن شاعری اور تاریخ گوئی میں مہارت رکھتا تھا یہ فن اس نے مرزا عبدالقادر بیدل سے سیکھا تھا۔ یہ شعر جس کو اس نے نعت میں کہا تھا، شریف مدینہ سے درخواست کی کہ روضہ منورہ پر لکھ دیا جائے:

نگاہ چشم ممکن نیست بیند جلوہ دوست  
کہ اللہ نقش دیوار است در محراب ابرویت (۷۸۸)

سید محمد اشرف حسرت:

اشرف قصبہ سندیلہ کا رہنے والا تھا جو لکھنؤ سے سولہ کوس کے فاصلہ پر واقع ہے۔ وہ بیدل کا شاگرد اور صاحب ذوق اور بلند طبع شاعر تھا (۷۸۹)۔ آخر حیات میں مراد آباد چلا گیا اور وہیں بس گیا اس کا ایک شعر درج ذیل ہے:

خوں شود آں دل کہ از درو ضعیفاں خوں شد  
بشکند رنگی کہ نتواند بروی ما شکست (۷۹۰)

شیخ صدر الدین محمد:

صدر الدین محمد ایک پشاور طالب علم تھا۔ بیدل کی صحبت میں حاضری کی وجہ سے اس کی زبان کی لکنت جو شعر خوانی کے وقت پیدا ہو جاتی تھی دور ہو گئی۔ اس نے صنف رباعی میں خوب طبع آزمائی کی ہے۔ (۷۹۱)

صاحب باغ معانی لکھتا ہے ”صدر الدین قادری سلسلہ کے مشائخ کا ارادتمند تھا۔ بیدل سے کثرت اختلاط کے نتیجہ میں شاعری سے رغبت اس میں پیدا ہوئی اور شعر گوئی کی صلاحیت بہم پہنچائی اکثر رباعی کہا کرتا تھا جیسے۔

صف پا کاں کہ خاص خلق باریست از نسبت جنس پوچ محو زاریست  
زیں شرم کہ با سراب تہمت زده است دائم غرق جبین دریا باریست (۷۹۲)  
ممکن ہے یہ وہی صدر الدین ہو جس کی غزل شکر اللہ خاں نے بغرض اصلاح بیدل کے پاس بھیجی تھی۔ بیدل نے جواب میں لکھا کہ اس نے شاعری پر اپنی قدرت کے اظہار کے لئے یہ اشعار بر جتہ کہے ہیں اور ہم سے اس کی قبولیت و پسندیدگی کا امیدوار ہے اگر وہ خود اس پر غور کرتا تو خود اس کی اصلاح کر سکتا تھا۔ اس خط کا عنوان ہے ”جواب نامہ شکر اللہ خاں در تکلیف اصلاح غزل صدر الدین خاں“۔  
”بفکر بد یہہ پرداخت و بامید قبول طبع معانی پسند، طبیعت رامستعد اموری شناخت لیکن  
باقی غزل وقتی بمعرض تو ہم آوردہ کہ از عہدہ آن مگر ہماں خودش تواند برآمد۔“ (۷۹۳)

میر معصوم وجدان:

معصوم وجدان میر محمد زمان راسخ کالڑ کا تھا جو بیدل کے احباب میں تھا جس کا تذکرہ پہلے گذر چکا ہے۔ اپنے باپ کی طرح وجدان بھی شاعرانہ ذوق کا حامل تھا۔ شروع میں بیدل سے مشق سخن کرتا تھا۔ اس کے بعد پنجاب جا کر یگانہ روزگار ہونے کا ڈھنڈورا پیٹنے لگا (۷۹۳)۔ بقول آزاد بلگرامی وجدان شاعری میں اپنے باپ سے گویا سبقت لے گیا (۷۹۵)۔ حاکم لاہوری کے مطابق وہ حضرت سید میر کلال سادات سرہند کی اولاد سے تھا۔ فرخ سیر کے زمانے میں میر جملہ کے ہمراہ لاہور آیا۔ کچھ عرصہ کے لئے دہلی چلا گیا لیکن جب وہاں کوئی سلسلہ نہ بنا تو واپس لاہور چلا آیا۔ یہاں سیف الدولہ عبدالصمد کے پاس ملازم ہو گیا۔ نواب مذکور شعر فہم اور شاعر نواز تھا، اس نے اس کی خاصی مدد کی اور اپنا ہدم بنالیا اور ہر روز عصر سے پہلے یہاں ایک مشاعرہ ہوتا جس میں یہ سرخیل شعرا ہوتا۔ نواب سیف الدولہ کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے ذکر یا خاں کے پاس رہا۔ ۱۱۱۰ھ میں لاہور میں وفات پائی۔ (۷۹۶)

محمد پناہ قابل:

قابل کشمیر کا باشندہ تھا ذاتی فضل و کمال کے ساتھ فارسی زبان پر بھی اسے مکمل قدرت تھی اور بیدل کی خدمت میں مشق سخن کرتا تھا۔ (۷۹۷)

شیخ محمد احسن سامع:

سامع راجہ ٹوڈل کی نسل سے تھا، اس کے دادا نے اسلام قبول کیا تھا۔ شروع میں بیدل کی صحبت سے استفادہ کرتا تھا اور اکثر اس کے پاس حاضری دیا کرتا تھا۔ بیدل کے انتقال کے بعد حکیم الممالک شیخ حسین شہرت کی شاگردی اختیار کی۔ (۷۹۸)

مغل خان قابل:

مغل خان بیدل کا شاگرد تھا جو طبع موزوں کا حامل تھا۔ (۷۹۹)

معنی یاب خان شاعر:

گل محمد نام اور شاعر اس کا تخلص تھا۔ شاعر بیدل کا ایک شاگرد رشید تھا، وہ بسیار گو اور خوب گو تھا۔ غزل، مثنوی، قصیدہ اور رباعی وغیرہ مختلف اصناف کلام میں طبع آزمائی کرتا تھا۔ بیدل کی شاگردی کے سبب اکثر اس کی خدمت میں حاضری دیتا۔ بیدل اسے بہت عزیز رکھتا تھا اور اپنی عصا اور شمشیر بھی اسے عطا کی تھی۔ بیدل کی وفات کے بعد یہی شاعر تھا جو عرس بیدل کا اہتمام کرتا تھا (۸۰۰)۔ درگاہ قلی خاں نے مرقع دہلی میں عرس بیدل کی جو تفصیلات پیش کی ہیں اس میں اس کا ذکر آتا ہے آگے چل کر عرس بیدل کے عنوان سے اس پر بحث کی جائے گی۔

مہر علی بیکس:

بیکس متھرا کا باشندہ تھا اور قاضی زادہ تھا۔ بیدل کی صحبت سے فیضیاب ہونے کی وجہ سے وہ ایک شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوا (۸۰۱)۔ بیکس کی ایک رباعی ملاحظہ ہو:

بیکس ز فراق داغ بر دل ماندی نی وصل نگار پای در گل ماندی  
ہر چند تلاش وصل دریا گوئی لیکن چوں موج سر بسا حل ماندی (۸۰۲)  
ابوالفیض مست:

مست کا اگرچہ دعویٰ تھا کہ وہ باطنی طور پر سعدی کا شاگرد ہے۔ درج ذیل شعر کے ذریعہ اس نے خواب میں سعدی سے اپنی ارادتمندی اور شاگردی کا اظہار اس طرح کیا ہے۔



”میر تقی میر“ بنو اب جانب شیراز در سخن شاگرد شیخ سعدی شیریں زبان شدم  
لیکن بظاہر اس نے ایک خاص مدت بیدل کی صحبت میں گزاری ہے، اس سے استفادہ کیا اور  
اپنے کلام میں اصلاح لی ہے۔ (۸۰۳)

میر رضی وحدت:

وحدت کے متعلق اگرچہ تذکروں میں کچھ نہیں ملتا تاہم تخلص بتاتا ہے کہ وہ شاعر تھا۔ رقصات  
بیدل میں ایک خط اس کے نام موجود ہے اس لئے ممکن ہے وہ بھی بیدل کا شاگرد رہا ہو۔ وحدت نے  
بیدل کو ایک حقہ بھیجا تھا بیدل نے اس کی شکرگزاری کے ساتھ یہ شکایت کی ہے کہ میرے پاس آمد  
ورفت میں تم کچھ کوتاہی کرنے لگے ہو۔

”ہر گاہ اقتضای اتفاق صحبہا، نقاب آرزوئی کشاید، قدم محبان درویدہ مردی می نماید  
..... حقہ ہای تحایف بہ قلقل خوشی مینائی کردہ اند“۔ (۸۰۴)

لالہ حکم چند ندرت:

ندرت قصہ تھامیر کا باشندہ تھا۔ وہ خوشگو کا ہمدرس اور دوست رہا ہے۔ بچپن سے ہی لطیفہ گو اور  
بذلہ رخ تھا اور شاعرانہ ذوق، ذہن رسا اور طبع بلند کا حامل تھا۔ اکثر بیدل اور شاہ گلشن کی صحبت سے  
استفادہ کرتا تھا۔ (۸۰۵)

کر بخش حضوری:

حضوری پنجاب کا باشندہ تھا لیکن یہاں سے ہجرت کر کے اسلام آباد مقہرا میں بس گیا تھا۔  
بیدل کا شاگرد تھا اور سالوں اس کی صحبت سے فیضیاب ہو کر درجہ کمال کو پہنچا۔ (۸۰۶)

سری گوپال تمیز:

تمیز برہمنوں کے سورج نسل سے تعلق رکھتا تھا وہ بھی بیدل کا شاگرد تھا۔ (۸۰۷)

لالہ سکھ راج سبقت:

سبقت بیدل کے ہونہار ہندو شاگردوں میں تھا جو خود بیدل کے بقول اس کے تمام ہندو  
شاگردوں سے گئے سبقت لے گیا تھا۔ (۸۰۸)

لالہ شیورام داس حیا:

حیا بیدل کا تخلص یافتہ شاگرد تھا۔ وہ طبع بلند اور شاعرانہ ذوق کا حامل ہونے کے علاوہ بیدل کی

کتاب ”چهار عنصر“ کے اسلوب میں اس نے ایک کتاب تصنیف کی تھی اور اس کا نام ”گلگشت بہار رام“  
رکھا تھا۔ (۸۰۹)

امانت رام امانت:

بیدل کا ایک ہندو شاگرد تھا۔ خان آرزو نے لکھا ہے کہ خاکسار کا شاگرد ہونے کا دعویٰ بھی کرتا  
ہے۔ نواب علی امجد خان مرحوم کا فشی تھا۔ نواب کے انتقال کے بعد اس کی ہمشیرہ رحیم النساء بیگم سے اس  
کو وظیفہ ملتا تھا۔ اس نے ہندی کی مبسوط کتابوں کو فارسی نظم کا قالب دیا اور ایک ضخیم دیوان ترتیب دیا۔  
وہ موزوں طبع شاعر تھا۔ (۸۱۰)

رامی:

رامی کا تذکرہ سید محمد ابن عبدالجلیل نے اپنے روزنامہ تبصرۃ الناظرین میں کیا ہے۔ جس کا ذکر  
پہلے آچکا ہے یہ بھی بیدل کا شاگرد تھا۔ (۸۱۱)

شاہ فصیح فصیح:

شاہ فصیح بیدل کا شاگرد تھا اور فصیح اس کا تخلص تھا۔ اس نے لمبی عمر پائی اور لکھنؤ میں ایک تکیہ  
بنا کر اپنی پوری زندگی درویشی اور فقیری میں گزار دی۔ (۸۱۲)

ایجاد عبدالعزیز:

ایجاد بیدل کا ایک شاگرد تھا اس کا ایک شعر ہے۔  
بھراے جنوں دیوانہ سامان چمن دارد چو ز گس چشم حیرانی چو گل چاک گریبانی (۸۱۳)  
ہنرور خاں عاقل:

عاقل خواجہ کمال کا بھائی تھا۔ آرزو کا بیان ہے کہ مجھ سے اس کے گہرے تعلقات تھے۔ چنانچہ  
اس عاصی کی تعریف میں اس نے ایک غزل بھی کہی ہے۔ ۷۱ سال پہلے اس کی وفات ہوئی۔ زندگی کا  
ایک حصہ اس نے آصف جاہ نظام الملک کی خدمت میں گزارا۔ آخر دکن سے شاہجہان آباد دہلی آیا اور  
یہیں خدا کو پیارا ہوا۔ میرا خیال ہے کہ وہ بیدل کا شاگرد تھا کیونکہ اس کا انداز بیان بیدل کے انداز سے  
ملتا جلتا ہے۔ اس نے بیدل کی تاریخ وفات اس طرح کہی ہے:

سال تاریخ وفات بیدل رضواں مقام از سر بیتابی دل گفتمہ شد ختم کلام (۸۱۴)

تو نواب موصوف نے اسے صلے میں ایک زنجیر ہاتھی اور خاصی رقم عطا کی اور کہا بس کرو کہ دوسرے اشعار کا صلہ دینے کی سکت مجھ میں نہیں ہے۔ (۸۱۷)

اس میں کچھ شک نہیں کہ ایک قادر الکلام شاعر کی حیثیت سے ناصر علی کو خاصی شہرت حاصل ہوئی اور اس دور کے شاعروں کا سرخیل ہو گیا تھا حتیٰ کہ سرخوش لکھتا ہے:

”در زمان بی فیض واقع شدہ والا چنیں نازک خیال می باید ملک اشعراء عصر باشد“ (۸۱۸)

بے فیض زمانہ میں پیدا ہوا تھا ورنہ ایسے نازک خیال شاعر کو تو اس دور کا ملک اشعراء ہونا چاہئے تھا۔ عظمت اللہ بیخبر لکھتا ہے:

”(بیدل) اگرچہ معاصر ناصر علی بود، اما بعد وفات او اعتبار تمام پیدا کرد۔“ (۸۱۹)

بیدل اگرچہ ناصر علی کا معاصر تھا پر اس کی وفات کے بعد ہی اسے مکمل عزت و اعتبار حاصل ہوا۔ لیکن شیخ احمد علی کا خیال ہے:

”ہر چند میان ناصر علی غالب حریفی بمیزان دارو لیکن باؤمی رسد“ (۸۲۰)

شیخ ناصر علی اگرچہ مرزا بیدل کا بڑا حریف تھا پر اس کے پائے کو نہیں پہونچ سکا۔ خوشگوشاہ گلشن کا درج ذیل مقولہ لکھتا ہے:

”ہنگامی کہ دی درحد و دی ہزار بیت گفتہ بود و فکر شعر پیش رفت می کرد ناصر و بکا ہش کردہ

بود۔“ (۸۲۱)

جس زمانہ میں بیدل تقریباً تیس ہزار اشعار کہہ چکا تھا اور شعر گوئی میں ترقی کر رہا تھا ناصر علی رو بہ زوال تھا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں اپنے عہد کے باکمال شاعر تھے اور اسی وجہ سے دونوں کے درمیان معاصرانہ چشمک جاری تھی اور دونوں کے اپنے اپنے کچھ حامی اور طرفدار تھے جو اپنے پسندیدہ شاعر کو دوسروں پر فوقیت دیتے تھے۔ خوشگوشاہ خیال کی تائید کرتا ہے۔ انہیں حالات کے پیش نظر وہ لکھتا ہے کہ ایک دفعہ میں نے شیخ گلشن سے کہا کہ کسی طرح ناصر علی کو آمادہ کیا جائے کہ مرزا بیدل کے گھر جا کر ان سے بات چیت کریں اور باہمی کدورت کو جو ان کے بیچ پیدا ہو گئی ہے دور کریں۔ گلشن نے جواب دیا ”ہوں تماشا کی جنگ فیلاں دارید“، یعنی ہاتھیوں کی کشتی کا تماشا دیکھنے کا ارادہ ہے کیا؟ اس کے بعد یہ شعر پڑھا:

افضل حق زہر دو جهان رم گرفتہ ایم یک در گرفتہ ایم وچہ محکم گرفتہ ایم (۸۲۲)

اب کچھ ادبی مناظرے کا ذکر کیا جاتا ہے جو ان دونوں کے درمیان ہوئے تھے۔ شیر خاں لودی

## بیدل کے رقیب

چهار عصر، رقعات اور تذکروں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بیدل کی عام مقبولیت، شہرت اور امراء و نوادین کے نزدیک اس کی غیر معمولی عزت اور اثر و رسوخ کی وجہ سے کچھ مشہور معاصر اس سے چلتے اور دل میں کدورت رکھتے تھے۔ شاید اسی بنا پر بیدل کے ان کے ساتھ دوستانہ اور مخلصانہ روابط قائم نہ ہو سکے۔

شاہد:

شاہد کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ شاعر تھا یا نہیں لیکن جیسا کہ نواب شکر اللہ خاں کے تذکرہ میں گذرا، یہ پہلا آدمی تھا جس نے بیدل سے اپنے حسد کا اظہار اعلانیہ طور پر کیا۔ شاہد نے دراصل بیدل کے شکر اللہ خاں اور شاہر خاں کے ساتھ نامہ نگاری کے انداز پر تنقید کی تھی لیکن اس کے پردہ میں اس کا اصل مقصد پوشیدہ تھا۔ بیدل کے ساتھ نواب کے روز افزوں مخلصانہ روابط، احترام اور محبت اس کے حسد اور جلن کا سبب ثابت ہوئی۔ اسی وجہ سے در ”تنبیہ شاہد“ کے عنوان سے اس کے نام ایک مخصوص خط میں بیدل نے نہ صرف یہ کہ اس پر سخت حملہ کیا بلکہ ایک طرح سے دشنام طرازی سے بھی باز نہیں آیا:

”طہر بوزنیہ حق ناشناس، ماندہ مفت خوری، خرس غولہ رنگ، سلسلہ نساں آثاری“ (۸۱۵)

ناصر علی سرہندی:

ناصر علی سرہندی بقول ڈاکٹر انصاری بلاشبہ بیدل کے بعد عہد اورنگ زیب کا ایک بڑا شاعر ہے (۸۱۶)۔ بالکل اسی طرح اسے بیدل کا سب سے بڑا رقیب اور حریف بھی کہا جاسکتا ہے۔

ناصر علی کی شاعرانہ اہمیت کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ایک بار نواب ذوالفقار خاں ابن اسد خاں کی تعریف میں اس نے ایک قصیدہ کہا۔ جب اس کا درج ذیل مطلع پڑھا:

ای شان حیدری ز جبین تو آشکار نام تو در نبر د کند کار ذوالفقار

کا بیان ہے کہ ایک دن بیدل شکر اللہ خاں کی خدمت میں پہونچا، ناصر علی وہاں پہلے سے موجود تھا، بیدل جو غزل وہاں سننے کو لایا تھا اسے پڑھنا شروع کیا، جس کا مطلع ہے:

نشد آئینہ کیفیت مآظاہر آرائی نہان ماندیم چون معنی بچندین لفظ پیدائی  
ناصر علی نے دوسرے مصرعہ پر اعتراض کرتے ہوئے کہا: یہ دعویٰ مسلمہ اصول کے خلاف ہے کیونکہ معنی ہمیشہ لفظ کے تابع ہوا کرتا ہے، جب کوئی لفظ سامنے آتا ہے تو اس کا معنی روشن ہو جاتا ہے۔ مرزا نے مسکرا کر جواب دیا جس معنی کو آپ لفظ کا تابع کہتے ہیں وہ لفظ ہی ہے اس سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ لیکن اس حیثیت سے کہ وہ ایک حقیقت کا حامل ہے کسی لفظ کے جامے میں نہیں آتا ہے۔ پھر اپنے دعوے کی ایک مثال کے ذریعہ وضاحت کی جس طرح لفظ ”انسان“ تمام ان شروحوں کے باوجود جو کتابوں میں لکھا ہے اب تک اس کی حقیقت صیغہ راز میں ہے۔ اس معقول جواب پر ناصر علی کو خاموش رہنے کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آیا۔ دوسرے اشعار اس قدر اسے پسند آئے کہ ان کو سن کر وجد کرنے لگا۔ منجملہ ان کے یہ شعر ہے:

از ہجوم کلفت دل نامہ بی آہنگ ماند بوی اس گل از ضعیفی در طلسم رنگ ماند (۸۲۳)  
ایک اور واقعہ میر حسین دوست نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ناصر علی اس قدر خود پسند و خود پسند واقع ہوا تھا کہ اپنے مقابلے پر کسی شاعر کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ ایک دن بیدل کی اس سے ملاقات ہوئی۔ ناصر علی نے پوچھا کیا نام ہے آپ کا؟ ”میں عبدالقادر بیدل ہوں“ بیدل نے جواب دیا۔ ناصر علی نے کہا ”اچھا آپ ہیں۔ آپ کے کچھ بہکائے ہوئے شاعر یہاں آئے تھے۔ اب بتاؤ کہ ان دنوں کتنے مضامین کا خون تم نے کیا ہے؟ مرزا اس وقت تو نری سے جواب دے کر گزر گیا۔ دوسرے دن ناصر علی مرزا کے گھر آیا۔ بیدل نے اسے اپنی مثنوی طور معرفت سنانی شروع کی جب اس شعر پر پہونچا:

مزن بر ہیج سنگی سخت دستی کہ مینا در بغل خفته است مستی  
(کسی سخت پتھر پر ہاتھ نہ مارنا کہ وہاں پر کوئی مست بغل میں شیشہ لئے سویا ہوا ہے)  
ناصر علی نے کہا دوسرا مصرعہ اچھا کہا ہے، بیدل نے کہا تو پہلا مصرعہ آپ ہی تضمین فرمائیے، ناصر علی نے جواب دیا مصرعہ اول کہنا میرے وقار کے خلاف ہے۔

تیسرا واقعہ عبدالرزاق خاں خوانی نے بیان کیا ہے جس کا تذکرہ احمد عبرت کے احوال کے ضمن میں ہوا۔ (۸۲۴)

یہ واقعات کتنے سچے ہیں یہ کہنا مشکل ہے البتہ ان تین واقعات کے درمیان شیر خان لودی کا

بیان اس لحاظ سے زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ وہ شکر اللہ خاں کے متوسلین میں تھا اور اس کے اور بیدل کے درمیان خوشگوار تعلقات تھے۔ اس لئے ایسا لگتا ہے کہ اس نے اپنا چشم دید واقعہ بیان کیا ہو۔ ڈاکٹر نور الحسن انصاری مرحوم لکھتے ہیں:

نواب شکر اللہ خاں کے نام جو خط ناصر علی کا ہے وہ انانیت سے بھرپور ہے اور خود ستائی کا بہترین نمونہ ہے۔

”مرزا زکالت خود بر آوردند و بہ حضرت کبریای خود تسلیم نمودند“ ”خُن“ نام دولت دادند  
مصنوع از زوال۔ اگر بہ پشت گرمی او شکم چون کمان بر پشت بندم، زور تن و قوت دل  
بجاست۔ معنی لقب لشکری کہ اگر بعالم گیری سر بر آورم، رواست..... حرنی کہ بخاطر مگد  
شہ فکرو نیاست، و تفشیکہ در سینہ جا گرفتہ، یاد عقبی۔“ (۸۲۵)

اس لئے کچھ بعید نہیں کہ یہ واقعات پیش آئے ہوں۔ ان تینوں واقعات سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ناصر علی کو ہمیشہ شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس پس منظر میں شیخ احمد کا بیان زیادہ صحیح اور مستند معلوم ہوتا ہے۔

ناصر علی کی اس عجب و خود پسندی کی وجہ سے ۱۱۰۸ھ میں ناصر علی کی وفات کے موقع پر بیدل نے جو تاریخ کہی وہ ایک حد تک طنز پر مشتمل ہے۔  
”رنگ ناز بہ شکست“۔ (۸۲۶)

### افضل سرخوش:

سرخوش بھی ایک مشہور شاعر ہے جس کو بیدل کے حریفوں میں شمار کیا جاسکتا ہے کیونکہ ناصر علی کے تعاون اور اس کے اشارہ پر اکثر وہ ایسے کام کرتا جو بیدل کی کدورت کا سبب ہوتا۔ اسی قسم کا ایک واقعہ اپنے تذکرہ میں اس نے لکھا ہے:

”فقیر سرخوش، باشارہ میان ناصر علی، چند بیت ایشان را پیش مصرع رسانده، مطلع برجستہ  
ساختہ، اگر چہ ایشان شنیدہ مخطوط نشدند، از روی غیر تیکہ تلائدہ رحمانی رای باشد بر دند،  
امایاران منصف مزاج و عزیزان نازک فہم بسیار پسندیدند۔“ (۸۲۷)

خاکسار سرخوش ناصر علی کے اشارہ پر ان کے چند اشعار کے پیش مصرعہ بنا کر برجستہ مطلع کہے اگر چہ ان کو سن کر اس غیرت کی بنا پر جو تلامذہ الرحمن کو ہوتی ہے محفوظ نہ ہوئے لیکن منصف مزاج اور نازک فہم احباب نے بہت پسند کیا۔

سردست اس وقت دنیا میں کوئی اس کا مقابل نہیں البتہ گزشتہ ادوار میں امیر خسرو اور مولوی جامی رہے ہیں۔ اس دور میں ان کا وجود غنیمت ہے۔ ممکن ہے یہ اعتراف ناصر علی کے انتقال کے بعد کیا ہوا مگر سرخوش کا ذکر کرتے ہوئے خان آرزو لکھتا ہے:

”انصافی کہ در مزاج آں عزیز بزرگ دیدہ شد کم بنظر آمدہ، در طبع مرزا بیدل عشر عشر آں نہ بود۔“ (۸۲۹)

اس عزیز یعنی سرخوش کے مزاج میں جو اعتدال اور انصاف تھا بہت کم لوگوں میں دیکھنے میں آیا، بیدل کی طبیعت میں تو اس کا عشر عشر بھی نہ تھا۔

حکیم میرزا نعمت خان عالی:

نعمت خان عالی ایک زبردست اور قادر الکلام شاعر اور ادیب تھا، خصوصاً اپنے علمی و ادبی مناظرہ کے لئے سارے ہندوستان میں مشہور تھا۔ بقول خوشگو عالی ایک عالم اور فاضل آدمی تھا اور اکثر علوم میں اسے یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ انہیں اوصاف کی بنا پر وہ پانصدی سے لیکر سہ ہزاری تک کے مختلف عہدوں پر فائز رہا۔ اس کا وہ واحد عیب جو اس کے سارے کمالات پر پانی پھیر دیتا ہے اس کی ہزل گوئی ہے۔ جو اس کے مزاج اور طبیعت کی خمیر بن چکی تھی۔ بیدل کی زبان پر جب کبھی اس کا نام آتا تو ”حاجی ہجوی“ سے اسے خطاب کرتا (۸۳۰)۔ خوشگو کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ بیدل اور نعمت خاں عالی کے درمیان اختلاف رہا ہے اور چونکہ عالی ہزل گوئی کا عادی تھا اس لئے امکان اس بات کا ہے کہ اس نے بیدل کی بھی ہزل کی ہوگی اور بیدل نے اسے جواب میں حاجی ہجوی سے تعبیر کیا ہو۔ ڈاکٹر نور الحسن انصاری لکھتے ہیں:

”تجب ہے کہ عالی نے اپنے ہمعصر شاعروں اور ادیبوں کی طرف کوئی توجہ نہیں کی ان کی کلیات میں کسی شاعر کی ہزل نہیں ہے پھر بھی بیدل خائف رہتے تھے اور انہیں حاجی ہجوی کہا کرتے تھے۔ البتہ عالی نے حکیموں اور طبیبوں کی خوب خبر لی ہے۔“ (۸۳۱)

لیکن ”ہجو“ سے مراد بیدل کی شاید عام ہجو جیسا کہ مآثر الامراء میں لکھا ہے:

”اکثر امراء دونیماں زخمی تیغ زبان او بودند و تشنه خویش بودند و او دست از کنایہ و ہجو بر نمی داشت۔“ (۸۳۲)

یعنی اکثر امراء اور تعلقدار اس کی شمشیر زبان سے گھائل تھے اور اس کے خون کے پیاسے

سرخوش

بیدل

بہ فرصت آخرت تحصیل ز بی ثباتی عشرت سرشتہ اندر  
برات رگم و برگل نوشتہ اندر برات رگم و برگل نوشتہ اندر

☆

عوارض کثرت وہی ست ذات وحدت مارا دوئی کی ذات وحدت را بہ کثرت رہنما گردد  
خلل در شخص یکتا نیست گر قامت دو تا گردد خلل در ذات یکتا نیست گر قامت دو تا گردد

☆

شخص پیری، نفی ہستی می کند ہشیار باش جلوہ گاہ نقش پیری تحتہ مشق فنا ست  
صورت قد دو تا آئینہ ترکیب ماست صورت قد دو تا آئینہ ترکیب ماست

☆

بے تکلف مرگ ہم آساں نمی آید بکف نیست از شمع اجل آساں نگاہ افروختن  
از تماشائے جہانے چشم باید دوختن از تماشائے جہانی چشم باید دوختن  
سرخوش شیعہ مذہب کے پیرو تھے، اور بیدل سنی تھے، مرزا سرخوش نے نعمت اور منقبت میں ایک ایک رباہی لکھ کر بیدل کے پاس بھیجی۔

در فضل و کمال ذات احمد یکتا ست اسلام قوی ز یاری شیر خدا ست  
عین ایشان نتائج ایشانند ہجوں دو الف کہ یازدہ زان پیدا است  
بیدل نے بھی جواب میں یہ رباہی لکھ کر بھیج دی۔

آن چار خلیفہ رسول معبود کز ابجد وضع شان عشر شد موجود  
بے نقطہ شک بذات یکتائے نبی چوں جمع کنند یازدہ خواہد بود  
یہ واقعہ واضح کرتا ہے کہ اس کی سرگرمیوں کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ بیدل کی عام مقبولیت اور امراء کی نگاہ میں اس کی عزت کو بٹھ لگے اس لئے کوئی عجب نہیں اگر وہ بیدل کی کدورت کا سبب ہوا ہو۔

لیکن ۱۱۱۵ھ میں اپنے اصلاح کردہ تذکرہ میں بیدل کا تذکرہ اس طرح کیا ہے کہ اس سے اس کی غیر معمولی ستائش کی بو آتی ہے۔

”..... پافعل کسی در عالم نیست مگر در زمان سلف امیر خسرو و مولوی جامی خواہند بود۔ درین

عہد وجود و از مغنمات است۔“ (۸۳۸)

رہتے تھے لیکن وہ کسی طرح کنایہ اور اشارہ اور طنز و ہزل سے باز نہیں آتا تھا۔

انہیں امراء میں میر کامگار خاں ابن جعفر خاں تھا جس کی والی حیدر آباد ابوالحسن کے وزیر اعظم سید مظفر کی جوان لڑکی سے (۱۰۹۹ھ-۱۶۸۷ء میں) شادی کے موقع پر اس نے ایک نظم کہی جو طنز و استہزاء اور فحش گوئی پر مشتمل ہے۔

کہ خدا شد بار دیگر خان عالی مرتبت باکمال عز و تمکین و وقار و زینب و زریں (۸۳۳)  
جیسا کہ پچھلے صفحات میں گذرا، کامگار خاں بیدل کا بہت ہی مخلص دوست تھا۔ بیدل سے اسے بڑی عقیدت اور ارادت تھی، وہ اس کی قدر افزائی اور دلجوئی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا تھا۔ خود بیدل بھی اس کا بڑا احترام کرتا اس لئے ظاہر ہے کہ بیدل اس کی شان میں اس گستاخی کو کیسے پسند کرتا۔ شاید اسی بنا پر اس نے اسے حاجی بجوی کا خطاب دیا ہو۔ ممکن ہے کامگار خاں کے علاوہ دیگر امراء جیسے شکر اللہ خاں اور آصف جاہ اول کی شان میں بھی ہجو یہ نظمیں کہی ہوں اور یہ سب بیدل کے نہایت محبوب دوست تھے۔ بیدل کا نظریہ ہے کہ

ستم می پرورد آغوش گل از خار پروردن زبانی را کز و کار درود آید بسبب مکشا  
پھول اپنی آغوش میں کانٹے کی پرورش کر کے خود آپ پر ستم ڈھا رہا ہے۔ جو زبان درود و سلام کے لئے استعمال کی جاسکتی ہے اسے گالم گلوچ اور سب و شتم کیلئے استعمال مت کرو۔

خان آرزو نے نعمت خان کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کے درج ذیل شعر

دارد چه سر انجام خوشی خانه دنیا جاں بیچ، جسد بیچ، بقایچ، فنا بیچ  
کا بیدل کے ایک شعر سے مقابلہ کرتے ہوئے لکھا ہے

”فقیر آرزو گوید کہ مصرعہ مذکور باندک تغیر مرزا عبدالقادر بیدل نیز گفتہ چناں کہ گوید:

ای ہستی تو ننگ عدم تا بہ کجا بیچ جاں بیچ، جسد بیچ، بقایچ، فنا بیچ

لیکن برخن فہم پوشیدہ نیست کہ شعر مرزا بیدل بسیار بلند رتبہ است۔ (۸۳۳)

آرزو کا خیال ہے نعمت خاں عالی کے مذکورہ مصرعہ کو بیدل نے تھوڑی تبدیلی کیساتھ کہا ہے لیکن سخن فہم حضرات پر یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ بیدل کا شعر بہت بلند پایہ ہے۔

عبدالرحیم:

عبدالرحیم کے بابت خوشگو کے بیان سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ اکبر آباد کے قیام کے دوران بیدل کا اس سے سابقہ پڑا۔ وہ ایک موزوں شاعرانہ طبع کا حامل تھا۔ ایک دن بیدل پاکلی پر سوار

ہو کر کہیں جا رہا تھا کہ اس نے درج ذیل شعر لکھ کر پاکلی میں ڈال دیا۔

چہ خطا در خط استاد ازل دید آیا کہ باصلاح عزیزانش نیاز افتادہ است  
استاد ازل کے خط میں کیا غلطی اسے نظر آئی کہ اس کی پیاری چیز (داڑھی) کی اصلاح کی ضرورت اسے پڑی۔

بیدل نے اسی وقت اس کا جواب لکھ کر اسے دیا

مختصر کن بہ تغافل ہوس جنگ و جدل مد سر رشتہ تحقیق دراز افتادہ است (۸۳۶)  
لڑائی و لگنے کی خواہش کو تغافل سے کام لیکر کم کرو، سر رشتہ تحقیق کا سرا بہت لمبا واقع ہوا ہے۔

عبدالرحیم نے اپنے شعر میں بیدل کی خطا یعنی ”ریش تراشی“ پر اعتراض کیا تھا لیکن در پردہ اصل محرک وہ مناظرے معلوم ہوتے ہیں جن سے بیدل کو اکثر اپنے معاصر شاعروں اور ادیبوں کی طرف سے سابقہ پڑتا تھا۔ چنانچہ اکبر آباد میں میر کامگار خاں کے اشارہ پر جو ادبی مناظرہ ہوا اور جس کی تفصیل پچھلے صفحات میں گذری اس حقیقت کو واضح گاف کرتا ہے۔ یہاں بیدل کے بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ اکبر آباد کے شاعروں کی ایک خاص تعداد اس سے جلتی تھی اور اسے تحارت کی نظر سے دیکھتی تھی۔ چنانچہ ازراہ تحقیر انہوں نے بیدل سے کہا:

”..... بیدل را از طور افکار آفتد بعد و بیگا گئی نیست کہ بوسیله ہمتی یا مصرعی، قرب آشنائی

تواند جستن یا بعرق جہہ فکری، گردانفعال نامناستی تواند شستن۔“ (۸۳۷)

یعنی بیدل کو اعلیٰ افکار و خیالات سے اتنی بیگانگی اور بے تعلقی نہیں ہے کہ ایک شعر یا مصرعہ کہہ کر ہم شاعروں کا تعارف اور تقرب حاصل کر سکے۔

ناظم خان فارغ:

تاریخ فرخ شاہی کا مصنف ناظم خان فارغ کو اس واقعہ کی بنا پر جس کا تذکرہ خوشگو نے کیا ہے بیدل کا حریف کہا جاسکتا ہے۔ فارغ نے ایک دن اپنے گھر پر ضیافت کا انتظام کیا۔ اس میں بیدل کو بھی دعوت دی، ضیافت سے فراغت کے بعد ناظم خاں نے بیدل سے مخاطب ہو کر طنزیہ انداز میں کہا۔ جناب والا کے درج ذیل شعر میں ایک نہایت ہی انوکھے روزمرہ کا استعمال ہوا ہے:

تو نگری کہ دم از فقری زند، غلط است بموی کا سہ چینی نمند نمی بافند

مرزا نے جواب دیا: خاں صاحب میں ایسا احمق نہیں ہوں کہ آپ کے طنز کو نہ سمجھ سکوں۔ خاں موصوف نے دوبارہ کہا واللہ جناب والا کا ایجاد کردہ یہ ایک انوکھا روزمرہ ہے، بیدل نے پوچھا: اچھا تو

قدیم شاعروں میں آپ کس کو مستند اور معتبر سمجھتے ہیں؟ اس نے کہا قدیم شاعروں میں چاہے جو ہو۔ بیدل نے اسی وقت قدیم شاعروں میں عسجدی، فرخی، معزی، مسعود سعد سلمان اور دوسرے شاعروں کے کلام سے سترہ معتبر سندیں ”مبد بافتن“ کی پیش کر دیں۔ ناظم خاں انتہائی حیرت زدہ ہو کر بولا: ”واللہ ہر کہ دراستادی این عزیز شک آرد، بی شک کافر باشد۔“ (۸۳۸)

خدا کی قسم جس آدمی کو اس عزیز کی استادی میں شبہ ہو وہ بلاشبہ کافر ہے۔

خوشگوار کا بیان ہے کہ اس مناظرہ میں شکست کھانے کے بعد وہ ساری زندگی بیدل کا ارادتمند رہا۔ بہر حال ایک ضیافت کا انتظام کرنا، بیدل کو اس میں دعوت دینا، شاعروں کی محفل میں اس کے ایک شعر کو پڑھنا اور اس پر اعتراض کرنا پھر بھری محفل میں بیدل سے بحث کرنا اس نیت کو واضح کرتا ہے جو اس کے دل میں چھپی تھی ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ خلوت میں یا خود بیدل کے گھر جا کر اس محاورہ کی بابت تبادلہ خیال کرتا۔ خوش قسمتی سے بیدل کو اس مناظرہ میں کامیابی ہوئی اور ناظم خاں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

\*\*\*

## غیر شاعر احباب

بیدل کے رقعات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے تعلقات ایسے لوگوں سے بھی تھے جو شاعر یا ادیب نہ تھے۔ ان سے تعلقات کی نوعیت محض سماجی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ بیدل کی خوش اخلاقی، انسان دوستی اور خلوص و محبت کی وجہ سے اس سے مخلصانہ روابط رکھتے تھے۔

مرزا ابوالوقار:

مرزا ابوالوقار کے نام بیدل کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیدل کے ان دوستوں اور عقیدتمندوں میں تھا جو اکثر اسے ہدیے اور تحائف بھیجا کرتا تھا۔ چنانچہ اس کے اخلاق کی شکر گزاری میں لکھتا ہے۔

از نعمت بیخواست کفران نتواں زد محتاج نیم لیک کریم است کریم  
”تحائف آثار اخلاق، از عالم بی شائبہ اطلاق، و رد و از شہا فرمود۔“ (۸۳۹)

بے مانگے ملنے والی نعمت کی ناشکری نہیں کی جاسکتی ہے۔ اگرچہ میں محتاج نہیں ہوں پر میرا کریم بہت ہی مہربان ہے۔ اخلاق حمیدہ کی نشانیوں پر مشتمل تحفوں نے اطلاق کے عالم بے شائبہ سے نوازشیں فرمائیں۔

میرزا محمد معین:

مرزا محمد معین بیدل کا ایک ایسا دوست تھا جو پتھری چاقو پر سان لگانے کا کام کرتا تھا۔ بیدل اپنے چاقو پر سان لگانے کے واسطے اس کے پاس بھیجا کرتا تھا اور وہ اس کام کو نہایت خوبی سے انجام دیتا تھا۔ بیدل اس کی تعریف میں لکھتا ہے:

”از ناز کیہای پرداز کار دچہ نویسد، کہ اگر بکل، تصور لطافتش بخاطر آرد محتاج زخم دوبارہ می  
تواند گردید۔ و از کیفیت اختراع غلاف چہ نگارد، کہ اگر معنی، شوخی، عریانی بخیاں  
اندیشد، خود را باین لباس تواند پوشید۔“ (۸۴۰)



چاقو تلے سان کی نزاکت کی بابت کیا تحریر کریں بس یہ سمجھئے کہ مقتول اگر اس کی لطافت کا تصور کرے تو دوبارہ مقتول ہونے کی تمنا کرے اور اس کے دستے کی کیفیت کی بابت کیا لکھیں کہ اگر معنی شوخی عریانی کا خیال کرے تو خود کو اس لباس سے زیب تن کر لے۔

ملا باقر گیلانی:

ملا کے لفظ سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی ان احباب میں تھا جو شاعریا ادیب تھے۔ اگرچہ اسے خارج از امکان نہیں قرار دیا سکتا لیکن اس کے نام ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اکثر بیدل کی صحبت میں حاضری دیا کرتا تھا۔ بیدل نے اسے طول اہل اور نا پائنداری عمر کی بابت دلنشین انداز میں کچھ نصیحت کی۔

”حصہ حدود طول اہل، در احاطہ ادراک عمل محال۔ حمل دوام عمر در دل آگاہ واسطہ گرد ملال الخ“ (۸۳۱)

”طول اہل“ کے حدود کو عمل کے احاطہ ادراک میں منحصر اور موقوف کرنا محال ہے اور ”دوام عمر“ کی خواہش کو دل آگاہ پر زبردستی تھوپنا گرد ملال کا ذریعہ ہے۔

شیخ غلام محی الدین:

شیخ غلام محی الدین بیدل کا ایک دوست تھا، بیدل سے ارادت کی بنیاد پر اکثر اسے آم بھیجا کرتا تھا۔ بیدل شکر یے میں لکھتا ہے:

”ارسال انبہ ہای منتخب، کہ ہر یک از لذتی سربستہ، نوید ذوقی تمام داشت، تلخکا مان زاویہ بیدلی را، تا زبان بجاشنیہای حصول شکر انپاشت۔“ (۸۳۲)

منتخب آموں کے ارسال نے، جس میں سے ہر ایک آم لذت سربستہ کی وجہ سے مکمل لطف کی نوید کا حامل تھا، گوشہ بیدل کے تلخ کاموں کو زباں تک شکر کی چاشنی سے بھر دیا۔

میرزا ابوالخیر:

مرزا ابوالخیر ان لوگوں میں تھا جن سے بیدل کے مخلصانہ روابط برقرار تھے۔ اس کے نام ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اکثر بیدل کی صحبت میں حاضر رہتا تھا ایک دفعہ جب کچھ مدت کے لئے بیدل کی صحبت سے غیر حاضر ہا تو بیدل نے مضطرب ہو کر اسے لکھا:

”شرح آشفگیہای طرہ احوال، بشانہ پردازی سعی قلم، کہ در زبان بیدل بیش مدار و محال..... حیف قدر شناسیہا، کہ آن شمع انجمن وفاق، کدورت غریب اوہام را، فالوس چراغ یگانگی

پسند، و خلاف عہد انصاف، بالتفات پروانہای بیدل نہ پیوند

سیر این گلشن غنیمت دان کہ فرصت بیش نیست در طلسم خندہ گل، بال و پر دارد بہار (۸۳۳)  
زلف احوال کی آشفگیوں کی شرح سعی قلم کی شانہ کشی سے جو بیدل کی زبان میں ایک سے زیادہ نہیں ہے۔ محال ہے افسوس ہے قدر شناسی کا کہ انجمن وفاق و دوستی کی وہ شمع اوہام کی انوکھی کدورت کو چراغ یگانگی کا فالوس ہونا پسند کرے؟ اور عہد انصاف کے خلاف بیدل کے پروانوں پر توجہ نہ کرے۔ اس باغ کی سیاحت کو غنیمت سمجھو کیونکہ فرصت کچھ زیادہ نہیں ہے خندہ گل کے طلسم میں بہار کے بال و پر چھپے بیٹھے ہیں کہ وہ کسی وقت بھی اڑ سکتے ہیں۔

میرزا فاضل بیگ ترک:

مرزا فاضل بیگ کے نام بیدل کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بیدل کے سماجی روابط برقرار تھے۔ بیدل نے اسے ایک مفرح حقہ بھیجا تھا۔

”حقہ مفرحی کہ چون سر سودائیان شوق، خالی از گرمی خیالی نیست، بذوق نغما قبول آن محفل آرای دماغ فطرت رسول بود۔“ (۸۳۴)

حقہ مفرح جو سودائیان شوق (مجنونوں) کے سر کی طرح خیالی گرمی و حرارت سے خالی نہیں ہے، اس محفل آرای دماغ فطرت کے نشہ قبول کی امید کے ساتھ روانہ خدمت ہے۔

مرزا فاضل بیگ ترک کے بعد پانچ اور رقعات بغیر عنوان کے پائے جاتے ہیں اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کون لوگ ہیں۔ منجملہ ان کے ایک خط ہے جو بہار کے کسی شخص کے نام لکھا گیا ہے۔ اس خط میں بیدل ان ایام کو جو بہار میں گزارے ہیں نہایت خوشی کے ساتھ یاد کرتا ہے۔

”نعیم عیش صوبہ بہار مبارکباد۔ قبلہ آرزوی بیدلان! ہر چند عبودیت قدیم تلخ حالتی از ادای خدمات سربرنمی آرد قوی از بستر آرایان حرکات نارساست۔ و حواس از گوشہ گیران انتظار کمین، در امور جرات سراپا منفعل نفس شماری ست۔ و در سعی طاقت آئینہ وار نگوناری۔ دریں اوقات صوابی بقبول عذر بیدلان ملاحظہ نہ نمایند۔ السنہ ہجرہ احوال بیدست و پایان تصور نہ فرمایند۔“

در پیریم آخر بتہ یار امید اعضا در ہم شکست چون سایہ بید  
از بسکہ نگاہ ہرزہ ناز بہا داشت مرغان یکسر چو جادہ گردید سپید (۸۳۵)

والسلام

ممکن ہے اس خط کے مکتوب الیہ خواجہ پیر محمد کے بیٹے ہوں جن کا مکان مہسی ضلع چپارن میں مرزا قلندر کے پڑوس میں تھا اور جن کے اخلاق حمیدہ سے بیدل بہت متاثر تھا۔

یہ فہرست ہے ان لوگوں کی جن کے بارے میں رقعات یا تذکروں میں کچھ تفصیلات موجود ہیں اور ایسے بہت سے لوگ ہیں جن کی طرف بیدل نے رقعات اور قطعات میں صرف اشارہ کیا ہے ان کے بابت کسی اور مآخذ میں کچھ نہیں ملتا۔ مجملہ ان کے ہیں مرزا عمر (۸۳۶)، مرزا حیدر (۸۳۷)، احمد بیگ (۸۳۸)، آتش خاں (۸۳۹) جو غالباً ایک امیر تھا جو ۱۰۹۶ھ میں شہزادہ کام بخش کے ساتھ ایک بڑی فوج اور پانچ سو سواروں کیساتھ گولکنڈہ روانہ ہوا۔ (۸۵۰)، صلاح خاں (۸۵۱) یا رقعات میں بیدل نے ان کا تذکرہ ضمنی طور پر کیا ہے لیکن ان کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے جیسے احمد خاں (۸۵۲) مرزا ملتانی (۸۵۳) فتو خاں (۸۵۴) شیخ غلام مصطفیٰ ناطق (۸۵۵) حکیم فیض علی و (۸۵۶) ظفر جنگ (۸۵۷) یہ بھی امرا میں تھا پورا نام خان جہاں ظفر کوکلتاش ہے۔ ۱۰۹۵ھ میں بہادر گڈھ کے قلعے کو فتح کرنے والوں میں تھا (۸۵۸)۔ بیدل نے دیوان میں ایک غزل اسی کے بابت کہی ہے۔

تو شمشیر حتی، ہر کس بغفلت با تو بستیزد ہماں در کاسہ سرخوں او را کردش ریزد  
تو خدائی تلو اسے، جو آدمی از را غفلت تجھ سے الجھے گا اس کا خون کاسہ سرخیں بہہ کر ہی رہے گا۔  
دعای بیدلاں از حق امید ایں اثر دارد کہ یارب آتش از بنیاد اعدای تو برنیزد  
خدا سے بیدل نے جو دعا کی ہے اس میں اس اثر کی امید پائی جاتی ہے کہ خدا یا تیرے دشمن کی بنیاد سے آگ بھڑکائے۔

بہر جا در رسد آوازہ کوں ظفر جنگت ہمہ گر شیر باشد زہرہ اش چوں آب می ریزد  
ظفر جنگ تیرے نقارہ کی آواز جہاں جہاں بھی پہنچتی ہے اگر وہ شیر کی طرح بہادر ہو تو بھی اس کا پتہ پانی ہو جاتا ہے۔

غبار موکت ہر جا نماید غارت آہنگی حسود از بی پرو بالی بدوش رنگ بگریزد  
تیری سواری کا غبار جہاں بھی غارت آہنگی کی نمائش کرتا ہے حاسدا اپنی بے پرو بالی کے سبب رنگ کے دوش پر سوار ہو کر فرار کر جاتا ہے۔

ببالد آفتاب اقتدار از چرخ اقبال بفرق دشمن جانت فلک خاک سیہ پزد (۸۵۹)

تیرے چرخ اقبال کی وجہ سے آفتاب اقتدار میں بالیدگی ہے، تیرے جاہ و مرتبے کے دشمن کی پیشانی پر آسمان سیاہ خاک اڑاتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور غزل میں اس کو مخاطب کیا ہے  
اے ”ظفر“ ہیفتہ ہمت نصرت فالت چمن فتح تبسم کدہ اقبال  
آیت فضل و سخا شان ترا آیینہ دار نص تحقیق وفا ترجمہ اقوال  
در مقامیکہ شکوہت فشرذ پای ثبات کوہ بازو کمر از سایہ استقلالت  
روح اعدا ہمہ گر ہمسر سیرغ شود نیست جز صعوہ شاہین قضا چنگالت  
سرگردون شکلمان دوحۃ نقش قدم تاج شاہان غیور آبلہ پامالت  
یارب از ملک اجابت بداعی بیدل کند اقبال ازل تا ابد استقبالت  
(دیوان بیدل مطبوعہ تہران ص ۱۷۹)

غلام حسن مجددی نے کچھ اور لوگوں کے بابت معلومات فراہم کیے ہیں لیکن ان کے مآخذ کا تذکرہ نہیں کیا ہے:

- ۱۔ سید جعفر رومی (وفات ۱۱۵۴ھ) شاہ عالم کی سلطنت کے عہد میں شاہجہاں آباد دہلی آیا اور بیدل سے ملاقات کی۔ (۸۶۰)
- ۲۔ عمدۃ الملک نواب امیر خان انجم (وفات ۱۱۵۹ھ) بیدل کے شاگردوں میں تھا (۸۶۱)۔
- ۳۔ مرزا مبارک اللہ ارادت خاں واضح (وفات ۱۱۲۸ھ) بیدل کا شاگرد تھا۔ آئندہ رام قلعہ نے اسے فرخ سیر کے عہد میں بیدل کے ساتھ دیکھا تھا۔ (۸۶۲) لیکن ڈاکٹر نور الحسن انصاری نے اس کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے اس امر کا تذکرہ نہیں کیا ہے بلکہ شیر خاں لودوی کے حسب تصریح اسے راسخ سرہندی کا شاگرد لکھا ہے (۸۶۳)۔
- ۴۔ میر محمد ہاشم جرأت موسوی خان امیر الامراء سید حسین علی خاں کی خدمت میں زندگی بسر کرتا تھا۔ ۱۱۳۱ھ میں اس کے ساتھ کُن سے دہلی آیا اور بیدل سے ملاقات کی۔ (۸۶۳)



خوشگو کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیدل کی چار شریک حیات تھیں لیکن یہ واضح نہیں ہوتا ہے کہ یہ سب بیک وقت اس کے تحت تھیں یا ایک کے مرنے یا طلاق دینے کے بعد دوسری عورت سے وہ شادی کرتا چلا گیا۔

چهار عنصر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بیدل نے اول ۱۰۸۰ھ ۱۶۶۹ء کے آس پاس تقریباً ۲۶ سال کی عمر میں شادی کی جیسا کہ پچھلے صفحات میں گذرا لیکن شب زفاف میں اس کو اندازہ ہوا کہ وہ قوت مردانگی سے عاری ہے یا شادی اس کی آزاد نشی میں رکاوٹ ہے۔ تو والد و تناسل کا خیال صفحہ ذہن سے نکال دینا چاہئے لیکن چونکہ اب شادی ہو چکی تھی اس لئے ازدواجی ذمہ داریوں کو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ لکھتا ہے:

”ہشیمہ عقدہ تزویج گوہر آرای رشتہ اتفاق می گردید، در عالم معاملہ، بمکاشفہ طبع متحیر رسیدہ کہ گل کردن آثار این کیفیت متقاضی مصلحتی است۔ خاطر از دوسوسہ انتظار و التماسل باید پرداخت..... بحکم انشاء دیوان عبودیت، جبین سجدہ نگین، غیر از اقبال نقش رضا سر خط دیگری نتوانست خواند۔“ (۸۶۸)

شادی کی گرہ جس رات رشتہ اتفاق میں گوہر آرا ہوئی (شادی ہوئی) عالم معاملہ یعنی شب زفاف میں (بیدل نے لفظ ”معاملہ“ کا استعمال ہمستری کے لئے کیا ہے۔ مثنوی عرفان کا ایک شعر ہے۔  
گاؤرش صاحب معاملہ شد چند روزی زرفہ حاملہ شد (۸۶۹)  
میں طبع حیرت پرست کو کشف سے معلوم ہوا کہ اس کیفیت (نامردی یا ازدواجی زندگی سے بے تعلقی) کے اثر کا نمودار ہونا کسی مصلحت کا متقاضی ہے لہذا تو والد و تناسل کے انتظار کا دوسوہ دل سے نکال دینا چاہئے۔ دیوان بندگی کے حسب حکم جبین سجدہ نگین نقش رضا کو قبول کرنے کے سوا کوئی اور تحریر نہیں پڑھ سکتی تھی۔

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیدل یا تو قوت رجولیت کھو چکا تھا جیسا کہ نبی ہادی صاحب کا خیال ہے یا عورت کو اپنی آزادی اور وارفتگی یا ادبی سرگرمیوں کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ محسوس کرتا تھا مگر اب جبکہ شادی ہو چکی تھی شیوہ تسلیم و رضا کے مطابق اس کو نبھانے کے سوا کوئی اور چارہ کار اس کے سامنے نہ تھا۔ مثنوی عرفان میں بیدل نے ازدواجی زندگی کی اہمیت جتاتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کی کامیابی بڑی حد تک شادی شدہ جوڑے کے تعلقات میں اعتدال اور میانہ روی پر موقوف ہے۔

عدل یک کن زن و مرد است ورنہ ہر یک بطبع خود فرد ست

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک اچھے اور ذمہ دار شوہر کی حیثیت سے اس نے اپنی شریک

## بیدل کے اعزہ

وارستہ مزاج، آزاد منش اور مست مولا بیدل اپنی ادبی تخلیقات میں اتنا مصروف و منہمک دکھائی دیتا ہے جیسے اس نے اپنی تمام توانائیاں اس میں لگادی ہوں۔ شیر خاں لودی نے اس کے انہیں رجحانات کے پیش نظر لکھا ہے۔

”در مدت العمر بجز تعلق جمال معنی کچھ تعلقی سرہمت فرد دنیا ورده۔ واز بدو شعور بجز لذت سخن، کچھ لذتی میل نکردہ۔“ (۸۶۵)

ساری زندگی جمال معنی کے سوا کسی چیز سے کوئی تعلق نہیں رکھا اور ابتدائے شعور سے لذت سخن کے سوا کسی اور لذت کی طرف مائل نہیں ہوا۔

بیدل خود بھی شکر اللہ خاں کے نام ایک خط میں احمد خاں کے بابت یہ پوچھے جانے پر کہ کیا وہ آپ کے عزیزوں میں ہے اور کیسا آدمی ہے لکھتا ہے:

”از مرآت معنی نمائنی نیست کہ دعا گو یک کیفیت اعمال اعزہ کتر وارسیدہ است۔“ (۸۶۶)

(نواب صاحب) کے مرآت معنی نما سے یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ بیدل عزیز و اقارب کی سرگرمیوں پر بہت کم دھیان دیتا ہے۔

شاید اسی وجہ سے اس کے عزیز و اقارب کے بابت کچھ زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ مرزا ظریف اور مرزا قلندر کے علاوہ جو بالترتیب اس کے ماموں اور چچا تھے وہ مرزا روح اللہ اور مرزا عباد اللہ کا نام لیتا ہے جو اس کے ماموں زاد بھائی تھے اور وہ بھی اس انداز سے کہ گویا ان کے ادبی اور معنوی پہلو کو پیش نظر رکھا ہو۔

## بیدل کی شریک حیات:

بیدل کی شریک حیات کے بابت خوشگو کا بیان ہے:

”چہارم حرم در حرم داشت و اینجا اتفاق خوردن زربخ کشتہ اش افتاد۔“ (۸۶۷)

چوتھی شریک حیات ان کے حرم میں تھی اور اس وقت ان کو ہر تال کشتہ کھانے کے ضرورت پڑ گئی۔

حیات کے ساتھ زندگی گزاری ہے اور اس کے جذبات و رجحانات کا پاس و لحاظ رکھا ہے۔

اس کے بعد وہ اپنی شریک حیات کے بابت کچھ نہیں لکھتا ہے یہاں تک کہ ۱۰۹۶ھ/۱۶۸۴ء میں متھر اور اس کے آس پاس میں بدامنی پھیل جانے کے سبب وہ وہاں سے دہلی کے لئے روانہ ہوتا ہے اور اس سفر میں جو لوگ اس کے ساتھ تھے ان کے لئے ”بی دست و پای چند“ کی ترکیب استعمال کی ہے اور دو صفحہ کے بعد اپنے رفقاء سفر کی اس طرح وضاحت کی ہے۔

”فقیر بادو خادم کہ یکی را امتداد بیماری، بناز مخدومی پروردہ بود و دیگری را عذر ناتوانی، از

سلسلہ تکلیف خدمت آزاد کردہ فتح عزیمت جائز نداشت۔“ (۸۷۰)

یعنی خاکسار نے دو خادموں کے ساتھ جس میں سے ایک کی طویل علالت نے نامزدی سے اس کی پرورش کرنی شروع کر دی تھی (اس کو خادم سے مخدوم بنادیا تھا) اور دوسرے کو اس کی ناتوانی کے عذر نے خدمت کی ذمہ داریوں سے آزاد کر دیا تھا، ارادہ سفر کو ملتوی کرنا مناسب نہ سمجھا۔

اس تصریح کے باوجود ڈاکٹر عبدالغنی کا خیال ہے کہ اس سفر میں بیدل کے ہمراہ اس کی شریک حیات بھی تھی، موصوف نے شاید ”بی دست و پای چند“ کی ترکیب سے جس کو بیدل نے چہار عنصر میں استعمال کیا ہے (۸۷۱) اور ”با پا شکستہ چند کہ بارگردن زندگی اندرخت سلامت برون کشید“ کے جملہ سے جس کو رقصات میں استعمال کیا ہے (۸۷۲) یہ استنباط کیا ہو کہ بیدل کے ساتھ اس کی شریک حیات بھی تھی۔ اگرچہ اس احتمال کو رد نہیں کیا جاسکتا لیکن ڈاکٹر عبدالغنی کے دعوے کو اگر ہم درست مان لیں تو بھی واضح نہیں ہوتا کہ یہ اس کی دوسری اور تیسری بیویاں تھیں یا وہی پہلی، خوشگو کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۰۹۶ھ میں دہلی پہنچ کر جب بیدل کو گھر اور معاش کی طرف سے یک گونہ اطمینان حاصل ہوا تو اسے گھر بسانے کی فکر ہوئی۔ چوتھی بار اس نے شادی کی لیکن اس وقت چونکہ قوت مردانگی کمزور ہو چکی تھی اس لئے اسے ہر تال کشتہ کھانے کی ضرورت پڑی۔

”نامہ لکھنؤ و چہارم حرم در حرم داشت و اینجا اتفاق خوردن زربخ کشتہ اش افتاد۔“ (۸۷۳)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دہلی میں مستقل قیام کے دوران بیدل کے گھر اس کی شریک حیات رہی ہے کیونکہ اس نے متعدد خطوط میں دوستوں کو لکھا ہے کہ ۱۱۲۱ھ میں اس کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام ”عبدالخالق“ رکھا ہے جیسا کہ اگلے صفحات میں پڑھیں گے لیکن ایک سوال سنجیدہ قارئین کے ذہن میں ابھرتا ہے اور بظاہر سنجیدہ نظر آتا ہے کہ بیدل نے اپنی نامردی کے ظہور یا آزادی میں رکاوٹ کے خوف سے پہلی بیوی کو بادل ناخواستہ قبول کیا تو کیونکر ممکن ہے کہ اس نے یکے بعد دیگرے چار چار شادیاں کی ہوں؟

اس لئے راقم السطور کا خیال ہے کہ بیدل کی یہ وہی پہلی بیوی ہوگی اور چونکہ قوت مردانگی سے عاری تھا اور اس کا دل ایک وارث کے لئے فطری طور پر مضطرب تھا اس لئے ایک طرف خدا سے دعا کرتا تھا دوسری جانب اپنے بعض احباب کے حسب مشورہ اس نے کشتہ کا استعمال کیا ہوگا اور آخر اس میں کامیاب ہوا۔ اس خیال کی تائید بیدل کی اس تحریر سے بھی ہوتی جو اس نے اپنے لڑکے کی ولادت کی مناسبت سے شاکر خاں کے نام ایک خط میں لکھا ہے، لکھتا ہے:

”عمر ہا، اندیشہ نیاز پیشہ، نقاشی کارگاہ دعا داشت۔ و بحکم قصور استعداد، چون کلک

تصویر، جز از رنگ افعال سری نمی افراشت۔ اعانت استاد قدم، نقش تازہ ای، بعرصہ ارشاد

آورد۔“ (۸۷۴)

ایک طویل مدت تک اندیشہ نیاز پیشہ کارگاہ دعا کی نقاشی میں مصروف رہا (اولاد کے لئے دعائیں کرتا رہا) لیکن استعداد میں خامی کے سبب کلک تصویر کی طرح افعال و شرمندگی کے سوا کسی اور چیز کا رنگ اس میں نہیں بھرتا تھا (قوت مردانگی کی کمی اور کوتاہی کے سبب سوائے ندامت کے کچھ ہاتھ نہیں لگتا تھا) استاد قدم (خدائے تعالیٰ) کے فضل و کرم نے ایک تازہ نقش عرصہ ارشاد میں ابھارا (خدائے محض اپنی مہربانی سے ایک لڑکا عطا فرمایا)۔

بیدل کا لڑکا عبدالخالق:

بیدل کے لڑکے کی بابت خوشگو لکھتا ہے:

”در عمر شصت و پنج سالگی، فرزندی قدم بہ بیت الشرف او گذاشت۔ ازین عنایت

غیر مترقبہ شادیہا کرد و صدقہ ہاداد۔“ (۸۷۵)

چھٹیسٹھ سال کی عمر میں بیدل کے گھر ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اس غیر مترقبہ عنایت پر اس نے خوشیاں منائیں اور صدقہ خیرات دیئے۔

بیدل نے اپنے دو خطوط میں اپنے لڑکے کا تذکرہ کیا ہے۔ شاکر خاں کے نام ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱۲۱ھ/۱۷۰۹ء میں اس کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا اور اس کا نام عبدالخالق رکھا جوا اتفاق سے بیدل کے باپ کا بھی نام تھا۔ پہلے اس نے شکر اللہ خاں کے ایک بیٹے عاقل خاں کو اس کی اطلاع کی۔ موصوف نے اس کے لئے نثر و نظم میں کئی تاریخیں نکالیں اور بیدل کو روانہ کیں۔ منجملہ ان کے ہے ”آئینہ فیض قدس“ اور ”سرخوش شراب ازلی“۔ ان میں سے ہر ایک سے ۱۱۲۱ھ/۱۷۰۹ء لکھتا ہے۔ عاقل خاں کے علاوہ دیگر احباب نے بھی اس موقع پر تاریخیں نکال کر بھیجی تھیں، لیکن عاقل خاں کی

تاریخیں بیدل کو زیادہ پسند آئیں۔ اس کے بعد شا کر خاں کو اطلاع دی کہ ایک مدت تک لڑکے کے لئے دعا کرتا رہا لیکن استعداد کی خامی کی وجہ سے ندامت محرومی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں لگا۔ آخر بڑھاپے میں وہ دعا قبول ہوئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فقیروں کو بھی اپنی اس غیر مترقبہ نعمت سے محروم نہیں فرماتا ہے۔

”عمر ہا، اندیشہ نیاز پیشہ، نقاشی کا رگاہ دعا داشت..... در ظہور این نتیجہ عمر، از افکار مشتاقان ہیریا، تاریخچہای بی تعداد، براتب تحریر پیوست۔ خاصہ از عالم اکرام عاقلخان صاحب، چہ بہ نظم و نثر، کہ بکری شفقت نہ نشست“ آئینہ فیض قدس“ از آنجملہ خبراست و ”سرخوش شراب ازلی“ از ان اشارات مشعر۔ از بیجا معلوم می شود کہ فقر اراہم بی بہرہ نصیب اقبال نمی گذارد یعنی بیکسان رانیز قابل درجات بری آرند۔“ (۸۷۶)

ایک مدت تک اندیشہ نیاز پیشہ کا رگاہ دعا کی نقاشی میں مصروف رہا..... اس نتیجہ عمر کے ظہور کی مناسبت سے مختص احباب کی طرف سے بے شمار تاریخیں رشہ تحریر میں آئیں خصوصاً جناب عاقل خاں صاحب کی عنایتوں سے بہت سی تاریخیں کیا نظم میں اور کیا نثر میں کرسی شفقت پر جلوہ افروز ہوئیں منجملہ انکے ”آئینہ فیض قدس“ اور ”سرخوش شراب ازلی“ کی تاریخیں اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ فقیروں کو بھی خدا بے نصیب اور محروم نہیں فرماتا یعنی بے کسوں کو بھی کسی درجے میں قابل بناتا ہے۔

شکر اللہ خاں کے نام ایک خط میں اس نعمت پر جو بڑھاپے میں اسے ملی حیرت کا اظہار کرتا ہوا لکھتا ہے:

”..... خامہ صنع رقم قدرتی بمطالعہ تامل رسانید۔ و سطرندرتی قرین طومار حیرت گردانید۔ در معنی مضمون تازہ ایست از در سگاہ دعاسبقان آنجناب۔ و عبارت جدیدی از افکار سپاس آہنگان بارگاہ تعظیم امتساب۔ جبین اکسار بر خط تسلیمی گذارد۔ و آداب سجدات مبارکباد بجای آرڈ۔“ (۸۷۷)

خامہ ایزدی نے قدرت کی ایک تحریر بہ غور مطالعہ کرنے کے لئے دی ہے اور ایک نادر سطر طومار حیرت سے ہما آہنگ کیا ہے معنوی طور پر جناب والا کی در سگاہ دعا کا ایک تازہ مضمون ہے اور بارگاہ پر عظمت کے سپاس آہنگوں کے افکار و خیالات کی جدید عبارت ہے۔ جبیں فروقی خط تسلیم پر بیٹتا ہے اور سجدہ مبارکباد کے آداب بجالاتا ہے۔

قطعات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خود بیدل نے بھی اس مناسبت سے ایک قطعہ کہا ہے:

عبد الخالق بعالم کسب ادب در لیل زغائب آمد از قدرت رب اقبال ازل شامل این تاریخ است آذینہ اول شب شہر رجب ۱۱۲۰، (۸۷۸) اس قطعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عبد الخالق ساتویں رجب المرجب ۱۱۲۰ھ روز جمعہ بہ وقت شب پیدا ہوا جبکہ عاقل خاں کی تاریخوں سے ۱۱۲۱ھ نکلتا ہے اور خوشگو کا بیان ہے کہ ۱۱۱۹ھ میں پیدا ہوا۔ ایسی صورت میں بہتر یہ ہے کہ ہم خود بیدل کے بیان پر اعتماد کریں جس نے تاریخ کے ساتھ دن، وقت اور مہینہ سب کی تعیین کر دی ہے۔

بہر حال اس مناسبت سے بیدل نے بہ قول خوشگو خوشی کے جشن منائے اور صدقے خیرات کئے چنانچہ لکھتا ہے:

”ازیں عنایت غیر مترقبہ شاد یہا کرد و صدقہا داد۔“

لیکن افسوس کہ عبد الخالق کو دنیا میں قدم رکھے ابھی کچھ زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ باپ کو داغ مفارقت دے گیا۔ خوشگو کا بیان ہے کہ وفات کے وقت عبد الخالق اپنی عمر کی چوتھی منزل میں تھا (۸۷۹) بیدل نے بھی اس مناسبت سے ایک قطعہ کہا ہے:

عبد الخالق آہ بدیر فانی دیر آمد وزود کرد بال افشانی زین مصرع تاریخ وداعش دریاب صبح نہم از ماہ ربیع الثانی“ (۸۸۰)

افسوس کہ عبد الخالق اس دنیائے فانی میں دیر سے آیا اور جلد یہاں سے رخصت ہو گیا مصرع ”صبح نہم از ماہ ربیع الثانی“ سے اس کی وفات کی تاریخ معلوم کرو۔

اس قطعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عبد الخالق نے نور ربیع الثانی ۱۱۲۳ھ کو بہ وقت صبح دار فانی سے کوچ کیا۔ اس طرح اس کی کل عمر لگ بھگ تین سال نو مہینے تین دن کی ہوتی ہے۔

بیدل نے بہ قول خوشگو، اس سانحہ کو بڑے صبر و ضبط کے ساتھ برداشت کیا، اس کی تجہیز و تکفین سے وابستہ سارے امور انجام دیئے اور دروازے تک اس کی مشایعت کی۔ جو لوگ پڑ سے میں آکر گریہ و زاری کر رہے تھے بیدل نے ان سے کہا یا راں! جای تعجب است کہ فرزند من مردہ و گریہ بہ شامی آید۔ (۸۸۱)

دوستو! حیرت کا مقام ہے کہ لڑکا میرا رخصت ہوا اور گریہ و زاری آپ پر طاری ہے۔ پھر ایک محسوس کے ذریعہ اس نے اپنے اندرونی حزن و غم کا اظہار نہایت دردناک انداز سے کیا ہے جس کے دو بند درج ذیل ہیں:



بہیات چھ برق پر نشان رفت  
کاشوب قیاسم بجان رفت  
گر تابی بود ورتوان رفت  
طغلم زین کہنہ خاکدان رفت  
بازی بازی بر آسمان رفت  
ہر کہ دو قدم خرام می کاشت  
از آکشم عصا بکف داشت  
یارب چہ علم بوحشت افزاشت  
دست از دستم چگونہ برداشت  
بی من راہ عدم چنان رفت (۸۸۲)

مرزا روح اللہ و مرزا عباد اللہ:

ان دونوں بھائیوں کا تذکرہ بیدل کے احباب کے ضمن میں ہو چکا ہے۔ خوشگو کے مطابق مرزا عباد اللہ بیدل کے ماموں زاد بھائی تھے یعنی مرزا ظریف کے لڑکے تھے۔ بیدل نے ایک خط میں روح اللہ اور عباد اللہ دونوں کے لئے ”اخوان پناہ“ کی تعبیر استعمال کی ہے (۸۸۳)۔ اخوان جمع اخ (بھائی) کی ہے اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ دونوں بھائی مرزا ظریف کے لڑکے تھے۔ یہ لوگ کہاں تھے اور کیا کرتے تھے بیدل کے بیان سے واضح نہیں ہوتا لیکن ماموں سے غیر معمولی تعلق کی بنا پر اپنے ماموں زاد بھائیوں سے بھی وہ بڑی محبت کرتے تھے جیسا کہ ترکیب ”اخوان پناہ“ سے مترشح ہوتا ہے۔

مرزا محمد سعید:

خوشگو کے مطابق مرزا محمد سعید مرزا عباد اللہ کا بیٹا تھا۔ جو بیدل کے انتقال کے بعد بیدل کے مرزا کا سجادہ نشین تھا اور عرس بیدل سے متعلق تمام امور کا انتظام کرتا تھا (۸۸۴)۔ درگاہ قلی خاں محمد سعید کے بابت لکھتا ہے:

”محمد سعید برادر زادہ اش، کہ چون معنی بیگانہ، از نسبت معنوی میرزا بیگانہ است، بتواضع حاضران مجلس و ترتیب شمع و چراغ، دماغ خود را می سوزد۔“ (۸۸۵)

بیدل کا بھتیجا محمد سعید، جو معنی بیگانہ کی طرح مرزا بیدل سے کوئی معنوی نسبت نہیں رکھتا ہے، حاضرین محفل کی خاطر تواضع اور شمع و چراغ کے جلانے کے اہتمام میں دماغ سوزی کیا کرتا ہے۔

حکیم محمد حفیظ خاں و حکیم مرزا فضل اللہ:

حکیم محمد حفیظ خاں، قدرت اللہ شوق کے مطابق مرزا عباد اللہ کے پسماندوں میں تھا اور

حکیم مرزا فضل اللہ پانی پتی محمد حفیظ خاں کا داماد اور اردو زبان کا شاعر ہے لکھتا ہے:

”حکیم فضل اللہ پانی پتی المعروف بہ میرزا نیناوی جو نیست ظریف الطبع..... نسبت خویشی بہ حکیم محمد حفیظ خان سلمہ الرحمن، کہ از احفاد امجاد برادر بزرگ سخن ساز حق مشتغل میرزا عبد القادر بیدل، کہ میرزا عباد اللہ نام داشت ہستند، دارد۔ و بہر دوزبان سخن از زہانش می تراود۔“ (۸۸۶)

حکیم فضل اللہ پانی پتی عرف مرزا نیناوی ایک ظریف الطبع جوان ہیں۔ حکیم محمد حفیظ خاں سلمہ سے دامادی کا رشتہ رکھتے ہیں۔ حفیظ خاں خدا سے تعلق رکھنے والے شاعر مرزا عبدالقادر بیدل کے بڑے بھائی مرزا عباد اللہ کے پوتوں میں ہیں حکیم فضل اللہ دونوں زبان میں شاعری کرتے ہیں۔

احمد خان:

شکر اللہ خاں کے نام بیدل کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ احمد خاں نام کا کوئی عزیز بیدل کا تھا۔ نواب موصوف نے اس کے حالات بیدل سے دریافت کئے تھے۔ بیدل نے جواب میں لکھا:

”از مرآت معنی نمائنی نیست کہ دعا گو یک کیفیت اعمال اعزہ کمتر وار سیدہ است۔ امامی داند کہ این عزیز را در آل حدود بدیانت و امانت می ستودند۔“ (۸۸۷)

آئینہ معنی سے یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ دعا گو (بیدل) عزیز واقارب کے اعمال و احوال کی کھود کرید بہت کم کیا کرتا ہے البتہ اتنا معلوم ہے کہ اس عزیز کو اس علاقے میں دیانت و امانت کی صفات سے متصف اور آراستہ مانتے ہیں۔





اپنے شیوہ فقر و آزادی کی توجیہ کر کے اس خدمت سے معذرت کا اظہار اس طرح کیا ہے:

”در مدت اختیار فقر، خاکساری این غبار موہوم، ہائے سنگی در ساختہ، کہ ہر گاہ بر پستی اقتدار خود

نظر اندازد، بی اختیار یہی اوضاع زمانہ را غنیمت بشمارد..... متوقع این توجہ است کہ ہر گاہ

تقریبی ظہور پیوند، در استغناء جرایم زمین گیری، ہمیں قدر معروض دارند۔“ (۸۹۱)

”شیوہ فقر“ اختیار کرنے کی اس مدت میں اس غبار موہوم (بیدل) کی خاکساری کو شکست کا

نہیں دیکھنا پڑا۔ جب کبھی اپنے اقتدار کی پستی پر نظر ڈالی وضع زمانہ کی بے اختیار کو غنیمت سمجھا

..... امید ہے کہ (شہزادے سے) آپ کے ملاقات کی اگر کوئی سبیل نکلتی ہے تو جرم زمین گیری کے

استغناء میں اتنی معذرت ضرور پیش کر دیں۔

۲۔ اکبر آباد کے قیام کے دوران بیدل کو ایک دفعہ شدید گرگی سے سابقہ پڑا، ظاہری وضع قطع ایسی

نہ تھی کہ اس کو کوئی بھکاری تصور کرتا اس لئے بھوک کی ساری کلفتوں کو برداشت کرتا پر کسی کے

سامنے دست سوال دراز کرنا ہمت فقر کے خلاف تصور کرتا۔ اس واقعہ کے آخر میں لکھتا ہے:

”کامروای منعم حقیقی، بی نیازی بر طبعیت گماشتہ بود، کہ خود را در بیج صورتی، آئینہ دار احتیاج نمی

دیدم۔ و غناء تعلیمی معلم اسرار، سرخوشی در مزاجم اپناشتہ کہ از هیچ المی غیر از نوای خرسندی نمی

شنیدم۔“ (۸۹۲)

کامروائے منعم حقیقی (خدا) نے میری طبیعت میں ایسی بے نیازی بھر دی تھی کہ کسی بھی شکل

میں خود کو احتیاج کا آئینہ دار نہیں سمجھتا تھا اور معلم اسرار نے غنا کی تعلیم دے کر ایسی سرخوشی میرے مزاج

میں بھر دی تھی کہ کسی بھی دکھ سے سکھ کی آواز کے سوا کوئی اور آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔

۳۔ جب شا کر خاں دکن میں کسی منصب پر فائز تھا تو اورنگ زیب سے اس نے اس کے لئے

جاگیر حاصل کر کے بیدل کو اطلاع دی، بیدل نے اسے نامنظور کر دیا جیسا کہ شا کر خاں کے

تذکرے میں ہم نے پڑھا۔

۴۔ نظام الملک نے اس کو دکن آنے کی دعوت دی اسے بھی اس نے نامنظور کر دیا جیسا کہ اس کے

حالات کے ضمن میں گذرا۔

۵۔ بیدل سے بہادر شاہ نے شاہنامہ لکھنے کی فرمائش کی لیکن اس نے اسے قبول نہیں کیا۔

۶۔ فرخ سیر نے اسے اپنے دربار میں بلایا۔ وہاں جانے سے بھی انکار کر دیا۔ اسی قسم کے اور

واقعات ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ اس نے نہایت استغناء اور بے نیازی سے زندگی

گذاردی۔ خود کہتا ہے:

## اخلاق بیدل

بیدل کے معاشرہ کے مختلف طبقے سے روابط اور بیدل سے ان لوگوں کی ارادت اور خلوص اس

نکتے کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ بہت سے اوصاف پسندیدہ اور اخلاق حمیدہ کا مالک تھا جو لوگوں کو پروانے

کی طرح اس کے گرد طواف کرنے پر مجبور کرتے تھے۔ ذیل میں ہم اس کی ان خصوصیات کا جائزہ

لیتے ہیں۔

### فقر و استغناء:

”نوابوں اور امراء“ کے زیر عنوان پچھلے صفحات میں ازاد بلگرامی کا یہ قول نقل کیا گیا ہے:

”چون میرزا خود را از در اغنیاء کشید حق تعالی امراء عصر را بر آستان او فرستاد۔“ (۸۸۸)

بیدل نے چونکہ اغنیاء اور مالداروں کے آستانے سے خود کو الگ تھلگ رکھا اس لئے اللہ تعالیٰ

نے ان کے معاصر امراء کو خود ان کے دروازے پر پہنچا دیا۔ سرخوش لکھتا ہے:

”در فقر تو کل بادشاہ وقت خود است۔“ (۸۸۹)

فقر تو کل میں اپنے عہد کا بادشاہ رہا ہے۔

خان آرزو لکھتا ہے:

”از در تو کل پابرون نہ ہادہ۔“ (۸۹۰)

تو کل کے آستانے سے اس نے قدم بھی باہر نہیں رکھا۔

بیدل کی سوانح حیات کو اگر مد نظر رکھئے تو یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ اس نے واقعی در تو کل سے

قدم باہر نہیں رکھا۔ بعض واقعات البتہ ایسے نظر آتے ہیں جو اس دعویٰ کی تکذیب کرتے ہیں جیسا کہ اس

کے قصائد پر بحث کے دوران ہم آگے چل کر پڑھیں گے لیکن اگر فیصلے کا مدار زندگی کے بیشتر واقعات پر

ہو تو ماننا پڑے گا کہ بیدل نے بہت سے مواقع پر اپنی ان خصوصیات کا مظاہرہ کیا ہے۔

۱۔ اعظم شاہ کی ملازمت سے استعفا دینے کے بعد جب شہزادے کی طرف سے بار بار اصرار ہوا

کہ ملازمین کے زمرے میں شامل ہو جائے تو بیدل نے قابل خاں منشی کے نام ایک خط میں

زیر دست انتہا چتر شاہی میستم  
ساز من آزادی، آہنگ میں آوارگی  
آزادی میری ساز ہے آوارگی میری آہنگ ہے، میرے قانون (بابے) کو تار کے تعلق سے  
باندھا نہیں جاسکتا۔

قناعت و استغنا پر اس کے دوسرے اشعار ملاحظہ ہوں:

قناعت کو کہ فرش دل کند آئینہ کردارم  
تا قناعت رشتہ دار گوہر جمعیت است  
با قناعت ساز، گر حسرت پرست راجتی  
خواہ ای مفلسی ذلت کش تسلیم دو نامم  
کافر مگر تحمل و سنجاب می باید مرا  
دست از دنیا بدار و دامن آہی بگیر  
پادشاہی در طلسم سیر چشمی بستہ اند  
اس کے باوجود ایک جگہ کہتا ہے:

طبع آن نیست کز افلاس شکایت کند

تواضع و انکساری:

تواضع و کسر نفسی اور انکساری و خاکساری در حقیقت ایک غیر متند اور خوددار طبیعت کی خصوصیت  
ہے۔ روحانی مرشدوں کی تعلیم و تربیت کے نتیجے میں اس میں مزید جلا پیدا ہو جاتی ہے۔ بیدل کی  
بے نیازی خاکساری کے ساتھ ہم آہنگ تھی۔  
از تواضع نگذری گر آرزوی عزتست  
تواضع کی روش کو نہ چھوڑنا اگر عزت مطلوب ہے۔ بیدل تیری یہ روش ہر آدمی کی نگاہ میں تیری  
عزت کی ضامن ہے۔

بیدل بخاکساری خود ناز می کند  
دیدہ تا دل فرش راہ خاکساری کردہ ام  
ای در غبار دل ز خیالت دینیہ ہا  
از نفس تا موج مرگاں بوریا افتادہ است  
اس نے اپنے خطوط میں کبھی ایسا انداز بیان اختیار نہیں کیا جس سے کبر و نخوت اور عجب و خود  
پسندی کی بو آتی ہو۔ چنانچہ اپنے معاصر عظیم شاعر ناصر علی کے برخلاف نہایت فروتنی اور انکساری کا انداز

اختیار کرتے ہوئے نواب شکر اللہ خاں کو ایک خط میں لکھتا ہے:  
بیدل ہر چند شور نظم پیش است گروارسم اندیشہ خجالت کیش است  
درسلک سخوران گہرہای مرا چون ژالہ ہماں آب شدن در پیش است (۸۹۳)  
بیدل! اگرچہ میری شاعری کا بڑا چچا ہے پر غور سے اپنے کلام کو دیکھتا ہوں تو میری قوت فکریہ  
شرمندہ ہو جاتی ہے۔ شاعروں کی صف میں میرے کلام کو ہر نظام کی وہی حیثیت ہے جو ازلے کی ہے کہ  
بارے شرم کے پانی پانی ہوا جا رہا ہے۔

اور شاعری میں تمام تر شہرت، لیاقت اور صلاحیت کے باوجود کہتا ہے:

”عنان وضع بیدلی بادعوی شاعری نسبی ندارد۔“ (۸۹۳)

وضع بیدل کو دعوی شاعری سے کوئی نسبت نہیں ہے۔

دوسری جگہ لکھتا ہے:

آنجا کہ تکبر منشاں ناز فروشد  
جہاں مغرور لوگ ناز فروشی کرتے ہیں ہمارا شیوہ شکست و خاکساری کا ہے جو ہماری ٹوپی کو  
لیپ دیتا ہے۔

ما بیچ کساں بیہدہ مغرور کمالیم  
ہم ناچیز لوگ بلا وجہ اپنے کمال پر مغرور ہیں۔ ذرہ اگر آسمان پر پہنچ جائے تو کس شمار میں ہے۔  
جبکہ ناصر علی اسی شکر اللہ خاں کو اس انداز سے لکھتا ہے:

”مرا از وکالت خود برداردند و بہ حضرت کبریای خود تسلیم نمودند، سخن نام دولت دادند مضمون  
از زوال۔“ (۸۹۶)

مجھ کو اپنی وکالت سے نکال کر حضرت کبریا جل و علی کے حوالے کیا جس نے ”سخن“ نام کی وہ  
دولت مجھے عطا کی جو زوال سے محفوظ ہے۔

حسن خلق:

خوشگو لکھتا ہے:

”بسیار آرمیدہ و بہ حسن خلق گذاشتہ است۔“ (۸۹۷)

بہت ہی پروقار اور حسن اخلاق سے آراستہ ہیں۔

پیچر بلگرامی لکھتا ہے:

”فقیر اتفاق دید و دید ایشان افتاد۔ حقا کہ در کمال خلق و مزہ و درود شوق یافتم۔“ (۸۹۸)

فقیر (بنجر گوان) سے بارہ ملاقات کا اتفاق ہوا چکی بات یہ ہے کہ انہیں انتہائی خلیق، خوش گفتار اور صاحب درد و اہل شوق پایا۔

شیر خاں لودی لکھتا ہے:

”فرشتہ خوی صاحب دل میرزا عبدالقادر بیدل۔“ (۸۹۹)

فرشتہ خوی صاحب دل میرزا عبدالقادر بیدل۔

محمد شفیع واردطہرانی لکھتا ہے:

”میرزا بہ پیرایہ اہلیت آراستہ وزیر صاحب کمالی پیراستہ بود۔“ (۹۰۰)

مرزا بیدل میں بڑی اہلیت و لیاقت تھی اور وہ کمالات کے زیور سے آراستہ تھا۔

لیکن حسن اخلاق کیا ہے؟ اس کا مفہوم اور مصداق مختلف لوگوں کے نقطہ نظر سے مختلف ہے۔

راقم السطور کے نزدیک حسن اخلاق کا مطلب حسن گفتار اور حسن کردار کی خصوصیات سے آراستہ ہونا ہے۔ زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہ اگر کوئی نرم لب و لہجہ میں، محبت بھرے انداز میں اور خندہ پیشانی کے ساتھ مسکراتے ہوئے گفتگو کرتا ہے، سخی، تند خوئی اور ترش روئی سے گریز کرتا ہے تو کہہ سکتے ہیں کہ وہ حسن اخلاق سے آراستہ ہے اگرچہ وہ ایک گلاس پانی یا ایک پیالی چائے سے ہماری خاطر تواضع نہیں کرتا ہے۔ خوش قسمتی سے بیدل کو ہم ان اوصاف سے آراستہ پاتے ہیں تذکرہ نگاروں کی ان شہادتوں کے علاوہ بیدل کے مکتوب الہیم میں محمد امین عرفان بیدل کے انداز گفتگو اور اس سے غیر معمولی تاثر کا تذکرہ اس طرح کرتا ہے:

”طبیعت خو کرده حضور تربیت گنجور، دمدم ساغر لبریز شوق می پیاید۔ و بیتا باندہ آرزوی مکالمہ

زبانی، کہ عبارت از صحبت سراپا الفت و حشت نسیان است، می نماید۔“ (۹۰۱)

حضور تربیت گنجور (آپ کی صحبت) کی عادی طبیعت رہ رہ کر ساغر شوق کو گردش میں لاتی ہے۔

بڑی بیقراری سے زبانی گفتگو کی جو صحبت سراپا الفت اور حشت نسیان ہے آرزو کرتی ہے۔

افسوس کہ دوسرے مکتوب الہیم کے خطوط دستیاب نہ ہو سکے ورنہ وہ اس پہلو کی صحیح تشریح و توضیح

میں معاون ہوتے پھر بھی خوشگوار اس کی تھوڑی وضاحت کرتا ہوا لکھتا ہے:

”ہنگام تکلم سخن بسیار آہستہ آہستہ و جدا جدا می فرمود، گویا گہر باری می کند، یا گلفشانی می نماید۔

و آہستگی کلامش بحدیکہ صف نشینان موخر می شنیدند۔ اکثر کلام بی قیدانہ بر زبان می

آوردی۔ اما شعر را با صلابت و مہانتی خواندی کہ گوش مستمعان باز شدی و از بیرون دروازه

در کوچہ معلوم شدی کہ آنحضرت شعری خوانند۔“ (۹۰۲)

بیدل نہایت دھیمی آواز میں اور واضح تلفظ کے ساتھ بات کرتے تھے لگتا تھا گہر باری یا گل فشانی کر رہے ہوں، گفتگو کا انداز اتنا ہی دھیمہ تھا کہ آخری صف میں بیٹھنے والوں کو کم سنائی دیتا تھا۔ ان کی گفتگو کا دائرہ وسیع ہوتا اس میں کسی موضوع کی قید نہیں ہوتی۔ لیکن شعر کو ایسی صلابت و مہانتی اور گرجدار آواز میں پڑھتے تھے کہ سامعین کے کان کھل جاتے اور باہر گلی میں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آنحضرت (بیدل) شعر پڑھ رہے ہیں۔ خود بیدل نے اپنی گفتگو کی خصوصیت کا تذکرہ اس طرح کیا ہے۔

مہر خاموشیت چوں آئینہ سر تا پای من  
گر بعرض گفتگو ایم زبانم جوہر است  
آئینہ کی طرح میرا سراپا و جوہر خاموشی ہے لیکن اگر گفتگو پر آؤں تو میری زبان سے موتی جھڑتے ہیں۔

بحرف نا ملائم زحمت دلہا مشو بیدل  
کہ ہر جا جنس سگی ہست باشد دشمن مینا  
ناموزوں اور نامناسب بات کہہ کر دلوں کو ٹھیس نہ پہونچاؤ کیونکہ جہان پتھر کی جنس ہوتی ہے وہ جام کی دشمن ہوتی ہے۔

جہاں تک اس کے ”حسن رفتار و کردار“ کا تعلق ہے ”بیدل کے احباب“ کا تفصیلی مطالعہ واضح کرتا ہے کہ اپنے دوست احباب اور شاگردوں کے ساتھ اس کا سلوک نہایت محبت آمیز رہا ہے۔ اس کے آشناؤں میں اگر کوئی عرصہ تک ملاقات کو نہ آسکا یا اس کی مجلس سے غائب رہا تو فوراً خط کے ذریعہ اس کی مزاج پرسی کرتا اور ملاقات کے لئے غیر معمولی اشتیاق کا اظہار کرتا۔ اگر کوئی نامساعد حالات سے دوچار ہوتا یا کوئی مالی دشواری اسے درپیش ہوتی تو فوراً اس کی مشکل حل کرنے کی کوشش کرتا یا خود اس کی مدد کرتا یا دوسروں سے کرانے کے لئے سارا اثر و رسوخ استعمال کرتا۔ نواب شکر اللہ خاں سے شاہ زین العابدین کیلئے سفارش کرتے ہوئے کیا خوب لکھتا ہے۔

کم ظرفی ما فیض ترا مانع نیست  
گر قطرہ بود قطرہ، محیط است محیط (۹۰۳)

ہماری کم ظرفی آپ کے جود و کرم کی راہ میں آڑے نہیں آتی۔ قطرہ اگر قطرہ ہے تو سمندر بھی

سمندر ہے۔ یعنی اگر میں قطرہ کی طرح بے وقعت ہوں تو آپ سمندر کی طرح وسیع الظرف ہیں اس لئے آپ اپنے جود و کرم سے کسی کم ظرف کو کیوں محروم رکھیں۔

اسی طرح ان کے وہ خطوط ہیں جو انہوں نے میر محمد زمان راسخ اور ان کے ساتھیوں کی سفارش

میں رفیع خاں باذل کو لکھے، مرزا سہراب رونق کی سفارش کے لئے مرزا محمد نعیم بخشی سرکار کو لکھے، محمد عاشق

ہمت کی سفارش کے لئے خان بہادر لعل محمد خاں کو لکھے، میر محمد احسن ایجاد کی سفارش کے لئے نواب



چین قیچ خان کو لکھے، شیخ علاء الدین متوکل کی سفارش کیلئے نواب عاقل خاں کو لکھے اور سونی پت کے ایک مظلوم شخص کی سفارش کئے لئے نواب شکر اللہ خاں کو لکھے۔ اس خط میں لکھتا ہے:

”محرمک این سلسلہ تعظم مظلومی از معیمان زوایای سونی پت است..... امید کہ توجہ محدرت

نشینان بارگاہ حضور۔ از نصیبہ نتائج عدل محروم نہاند۔“ (۹۰۳)

اس نامہ نگاری کا محرک سونی پت کے علاقہ کے ایک مظلوم باشندہ کی فریادری ہے امید کہ بارگاہ حضور کے انصاف پسندوں کی توجہ سے عدل و انصاف کے نتائج سے وہ محروم نہ رہے گا۔

ان واقعات کے علاوہ اگر خود اس کی مالی حالت مدد کرنے کی اجازت دیتی تو اس میں بھی دریغ نہیں کرتا تھا جیسا کہ پچھلے صفحات میں گذرا۔ نواب ذوالفقار خاں نے ایک دفعہ اسے دو سو اشرفیاں ہدیے میں بھیجیں، بیدل نے اسی وقت اسے نواب عاقل خاں ابن شکر اللہ خاں کو بھیج دیئے جو اس وقت مالی مشکلات سے دوچار تھا۔

یہ واقعات مجموعی طور پر انسانی ہمدردی کے ان جذبات و احساسات کی نشاندہی کرتے ہیں جو دوست احباب کے لئے اس کے دل میں تھے اور اسی کے ساتھ یہ بھی بتاتے ہیں کہ نوابوں اور امیروں کے یہاں اس کا کتنا اثر و رسوخ تھا کہ وہ ان کی سفارش کو قبول کرنا اپنے لئے سرمایہ سعادت سمجھتے تھے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے دوست احباب میں تو مقبول تھا ہی نوابوں اور امراء کی نظر میں بھی محبوب تھا۔ اسی لئے دوستوں کے بابت کہتا ہے:

شاخ از گلبن جدا مصروف گلشن می شود زندگی باد و ستاں عیش است و تنہا آتش است شاخ بڑ سے جدا ہونے کے بعد آتش دان کی نذر ہو جاتی ہے، زندگی دوستوں کے ساتھ عیش ہے اور اکیلے سراپا آتش ہے۔ خود کہتا ہے:

بسکہ عالم را بہ حسن خلق ممنون کردہ ام رنگ ہم نتواند از جرأت بروی ما شکست اپنے حسن اخلاق سے میں نے دنیا کو اس قدر ممنون کیا ہے کہ اس کا رنگ جرأت کر کے بھی میرے سامنے نہیں اڑ سکتا۔ لیکن بعض اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگ اس کے درپے آزار رہتے تھے اس لئے ان کے بارے میں کہتا ہے:

تا توانی قطع کن بیدل زانائے زماں آشنای کس نگرند این حیا بیگانہ ہا در حق انصاف اینای زماں داد تحسین می دہد دشنام ما ان حالات میں جو دو کرم سے متعلق اس کے درج ذیل اشعار کا مطالعہ کیجئے جن میں خلوص

کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے:

از سائلاں دریغ نہ شاید تبسمت گیرم گفت تہیست لب آفریں کشا سائلوں سے کم از کم خندہ پیشانی سے ہی پیش آؤ، مانا کہ تمہارا ہاتھ خالی ہے مگر لب آفریں کھولنے میں کیا پریشانی ہے۔

تا از گلت جز ایثار رنگ دگر نہ خندد سرتا قدم چو خورشید دست کرم بروں آ تیرے پھول سے ایثار کے سوا کوئی اور شیوہ ظاہر نہ ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ سورج کی طرح سرتا قدم کرم بن جا۔

اگر اہل جود و کرامتی بکشا کفی بشگفتی کہ سحر طواف چمن کند ز تبسم لب سائمت اگر تو اہل جود و کرم ہے تو خندہ پیشانی سے دینے کے لئے ہتھیلی پھیلا دے کہ تیرے سائل کی مسکراہٹ سے سحر بھی چمن کا طواف کرتی ہے۔

### کمالات بیدل:

مانچکساں بیدہ مغرور کمالیم گر ذرہ بافلاک پرد در چہ حسابست ہم ناچیز لوگ بلا وجہ اپنے کمال پر مغرور ہیں ذرہ اگر آسمان پر پہنچ جائے تو اس کی کیا حقیقت ہے۔ شخص تصویریم بیدل از کمال ما میرس حرف مانا گفتی و کار مانا کردنی است بیدل! ہم ایک مجسم تصویر ہیں ہمارے کمال کا حال نہ پوچھو ہماری کوئی بات ایسی نہیں جس کو سنایا جائے اور کوئی کام ایسا نہیں جس کا ذکر کیا جائے۔

اس میں شک نہیں کہ عوام اور خواص کی نظر میں مقبولیت پیدا کرنے کے لئے حسن اخلاق کا بڑا اہم رول ہوتا ہے۔ حافظ نے صحیح کہا ہے:

بحسن خلق توان کرد صید اہل نظر بہ بند و دام نگیرند مرغ دانا را اہل نظر کو حسن اخلاق ہی سے اپنا بنایا جاسکتا ہے۔ مرغ دانا کو پھندوں سے گرفتار نہیں کر سکتے۔ خود بیدل کا ایک شعر اس موضوع پر بہت عمدہ ہے:

بحسن خلق بیدل تا توان در جنت آسودن چہ لازم در دل دوزخ نشستن از شرارتہا حسن اخلاق کے ذریعہ جب تک آدمی جنت میں آسودہ ہو کر رہ سکتا ہے، کیا ضروری ہے کہ اپنی شرارتوں اور بد معاشیوں کے ذریعہ وہ دوزخ کے بیچ میں جا بیٹھے اور اپنا چین و سکون کھو بیٹھے۔

بہر حال حافظ ہی کا دوسرا شعر ہے:

بس نکته غیر حسن ببايد کہ تا کسی مقبول طبع صاحب و اہل نظر شود

حسن کے علاوہ اور بھی خوبیاں درکار ہیں تب کہیں جا کر انسان اہل نظر کی نگاہ میں چلتا ہے۔  
اب ہم انہیں خوبوں پر ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں جنہوں نے معاصر اور غیر معاصر دانشوروں  
کے ایک طبقے کو بیدل کا عاشق و گرویدہ بنا دیا ہے۔ خوشگو بیدل کے کمالات پر اس طرح روشنی ڈالتا ہے:  
”آجناب از الہیات و ریاضیات و طبعیات کم و بیش چاشنی بلند کردہ بود۔ و طبابت و نجوم و  
رمل و حروف و تاریخ دانی و موسیقی بسیار آشا بود۔ تمام قصہ مہا بہارت کہ در ہندیان ازان معتبر تر  
کتابی نیست، بیادداشت۔ و در فن انشاء، نثری بی نظیر چنانچہ چار عنصر و رقعات اور برین دعوی  
دلیل ساطع است و در نثر چیزیکہ عیانست چچحتاج بیان است۔“ (۹۰۵)

بیدل نے الہیات (وہ علم جس میں وجود ذات و صفات باری تعالیٰ سے بحث ہوتی ہے)  
ریاضیات (وہ عقلی علوم جو وجود خارجی میں مادہ کے محتاج ہیں) اور طبعیات (وہ علم جس میں اجسام کے  
تغیر و تبدل اور ان کی خاصیت کا حال درج ہوتا ہے) کا کم و بیش علم رکھتے تھے۔ طبابت، نجوم (ستارہ  
شناسی) رمل (وہ علم جس سے گزشتہ اور آئندہ کے احوال کا علم ہوتا ہے) جفر (وہ علم جس سے غیب کے  
حالات معلوم ہوتے ہیں) تاریخ اور موسیقی سے اچھی طرح واقف تھے، مہا بہارت ہندوؤں میں سب  
سے معتبر کتاب مانی جاتی ہے اس کی ساری کہانیاں ان کو از بر تھیں۔ فن انشاء میں بے نظیر نثری تھے، ان کی  
کتاب چار عنصر اور رقعات اس دعویٰ کی واضح دلیل ہے۔ نثر میں جو چیز عیاں ہے وہ محتاج بیان نہیں۔  
خوشگو کے بیان کے اساس پر کہا جاسکتا ہے کہ بیدل کی شخصیت مجموعہ کمالات واقع ہوئی تھی جس  
کی صحبت سے استفادہ کی خاطر دہلی کا دانشور طبقہ اکثر ان کے گھر ارادتمندی سے آمد و رفت رکھتا تھا۔  
بیدل کی شعری اور نثری تخلیقات خصوصاً مثنویوں کی تحلیل و تجزیہ خوشگو کے بیان کے مکمل توثیق  
کرتی ہے۔

بیدل نے صرف دس سال کی عمر تک اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ فارسی میں گلستاں و بوستاں،  
عربی میں کافیہ تک اس نے مطالعہ کیا۔ پھر چچا مرزا قلندر کے حسب ہدایت قدیم اساتذہ کے کلام کا  
بالاستیعاب اور بغور مطالعہ کیا اور اس کا ایک انتخاب بھی تیار کیا۔ ”بیاض بیدل“ جو اس وقت دو جلدوں  
میں برٹش میوزم میں محفوظ ہے اس کے پاکیزہ ذوق انتخاب اور وسعت مطالعہ کی منہ بولتی تصویر ہے۔  
ڈاکٹر ریو کے مطابق اس بیاض میں خاقانی سے لیکر خود بیدل کے عہد تک کے شاعروں کے کلام کا ایک  
انتخاب ہے (۹۰۶)۔ قدیم اساتذہ کے کلام کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ ضمنی طور پر وہ صوبہ بہار اڑیسہ و  
دہلی کے علماء اور اولیاء کی صحبت سے بھی استفادہ کرتا رہا۔ مرزا ظریف اور شاہ قاسم ہوالہی کی خدمت  
میں اس نے قرآن پاک کی تفسیر کا مطالعہ کیا۔ اسی مجلس میں تذکرۃ الاولیاء وغیرہ تصوف کی کتابیں بھی

اس کے زیر مطالعہ رہی ہیں۔ مثنوی عرفان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے نفع البلاغہ کا مطالعہ  
بھی کیا ہے۔ یہ تھی اس کے مطالعہ کی کل کائنات جس کا اس نے چار عنصر اور دیگر مقامات میں اعتراف  
کیا اور شاید اسی بنا پر خان آرزو مجمع الفکس میں لکھتا ہے:

”اگرچہ از علم ظاہر بہرہ وافی نہ داشت اما از صحبت بزرگان و سیر کتب صوفیاء آنقدر مایہ و ربود  
کہ در سرزمین شعر، تمام تخم تصوف می کاشت۔“ (۹۰۷)

اگرچہ ظاہری علوم سے کچھ زیادہ بہرہ مند نہ تھا تاہم بزرگوں کی صحبت اور صوفیاء کی کتابوں کے  
مطالعہ سے اس نے اس قدر سرمایہ اکٹھا کر لیا تھا کہ شاعری میں سراسر تصوف کی تخم ریزی کیا کرتا تھا۔  
آرزو کی یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے۔ بزرگوں کی صحبت اور صوفیاء و شعراء کی کتابوں کا مطالعہ  
یہ دو عامل تھے جس نے بیدل کے دماغ میں معانی اور مضامین کے انبار لگا دیئے تھے اور اس کی شاعری  
کے لئے بہترین مصالح فراہم کیا۔ دہلی میں اپنے معمولات کا تذکرہ کرتے ہوئے بیدل ایک خط میں  
لکھتا ہے:

”گاہی از زبان خامہ بادوات گرم سرگوشی می گرد، و گاہی بصحبت کتابی ہمدس خوشی می  
شود۔“ (۹۰۸)

کبھی تو دوات گرم کے ساتھ زبان خامہ سے سرگوشی کا سلسلہ رہتا ہے یعنی کچھ لکھنے میں مصروف  
رہتا ہوں اور کبھی کسی کتاب کی صحبت میں خوشی کا ہمدس بن جاتا ہوں یعنی مطالعہ میں مصروف رہتا ہوں۔  
ایک شعر میں علم و دانش کے پیشے کو اعجاز سے تعبیر کرتے ہوئے اس کی اہمیت جتانے پر  
گرچہ ہر پیشہ سحر پرداز نیست پیشہ علم و فضل اعجاز نیست  
جہاں تک اس کے مطالعہ کا تعلق ہے اس کا دائرہ صرف صوفیاء کی کتابوں تک محدود نہ تھا۔  
مثنویوں کا دقیق مطالعہ واضح کرتا ہے کہ اس کے مطالعہ میں تنوع اور رنگارنگی تھی۔ ایک شعر سے معلوم  
ہوتا ہے کہ وہ زندہ دلی کے ساتھ کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا صرف جمع نہیں کرتا تھا۔

بیدل اگر افسردہ دلی جمع کتب کرد در مدرسہ دانش ما جلد کتابست

مثنوی عرفان نہ صرف یہ کہ اس کے صوفیانہ ذوق اور عارفانہ مطالعہ کی نشاندہی کرتی ہے بلکہ یہ  
بھی بتاتی ہے کہ اس نے علم الاخلاق، علم الاجتماع، علم کیما، جفر و رمل حتی کہ اقتصادیات، علم تجارت اور  
علم زراعت کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ مثنوی طلسم حیرت علم تشریح الاعضاء، علم وظائف الاعضاء اور نفسیات سے  
اس کی گہری واقفیت کو واضح کرتی ہے۔ مثنوی محیط اعظم ہندوستانی قصے کہانیوں سے اس کی آشنائی کو  
واضح کرتی ہے، اور طور معرفت قدرتی مناظر کی تصویر کشی پر اس کی غیر معمولی توانائی کو ظاہر کرتی ہے۔

ان تمام تر علمی کمالات کے باوجود بیدل کو احساس تھا کہ داغ جہالت ہنوز برقرار ہے۔ علمی تفکری کا یہی عالم ہوتا ہے اور کتابوں کے مطالعہ نے اسے علمہائے بے عمل بنادیا۔  
عالم معنی شمیم و داغ جہل از ما نرفت ساخت بیدل علمہای بی عمل ما را کتاب بیدل اگر لطف سرو برگ کمالت تحقیق معانی غلط و فکر رسا هیچ اس سلسلے میں خوشگو کا بیان حقیقت پر مبنی کہا جاسکتا ہے۔ البتہ اس کی تمام تخلیقات کو پیش نظر رکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ بیدل کا طبعی رجحان تصوف کی طرف زیادہ تھا جیسا کہ نواب نظام الملک کے حالات کے ضمن میں اس کا تذکرہ آچکا ہے۔ بقول خوشگو نواب موصوف نے جب بیدل سے ملاقات کر کے واپس جانا چاہا تو بیدل نے کیمیائے سعادت اور نجات الانس وغیرہ کتابیں ہدیہ کے طور پر پیش کیں۔ یہ واقعہ اور اسی طرح پیچر بلگرامی کا بیان بیدل کے طبعی رجحان کو واضح کرتا ہے۔ مختلف علوم و فنون میں بیدل کی اسی جامعیت کی بنا پر اس کے معاصر دانشور اس کی غیر معمولی تحسین کیا کرتے تھے۔ خوشگو نے اس سلسلہ میں اپنے مشاہدات کا خلاصہ اس طرح پیش کیا ہے:

”فقیر درین مدت عمر، کہ بچاہ و شش مرحلہ طی کردہ، با ہزاران مردم ثقہ بر خوردہ می باشم، لیکن بجا معیت کمالات و حسن اخلاق و بزرگی و ہمواری و گفتگی در سائی و تیز نہی و زودرسی و انداز سخن گفتن و آداب معاشرت و حسن سلوک و دیگر فضائل انسانی نہجواوی ندیدہ ام۔ و از کسی کہ اور ابیاری و کم دیدہ است انصاف می خواہم بشرطیکہ منصف باشند نہ متعصب۔“ (۹۰۹)

خاکسار کو اپنی اس چھپن سالہ زندگی میں ہزاروں ثقہ اور معتبر لوگوں سے ملاقات کا اتفاق ہوا لیکن جامعیت کمالات، حسن اخلاق، عظمت و بزرگی، ہمواری و نرمی، گفتگی و زندہ دلی، ذہنی رسائی و تیز نہی، زودرسی، شیریں بیانی، آداب معاشرت اور حسن سلوک وغیرہ انسانی فضائل و کمالات میں ان جیسا کوئی نظر نہیں آیا۔ جنہوں نے ان کو کم و بیش دیکھا ہے ان سے انصاف سے پوچھتا ہوں کہ وہ کیا کہتے ہیں شرط یہ ہے کہ متعصب اور تنگ نظر نہ ہوں۔

### بیدل کا پیشہ:

اب جبکہ بیدل کی جامعیت کی گفتگو اس منزل پر پہنچی ہے بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ وہ ایک طبیب بھی تھا اور اپنی گذراوقات کے لئے طبابت کا پیشہ اس نے اختیار کیا تھا۔ خود راقم السطور کا خیال تھا کہ نواب اور امراء اس کی سرپرستی اور حاجت روائی کرتے تھے، اس لئے اس کی معاشی زندگی مکمل طور پر ان کے ہدایا اور عطایا پر منحصر تھی۔ لیکن مثنوی عرفان میں جہاں تجارت کی اہمیت پر روشنی ڈالی

ہے وہاں خود اپنے بابت درج ذیل شعر کہا ہے:

دل بر این پیشہ مستقل گیریم از تجارت مراد دل گیریم (۹۱۰)  
اب مستقل طریقے پر اس پیشے میں لگیں اور تجارت سے اپنی دلی مراد حاصل کریں (روزی روٹی کمائیں)۔

تب سے یہ فکر ستاتی رہی کہ بیدل نے آخر وہ کون سی تجارت اختیار کی تھی جس کی طرف اس شعر میں اشارہ کیا ہے۔ راقم السطور کی جستجو آخر ٹھکانے لگی۔ درگاہ قلی خاں نے ”مزار بیدل“ کے عنوان سے بیدل کے بھتیجے محمد سعید کے بابت لکھا ہے۔

”محمد سعید برادرزادہ اش..... بتواضع حاضران مجلس (عرس) و ترتیب شمع و چراغ، دماغ خود را می سوزد و با تباغ ہم مواجین و جوب اختراعی میرزا، کہ ازاں قبیل کیمیاست و در ہمہ دہلی انگشت نما ہیں، صرف معیشت می نماید۔“ (۹۱۱)

اس (بیدل) کا بھتیجہ محمد سعید مجلس عرس کے حاضرین کی خاطر تواضع اور شمع و چراغ کے انتظام میں دماغ سوزی کرتا ہے اور ضمنی طور پر مرزا کے ایجاد کردہ معاجیں اور جوب جو کیمیاست کی چیزیں اور دہلی میں انگشت نما ہیں بنا کر اپنی گذراوقات کرتا ہے۔

اس اقتباس سے واضح ہے کہ بیدل نے کچھ مخصوص قسم کے معجون اور جوب تیار کئے تھے جو دہلی میں ایک طرح سے کیمیا تصور کئے جاتے تھے۔ بیدل کے بعد اس کے بھتیجے نے اس روایت کو قائم رکھا۔ وہ ان دواؤں کو بنا کر اپنی گذر بسر کیا کرتا تھا۔ اب ہم شکر اللہ خاں ثانی کے نام بیدل کے ایک خط کا اسی پس منظر میں مطالعہ کرتے ہیں، لکھتا ہے:

”..... برف انفعال دوری، ارسال حب اعجاز و اکسیر احمر و اوجی ورنجک عذروا خواہ است مسبب حقیقی از حصول دولت و دیدار محرم مگرداناد۔ مرجع تمنای بیدلان اقبل ازین بمعرفت میرزا خسرو بیگ، قدری اکسیر احمر نیاز بار یافتگان جناب تقدس انتساب، پادشاہزادہ عالیان مآب، گردیدہ بود، بشرف قبول امتیاز یافتہ باشد، بالفعل ازین اشیاء مرسولہ آنچه شایستہ پیشکش بارگاہ داند، از نظر اشرف بگذرانند۔ در معنی دعاء جسمی است، در صورت دوا کہ اثرش با حصول اجابت مناسبتی قریب دارد۔“ (۹۱۲)

(جناب عالی کے آستانے سے) دوری کی ندامت کو ختم کرنے کی غرض سے حب اعجاز، اکسیر احمر، اوجی اور رنجک (یہ چاروں دوائیں) بھیج کر معذرت چاہتا ہوں۔ مسبب حقیقی دولت و دیدار سے محروم نہ کرے۔



مرجع تمنائے حیدر لاں! اس سے پہلے مرزا خسرو بیگ کی معرفت کچھ اکسیر احمر جناب تقدس انتساب شہزادہ عالمیان باب (اعظم شاہ) کی نذر کی تھی (امید کہ) شرف قبول سے ممتاز ہوئی ہوگی۔ ان چیزوں میں جو چیز آپ شہزادہ کی بارگاہ کی پیشکش کے لائق سمجھیں ان کی نظر سے گذاریں۔ صورتاً دوا ہے مگر معنوی لحاظ سے دعاء مجسم ہے جس کا اثر حصول اجابت سے بہت قریبی مناسبت رکھتا ہے۔

اس خط سے معلوم ہوا کہ وہ دوائیں اور معالجین حب اعجاز، اکسیر احمر، اوجی اور رنجک ہیں۔ نیز یہ کہ بیدل تحفہ کے طور پر انہیں نواب اعظم شاہ اور بہادر شاہ کو بھیجا کرتا تھا، ممکن ہے اس کے علاوہ اور بھی دوائیاں اور معالجین وہ بناتے ہوں اور اپنے مخلص احباب کو ہدیہ ارسال کرتے ہوں لیکن اس اعتراف کی بنا پر جو اس نے مثنوی عرفان میں کیا ہے کہا جاسکتا ہے کہ بیدل ان دواؤں کو بنا کر اور انہیں فروخت کر کے بھی اپنی گذر بسر کرتے تھے۔ خوشگو صرف اتنا لکھتا ہے:

”دو فصل زمستانی مجھونی می ساخت و آزا ”اوجی“ نام می گذاشت۔“ (۹۱۳)

موسم سرما میں وہ ایک مجون تیار کرتے تھے اور اس کا نام اوجی رکھا تھا۔

### بیدل کا حلیہ:

ان معنوی کمالات کے دوش بدوش بیدل کے حلیہ نے بھی اس کی شخصیت کو نہایت پرکشش بنا دیا تھا۔ خوشگو بیدل کے سراپا کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتا ہے:

”بالای والا لیش در طول میانہ بود عرض پہنادر بیسار داشت۔ جمالی داشتہ بود ہرنگ کمال، با چشمہای بخشنہ و ابروان کلید در ہای بستہ۔ تختہ پیشانی و سستی داشتہ کہ گوئی قلم تقدیر جمیع کمالات انسانی برو مرتسم کردہ۔ مقدار شش گرہ بود کہ ہر گز بروئی افتاد..... بی باکی تمام داشت، وضع تراش ریش و برت تراشیدہ بود۔“ (۹۱۳)

قد والا کی لمبائی اوسط درجے کی تھی پر جسم کی چوڑائی زیادہ تھی۔ وہ ایسے جمال کے حامل تھے جو کمال سے ہرنگ تھا، آنکھیں مبارک و مسعود اور ہنویں گویا بند دروازے کی کلید ہوں۔ پیشانی اتنی کشادہ کہ گویا قلم تقدیر نے سارے انسانی کمالات اس پر نقش کر دیئے تھے۔ سر کے بال تقریباً چھ گرہ کے برابر تھے جو چہرے پر نہیں گرتے تھے..... انتہائی بے باک تھے داڑھی مونچھ سب منڈاتے تھے۔

داڑھی مونچھ مونڈانے کے بابت بہت سے سوالات قاری کے صفحہ ذہن پر ابھرتے ہیں۔ چونکہ اس موضوع پر الگ سے بحث ”بیدل کے افکار و خیالات“ کے زیر عنوان باب میں کی گئی ہے اس لئے یہاں اسے ترک کیا جاتا ہے۔ ایک شعر میں اس نے اپنی ظاہری شکل و صورت کے بابت کہا ہے۔

بصورت گر تہی دستم، بمعنی گنجہ دارم کہ گر یک چشم من دامن افشا ند گھر ریزد صورتاً میں تہی دست ہوں معنوی لحاظ سے خزانوں کا انبار میرے پاس ہے اگر میری ایک آنکھ دامن افشانی کرے تو سیکڑوں موتی جھرنے لگے۔ دوسرے شعر میں کہتا ہے صورت معنی دونوں میں بے نظیر ہوں۔

بمعنی گوہر تک معنیت پیدا نہ شد بیدل جہاں گشتم، بصورت نیز نتواں یافت مانندت

### بیدل کی جسمانی طاقت:

خوشگو نے ”بیان زور مرزا“ کے تحت بیدل کی جسمانی توانائی کی تعریف کرتے ہوئے بعض ایسے واقعات لکھے ہیں جس سے مبالغہ کی بو آتی ہے:

”آنحضرت را از بدو شعور توجہ بر کسب زور بیشتر بود۔ چنانچہ شمارو یام ہر روزہ کہ موجود فیض آمودی نمود، چہار ہزار و اکثر بہ پنج ہزار کشیدی۔ و بسکہ در کشتی کردن و مصارعہ جستن حریفان را بہر دودست برداشتی و بر زمین زدی۔ پیچ کس را تاب پنجہ آزمائی و زور آزمائی اونہود۔“ (۹۱۵)

بیدل کو ابتداء شعور ہی سے اپنی جسمانی توانائی بڑھانے کی فکر رہتی تھی۔ چنانچہ روزانہ چار ہزار اور بسا اوقات پانچ ہزار ڈنڈ بیٹھک لگاتے تھے اور کشتی کھیلنے اور پچھاڑنے میں مد مقابل کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر زمین پر پٹک دیتے تھے کسی کو ان سے بچنے آزمائی اور زور آزمائی کی جرأت نہیں تھی۔

اس میں شک نہیں کہ بیدل کی جسمانی طاقت غیر معمولی تھی جو ابتدائے سن شعور سے لگا تار ریاضت کا نتیجہ تھی ورنہ پندرہ سال کی عمر میں وہ شاہ شجاع کی فوج (مرزا عبداللطیف کے دستے میں) شریک ہونے کے لائق نہ ہوتا۔ ہمیں معلوم ہے کہ تین مہینے تک وہ مرزا عبداللطیف کے دستے میں داد شجاعت دیتا رہا اور ان فوجیوں کی بہادری کے بابت جس میں خود بیدل بھی شامل تھا۔ لکھتا ہے:

”ہر پیادہ را کہ می دیدم داد مقابلہ صد سواری داد۔ و ہر سوار یکہ می سنجیدم با فوجہای جرار گران سنگ می افتاد۔“ (۹۱۶)

جس پیادہ فوجی کو دیکھتا تھا وہ سو سواروں کے مقابلے کی داد دے رہا تھا اور جس سوار کو جانچتا تھا۔ وہ ایک لشکر جرار سے برسر پیکار تھا۔

اس لئے خوشگو کا یہ بیان کہ کشتی میں وہ اپنے حریفوں کو پچھاڑ دیتا تھا صحیح معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات کہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر نیلے پر جاتا اور وہاں اپنی تمام تر جسمانی قوت کے ساتھ گھوڑے سے لڑتا

اور اسے زمین پر چھچھاڑ دیتا پھر وہ خود اور گھوڑا ٹیلے سے لڑھکتا ہوا نیچے آتا۔ یہ عمل کئی بار کرتا تب کہیں اس کے دل کو سکون ملتا۔

یاد یہ کہ ایک دن اس نے حجام کے بچے کو جس سے بیدل کو ایک طرح کا تعلق خاطر ہو گیا تھا ایسی حالت میں دیکھا کہ اس سے غیر شایعہ حرکت سرزد ہو رہی تھی اور بیدل کے طبع نازک پر گراں گذر رہی تھی ایسا طمانچہ مارا کہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

یا پٹنہ کے دوران قیام ایک تاجر نے عراقی نسل کا ایک گھوڑا لایا اور ایک ہزار روپے میں اسے بیچنا چاہا۔ بیدل کے دل میں آیا کہ وہ اسے خرید لے۔ اس نے تاجر سے کہا کہ تمہارا گھوڑا اگر دوڑ میں مجھ سے آگے بڑھ جائے گا تو دو ہزار روپے تم کو دوں گا ورنہ یہ گھوڑا تم کو مفت دینا ہوگا۔ تاجر نے یہ شرط قبول کر لی۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو گیا اور بیدل پا پیادہ چلا۔ دونوں ایک لمبے چوڑے وسیع میدان میں دوڑنے لگے۔ دوڑتے وقت بیدل جب کبھی پیچھے مڑ کر دیکھتا تو سوار کو اپنے سے ایک میٹر کے فاصلے کے برابر دور پاتا یہاں تک کہ وہ دوڑ میں بازی لے گیا۔ اس کے باوجود گھوڑے کو مفت لینا اس نے انسانیت اور شرافت کے خلاف تصور کیا۔ (۹۱۷)

یہ تینوں واقعات جن کا ذکر خوشگلو نے اپنے تذکرہ سفینہ خوشگلو، میں کیا ہے عقل و درایت کے معیار پر پورے نہیں اترتے اور نہ بیدل کے حالات کے لحاظ سے وہ درست نظر آتے ہیں کیونکہ گھوڑے کے ساتھ کشتی کھیلنا یا گھوڑا دوڑ میں سبقت لے جانا ایسی غیر سنجیدہ حرکتیں ہیں جن کو عوام بھی پسند نہیں کرتے، پھر بیدل جیسا سنجیدہ طبع اور صاحب ذوق دانشمندان کاموں میں کیونکر پڑ سکتا ہے۔ ہم نے بیدل کے حالات میں پڑھا ہے کہ ۱۰۷۰ھ میں پٹنہ سے ہمسے کے سفر کے دوران اس کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے اور جمنپور پار کیا تو اس کی طاقت جواب دے چکی تھی اور خادم کے تمام تر اصرار کے باوجود لپٹک قدم بھی آگے نہ بڑھاسکا۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پیادہ چلنے کا اتنا عادی نہ تھا پس کس طرح یقین کیا جاسکتا ہے کہ عراقی گھوڑے سے مقابلے میں وہ بازی لے گیا اور شاید انہی وجوہ سے قاضی عبدالودود مرحوم اور یسین خان نیازی نے انکار کیا ہے۔ (۹۱۸)

خوشگلو نے ایک اور واقعہ لکھا ہے: ایک دن بیدل کا پاؤں پھسلا، اتفاق سے وہاں ایک دیوار تھی۔ بیدل نے دیوار کا سہارا لینا چاہا تو اچانک وہ بیدل کی طاقت کی تاب نہ لا کر زمیں بوس ہو گئی (۹۱۳)۔ دیوار کے بارے میں تو یہ توجیہ کی جاسکتی ہے کہ وہ پرانی رہی ہوگی اور ڈھ جانے کے قریب ہوگی اور بیدل کا اس کا سہارا لینا اس کے انہدام کا سبب ہوا۔ اسی طرح حجام کے بابت کہا جاسکتا ہے کہ وہ بیدل کے زوردار طمانچہ کی تاب نہ لا کر اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔ (۹۱۹)

ڈاکٹر عبدالغنی نے اپنے ایک مقالہ ”بیدل کی شخصیت اور ان کا اسلوب“ میں لکھا ہے کہ ”عظیم شاہ کی ملازمت کے دوران بیدل نے ایک شیر سے بچنے آزمائی کی جس نے شاہ کے ہمراہیوں پر حملہ کر دیا تھا اور اسے مار ڈالا (۹۲۰)۔ مجھے نہیں معلوم ان کا ماخذ کیا ہے لیکن بیدل کے اس سفر کو جو ۱۰۹۶ھ ۱۶۸۳ء میں اس نے مقرر سے دہلی کا کیا تھا، پیش نظر رکھیں تو کہا جاسکتا ہے کہ وہ سارے واقعات جو اس کی دلیری، بہادری اور پہلوانی سے وابستہ لکھے گئے ہیں افسانے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے کیونکہ اس سفر میں شیر گڑھ نام کے ایک مقام پر پہنچ کر جیسے ہی آگے بڑھنا چاہا ڈاکوؤں کی ایک جماعت سے اس کا سابقہ پڑا اس وقت بیدل کے ساتھ دو خادم اور شاید بیوی بھی رہی ہے وہاں بیدل کو کشتہ راضطراب و پریشانی لاحق ہوئی اور کس قدر خوف و ہراس اس پر طاری ہوا اس کے درج ذیل بیان سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

”غبار این فتنہ، صبح زندگی را در چشم امید ما شام کرد۔ و شور قیامت، از شمس جہت جہم یاس آورد۔ نہ عنان بازگشتن در بچہ اختیار، نہ زمام استقامت در قبضہ اقتدار۔ تارنگ باختہ تہیہ گردیدن پر دازد، فوج بیخودی از قفای رسید۔ و تا اشک بیدست و پا گام تلاش پیش گذارد، سعی قدم بسر کوبی انجامید۔ صدرا از آفت بلندی رو مگر بیان نالیدنی بود۔ و نگاہ را از ہراس مقابل در سایہ مژگاں خزیدنی۔“ (۹۲۱)

اس فتنے کی گردنے صبح زندگی کو ہماری نگاہ میں شام زندگی میں بدل دیا تھا۔ اور چاروں طرف سے قیامت کا سماں کچھ اس طرح نگاہوں کے سامنے پھر گیا کہ ہم اپنی آس توڑ بیٹھے۔ اب نہ تو واپسی کی باگ ہمارے اختیار میں تھی اور نہ ہی استقامت اور پامردی کی ڈور ہمارے قبضہ میں تھی۔ جب تک (چہرے کا) اڑا ہوا رنگ لوٹے بیخودی کی فوج پیچھے سے آدھمکی اور بے دست و پا پانچ آنسو جب تک قدم آگے بڑھائے قدم کی کوشش نے ان کی سرکوبی کر دی۔ اور آواز کو ایک بڑی آفت کی وجہ سے منہ گریباں میں رکھ کر آہ و نالے کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا اور نگاہ کو حریف مقابل کے خوف سے پلکوں کے سایہ ہی میں سمیٹنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

یہ تھی بیدل کی کل پہلوانی۔ اتنا خوف اسے لاحق ہوا کہ آواز حلق میں انک کر اور نگاہ پلکوں میں پھنس کر رہ گئی پھر حریف کو شکست دینے کیلئے گھوڑے سے کشتی کھیل کر اسے پچھاڑنے اور شیر کو مارنے کی بات کہاں تک درست ہوگی اللہ ہی کو معلوم ہے۔

ممکن ہے کہا جائے کہ یہ واقعات چونکہ مختلف حالات اور مختلف زمانے میں پیش آئے اس لئے اس بات کا امکان ہے کہ یہ واقعہ تب کا ہو جب طاقتور تھے پھر بھی اسے مبالغہ آرائی سے خالی نہیں قرار دیا جاسکتا ہے۔

## عصای بیدل: ۴

بیدل کی پہلوانی اور اس کے کس بل کے واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے خوشگلو نے اس کی ایک مخصوص لاشی کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ لوہے کی ایک چھوٹی سی لاشی تھی جو ہر وقت بیدل کے ہاتھ میں رہتی تھی اس کا وزن ۳۶ شیرشا جہانی تھا اور اس کا نام اس نے ”نولاسی“ رکھا تھا۔ پھر اس کے معنی کی وضاحت کرتا ہوا لکھتا ہے کہ ”نولاسی“ ہندی زبان میں باریک شارخ کو کہتے ہیں۔ خوشگلو نے اپنے دعویٰ کی تصدیق کے طور پر لوگوں کو اس کی زیارت کرنے کی دعوت دی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اب بھی عرس کے دن بیدل کی قبر کے پہلو میں اسے رکھتے ہیں۔ طاقتور لوگ بڑی مشکل سے دونوں ہاتھوں کی طاقت لگا کر ہی اسے اٹھا پاتے ہیں اگر کسی کو یہ بات مبالغہ پر مبنی معلوم ہو تو آکر خود اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ (۹۲۲)

دوسرے تذکرہ نگاروں نے بھی قدرے اختلاف کے ساتھ بیدل کی لاشی کا ذکر کیا ہے۔ شیخ احمد علی لکھتا ہے:

”گویند کینک آہن وہ من تہریز کہ سی آثار دہلی باشد ہمیشہ در دست داشت و ہمیں حربہ اش بودہ، در دو انگشت گرفتہ پشت خودی خارید۔“ (۹۲۳)

کہتے ہیں ایک موٹا لکھنؤی ڈنڈا جس کا وزن دس من تہریزی تھا جو دہلی کے تیس سیر کے برابر ہے ہمیشہ اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا اور یہی اس کا ہتھیار تھا۔ دو انگلیوں سے پکڑ کر اس سے اپنی پیٹھ کھجاتا تھا۔ درگا داس لکھتا ہے:

”روزی چوب دستی کہ در ہندوی الہی گویند بدست کردہ از خانہ برآمدند، شیخ لہیری کہ از آشنا یان ایشان بودہ ذکر عصا بر زبان آورد۔ آنحضرت پنج فقرہ در تعریف عصا فرمودند: ”مُسْتَنَدُ الْاَنْبِیَاءِ، زِبْنَةُ الصُّلَحَاءِ، مُوَلِّسُ الْاَعْمٰی، مَمْلُکَةُ الضُّعَفَاءِ، دَافِعُ الْاَعْدَاءِ۔“ (۹۲۴)

ایک دن لکڑی کی ایک چھڑی جسے ہندی میں لٹھ کہتے ہیں ہاتھ میں لے کر بیدل گھر سے نکلا۔ شیخ لہیری نے جو اس کے دوستوں میں تھے، چھڑی کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ جناب والا نے چھڑی کی تعریف میں پانچ فقرے استعمال کئے: انبیاء کی روایت، صلحا کی زینت، اندھوں کا مولس، کمزوروں کا مددگار، دشمنوں کا بھگانے والا۔

ان تینوں تذکرہ نگاروں میں خوشگلو اس حیثیت سے فوقیت حاصل ہے کہ وہ بیدل کا ہم عصر اور شاگرد تھا نیز یہ قول خود ایک ہزار سے زیادہ دفعہ اس کی صحبت سے فیضیاب ہونے کا موقع اس کو ملتا تھا اور اپنے دعوے کو چشم خود مشاہدہ کرنے کی دعوت دے کر مؤکد کر دیا ہے۔

راقم السطور کے خیال میں ہاتھ میں چھڑی رکھنے کے واقعہ سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہ اصول اکثر دانشوروں کا خصوصاً آخری عمر میں اب تک چلا آ رہا ہے۔ لیکن اس کے اہنی اور اس قدر روزنی ہونے میں اس کی پہلوانی کے واقعات کی طرح شک و شبہ کی گنجائش ہنوز باقی ہے۔ شیخ احمد علی کا خیال کہ اپنی دو انگلیوں سے پکڑ کر اپنی پیٹھ کھجاتا تھا سراسر مبالغہ آرائی پر مبنی نظر آتا ہے۔ درگا داس کا بیان کہ وہ لکڑی کی ایک چھڑی ہاتھ میں لئے رہتا تھا، عقلی لحاظ سے بھی اور دانشوروں کے روایتی اصول کے لحاظ سے بھی معقول تر نظر آتا ہے۔ بیدل کے ایک شعر سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے۔

شد قامت جوانی در پیریم فراموش آخر عصای چوبیں از دستم آن عصا برد (۹۲۵)  
عہد جوانی کی قد و قامت بڑھاپے میں طاق نسیان کی زینت بن گئی اور بالآخر عصای چوبیں (لکڑی کی چھڑی) نے اس عصائے قامت کو میرے ہاتھ سے لے لیا۔

لیٹین خاں نیازی نے ”نولاسی“ کے واقعہ کا سراسر انکار کیا ہے۔ (۹۲۶)

## بیدل کے عادت و اطوار:

بیدل کے خورد و نوش سے وابستہ عادات کے سلسلے میں بعض ایسی باتوں سے ہمارا سابقہ پڑتا ہے جن کی حیثیت اس کی پہلوانی کے واقعات کی طرح فرضی افسانے سے زیادہ نہیں معلوم ہوتے ہے یا کم از کم اس کے حالات اور اصول کے پیش نظر اس کی زندگی سے ہما ہنگ نہیں ہیں۔

## غذا:

بیدل کے قریب ترین شاگرد خوشگلو کا اس سلسلے میں بیان ہے کہ:

”در وقت جوانی غایت گرسنگی قریب مفت و ہشت سیر بود و اکثر بسبب ورزش فقر، بطور و رغبت فاقہ ہم کشید۔ درین وقت کبرن کہ فقیر خوشگلو ہر روز بخدش می رسید خوردن دو نیم سیر سہ سیر طعام بخشم خود دیدہ۔ در عالم شباب اگر چہ بشرب شراب ارتکاب کردہ لیکن در پیر ہما بواج مبارکش گوارنی آمد۔ لہذا از جمع مکلفات و مفیرات بیگانی نمودہ بہ بنگ اختیار فرمود۔ آزرا باسم ”موجی“ یاد می نمود۔ در فصل زمستان موجی مرتب می ساخت و آنرا اوجی نام گزاشت۔ شعری ازین عالم گفتہ۔“ (۹۲۷)

جوانی کے زمانے میں انتہائی بھوک کے عالم میں اس کی خوراک لگ بھگ سات آٹھ سیر تھی اور فقر کی ریاضت کی خاطر بسا اوقات اپنی رغبت سے فاقہ کشی بھی کرتا تھا۔ اس وقت اس بڑھاپے میں بھی

جبکہ یہ خاکسار خوشگو ہونے والا ان کی خدمت میں حاضری دیا کرتا ہے۔ ڈھائی تین سیر کھانا کھاتے ہوئے ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ جوانی میں اگرچہ شراب نوشی بھی کرتے تھے لیکن بڑھاپے میں یہ چیز ان کے مزاج مبارک کو گوارا نہ ہوئی اس لئے تمام مسکرات سے پرہیز کرتے تھے۔ لے دے کے بھنگ کا استعمال برقرار رکھا اور اسے موجدی کا نام دے رکھا تھا۔ موسم سرما میں ایک میخون تیار کرتے تھے اس کا نام 'اوجی' رکھا تھا۔ چنانچہ ایک شعر میں بھی اس کی طرف کیا ہے۔

شادم کہ فطرتم نیست تر یا کی تعین وہمیکہ می فروشم بنگست دگاہ گاہ است مجھے خوشی ہے کہ میری فطرت تر یا کی تعین نہیں ہے یعنی افیم خوری اور شراب نوشی کا میں فطری طور پر عادی نہیں ہوں اگر کوئی وہم فروشی کرتا ہوں تو وہ بھنگ کا استعمال ہے اور وہ بھی کبھی کبھی۔

جوانی میں سات آٹھ سیر اور بڑھاپے میں ڈھائی تین سیر غذا کا استعمال اور وہ بھی شاہجہانی عہد کے وزن کا جو یقیناً موجودہ کیلو سے کہیں زیادہ رہا ہوگا۔ اگرچہ خارج از قیاس نہیں قرار دیا جاسکتا لیکن یہ اس بات کی علامت ہے کہ بیدل بہت بسیار خور آدمی تھا اور یہ عمل اس کے قول سے ہامنگ نہیں ہے کیونکہ وہ لکھتا ہے:

”حصول نعمت کمال، بی وساطت گرسنگی محال، و سیراب زلال جمعیت، بی وسیلہ تشنہ لبی سراب خیال۔ ہلال تا از خود تہی مگردیدہ، بآئینہ داری آفتاب نرسید..... خلای معدہ در ہمہ حال مستعد جرأت کمال است و امتلاء در جمیع اوقات مادہ مخصیان و انفعال۔“ (۹۲۸)

”کمال“ کا حصول بھوک برداشت کے بغیر ممکن نہیں ہے اور سکون خاطر کے آب زلال سے سیرابی پیاس سے بغیر خواب و خیال ہے۔ ”ہلال“ جب تک خود آپ سے خالی نہ ہوا آفتاب کا آئینہ دار نہیں بنا۔ اگر معدہ خالی ہوتا ہے تو انسان حصول کمال کے لئے ہر حال میں آمادہ رہتا ہے اور اگر بھرا ہوتا ہے تو ہر وقت اس کی طبیعت مضطرب رہتی اور بدہضمی کا شکار ہو جاتا ہے۔

یہاں بیدل نے پر خوری اور شکم سیری کو بدہضمی اور اضطحال کا سبب قرار دیا ہے۔ دوسری جگہ غذا میں افراط و تفریط سے ہٹ کر میانہ روی کو نہایت فلسفیانہ انداز میں اس طرح بیان کیا ہے۔

”گواہ قوت جسم آدمی است سعی و راداء شرایط عبادت۔ و شاہد قوت عقل توجہ بر اکتساب علوم و حکمت۔ و دلیل قوت روح پرواز ہمت بعروج نسبت وحدت۔ مادہ این ہر سہ قوت مقدار اعتدال غذا است، کہ بقویت آل جسم توانا شود بر قدرت اعمال، و عقل اعانت یا بدر سعی تحصیل کمال، و روح بال کشاید بفہمای محبت ذوالجلال۔ اگر اسباب غذا مفقود باشد تردد جسم در طلب وجہ معاش مانع ذوق عبادت است۔ و تصرف عقل در تدبیر حصول آن محروم

کسب علم و حکمت، و توجہ روح از تشویش لہ نہا بر جوع سر منزل جمعیت۔“ (۹۲۹)

انسان کی جسمانی توانائی کی علامت یہ ہے کہ وہ شرائط بندگی کی ادائیگی میں لگا ہوا ہو، اور عقلی توانائی کی علامت یہ ہے کہ علوم و فنون اور حکمت و دانائی کے حصول پر متوجہ ہو اور روحانی توانائی کی دلیل یہ ہے کہ ”وحدت“ کی نسبت کے مطابق اس کی ہمت پرواز کر رہی ہو۔ ان تینوں قسم کی توانائیوں کا مادہ غذا کی معتدل مقدار ہے جس کے سہارے جسم میں اپنے وظائف کی ادائیگی کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، عقل کو حصول کمال کی کوشش میں مدد ملتی ہے اور روح کو عشق الہی کی فضا میں بال کشائی کا موقع ہاتھ آتا ہے۔ اسباب غذا اگر مفقود ہو تو وجہ معاش کے حصول میں جسم کی فکر و ذوق بندگی کے لئے رکاوٹ ثابت ہوگی اور اس کی تدبیر میں عقل کی کارفرمائی علم و حکمت کے حصول سے اسے محروم رکھے گی اور ذہنی پراگندگی کی وجہ سے جمعیت قلب کی منزل تک پہنچنے میں روح کی توجہ بے گی۔

جو آدمی غذا کے معاملے میں اعتدال کی اس طرح فلسفیانہ انداز سے توجیہ و تشریح کرتا ہو اور اس کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہو اس کی نسبت یہ گمان کرنا کہ اس نے دائرہ اعتدال سے قدم باہر رکھا ہوگا اور صرف خوشگو کے بیان کی بنیاد پر اس کو پر خور اور بسیار خور سمجھنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ خصوصاً اس وجہ سے بھی کہ بہت سے دوسرے معاصر تذکرہ نگاروں مثلاً شیر خاں لودھی، عظمت اللہ خٹک، افضل سرخوش، خان آرزو، سید محمد ابن عبد الجلیل اور محمد شفیع وارد نے اس امر کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے۔ خود بیدل نے ایک شعر میں پر خوری یا امتلا کے بابت کہا ہے۔

ز امتلا پسندید خواری نعمت کہ شاخ میوہ بد سیری بخاک گندد پر خوری کی وجہ سے نعمت کی بے حرمتی مت پسند کرو کیونکہ شاخ میوہ جب آسودہ ہو جاتی ہے تو زمین پر آ رہتی ہے۔

جہاں تک بیدل کی شراب نوشی اور بھنگ کشی کا تعلق ہے اس کے بعض اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کبھی شراب کا عادی تھا۔

ما بزور می پرستی زندگانی می کنیم چوں حباب می بنای ماست سرتا پا شراب لیکن اس می سے مراد بظاہر دنیاوی شراب نہیں لگتی ہے کیونکہ اس کی جوانی بزرگوں کی صحبت میں گزری ہے۔ اور خوشگو کے بیان پر آنکھ بند کر کے اعتماد نہیں کیا جاسکتا کیونکہ دوسری جگہ بیدل نے صراحت کیساتھ کہا ہے۔

از می حذر کنید کہ ایں دشمن حیا کاریکہ از ادب نتواں کرد، می کند شراب سے پرہیز کرو کہ یہ دشمن حیا وہ کام انجام دیتا ہے جو ادب سے ممکن نہیں ہے جو شراب

سے دوسروں کو پوچھتا ہوں وہ خود شراب کیا پئے گا۔

لیکن خاں نیازی اپنے ایک مقالہ ”مرزا عبدالقادر بیدل“ میں لکھتے ہیں:

”شراب نوشی اور بھنگ کشی جس کا تذکرہ خوشگو نے کیا ہے یقیناً درست نہیں معلوم ہوتا ہے

کیونکہ محیط اعظم میں شراب کی مذمت میں بہت سے اشعار پائے جاتے ہیں۔“ (۹۳۰)

ڈاکٹر عبدالغنی لکھتے ہیں:

اس عہد کی تصنیفات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ مسکرات سے پرہیز کیا کرتے تھے۔

بندر ابن داس خوشگور قطر از ہے کہ ”بیدل گاہے گاہے برگ حشیش استعمال کیا کرتے تھے“ لیکن اول تو

یہ بڑا نا کافی ہے دوسرے جو شخص بہترین اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرتا تھا وہ عیش و عشرت کے لئے

کس طرح معمولی چیز کو بھی روا رکھتا ہوگا۔ (۹۳۱)

مثنوی محیط اعظم میں بیدل نے شراب نوشی کی مذمت سے وابستہ جو اشعار کہے ہیں راقم السطور

کو تلاش کے باوجود نہیں ملے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ بیدل کی پوری سوانح عمری میں کہیں بھی شرابیوں

کی صحبت اور ہم نشینی کا ذکر نہیں ملتا بلکہ اپنی طفولیت اور جوانی اس نے بلند پایہ بزرگوں اور مجذوبوں کی

صحبت میں گزاری۔ البتہ ہو سکتا ہے بعض مجذوب جیسا کہ عہد حاضر میں دیکھا جاتا ہے بھنگ کا استعمال

کرتے ہیں اس لئے کبھی ان کی پیروی میں ایسا کیا ہو۔ جیسا کہ ان کے درج ذیل شعر سے واضح

ہوتا ہے۔

شادم کہ فطرت نیست تریا کی تعین وہمیکہ می فروشم بنگ است وگاہ گاہ است

خوشی ہے کہ میری فطرت میں تریاک یعنی افیون کی عادت نہیں ہے ہاں اگر وہم فروشی کرتا

ہوں تو وہ بھنگ (نشے کی پتی) کا استعمال ہے اور وہ بھی گاہے گاہے۔

اب ہم رقعات بیدل کی طرف رجوع کرتے ہیں اور بیدل کو کن کن چیزوں کی لت لگ گئی تھی

ان کا سراغ یہاں سے لگاتے ہیں:

(الف) بیدل کو حقہ کشی بہت پسند تھی۔ جن احباب کو بیدل کے اس ذوق کا علم تھا وہ اسے حقے کی

پیشکش کرتے تھے چنانچہ میرضی وحدت کے نام ایک خط میں اس نے اس کا شکریہ ادا کرتے

ہوئے لکھا ہے:

”حقہ ہای تخایف بہ قتل مثنوی بینائی کردہ اند“ (۹۳۲)

خفے میں بھیجے گئے حقے مثنوی کے قتل سے بینائی کا رول انجام دے رہے ہیں۔ اور کبھی خود

بیدل اپنے احباب کو بھیجا کرتا تھا جیسا کہ مرزا فاضل بیک کے نام ایک خط سے مستفاد ہوتا ہے۔

”حقہ مفرجی، کہ چوں سر سودایان شوق، خالی از گرمی خیالی نیست، بذوق نشاء قبول

آں محفل آرای دماغ فطرت مرسول گردیدہ بود۔“ (۹۳۳)

فرحت بخش حقہ جو سودایان شوق کے سر کی طرح گرمی خیال سے خالی نہیں ہے دماغ فطرت

کے اس محفل آراء کے ذوق نشاء قبول کا پاس و لحاظ رکھتے ہوئے روانہ خدمت ہوا تھا۔

یہاں لفظ ”حقہ مفرجی“ کی ترکیب بتاتی ہے کہ بیدل شاید تمباکو میں ایسی کوئی چیز شامل کرتا تھا

جو سرد و انبساط میں اضافہ کر دے۔ خوشگو نے بھی بیدل کی حقہ کشی کا ذکر کیا ہے۔

”یک غلامی داشتند ”مضمون“ نام چنانکہ فقیر گفتہ:

بیدل کہ تخت گاہ فصاحت مقام اوست معنی کینز او شد و مضمون غلام اوست

اکثری آل غلام را برای تازہ کردن چلم قلیان یا امر دیگر طلبید۔“ (۹۳۳)

”مضمون“ نام کا ایک غلام بیدل کے یہاں رہتا تھا جیسا کہ فقیر خوشگو نے کہا ہے (بیدل جس

کا مقام تخت گاہ فصاحت ہے معنی اس کی کینز ہے تو مضمون اس کا غلام ہے) بسا اوقات اس غلام کو چلم

تازہ کرنے یا کسی اور کام کے لئے آواز دیا کرتا تھا۔

(ب) بیدل کو اکثر موسیقی پھل جیسے آم، خرپوزہ، انناس اور قند وغیرہ بہت پسند تھے۔ اس کے احباب

خصوصاً نواب شکر اللہ خاں، شا کر خاں اور دوسرے لوگ اکثر یہ پھل اسے تحفے میں بھیجا

کرتے تھے اور بیدل ان کو شکریے کا خط لکھا کرتا تھا (۹۲۹)۔ جیسا کہ بیدل کے احباب کے

ضمن میں لکھا گیا۔ شکر اللہ خاں کے نام ایک خط میں لکھتا ہے:

ہمہ گر در سہارنپور بالہ بدہلی بایدش محمل کشیدن (۹۳۵)

اگر یہ آم سارے سہارنپور میں پیدا ہوتے ہیں تو سب کو لا کر بدہلی لانا چاہئے۔

آم کے لئے اس کے اشتیاق کا یہ عالم تھا، جس کی بنا پر نواب شکر اللہ خاں سہارنپور سے برابر

اس کو بدہلی بھیجا کرتے تھے۔

(ج) روغنیات سے متعلق چیزیں جیسے روغن گل اور روغن بادام بیدل کی پسندیدہ چیزیں تھیں۔ ایسا

لگتا ہے کہ لکھنے پڑھنے میں کثرت سے مصروف رہنے کی وجہ سے، جیسا کہ ایک خط میں اس کا

تذکرہ کیا ہے، بیدل کے دماغ میں اکثر خشکی پیدا ہو جاتی تھی اس وقت اسے اس قسم کی

روغنیات کی ضرورت پڑتی تھی۔ اس کے احباب خصوصاً نواب شکر اللہ خاں و نواب شا کر خاں

جیسا کہ متعدد خطوط سے معلوم ہوتا ہے اسے روغن گل اور روغن بادام بھیجا کرتے تھے۔ (۹۳۶)

(د) موسیقی سے بھی بیدل کو کافی دل و لچپی تھی۔ اس سے پہلے اس سلسلے میں خوشگو کا قول نقل ہوا اور



اب مرزا فضائل کے نام بیدل کا ایک خط ”بہ مرزا فضائل در طلب غچک مرتب“ کے عنوان سے ملاحظہ ہو:

”مخلص نواز! اگر حسن بیباختہ غچک باریش گیسوی تار سلسلہ پیرای غنمات وفاق گردیدہ باشد، بی نوائیان محفل آرزو را صد اداری موصول مقامات سرور گردانند، کہ نفس مترود چون کمانچہ متعید خراش سینہ است۔ ونگاہ منتظر چون موی چینی محو کاسہ چشم۔ مضرب شوق را متحرک و زمر نہ تنار اقتصاد انگارند۔“ (۹۳۷)

مخلص نواز! اگر ”غچک“ (سارنگی) کا حسن بے ساختہ گیسوئے تاریکی آرایش کی خاطر غنہ ہاں وفاق کا سلسلہ پیرا ہو تو محفل آرزو کے بیواؤں کو آواز کی مانند مقامات سرور تک پہنچانے کی زحمت کریں۔ کیونکہ نفس مترود کمانچہ کی طرح خراش سینہ کی پابند ہے اور نگاہ منتظر موی چینی کی طرح کاسہ چشم میں محو ہے۔ مضرب شوق کو رواں اور زمر نہ تنار کو دواں تصور کریں۔

غیاث الدین کی تشریح کے مطابق غچک ایک قسم کے باجے کا نام ہے جو ہندی زبان میں سارنگی کی طرح کا ہوتا ہے اور اسے کمانچہ کہتے ہیں (۹۳۸) اگر یہ سارنگی وہی ہے جس کو ہم اپنے معاشرے میں بعض فقیروں کے پاس بھیک مانگتے ہوئے دیکھتے ہیں تو پھر کہنا چاہئے کہ بیدل کا ذوق کچھ زیادہ اچھا نہ تھا اس لئے اس بات کا امکان ہے کہ وہ سارنگی سے نزدیک ہو۔

بہر حال خط کشیدہ عبارت موسیقی سے اس کی دلچسپی اور اس کے اشتیاق کو پوری طرح واضح کرتی ہے۔ موسیقی سے دلچسپی ہی کی وجہ سے اس کی غزلوں میں، غنائیت اور موسیقی کے ذریعہ بزم نظر آتے ہیں۔ قاضی عبدالودود مرحوم نے بھی اس خصوصیت کا اعتراف کیا ہے۔

لباس و پوشاک:

بیدل کے لباس کے بابت خوشگو لکھتا ہے:

”مرزائی از سراپائیش می بارید۔“ (۹۳۹)

اس کے پورے حلیے اور سراپا سے مرزائی پتہ چلتی۔

مرزا اصل میں امیر زادہ یعنی امیر کا بیٹا اور سردار زادہ کو کہتے ہیں۔ ایران میں اس لفظ کا اطلاق سادات پر ہوتا ہے پس خوشگو کا مقصد شاید یہ ہے کہ لباس پوشاک کے لحاظ سے اس کی شکل و صورت اور وضع قطع سے سرداری پتہ چلتی تھی۔ بیدل کے بیان سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خوش پوشاک آدمی تھا اور اپنی ظاہری وضع قطع ایسی نہیں رکھتا تھا کہ کوئی اس کو سائل یا گرا ہوا تصور کرتا جیسا کہ بہت سے خود ساختہ

درویش اپنے کو ظاہر کرتے ہیں۔ اکبر آباد میں قیام کے دوران ایک دفعہ وہ سخت گرسنگی کا شکار ہوا۔ اس موقع پر اپنی ظاہری وضع کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

”وضع ندا شتم کہ کسی محتاج تصور نماید۔“ (۹۴۰)

میری وضع قطع ایسی نہ تھی کہ کوئی مجھے نادار اور سائل تصور کرتا۔

رقعات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر خرقہ (گڈری یا پرانا جامہ) گلیم (کبل) کبل سیاہ (سیاہ کملی) چھینٹ کے جامہ دار (ایک قسم کی پھول دار چھینٹ) ڈوریہ ہاں سفید (ایک قسم کا ولایتی دھاری دار باریک کپڑا) جن کو وہ ”زمتانی پوشاک (سردیوں کا لباس) سے تعبیر کرتا تھا، ان کے علاوہ پارچہ گزی (ایک قسم کا موٹا سوتی کپڑا) اس کے استعمال میں رہے ہیں جو اکثر نواب شکر اللہ خاں اور نواب شاہ کر خاں اسے ہدیہ بھیجا کرتے تھے (۹۴۱)۔

یہ سارے لباس ہماری نگاہوں کے سامنے ایک ایسی شخصیت کی تصویر پیش کرتے ہیں جو قلندر سے قریب قریب ہو۔ میر حسین دوست لکھتا ہے کہ دستار کی جگہ پہنہ استعمال کرتا تھا۔ پہنہ چھوٹے دستار کو کہتے ہیں جو سر پر باندھا کرتے ہیں۔ (۹۴۲)

آخر میں بیدل کی سیرت پر اس کی ایک غزل بڑی روشنی ڈالتی ہے جو ترجمہ کے ساتھ پیش ہے۔ بنای رنگ فطرت بر مزاج دوں نمی باشد زمین خانہ خورشید جز گردوں نمی باشد پست و دنی الطبع لوگوں پر رنگ فطرت کی اساس قائم نہیں ہوتی۔ خانہ خورشید کی سر زمین آسمان کے سوا کوئی نہیں ہے۔

تکست کار دنیا نیست تشویش دماغ من خیال موی چینی در سر مجنون نمی باشد دنیاوی امور میں تکست و ناکامی میرے دل و دماغ کے لئے موجب پریشانی نہیں۔ موی چینی کا تصور مجنوں کے صفہ دماغ پر نہیں ابھرتا... میں آزاد منش ہوں اور مست مولا ہوں۔

کمند ہمتم گیرائی دارد کہ چوں گردوں سرمن نیز از فزاک من بیرون نمی باشد میری ہمت کے کمند میں اتنی گیرائی ہے کہ آسمان کی طرح میرا سر بھی میرے شکار بند سے باہر نہیں آتا۔۔۔ میں عالی ہمت و بلند حوصلہ ہوں۔

کہ دارد طاقت سنگ ترا زوی عدم بودن کم چنداں کہ از من ہچیک افزوں نمی باشد ترا زوئے عدم کے باٹ بننے کا کس میں کس بل ہے میں اتنا ہی کم ہمتی ہوں کہ مجھ سے زیادہ ہلکا کوئی نہ ہوگا۔

دم تقریر اگر گاہی نفس دزد مکن عییم بطور اہل معنی سکتہ ناموزوں نمی باشد



تقریر کے وقت اگر دم لینے کے لئے رکا تو میری عیب جوئی نہ کرو۔ اہل معنی کے نزدیک سکتے ناموزوں نہیں ہوتا ہے۔ کلام میں اگر سکتہ نظر آئے تو اس پر عیب نہ کرنا۔  
بسامان لباس از سعی رسوائی تمرا کن عبارت جز گریباں چا کی مضمون نمی باشد  
سامان لباس کے ہوتے ہوئے رسوائی کے جتن سے بیزار رہو۔ عبارت مضمون کی گریبان چا کی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

دریں عبرت فضا تا کی بساط کرو فرچیدن زمانی بیش گرد سیل در ہا موں نمی باشد  
اس عبرت سرا کے ماحول میں کرو فر کی بساط کب تک بچھاتے رہو گے۔ سیلاب کا سارا زور دریا میں تھوڑی دیر سے زیادہ نہیں رہتا۔ جاہ و حشمت سے دور رہتا ہوں۔  
زرو مال آنقدر خوشتر کہ خاکش کم خورد بیدل تلاش گنج جز سر منزل قاروں نمی باشد  
بیدل! مال و دولت بس اتنی ہی بہتر ہے جسے خاک نہ کھائے۔ تلاش گنج میں سرگرداں رہنا تو قاروں کی منزل تک پہنچنا ہے۔ بقدر کفاف روزی بہتر ہے۔

صاف دلی:

میستم جرعه کش درد کدورت بیدل چوں گہر صافی دل بادہ مینائی من است  
میں کدورت کا تلچھٹ نہیں پیتا ہوں۔ موتی کی طرح میرا مینا صاف دلی ہے۔

شرم و حیا:

ز انفعال سرشمد نقش پا بیدل تری بروں رود از طبع آب دشوار است  
میری خمیر میں حیا و شرم کوٹ کوٹ کر بھردی گئی ہے۔ پانی کی طبیعت سے تری ختم ہو جائے ممکن نہیں ہے۔

انکساری و خاکساری:

دیدہ تا دل فرش راہ خاکساری کردہ ام از نفس تا موج مژگاں بوریا افتادہ است  
آنکھ سے لے کر دل تک سارے اعضا کو راہ خاکساری میں بچھا دیا ہے سانس سے لے کر پلک تک بوریا پچھی ہے۔

ادب و تمیز:

با ادب جو شیدہ ای بیدل ز ہریاں دم مزن موج گوہر بستہ را شوخی نخواہد بیش رفت  
بیدل ادب و تمیز کی رعایت کیسا تھ تمہاری پرورش ہوئی ہے اس لئے ہریاں گوئی مت کرو۔

کسی سے گلہ شکوہ نہیں:

دماغ شکوہ ندارم و گرنہ می گفتم بدو ستاں ز فراموشیم دعا برسد  
شکوے کا مزاج نہیں ہے ورنہ میں کہتا دوستوں کو ان کی فراموشی کے سبب دعا پہنچے۔

شوخی طبع:

بیدل مزاج کے لحاظ سے شک قسم کا نہ تھا بلکہ شوخ طبع، شعلہ مزاج، بذلہ سخ اور سدا بہار شخصیت کا مالک کا تھا۔

ز طبع شوخ این ہمہ در بند کلفتم بستند چون شرار بنگ آشیان ما  
بحر رازم، بیچ و تاب فکر گرداب من است شوخی طبع رسا امواج بیتاب من است  
ز بسکہ دشمن آسودگی است طینت من چو شعلہ می شکند رگم از شکستن تب  
طبعم از آشفتگی دام صفای دیگر است در خور امواج باشد حسن روز افزوں آب  
چہن طبیعت بیدل ادب آبیار آشفتگی است زده است ساغر رنگ و بو بدماغ غنچہ بہار ما  
پیر گردیدی و شوخی یکسر موکم نہ شد پیکر خم گشتہ ات پچشم ابروی خم است

بیدل کا اندرونی اضطراب:

بیدل دہلی میں اپنے احباب کے درمیان نسبتاً ایک آسودہ اور مطمئن زندگی گزار رہا تھا کہ اچانک ایک زبردست اضطراب اور ہیجان اس کے دل میں برپا ہوا۔ یہ اضطراب درحقیقت دہلی میں قیام کے دوران اس کے چند سالہ مشاہدات کا نتیجہ تھا۔

شکر اللہ خان ثانی کے نام بیدل نے ایک خط ”در عرض احوال خود“ کے عنوان سے لکھا ہے۔ یہ خط کب لکھا گیا صحیح طور پر نہیں کہا جاسکتا لیکن اس خط سے پہلے جو خطوط لکھے گئے ہیں یا ترتیب میں آئے ہیں ان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱۲۲ھ/۱۷۱۰ء میں کام بخش پر بہادر شاہ کی فتح کے بعد لکھا گیا ہے۔

اس خط کا موضوع ہے ”انسان کی موہوم ہستی“۔ ہمیں معلوم ہے کہ پہلی جنگ جانشین کا جو

اورنگ زیب اور اس کے بھائیوں کے درمیان ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۷ء میں ہوئی تھی اس کا اس نے دور سے مشاہدہ کیا تھا۔ اور اب دہلی میں مستقل سکونت کے دوران ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء میں اعظم شاہ اور بہادر شاہ کے درمیان دوسری دفعہ، پھر ۱۱۲۲ھ/۱۷۱۰ء میں بہادر شاہ اور کام بخش کے درمیان تیسری دفعہ اور ۱۱۲۳ھ/۱۷۱۲ء میں جہاندار شاہ اور اس کے بھائیوں کے درمیان چوتھی مرتبہ پھر اسی سال محمد فرخ سیر اور جہاندار شاہ کے درمیان پانچویں دفعہ جنگ جانشینی کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا۔

آخر کی ان چار خونیں جنگوں کے نتیجے میں سیاسی اسٹیج پر جو انقلابات رونما ہوئے ان سے کیا شاہ و کیا گدا، کیا امیر و کیا غریب، کیا خواص اور کیا عوام سارے طبقے براہ راست یا بالواسطہ متاثر تھے۔ بیدل نے اس عروج و زوال، پستی و بلندی، نشیب و فراز اور اتار چڑھاؤ کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا اور ان سے متاثر تھا اور عبرت حاصل کرتا تھا۔ جیسا کہ اس کی پرچھائیں اس کے بعض اشعار میں موجود ہیں: از انقلاب دہر بیدل کارم از طاقت گذشت بعد ازیں از سخت جانی سنگ بردل بستان است زمانے کے انقلاب کی بدولت میرا معاملہ یا میرے حالات اب برداشت سے باہر ہو گئے اب اس کے بعد سخت جانی کی وجہ سے دل پر پتھر رکھنا ہوگا۔

اوج و اقبال جہان را پایہ فرصت کجاست گو بہ اشکی چند بر بام سر مژگان برآ دنیا کے عروج و اقبال کو کہیں نکاؤ کی فرصت نہیں (انقلاب سے متاثر لوگوں سے کہدو) آنسوؤں کے چند قطرے بن کر پلکوں کے بام سے باہر نکل آئیں۔

خاک غم گل می کند سامان خشکی از غبار سیر کن ہنگامہ اقبال و ادبار مرا ترمی غبار سے خشکی کے ساز و سامان نمایاں کرتی ہے۔ ہمارے اقبال و ادبار کا تماشا دیکھو۔

غافلند از باب جاہ از پستی اقبال خویش زیر پا بودست صدر آرائی اورنگ ہا از باب جاہ و شہمت اپنے عروج و اقبال کی پستی سے غافل ہیں۔ اورنگ شاہی کی صدر نشینی پاؤں تلے پامال ہوتی رہی ہے۔

کردیم تماشای ترقی و تنزل آئینہ ما ہر نفس از ما بتری داشت ترقی و تنزل اور عروج و زوال کا تماشا ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ ہمارے آئینہ دل کا حال ہر آنے والے لمحے میں پہلے سے بدتر ہوتا جا رہا ہے۔

اوج دولت سفلہ طبعاً نرا دور روزی بیش نیست خاک اگر امروز بر چرخ است فردا زیر پاست دولت و حکومت کا عروج بیوقوفوں کو دودن سے زیادہ حاصل نہیں ہے خاک اگر آج آسمان پر ہے تو کل پاؤں تلے پامال ہو رہا ہے۔

سلطنت و ہمت بیدل، خاکسار عجز باش افسر ما چوں رہ خوابیدہ نقش پاپس است بیدل! سلطنت ایک وہم ہے عجز و انکساری اور تواضع و خاکساری اختیار کر۔ خوابیدہ راستے (جس پر کوئی نہ چلے) کی طرح ہمارے تاج کے لئے نقش پاکافی ہے۔

فلک تکلیف جاہت گر کند فال حماقت زن کہ غیر از گاو نتواند کشیدن بار دنیا را آسمان اگر کبھی تجھے جاہ و مرتبہ عطا کرے تو اسے حماقت پر محمول کر کیونکہ دنیا کے بوجھ کو تیل بھینس کے سوا کوئی اور نہیں کھینچتا۔

ازاں زماں کہ بسر کشکی است نسبت من از ازل زماں کہ بسر کشکی است نسبت من سنگی بنگر بستہ ام از سختی ایام آئینہ ام و جوہر فولاد من اینست لشکر کز گرم و سرد دہر داغ عبرتم شعلہ را باید بحالم تا ابد لرزید و سوخت در محیط حادثات دہر مانند حباب از دم خاموشی ماسخ ہستی روشن است کجاست امن کہ در مرغزار لیل و نہار بہر طرف نگری یک پلنگ می گذرد فیل صاحب منصب است، گاو و خر روز پندار فخر انسانی ز روی منصب و روزیہ نیست ما درد سر ز افسر دولت نمی کشیم بخت سیاہ ما چہ کم از سایہ ہماست امروز قدر ہر کس مقدار مال و جاہ است آدم نمی توان گفت آنکس کہ خر نباشد ز نا ہنجاری مغرور جاہ ایمن مشو بیدل لگد اندازی در پردہ ہر کہ خر دارد غرض ان انقلابات نے بیدل کو انسان کی ”موہوم ہستی“ کی طرف متوجہ کیا۔

دارم بیدل از ”ہستی موہوم“ غباری ای سیل بیا خانہ آباد من اینست وہ اس وقت اپنے بعض ہمعصر لوگوں کی طرح غیر معمولی قلبی اضطراب سے دوچار اور دنیا سے انتہائی دل برداشتہ دکھائی دیتا ہے۔ حوادث و آلام سے بھری اس زود گذر زندگی کے مقابلے پر وہ کسی قسم کی خوشی اور آسودگی محسوس نہیں کرتا۔ شکر اللہ خاں ثانی کے نام اپنے ایک خط میں ”در عرض احوال خود“ کے عنوان سے لکھتا ہے:

”طلسم حیرت بنای زندگی بفسون دوسر نہ بستہ اند، کہ بتا شیر نفس در سینہ دزدیدن کفیل آسودگیش توان گردید۔ یا بتدبیر سنگ بردل بستان پیام راحتش توان رسانید۔ غباری در کوچہ بند تعلق ہوا افتادہ، اگر گردن ہوس برافرازد، دماغ گرد بادی بلند آشتی بہم رساندہ با شد و اگر بفکر آرایش تمکین پردازد، خاک گمشتگی بفرق تو ہم افشا نہ باشد۔ در فراہم آوردن اسبابیکہ رابطہ سلسلہ زندگی در دیدہ ایم، نعمات آشتی و پراگندگی نیز از همان ساز و عشرت

آہنگ شنیچہ اجم۔ نہ فطرت را از وضع ترکیب جو ارج خبریست کہ بضبط اعمال واقعاتش  
تواند کوشید۔ و نہ از کیفیت حرکات و سکنات حواس و قوی اثری، کہ با آثار و احوال آن تواندوار  
سید۔ ہا این برگ و ساز، عجب تر آنکہ از وجدان ہر خیال ہنگامہ وجدی بصور چیدن است۔  
واز فقدان ہر مطلبی، مگر بیان چندین قیامت دریدن۔ کاش تماشای این نیرنگ، ہم بیانی  
داشتہ باشد۔ تا با وہام اعتعاش، خرسندی ساختہ را، پیش طبع مشوش توان ساخت۔ یا بہ تحلیل  
آلام بالترام بیدماغی جاوید باید پرداخت۔ نفس نیم نفس بگوشہ دل نیا رامید۔ و نگاہ یک معرہ  
در خانہ چشم واکشید۔ تنگ و تاز محض تنگ و تاز است و نشیب و فراز محض نشیب و فراز است۔  
اشکال این خیالات ہر چند بازی تصوری کم، دل بکج خورسند باور ندارد۔ و نقوش این آثار  
ہر قدر باطل می اندیشیم، یقین خود پسند عرض نمی شمارد۔ حیرانیم ما را باین محفل کہ خواند، و حنائ  
بیرنگی باین رنگ کہ گرداند۔“ (۹۳۳)

اساس زندگی کا طلسم حیرت و سوسہ کے جادو سے وابستہ نہیں ہے کہ سانس کے سینے میں اٹکنے کی  
تاثیر سے اس کی آسودگی کا کفیل ہوا جاسکتا ہے یا دل پر پتھر رکھنے کی تدبیر سے اس کی راحت کا پیام  
پہونچایا جاسکتا ہے۔ گلی کے اندر پڑا غبار ہوا کی قید و بند میں ہے۔ اگر ہوس کی گردن ذرا بلند کرے گرد  
باد کا دماغ اسے فوراً آشفٹہ و پراگندہ کرے گا۔ اگر اپنی جگہ ٹکے رہنے کی فکر کرے تو گم ہشتگی کی خاک  
تو ہم کی پیشانی پر اڑائے۔

جن اسباب کی فراہمی میں سلسلہ زندگی کے رابطے کو درہم برہم کیا ہے، آشفٹگی اور پراگندگی کے  
نفع بھی اسی ساز و شرت آہنگ سے سنے ہیں۔ نہ تو انسانی فطرت کو اعضاء و جوارح کی ترکیب کی صورت  
حال کی خبر ہے کہ اپنے اعمال و افعال پر کنٹرول کرنے کی کوشش کر سکے اور نہ حواس و قوی کی حرکات و  
سکنات کا اس پر کوئی اثر ہے کہ اس کے آثار و احوال پر غور کر سکے۔ اس سر و سامان کے ساتھ حیرت انگیز  
امر یہ ہے کہ ہر خیال کے عملی جامہ پہننے سے وجد و سرور کا ہنگامہ عالم تصور میں برپا ہو جاتا ہے۔ (بڑی  
خوشی حاصل ہوتی ہے) اور ہر مطلب کے فقدان یا پورا نہ ہونے سے کئی قیامت کے گریباں چاک  
ہوئے ہیں (بے انتہا غم ہوتا ہے) کاش اس نیرنگ کے تماشایں بھی کوئی بیان مضمر ہوتا تاکہ حصول خوشی  
کے وہم میں بناوٹی خوشی کو طبع مشوش کے ساتھ ہماہنگ کیا جائے یا مصائب و آلام کا خیال کر کے دائمی  
بے صبری اور بدمزاجی کے التزام میں مصروف رہا جائے۔ گوشہ دل میں سانس بلکہ نیم سانس کو بھی آرام  
کی نوبت نہیں آئی اور خانہ چشم میں نگاہ کو پلک جھپکنے بھر بھی وا ہونے کا موقع نہ ملا۔ تنگ و تاز اور جد و جد  
محض تنگ و تاز اور نشیب و فراز محض نشیب و فراز ہے۔ ان خیالات کی شکلوں کو اگرچہ ایک کھیل تماشائے

زیادہ نہیں سمجھتا ہوں لیکن دل جو کسی چیز سے خوش نہیں ہے اس کو ان باتوں کا یقین نہیں ہوتا ہے اور ان  
آثار کے نقوش کو میں جس قدر غلط اور باطل سمجھتا تھا یقین خود پسندان کو کوئی اہمیت نہیں دیتا ہے۔ حیران  
ہوں اس محفل میں ہمیں کس نے بلایا اور نیرنگی کی باگ کو اس انداز سے کس نے موڑا۔

سادات بارہ کا واقعہ اور بیدل کالا ہو کر فرار:

بیدل اس عالم اضطراب میں زندگی گزار رہا تھا کہ ایک انوکھا واقعہ پیش آیا۔ ایسے وقت میں  
جب کہ بیدل کو ہر قسم کی ذہنی تازہ سے پاک سکون کی زندگی مطلوب تھی یہ واقعہ اس کے لئے مزید  
بے سکونی کا سبب ثابت ہوا۔

پہلے باب میں ہم نے پڑھا کہ محمد فرخ سیر سادات بارہہ (سید عبداللہ خاں صوبیدار الہ آباد،  
سید حسین علی خاں صوبیدار بہار) کی مدد سے اقتدار کی کرسی تک پہونچا تھا۔ ان کی خدمت کی قدر دانی  
کے طور پر اس نے بڑے بھائی کو وزارت اور چھوٹے کو امیر الامراء کے اعزاز سے نوازا تھا۔

چند سال کے بعد سادات بارہہ اور فرخ سیر کے درمیان کسی بات پر کدورت پیدا ہو گئی۔  
قطب الملک سید عبداللہ خاں نے اپنے بھائی امیر الامراء سید حسین علی خاں کو جو اس وقت دکن کے  
صوبیدار تھے اپنے پاس بلالیا۔ دہلی آنے کے بعد دونوں بھائی ۲۸ ربیع الاول ۱۱۳۱ھ / ۸ فروری  
۱۷۱۹ء کو اندرون قلعہ بادشاہ کی خدمت میں پہنچے اور اپنے کچھ معتمد نوکروں کو مناسب جگہوں پر تعینات  
کروا۔ دس دن کے بعد ان لوگوں نے اپنے نوکروں کو حرم شاہی میں بھیجا۔ فرخ سیر وہاں سادات کے  
خوف سے چھپا بیٹھا تھا۔ سادات کے نوکروں نے فرخ سیر کو انتہائی رسوائی کے ساتھ باہر لایا اور  
سادات کے حسب حکم قلعہ ترپولہ میں قید کر کے اس کی آنکھوں میں سلاخی کھنچوادی۔ ٹھیک دو مہینے بعد  
۱۲ جمادی الثانی کو قطب الملک کے اشارے سے قید خانے میں اسے مار ڈالا گیا۔ (۹۳۳)

بیدل، جس نے یہ سارے واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ خاموش نہ رہ سکا اور ایک  
رباعی میں سادات کے اس رویہ پر سخت تنقید کی بلکہ اسے سراسر ظلم و بربریت سے تعبیر کیا:

دیدنی کہ چہ باشاہ گرامی کردند صد جور و جفا از رہ خامی کردند  
تاریخ چو از خرد بجمستم فرمود سادات بوی نمک حرامی کردند

تو نے دیکھا کہ شاہ گرامی قدر کے ساتھ ان سادات نے کیا سلوک کیا؟ نا سنجی سے اس پر ظلم و  
ستم کے پہاڑ توڑے۔ جب عقل سے اس کی تاریخ پوچھی تو اس نے کہا ”سادات نے اس کے ساتھ  
نمک حرامی کی۔“

اس امر ملح کہ جرم سادات کا تھایا بادشاہ کا لوگوں میں بڑا اختلاف ہے۔ غلام علی آزاد بکگرای لکھتے ہیں:

”..... دروا خرد دولت راہ غلط پیوند و تار و قیامت داغ بدنامی بر خود بردند۔ اما زدار باب انصاف، منشاعزل بادشاہ محض پاس آبر و وحفظ جان عزیز بود کہ انہما مدت العمر جانفشانی نمودند و لوازم دولت خواہیہا بتمدیم رسانیدند، بادشاہ چشم از حقوق پوشیدہ در صدر قلع و قمع افتاد و تازندہ بود ہمیں خیال در سر داشت۔ آخر این رای سقیم باعث زوال سلطنت شد و دولت پادشاہ و سادات ہر دو بر ہم خورد۔“ (۹۳۵)

حکومت کے آخری زمانے میں انہوں نے غلط روش اختیار کی اور قیامت تک کے لئے بدنامی کا داغ اپنے سر لے گئے۔ لیکن ارباب انصاف کے نزدیک بادشاہ کو تخت سلطنت سے معزول کرنے کے پیچھے سادات کا مقصد اپنی عزت و آبرو اور جان و مال کی حفاظت کرنا تھا کیونکہ ان لوگوں نے ساری زندگی اس کے لئے جانفشانی کی تھی اور حکومت کی خیر خواہی میں تمام ضروری کام انجام دیئے تھے۔ بادشاہ ان کے حقوق سے چشم پوشی کر کے ان کو قلع قمع کرنے کے درپے ہو گیا اور جب تک زندہ رہا یہی خیاب اس کے سر میں سایا رہا۔ آخر یہ سقیم رائے سلطنت کے زوال کا سبب ثابت ہوئی اور بادشاہ کی حکومت اور سادات کا اقتدار دونوں ہی ختم ہو گیا۔

بچ پوچھے تو لوگ ویلیام ہیل کے مطابق دو طبقے میں بٹ گئے تھے۔ کچھ لوگ محمد فرخ سیر کے طرفدار تھے اور کچھ سادات کے۔ بیدل بادشاہ کے طرفداروں میں نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ شاید فرخ سیر کا بیدل کے ساتھ حسن سلوک رہا ہو جیسا کہ غلام حسن مجددی کا خیال ہے (۹۳۵) لیکن سادات سے بھی بیدل کے تعلقات کچھ کم مخلصانہ نہ تھے بلکہ بادشاہ کی نسبت وہ سادات سے زیادہ قریب تھا جیسا کہ بیدل کے احباب کے ضمن میں اس امر پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ سادات بھی بیدل کی بڑی قدر کرتے تھے اس لئے اس بات کا امکان ہے کہ معاملہ کچھ ایسا ہی رہا ہے جس کو بیدل نے رباعی میں بیان کیا ہے۔

حال میں ایک کتاب ”سیدان بادشاہ گر“ کے نام سے لاہور میں چھپی ہے جس کے مرتب ڈاکٹر سید صفدر حسین ہیں اور جو ”تاریخ فرخ بخش“ مؤلفہ محمد فیض بخش کا کوروی کے بیان کی اساس پر لکھی گئی ہے، اس کتاب میں مؤلف اور مرتب ہر ایک سادات بارہہ کے طرفداروں میں نظر آتے ہیں۔ تاریخی کتب کے حوالے سے انہوں نے ساری کوشش اس بات پر صرف کر دی ہے کہ سادات بارہہ کو فرخ سیر کے قید کرنے اور مار ڈالنے میں حق بجانب ثابت کریں۔

اس سلسلے میں گفتگو کا سلسلہ دراز کرتا ہوا مصنف لکھتا ہے کہ سادات کے بارے میں جو عام

بدگمانی معاشرے میں پیدا ہوئی وہ درحقیقت نظام الملک اور اس کے طرفداروں کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ اور ان کے مفصل حالات کی بنا پر (جس کا اس نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے) کہنا چاہئے کہ نظام الملک اور محمد امین عرفان وغیرہ ہی نے مغل سلطنت کی بنیادیں ہلانے میں اہم رول ادا کیا ہے اور چونکہ آصفیہ سلسلہ دو سو پچیس سال تک قائم رہا اس لئے کسی مورخ کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ حقیقی واقعات بیان کرے اور راہ حق میں ان شہید ہونے والوں کے ساتھ انصاف کرے۔ چنانچہ مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی جس کے شاگردوں میں آصف جاہ اول نظام الملک تھے، اپنے شاگرد کی طرفداری میں کہہ گئے ”دیدنی کہ چہ بادشاہ گرامی کردند الخ“۔ (۹۳۷)

ڈاکٹر صفدر حسین نے اس طرح غریب بیدل کو بھی مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا اور یہ نہ سمجھا کہ دشمن اگر قوی ہے تو نگہبان اس سے زیادہ قوی ہے۔ اس حقیقت کے علاوہ کہ فرخ سیر کے مقابلے پر سادات بارہہ بیدل سے زیادہ قریب تھے، جیسا کہ پچھلے صفحات میں لکھا گیا۔ دلچسپ بات وہ ہے جو ہمارے استاد محترم پروفیسر ولی الحق انصاری صاحب نے فرمایا:

”آصفیہ حکومت صرف دکن میں محدود تھی۔ اس کا دائرہ اثر دکن سے باہر کہیں نہیں تھا پس کیونکر ممکن ہے کہ دکن سے دور دراز علاقے کے مورخوں نے مذکورہ بالا ریاست کے خوف سے حقیقی واقعہ بیان نہ کیا ہو۔“

بہر حال، سارے حالات کے پیش نظر ایسا لگتا ہے کہ بیدل نے جس بات کو حق سمجھا اعلانیہ ظاہر کر دیا۔ عظمت اللہ بختر نے جو سادات کے طرفداروں میں تھا، بیدل کے رباعی کا جواب اس طرح دیا: بادشاہ سقیم آنچہ شاید کردند از دست حکیم ہر آنچہ آید کردند بقر اط خرد نسخہ تاریخ نوشت سادات دواش آنچہ شاید کردند (۹۳۸) سقیم رائے رکھنے والے بادشاہ کے ساتھ جو کچھ کرنا تھا انہوں نے کیا، حکیم ودانا کے ہاتھوں سے جو انجام پاسکتا تھا انہوں نے انجام دیا۔ بقر اط خرد نے اس کی تاریخ یوں لکھی: سادات نے اس کا جو علاج چاہئے تھا وہی کیا۔

اتفاق سے بیدل کی طبع زاد تاریخ ”سادات بوی نمک حرامی کردند“ زیادہ برجستہ اور بر محل واقع ہوئی تھی، اس لئے بہت جلد لوگوں کی زبان پر چڑھ گئی اور اس قدر مشہور ہوئی کہ بیدل کے لئے تشویش کا باعث بن گئی۔ بیدل کو سادات کی طرف سے انتقام جوئی کا خدشہ لاحق ہوا اس لئے مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ سادات کے قہر و غضب سے بچنے کے لئے جھک کر جلد ہو سکے اور جتنی دور ہو سکے فرار کر جائے۔ چنانچہ بے قول آزاد بکگرای، وہ عازم لاہور ہوا۔ لاہور کے صوبہ دار نواب عبدالصمد خاں نے اس کا پر جوش

خیر مقدم کیا اور اس پر اپنی نوازشوں کی بارش کر دی۔ یہ سفر کب پیش آیا صحیح طور پر نہیں کہا جاسکتا ہے لیکن فرخ سیر کی اسارت کی تاریخ کے پیش نظر قیاس کیا جاتا ہے کہ اوائل یا اواخر ربیع الثانی ۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۸ء میں پیش آیا ہوگا۔

اس اثناء میں سادات نے اول ربیع الدرجات بن ربیع الشان اس کے بعد ربیع الدولہ بن ربیع الشان کو دہلی کے شاہی تخت پر بٹھایا جن میں سے ہر ایک تین مہینے کی حکومت کے بعد دنیا سے رخصت ہو گیا۔ آخر جہان شاہ کے بیٹے محمد شاہ غازی کو تخت پر بٹھایا۔ محمد شاہ نے سادات کے غیر معمولی اثر و رسوخ کو دیکھ کر ان کے خلاف سازش کرنی شروع کی۔ آخر کار اس میں وہ کامیاب ہوا جیسا کہ مقدمہ میں گذرا۔ سید حسین علی خاں ۷ ربیع الثانی ۱۱۳۲ھ / ۱۷۱۹ء کو میر حیدر خاں کاشغری کے ہاتھوں مارا گیا اور سید عبداللہ خاں محمد شاہ کے ساتھ معرکہ آرائی میں اول قید ہوا پھر مارا گیا۔

### بیدل کی دہلی واپسی:

سادات کے اقتدار کا سورج ڈوبنے کے بعد بیدل دہلی واپس آیا۔ خوشگو لکھتا ہے: ”در سال ہزار و صد و سیوم در ایامیکہ ابوالفتح ناصر الدین محمد شاہ پادشاہ غازی بر سادات بارہہ مظفر و منصور شد و استقلال سلطنت یافتہ، مدار الخلافہ شاہجہان آباد تشریف آورد۔“ (۹۴۹) ۱۱۳۳ھ میں جبکہ ابوالفتح ناصر الدین محمد شاہ پادشاہ غازی کو سادات بارہہ پر فتح نصیب ہوئی اور سلطنت مستحکم ہو گئی تو بیدل دار الخلافہ شاہجہان آباد واپس آیا۔

قطب الملک کی اسارت کا واقعہ ۱۲ محرم ۱۱۳۳ھ / ۱۷۲۰ء کو رونما ہوا۔ اس لئے قیاس کیا جاتا ہے کہ اس تاریخ کے بعد ہی بیدل دہلی واپس آیا ہوگا۔ اس طرح وہ تقریباً ڈیڑھ سال لاہور میں نواب عبدالصمد خاں (۱۷۱۴ تا ۱۷۲۶ء) کے ہاں قیام پذیر رہا۔ وہاں کے ڈیڑھ سالہ قیام کی تفصیلات کسی تذکرے میں نہیں ملتی ہیں۔ نقوش لاہور نمبر سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ نواب عبدالصمد کے دربار سے میر معصوم وجدان بن میر محمد زمان راسخ، میرزا ابوالحسن قابل خاں، مرزا مقیم اور مرزا محمد بیگ نیرنگ وغیرہ وابستہ تھے اس لئے امکان ہے کہ ان کی صحبتیں ان لوگوں کے ساتھ رہی ہوں۔ نواب خود بھی شعر فہم اور شاعر نواز تھا۔ (نقوش لاہور نمبر ص ۸۸۱ تا ۸۸۳) البتہ واپسی کے بعد بیدل نے جو ایک خط نواب شکر اللہ خاں ثانی کو لکھا اس میں اس واقعہ کا تذکرہ اس طرح کرتا ہے:

”سرگزشت بیدل بیرون از تحریر و تقریر است، ظہور آثار قدرتی کہ شامل ہیچ کس این بیدست و پاست، یکا یک بساط آگہی حاضران آراست۔ تا این بنجر و قالج وجود و عدم، دم

افاقت توانست نمود..... عبرت آگاہان حال مفصل معروض داشتہ باشند۔“ (۹۵۰)

بیدل کی سرگزشت بیان سے باہر ہے اس ناکس اور بے یار و مددگار بندے پر قدرت الہی کے جو آثار نمایاں ہوئے وہ حاضرین کی بساط آگہی کو یکا یک آراستہ کر گئے تاکہ وجود و عدم کے واقعات سے یہ ناواقف شخص کو کچھ افادہ ہو اور بجائے میرے اور لوگ اس واقعہ کو بیان کریں۔ لیکن غفلت سرشت طبیعت پر تنبیہ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ آنکھ کھلنے کے بعد غفلت کی شکلوں کے سوا جس کی وہ حامل تھیں کوئی اور چیز اسے نظر نہیں آتی۔ عبرت آگاہ حضرات نے یہ حالات تفصیل سے بیان کئے ہوں گے۔

نواب نظام الملک کے نام ایک خط میں بھی اس طرف اشارہ کیا ہے:

”قبلہ گاہا! نفس پرورد اشتغال دعا، نیز سانحہ غریبی پیش آمد امان گذشت آنچہ گذشت۔“ (۹۵۱)

قبلہ گاہ! دعاؤں میں مصروف اس بندہ کو بھی ایک انوکھے واقعہ سے سابقہ پڑا لیکن جو کچھ گذرنا تھا گذر گیا۔

لیٹین خاں نیازی نے اپنے ایک مقالہ ”بیدل کے تعلقات“ میں اس واقعہ کی بابت لکھا ہے:

”مرزا کی تعنیقات اگرچہ اس واقعہ پر پوری روشنی نہیں ڈالتیں لیکن ان کا لاہور میں آنا

ثابت ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے ”وقتی غبار قافلہ تجردم از ساحت عرصہ دہلی بہ سیرہ بنجاب دامن

عزم شکست و درائی حمل خیال بہ پیش آہنگی سفر لاہور کر شوق بست۔“ (۹۵۲)

لیٹین خاں نیازی نے بیدل کی تصانیف پر پوری طرح غور و فکر نہیں کیا ہے۔ جیسا کہ بیدل کے حالات میں ہم نے پڑھا، بیدل کی یہ عبارت جس کا حوالہ لیٹین خاں نیازی نے دیا ہے۔ بیدل کے پہلے سفر لاہور سے وابستہ ہے جو ۱۰۸۵ھ / ۱۶۷۴ء میں اس نے کیا تھا۔ کیونکہ چار عشر کی تصنیف کا کام ۱۱۱۶ھ / ۱۷۰۴ء میں مکمل ہو گیا تھا اور بیدل کا دوسرا سفر لاہور جو رباعی کے مشہور ہونے کے بعد اس نے کیا ۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۸ء میں پیش آیا۔ اس لئے اس سفر کا تذکرہ چار عشر میں نہیں ہو سکتا تھا۔ ہاں رقصات میں ہو سکتا تھا لیکن رقصات میں بھی اس نے صرف اشارہ سے کام لیا ہے۔

حسین قلی خاں صاحب تذکرہ ”نشر عشق“ نے لکھا ہے کہ نواب نظام الملک نے مرزا بیدل کو لکھا کہ دکن تشریف لے آئیے۔ بیدل نے اس کے جواب میں درج ذیل شعر لکھ کر بھیج دیا۔

دنیا اگر دہند نہ خیزم زجای خویش من بستہ ام حتای قاعت پپای خویش (۹۵۳)

[دنیا بھی دیں اگر تو نہ جاؤں گا یاں سے میں مہندی لگائی میں نے قاعت کی پاؤں میں (ظفر)]

غلام حسن مجددی نے اس واقعہ کی مزید تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

”در اوائل سال ۱۱۳۳ھ ہجری نظام الملک خود را در دکن مستحکم ساختہ، سپس بیدل را بہ شبہ



جزیرہ مذکور دعوت کرداما بیدل بقناعت حیات بسر می برد، دعوت را نپذیرفت و چنیں پانچ  
داد: دنیا اگر دہندار ہے۔“ (۹۵۳)

۱۱۳۳ھ کے اوائل میں نظام الملک نے دکن پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے بعد بیدل کو وہاں  
بلا لیا لیکن بیدل چونکہ قناعت و سیر چشمی کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا۔ اس نے ان کی دعوت منظور نہ کی اور  
یوں جواب دیا:

”دنیا اگر دہندار ہے.....“

مجددی نے جس قطعیت کے ساتھ یہ بیان دیا ہے میں نہیں جانتا اس کی بنیاد کیا ہے۔  
راقم السطور کے خیال میں یہ ان کا قیاس ہے جو ترتیب واقعات کو سامنے رکھ کر صحیح کہا جاسکتا ہے۔

### بیدل کی وفات:

ایسا لگتا ہے کہ اس تھکا دینے والے سفر کے بعد جو تقریباً اسی سال کی عمر میں کیا تھا بیدل اپنی  
گرتی ہوئی تندرستی کو سنبھال نہ سکا۔ چنانچہ ایک شعر میں کہتا ہے۔  
تو ای پیری! مگر بار نفس برداری از دوشم گراں شد زندگانی بر دل از یاد جوانیہا  
اے پیری! میرے کاندھوں سے سانس کا یہ بار گراں بھی کبھی ہلکا کرے گی؟ جوانی کی یاد میں  
زندگی گراں ہوتی نظر آتی ہے۔

جمعیت حواس بہ پیری طمع مدار شیرازہ نفس چکند با کتاب صبح  
چنانچہ خوشگو کا بیان ہے کہ اسی کے قریب یعنی اواخر محرم ۱۱۳۳ھ/۲۰ء کو وہ تپ محرقہ (انتہائی  
شدید بخار) میں مبتلا ہوا جس کا سلسلہ چار پانچ دن تک قائم رہا۔ پھر جب افاقہ ہوا تو غسل کیا لیکن ایک  
دن کے بعد ہی صفر کی تیسری تاریخ کو بدھ کے دن، شام کے وقت پھر وہی بیماری عود کر آئی۔ ساری  
رات اسی حالت میں گذری۔ اس وقت بیدل کے ایک دوست نواب غیرت خاں بہادر صلابت جنگ  
اس کے پاس موجود تھے۔ خوشگوان کی زبانی بیان کرتا ہے کہ اس حالت میں کبھی بیہوش ہو جاتے اور کبھی  
ہوش آجاتا ساری رات اسی طرح کئی افاقہ کے وقت اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آتی جیسے اپنا شعر پڑھ  
رہا ہو:

جانان بہ قمار خانہ رندی چندند بر نیہ و نقد ہر دو عالم خندند  
رندی و شراب نوشی کے قمار خانے میں حسینان عالم دونوں جہاں کے نقد و نیہ پر کب تک ہنستی

رہیں گی۔

غرض مایوسی کا اس پر غلبہ ہونا شروع ہوا۔ صبح تک اس کی حالت اور غیر ہو گئی آخر ۳ رصفہ ۱۱۳۳ھ  
/۲۰ء کو جمعرات کے دن چھ گھنٹے گزرنے کے بعد ۷۹ سال کی عمر میں خدا کو سدا ہارے۔ (۹۵۵)

یاد رہے کہ بعض تذکرہ نگاروں مثلاً سید محمد بن عبدالجلیل واسطی اور درگاہ قلی خان نے بیدل کی  
تاریخ وفات تیسری صفر ۱۱۳۳ھ لکھی ہے۔ (۹۵۶) لیکن خوشگو نے شاگرد ہونے کے علاوہ اس کے مرض  
الموت سے لے کر وفات تک کے سارے حالات اور کیفیات لکھے ہیں اس لئے اس سلسلے میں اس کا  
قول بظاہر زیادہ مستند معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال خوشگو نے اس وقت مرزا کی وفات پر مادہ تاریخ کہا  
”یوم پنجشنبہ چہارم صفر“ (۱۱۳۳ھ) اس کے بعد رباعی ذیل کہی:

افسوس کہ بیدل زجہاں روی نہفت و اں جوہر پاک درتہہ خاک نہفت  
خوشگو چو عقل کرد تاریخ سوال ”از عالم رفت میر زابیدل“ گفت  
[افسوس کہ بیدل ہوا جہاں سے روپوش کی اس جوہر پاک نے رداے قبر بردوش  
در یافت جو کی عقل سے تاریخ اس کی از عالم رفت میر زابیدل بولایہ سروش] (ظفر)  
آگے لکھتا ہے کہ بیدل کے لاشہ بے جان کو اٹھانے کے بعد اس کے بچے کے نیچے ایک کاغذ ملا  
جس پر بیدل نے ایک غزل اور ایک رباعی لکھی تھی۔ انتقال کے تین دن بعد خوشگو نے مرزا محمد سعید کے  
پاس جو مرزا عبداللہ کے بیٹے اور بیدل کے بھتیجے تھے اس کاغذ کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس غزل کا  
مقطع اس طرح ہے:

بہنمی صبح این گلستاں فشانم جوش غبار خود را عرق چو سیلاب از جبین رفت و مانہ کر دیم کار خود را  
صبح کے وقت اس باغ نے اپنی ساری گرد شبنم پر جھاڑ دی۔ پسینہ سیلاب کی طرح پیشانی سے  
بہتا رہا پر ہم اپنے فرائض حیات انجام نہ دے سکے۔

اس غزل کا مضمون بتاتا ہے کہ بیدل نے اپنی زندگی کے آخری لمحات تک اپنی تخلیقی صلاحیت  
ہاتھ سے نہیں دی تھی اور نہ اس میں کسی قسم کا کوئی فتور پیدا ہوا تھا۔ چنانچہ بڑھاپے میں بھی وہ انداز شوقی کا  
حامل رہا ہے۔ کہتا ہے۔

گر چہ پیرم فارغ از انداز شوقی میستم قامت خم گشتہ ام چشم ابروی خم است  
پیر گر دیدی و شوقی یکسر موکم نہ شد پیکر خم گشتہ ات چشم ابروی خم است

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسے موت کے قریب آنے اور دنیاوی زندگی کے خیر باد کہنے کا احساس  
ہو چلا تھا۔ اس لئے غفلت میں گذری ہوئی زندگی اور تلف شدہ اوقات پر پشیمانی کا اظہار کرتا ہے یہی  
بات اس نے درج ذیل رباعی میں بھی کہی ہے۔

بیدل گلف سیاہ پوشی نشوی تشویش گلوئی نوحہ کوشی نشوی  
بر خاک بمیر و بچمان رو بر باد مرگت سبک است بار دوشی نشوی (۹۵۷)  
بیدل! سیاہ پوشوں اور سوگواروں کے لئے داغ نہ بننا، نوحہ گروں کے گلے کے لئے باعث  
تشویش نہ بننا۔ مٹی پر اپنی جان جان آفریں کے حوالے کر دے اور اسی طرح راہی عدم ہو جا۔ حیرتی  
موت آسان رہے کسی کے لئے بار دوش نہ بننا۔

### بیدل کا مقبرہ:

”آرام گاہ بیدل“ کے عنوان سے ڈاکٹر عبدالغنی صاحب نے ایک گرانقدر مقالہ سپرد قلم کیا ہے  
جو بڑی حد تک جامع نظر آتا ہے ڈاکٹر صاحب موصوف کے خیالات کا خلاصہ کسی قدر ضروری اور مفید  
حذف و اضافہ کے ساتھ پیش ہے۔

بیدل کے مزار کی تحقیق کی ضرورت اس کے لئے پڑی کہ معتبر تذکروں میں جس جگہ بیدل کے  
مزار کی نشاندہی کی گئی ہے وہ اس جگہ سے بہت مختلف ہے جہاں اس وقت موجود ہے۔ خوشگلو لکھتا ہے:

”در همان حویلی اقامت گاہ (حویلی لطف علی کہ بیرون شہر دہلی دروازہ و شہر پناہ در محلہ  
کھیکریان، کنار گذر گہات قرار داد) کہ چوتراہ ای قبر از مدت ده سال راست کردہ بودند  
:بخاک سپردند“۔ (۹۵۸)

اسی حویلی (لطف علی میں جو دہلی دروازہ اور شہر پناہ کے باہر محلہ کھیکریان میں گذر گہات کے  
پاس واقع ہے) جہاں قبر کے لئے ایک چوتراہ دس سال پہلے سے بیدل نے تیار کر رکھا تھا، وہ سپرد  
خاک کئے گئے۔

خوشگلو کی طرح سید محمد بن عبدالجلیل بھی اکثر بیدل کی صحبت میں حاضری دیا کرتا تھا ۱۱۳۳ھ/  
۱۷۲۰ء کے واقعات کے ضمن میں لکھتا ہے:

”ہدیریں سال سیوم ماہ صفر میرزا عبدالقادر بیدل سفر آخرت بر اقامت دنیا برگزیدہ و در دہلی  
نزدیک گذر رسید لطف علی در محن خانہ سکونت خود مدفون گردید۔“ (۹۵۹)

اسی سال تیسری تاریخ صفر کو مرزا عبدالقادر بیدل نے دنیا کے قیام پر سفر آخرت کو ترجیح دی اور  
دہلی میں سید لطف علی کے گذر کے پاس اپنے مکان کے محن میں دفن ہوئے۔

یہ روز نامہ شاید ڈاکٹر عبدالغنی کی نگاہ سے نہیں گذرا۔ آئندہ رام مخلص بیدل کا ایک شاگرد تھا  
۱۱۶۳ھ..... میں اس کا انتقال ہوا، ڈاکٹر عبدالغنی کے مطابق وہ اپنی ایک تحریر چھوڑ گیا ہے جو اس وقت

ڈاکٹر محمد شفیع کے پاس ہے اس میں بیدل کے مزار کے بابت لکھا ہے:

”در سال یکہزار و یکصد و بی و سہ ودیعت حیات سپردند و در محن حویلی قبرایشان است“ (۹۶۰)

۱۱۳۳ھ میں اس دار فانی کو خیر باد کہا اور اپنی حویلی کے محن ہی میں ان کی قبر واقع ہے۔

بیدل کے ان معاصر تذکرہ نویسوں کے علاوہ میر غلام علی آزاد جو بیدل کی وفات کے وقت  
۷۷ سال کے تھے اور اس لحاظ سے ان کو معاصر تذکرہ نگاروں کے زمرے میں شامل کیا جاسکتا ہے،  
اگرچہ ملاقات کی نوبت نہیں آئی، لکھتے ہیں:

”بیدل در محن خانہ خود مدفون گردید۔“ (۹۶۱)

بیدل کو اپنے گھر کے محن میں سپرد خاک کیا گیا۔

ان تمام بیانات کی اساس پر بیدل کے مزار کا محل وقوع یقینی طور پر واضح ہو جاتا ہے اور وہ ہے  
لطف علی کے گھر کا محن جو دہلی دروازہ اور شہر پناہ کے باہر، دریائے جمنا کے کنارے، گذر گہات کے  
پاس اور محلہ کھیکریان میں واقع ہے۔

ڈاکٹر عبدالغنی لکھتے ہیں کہ ۱۱۵۱ھ/ ۱۷۳۸-۳۹ء میں ہندوستان پر نادر شاہ کے حملے اور قتل و  
غار نگری کے وقت نظام الملک دکن سے دہلی آیا۔ اس کا ایک جوان سال درباری ”درگاہ قلی خاں“ اس کے  
ہمراہ تھا۔ قلی خاں تلوار کا بھی دھنی تھا اور قلم کا بھی۔ اس نے ”مرقع دہلی“ کے نام سے ایک کتاب لکھی  
جس میں اس زمانے کے دہلی کے سماجی اور ادبی حالات سے متعلق نہایت اہم امور پر روشنی ڈالی ہے۔  
”عرس بیدل“ کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ بیدل کے مزار کے بابت لکھتا ہے:

”ترتبت موزون ایشان درد دہلی کہند در محوطہ مغر برگ معنی خاص در الفاظ رنگین واقع است۔“

ان کی موزوں قبر قدیم دہلی کے ایک مختصر احاطہ کے اندر اس طرح واقع ہے جیسے مخصوص مفہوم کو  
رنگین الفاظ کے جامے میں پیش کیا گیا ہو۔

مشہور ادیب خواجہ حسن نظامی نے جب اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا تو ان کو خیال آیا کہ  
بیدل کے مزار کی صحیح جگہ اور محل وقوع کی تلاش کی جائے۔ ڈاکٹر عبدالغنی کے خط کے جواب میں خواجہ حسن  
نظامی نے ان کو لکھا۔ یہ خط مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۴۷ء کا ہے۔

میں نے اس کتاب ”مرقع دہلی“ کا اردو زبان میں ترجمہ شائع کیا تو اس پر نوٹ لکھا کہ معلوم  
نہیں مرزا بیدل کا مزار کہاں ہے۔ یہ نوٹ پڑھ کر حضرت مولانا شاہ سلیمان پھولاری نے مجھ کو لکھا کہ  
بیدل کا مزار پرانا قلعہ دہلی کے سامنے حضرت ملک نور الدین یار پراں کے مزار کے قریب ہے۔ میں خود  
وہاں گیا مزار بے نشان ہو چکا تھا مگر جگہ مل گئی تب حضور نظام کو لکھا اور انہوں نے دو ہزار روپے بھیج کر

مزار بنوادیا اور کتبہ بھی لگوادیا۔

اس موقع پر مزار پر جو کتبہ لگوایا گیا اس کی عبارت حسب ذیل ہے:

اس کی ضروری تعمیر و ترمیم اعلیٰ حضرت پر نور آصف جاہ صالح دکن کی توجہات شاہانہ سے

۱۳۵۹ھ ۱۹۴۰ء میں کرائی گئی۔“

لیکن درگاہ قلی خاں کے بیانات بڑی حد تک مبہم ہیں اور مزار بیدل کے محل وقوع کی مولانا سلیمان صاحب کی طرف سے نشاندہی اور خواجہ حسن نظامی کا اسے عملی شکل دینا خوشگو، سید محمد اور آزاد بلگرامی کے بیانات سے متصادم نظر آتا ہے۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ مزار بیدل غلط جگہ پر تعمیر ہوا ہے کیونکہ پرانا قلعہ دہلی دروازہ اور شہر پناہ سے ساڑھے تین کلومیٹر کے فاصلے پر ہے جبکہ مذکورہ بالا تذکرہ نگاروں کے مطابق لطف علی کی حویلی جس کے محن میں بیدل سپرد خاک ہوئے دہلی دروازہ کے باہر گذر گھاٹ کے قریب واقع تھی۔“ (۹۶۲)

یہ تو تھا ڈاکٹر عبدالغنی کے بیان کا خلاصہ ہے۔ راقم السطور جب تحقیق کے سلسلے میں ۱۹۷۴ء میں دہلی گیا اور خوشگو کے حسب بیان مزار بیدل کے محل وقوع پر غور کیا تو اس نتیجے پر پہونچا کہ جس کو خوشگو گذر گھاٹ لکھتا ہے وہ غالباً وہی جگہ ہے جس کو آج راج گھاٹ کہتے ہیں اور یہ گھاٹ دہلی دروازہ کے جنوب مشرق میں تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ ممکن ہے جنمندی اس وقت بہادر شاہ ظفر مارگ سے قریب رہی ہو اس وقت خوشگو کا بیان ”برلب رودخانہ“ درست معلوم ہوگا۔ اس بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ لطف علی کی حویلی اسی کے آس پاس تھی جہاں اس وقت فلک بوس سرکاری عمارتیں کھڑی نظر آتی ہیں۔

اپنی تحقیق کے سلسلے میں پٹنے میں قیام کے دوران وہاں کی مشہور علمی شخصیت قاضی عبدالودود صاحب سے ایک ملاقات ہوئی ان سے دوران گفتگو اس موضوع پر تبادلہ خیال کیا تو موصوف نے ازراہ مذاق کہا کہ خواجہ حسن نظامی نے آصفیہ سے ایک موٹی رقم انٹھنے کے لئے یہ سب ڈرامہ رچا تھا۔ خواجہ عبداللہ اختر نے اپنی کتاب ”بیدل“ میں ”مزار بیدل“ کے بابت ایک واقعہ لکھا ہے جس کا تذکرہ یہاں لطف سے خالی نہ ہوگا وہ لکھتے ہیں:

۱۹۴۰ء میں مجھے دہلی میں چند ماہ قیام کا اتفاق ہوا۔ جو عقیدت مجھے تھی اس کا تقاضا تھا کہ میں اولین فرصت میں فاتحہ خوانی کے لئے مزار پر حاضر ہوتا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ کہاں واقع ہے۔ میرے تصور میں روضہ کا ایک ایسا ہی نقشہ تھا جیسا کہ مشاہیر کا عموماً دیکھ چکا تھا۔ دریافت پر مجھے اتنا معلوم ہوا کہ قبر ریس کورس کے قریب میں ہے میں اس سڑک پر ہولیا جو دہلی سے نظام الدین کو جاتی ہے مگر مجھے

راستہ میں کہیں نشان نہ ملا۔ یہاں تک کہ میں بیدل ہی مقبرہ نظام الدین اولیاء پر پہنچ گیا۔ یہاں میں نے مجاوروں سے دریافت کیا تو ایک نے کہا کہ آپ بیدل کی نسبت دریافت کرتے ہیں جو شاعر تھا۔ مجھے یہ فقرہ سن کر دھکا سا لگا۔ کہا کہ ہاں شاعر تو تھا، اس نے کہا آپ اسی سڑک پر واپس لوٹیں، داہنے ہاتھ بلندی پر مکے شاہ کا مزار ہے وہاں آپ کو لکڑیوں پر مکے آویزاں دکھائی دیں گے۔ عین اس کے سامنے ایک قبرستان ہے وہاں اس شاعر کی قبر ہے۔ آتے ہوئے میں نے مکے لٹکے ہوئے دیکھے تھے اس لئے اطمینان ہو گیا کہ اب مرزا صاحب کے مزار کا پتہ مل گیا میں اس مقام پر واپس آیا۔ سڑک کے کنارے بائیں طرف ایک قبرستان تھا میں نے ان قبروں کو پہلے دیکھا جن کے گرد چار دیواری تھی اور کتبوں کو بھی پڑھا ان میں بیدل کا نام نہ ملا یہ مزار بھی بہت پرانے تھے۔ دیواروں کا کچھ حصہ گر چکا تھا اور کچھ گر رہا تھا اسی طرح اور قبریں بھی دیکھیں جن کے سرہانے کتبے نصب تھے۔ اس فہرست رفتگاں میں بھی مرزا صاحب کا نام نہ تھا۔ کتبوں کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ ان میں بعض اللہ والے بھی تھے جن کے نام کے ساتھ مناسب القاب بھی ہے۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ ان قبروں میں آپ کا پتہ نہیں چل سکتا تو سخت افسردہ خاطر ہوا اور حسرت بھری نظر سے اس عبرت گز کو دیکھتا ہوا پھر سڑک پر اتر آیا۔ معا مجھے خیال آیا کہ آپ کی قبر آخر انہیں میں ایک ہے۔ چلو یہیں کھڑے کھڑے فاتحہ پڑھ لیں۔ سڑک کے کنارے ایک قبر کے سرہانے میں نے فاتحہ خوانی کے لئے ہاتھ اٹھائے اس کے بعد شہر کی طرف لوٹا۔

ایک ماہ بعد مجھے پھر اسی سڑک پر جانے کا اتفاق ہوا دل میں تھا کہ وہیں سڑک کے کنارے پر کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھ لوں گا جب یہاں پہونچا تو میری حیرت کا اندازہ کون کر سکتا ہے کہ یہی قبر جس کے بالین پر میں نے گذشتہ ماہ فاتحہ خوانی کی تھی سینٹ کے پلسٹر سے پختہ بنی ہوئی تھی اور سامنے اس پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔

”مرقد مرزا عبدالقادر بیدل رحمۃ اللہ علیہ“

قبر کے ایک پہلو پر یہ الفاظ تھے ”بہ توجہ اعلیٰ حضرت حضور نظام دکن“ آج اتنے عرصہ بعد مجھے الفاظ یاد نہیں رہے مگر یقیناً یہی کچھ تھے، اگرچہ میری حیرت آمیز مسرت کی انتہا نہ رہی مگر افسوس بھی ہوا کہ خیر بیدل کو تو اس کی پروا نہ تھی کہ اس کے قول کے مطابق بعد وفات اس کا کیا فائدہ ہے کہ ”گل کند مقبرہ ام بہرام“، مگر اعلیٰ حضرت کی شان کے شایان تو کسی طرح نہ تھی۔ اتنا تو مجھے بھی معلوم تھا کہ موجودہ والی دکن کا مورث اعلیٰ آصف جاہ اول بیدل کا شاگرد اور عقیدہ مند تھا مگر یہ راز نہ کھلا کہ اتنی پشتیں گزرنے کے بعد حضور نظام کو تعمیر مرقد کا خیال کیسے آیا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ سب اہتمام ایک عقیدہ مند کی خاطر ہی ہوا کہ افسردہ نہ ہو ورنہ۔



ای مردہ دل آرائش مرقد چہ تمنا ست نام تو ہماں بہ کہ لب گور نگیرد (۹۶۳)  
یہ تھی خواجہ محمد عبداللہ اختر کی سرگزشت۔ اگر اس سال کو خواجہ حسن نظامی کے خط سے مقابلہ کریں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ خواجہ عبداللہ اختر جب ۱۹۲۰ء میں بیدل کے مزار کی تلاش میں نظام الدین پہنچے ہیں تو جس نے ان کی رہنمائی کی وہ غالباً خواجہ حسن نظامی ہی تھے۔ ان کو فوراً یہ خیال آیا کہ بیدل کا ارادہ مند اس کے مقبرے کی تلاش میں یہاں تک پہنچا ہے، اس لئے جلد از جلد اس کا پتہ لگا کر ایک پختہ مقبرہ تعمیر کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں اس نے ”مرقع دہلی“ کا مطالعہ کیا اور ترجمہ سے لے کر تعمیر تک کے سارے مراحل کل ایک مہینے کے اندر طے کر لئے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ مزار بیدل اول ۱۹۲۰ء ۱۳۵۹ھ میں تعمیر ہوا جیسا کہ ڈاکٹر عبدالحی نے لکھا ہے اور دوسری بار ۱۳۷۲ھ میں افغانی دوستوں کی مدد سے معمولی تبدیلی کے ساتھ تعمیر ہوا جیسا کہ ڈاکٹر علی اصغر حکمت نے لکھا ہے لیکن بقول سعدی۔

خشت اول چوں نہد معمار کج تا ثریا می رود دیوار کج

پہلی اینٹ معمار جب ٹیڑھی رکھتا ہے تو ثریا تک دیوار ٹیڑھی چلی جاتی ہے۔ ان لوگوں نے اسی غلطی کا تکرار کیا ہے ڈاکٹر حکمت نے ”نقش پاری دراجارہند“ میں اس کی تفصیلات یوں لکھی ہیں:

دہلی میں پرانا قلعہ کے نزدیک مرزا عبدالقادر بیدل کا مقبرہ ہے جس کو گزشتہ سال اس عظیم شاعر کے افغانی ارادتمندوں نے چندہ جمع کر کے ایک خوبصورت آرامگاہ کی شکل دیدی۔ دہلی میں افغانستان کے سفیر کبیر سردار نجیب خاں نے اس تعمیر کے لئے کافی زحمات اٹھائیں۔ اور ان کی قبر پر ۳ صفر ۱۳۳۳ھ کندہ ہے جو اس مشہور شاعر کی تاریخ وفات ہے۔ فارسی کتبے کی تحریر اس طرح ہے۔

پہلی سطر: آرامگاہ میرزا عبدالقادر بیدل

دوسری سطر: ۱۰۵۴ھ/۱۱۳۳ھ

تیسری سطر: ایں بناء در سال ۱۳۷۲ھ باعانت دوستداران افغانی بسر سید۔ (۹۶۳)

ہندوستانی حکومت نے بیدل کی شاعرانہ عظمت اور نبوغ کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے صرف اس قدر کافی سمجھا کہ اس کے واسطے مختصری چہار دیواری کے ساتھ ایک پارک بنادیا جائے اور اس کا نام باغ بیدل رکھ دیا جائے اسی احاطے میں بیدل کا مقبرہ موجود ہے۔

اس سلسلے میں افغانی دانشور استاد صلاح الدین سلجوقی نے ایک نئی دریافت پیش کی ہے، قارئین ان کے مغالطہ کا اندازہ خود لگائیں، لکھتے ہیں:

”جب میں ہندوستان میں تھا تو بیدل کے بابت کافی جستجو کی معلوم ہوا کہ ہندوستان کے لوگ بیدل کو فراموش کر چکے ہیں۔ مظہر اور ظہوری ان کے یہاں بیدل سے کہیں زیادہ بلند پایہ شاعر ہیں۔

بیدل کی قبر کا بھی کہیں کوئی نشان پتہ نہ تھا۔ اور میں نے ایک افغانی توصل جزل کی حیثیت سے جو ہندوستانیوں کے نزدیک انتہائی باعزت منصب ہے، غیر معمولی کوششیں کیں آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کے بچے کچھ جسمانی اعضا کو لوگ کا بل لے آئے ہیں۔ اس سلسلے میں میں استاد سید محمد داؤد الحسنی کا ہم خیال ہوں۔ استاد موصوف کے دلائل نہایت ٹھوس ہیں۔ اس کے علاوہ بیدل کی قبر کی ناگہانی گمشدگی کا، وہ بھی ایسے زمانے میں جبکہ اس کا شمار ایک عظیم شاعر، صوفی اور ادیب کی حیثیت سے ہوتا تھا، اس کے سوا کوئی اور مطلب نہیں ہے کہ اس کی نعش کو اس کے گھر سے (کیونکہ گھر میں قبر ہونے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ عارضی ٹھکانہ ہے) رکھی طور پر اس کے وطن افغانستان پھر خواجہ رواش گاؤں میں ایسی جگہ لے گئے جو چغتائیوں یعنی بیدل کے قبیلے کے محلہ کے نام سے مشہور اور آباد ہے اور اب تک وحدۃ الوجودی صوفیوں کا مرکز ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حملہ آوروں نے بیدل کی قبر بالکل مسمار کر کے رکھ دی۔ یہ بالکل بے بنیادی بات ہے۔ حملہ آوروں نے تو بہت سی قبروں کو اپنے حملے کا نشانہ بنایا لیکن یہ قبریں ناپید نہیں ہوئیں۔ جہاں کی قبر کا بھی یہی حشر ہوا تھا لیکن ان کی قبر ہنوز باقی ہے اور اس وقت خاص و عام سب کا مرکز ارادت ہے۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ حملہ آور ایک زود گذر سیلاب کی حیثیت رکھتے ہیں اور وہ مقبرے جس پر حملے ہوتے ہیں وہ اس کے بعد بھی فطری طور پر محترم تر محبوب تر اور آباد تر ہوتے ہیں۔ (۹۶۵)

صلاح الدین سلجوقی نے سید محمد داؤد الحسنی کے اس دعویٰ سے اتفاق کیا ہے کہ بیدل کا مرقد کا بل میں ”خواجہ رواش“ محلے میں ہے۔

اس سے پہلے جو کچھ لکھا گیا اور عرس بیدل کے بابت آگے جو کچھ لکھا جائے گا جس کے منانے کا سلسلہ ۱۱۸۵ھ/۱۷۷۱ء تک جاری رہا اس سے واضح ہوتا ہے کہ بیدل کا مزار دہلی ہی میں ہے اگرچہ اس کی جگہ کی تعیین میں کچھ غلط فہمیاں ہوئی ہیں۔ استاد سلجوقی کی یہ منطق کہ گھر میں قبر ہونے کا مطلب عموماً ایک عارضی قبر ہوتا ہے بالکل بے بنیادی بات ہے کیونکہ عارضی قبر بنانے کا رواج عام طور سے اہل تشیع حضرات میں ہے دوسرے یہ کہ بیدل نے بہ قول خوشگواپنی موت سے دس سال پہلے ہی سے اسے تیار کر رکھا تھا۔ (۹۶۶) کیا کسی کے صفحہ ذہن پر بھی یہ بات ابھر سکتی ہے کہ یہ سارا اہتمام ایک عارضی قبر کی خاطر تھا؟ ایسی بات بھی نہیں ہے کہ بیدل کی نعش کے بچے کچھ حصے کو وہاں سے کا بل لے گئے ہیں، کیونکہ ۱۱۸۵ھ/۱۷۷۱ء تک عرس کا جاری رہنا واضح کرتا ہے کہ اس کا مزار کم از کم مذکورہ سال تک وہاں موجود تھا اور اس وقت تک جبکہ بیدل کی وفات کو ۵۲ سال ہو چکے ہیں اس کی ہڈیوں تک کا برقرار رہنا

بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے استاد صلاح الدین اور ان کے ہمنوا لوگوں کا خیال سراسر خوش فہمی پر مبنی ہے۔ بیدل نے اپنے مسکن اور مدفن کی ویرانی کی طرف درج ذیل شعر میں اشارہ کیا ہے۔  
بنیاد خلق امروز گرو خرابہ دیدی تا مسکن تو فردا ویرانہ کہ باشد  
مخلوق کی بنیاد آج تجھے کھنڈرات کی شکل میں نظر آتی ہے اب دیکھنا ہے کہ تیرا مسکن کل کن  
کھنڈرات میں تبدیل ہوتا ہے۔

دلیل خویش پس از مرگ ہم توئی چو شمع کشتہ کسی جز تو بر مزار تو نیست  
بیدل

موت کے بعد بیدل تو خود ہی آپ اپنا رہبر ہے۔ شمع کشتہ کی طرح تیرے مزار پر تیرے سوا  
کوئی نہ ہوگا۔

### بیدل کا عرس:

بیدل کے عرس کے بابت خوشگو کا بیان ہے کہ اس کے ماموں زاد بھائی مرزا عبداللہ کے صاحبزادے مرزا محمد سعید اس کے واحد پسماندہ عزیز کی شکل میں مجلس عرس کا اہتمام اور اس سے متعلق جملہ امور کا نظم و نسق کرتے تھے۔ صفر المظفر کی چار تاریخ کو شہر کے نازک خیال شعرا وہاں اکٹھے ہوتے تھے۔ بیدل نے کلیات کا جو نسخہ اپنی زندگی میں کتابت کرایا تھا نیز اس کی چھڑی "نولاسی" کو اس کی مزار کے پاس رکھتے تھے۔ شعراء اول کلیات سے ایک غزل پڑھتے پھر ہر ایک شاعر باری باری سے اپنا کلام سناتا۔ اس طرح ایک بہت ہی عمدہ ادبی و شعری محفل منعقد ہوتی تھی۔ یہ محفل اتنی دلکش اور دلچسپ تھی کہ خوشگو لکھتا ہے:

”چشم بر تفرقہ ازاں مجمع رنگین دور باد۔“ (۹۶۸)

اس رنگین محفل کو پراگندگی کی نظر بد نہ لگے۔

خوشگو نے اپنا تذکرہ ۱۱۴۷ھ/۱۷۳۳ء میں مکمل کیا اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت تک اور خود اس کی زندگی میں یہ مجلس پورے اہتمام کے ساتھ منعقد کی جاتی رہی ہے۔

سراج الدین علی خاں آرزو نے اس پر کچھ اضافہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

”کلیاتش روز وفات او کہ چہارم شہر صفر باشد ہمیں تاریخ وفات دوست و مردم ہندوستان

آرزو چہر افغان کنند، طعام پختہ بخلاق دہند و عرس نامند، پیوستہ زیارت کردہ می شود“ (۹۶۹)

اس کی وفات کے دن جو صفر کی چوتھی تاریخ ہے اور یہی دن اس کی تاریخ وفات بھی ہے

ہندوستان کے لوگ اس دن چراغاں کرتے، کھانا پکا کر عوام کو کھلاتے اور اس کا نام عرس رکھتے ہیں۔ اس کی کلیات کی لگا تار زیارت کی جاتی ہے۔

آرزو کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۱۶۳ھ تک جو سن تالیف ہے مشاعرہ کے اہتمام کے علاوہ ہندوستان یعنی دہلی اور اس کے اطراف و نواحی کے عوام بھی بیدل کو ایک بزرگ سمجھتے تھے ورنہ عرس کے دن چراغاں کرنے اور کھانا پکا کر غریبوں کو کھلانے کا اہتمام وہ کیوں کرتے۔ اس سے یہ قیاس کرنا بے جا نہ ہوگا کہ بیدل نے عوام کے دل میں بھی اپنی جگہ بنالی تھی شاید اسی بنا پر ڈاکٹر عبدالغنی لکھتے ہیں:

”بیدل کی وفات دارالخلافہ دہلی کا کوئی معمولی سانحہ نہ تھا، امراء، شعراء اور عوام الناس میں

ایک تہلکہ مچا ہوا تھا اور انہوں نے بیدل کی یاد کو مجالس عرس کے ذریعہ تازہ رکھنے کا تہیہ کیا

اور عرصے تک عرس کی تقریب جاری رہی۔“ (۹۷۰)

اسی طرح بیدل کا ایک شاگرد آندرام مخلص لکھتا ہے:

”قبر ایشان زیارت گاہ معتقدان است و ہر سال محفل عرس منعقد می شود۔“ (۹۷۱)

بیدل کی قبر اس کے ارادتمندوں کی زیارت گاہ ہے اور ہر سال وہاں عرس منایا جاتا ہے۔

درگاہ قلی خاں، جیسا کہ پچھلے صفحات میں لکھا گیا، نواب نظام الملک کے ایک جوان درباری کی حیثیت سے ۱۱۵۱ھ/۱۷۳۸ء میں دہلی آیا اور ۱۱۵۳ھ/۱۷۴۰ء میں وہاں سے واپس ہوا۔ دہلی میں قیام کے دوران حاصل ہونے والے مشاہدات اور واقعات کو اس نے ”مرقع دہلی“ میں جمع کر دیا ہے۔ اس کتاب میں مذکورہ بالا امور کے علاوہ کچھ اور اہم معلومات بھی درج ہیں۔ موصوف مزار بیدل کے تحت لکھتا ہے:

”.....سیوم شہر صفر عرس می شود۔ تلامذہ اش و جمیع موز و نان شہر معزیت استفادہ روحش

حاضری شوند۔ و دور قبر، حلقہ مجلس ترتیب می دہند۔ کلیاتش کہ بخط گرامی ترتیب وتر قیم

یافتہ، مابین حلقہ گذاشتہ، افتتاح بشعر خوانی می نمایند۔ بر عنوانش این رباعی مرقوم است:

ای آئینہ طبع تو ارشاد پذیر در کسب نواید ننمائی تقصیر

مجموعہ فکر ما صلائی عام است سیری کن و سمت تسلی بر گیر

بعد ازیں علی قدر مراتب، نتائج افکار خود را نقل مجلس می سازند۔ حلاوت طرفہ بحصول می

پیوند و انبساط خاصی بھضار عاید می گردد۔ محمد سعید برادر زادہ اش، کہ چون معنی بیگانہ، از

نسبت معنوی میرزا بیگانہ است۔ بتواضع حاضران مجلس و ترتیب شمع و چراغ و داغ خود را می

سوزد۔ و باجماع ہم معاجین و جوب اختراعی میرزا، کہ ازان قبیل کیسیاست و درہمہ دہلی



انگشت نما، صرف معیشت می نماید، طاب ثراہ وجعل الجریہ مواء۔“ (۹۷۲)

صفر کی تیسری تاریخ کو عرس منایا جاتا ہے۔ بیدل کے تلامذہ اور شہر کے تمام موزوں طبع شعرا اس کی روح سے فیض حاصل کرنے کی غرض سے اس کے مزار پر اکٹھے ہوتے ہیں اور قبر کے ارد گرد ایک مجلس مشاعرہ ترتیب دیتے ہیں، اس کی کلیات جس کی خط جلی میں ترتیب اور کتابت ہوئی ہے، بچ میں رکھی جاتی ہے اور اس سے شعر خوانی کا آغاز ہوتا ہے۔ جلد کے خلاف پر یہ رباعی لکھی ہے:

ای آئینہ طبع تو ارشاد پذیر در کسب فواید تمنائی تقصیر  
مجموعہ فکر ما صلائی عام است سیری کن و سمت تسلی بر گیر

اے وہ شخص کہ ترا آئینہ طبع رشد و ہدایت کی بات قبول کرنے کو آمادہ ہے اس سے استفادے میں کوئی کوتاہی نہ کر، میرے افکار و خیالات کا یہ مجموعہ ایک صلائے عام ہے اس کا مطالعہ کر اور اس سے اپنی دلچسپی کا سامان حاصل کر۔

اس کے بعد شعراء علی قدر مراتب اپنا اپنا کلام سناتے ہیں مجھے بڑا لطف آتا ہے اور حاضرین کو مخصوص سرور و انبساط حاصل ہوتا ہے۔ ان کا بھتیجا محمد سعید جو معنی بیگانہ کی طرح مرزا کی معنوی نسبت سے بیگانہ ہے، حاضرین محفل کی خاطر تواضع کرتا اور شمع و چراغ کے نظم و نق میں دماغ سوزی کرتا ہے نیز مرزا کے ایجاد کردہ معاجین اور جوب کو جو سارے دہلی میں انگشت نما ہیں، بچ کر کسب معاش کرتا ہے، طاب ثراہ وجعل الجریہ مواء۔

معنی یاب خاں کے زیر عنوان لکھتا ہے:

”..... او غزل بسامان تمام گوید، واداہای طرفہ بکاری برد کہ سامع بوجدی آید۔ سیوم ماہ

صفر، کہ عرس میرزا بیدل مرحوم است۔ وجہ شعرائی دہلی بر مزار ایشان مجتمع می شوند۔

ود یوان میرزا را در میان گذار اشتہ افتتاح شعر خوانی از آنجائی کنند۔ وبعد ازین بتدریج

مسودات خود را بعرضہ آورده از حضار مجلس متوقع تحسین می شوند۔ اول کیسکہ شروع و بفرغ خوانی

می کنند ہمین عزیز است۔ و در حقیقت تقدیرش مستحسن ارباب معنی است۔“ (۹۷۳)

وہ (معنی یاب خاں) اچھی غزل کہتا اور اپنی دلکش اداؤں سے اس طرح پڑھتا ہے کہ سامعین پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ صفر المظفر کی تیسری تاریخ کو جو بیدل مرحوم کے عرس کا دن ہے دہلی کے تمام شعراء اس کے مزار کے پاس اکٹھے ہوتے ہیں، مرزا کے دیوان کو بچ میں رکھ کر اس سے شعر خوانی کا سلسلہ شروع کرتے پھر بتدریج اپنا اپنا کلام سناتے اور حاضرین مجلس سے داد و تحسین کی امید رکھتے ہیں۔ سب سے پہلے جو آدمی غزل پڑھتا ہے وہ یہی معنی یاب خاں ہے۔ دراصل اس کا پہل کرنا

ارباب معنی کے نزدیک پسندیدہ بھی ہے۔

سراج الدین علی خاں آرزو کے بابت لکھتا ہے:

”..... روز عرس میرزا بیدل مرحوم، بہ نسبت شاگردیش۔ بزم آرامی گردد۔ و عالمی را از

صافینا نہ افکار ذلہ چین منت می گذارد۔“ (۹۷۴)

مرزا بیدل کے عرس کے دن اس کی شاگردی کی نسبت سے بزم آرائی کرتا اور اپنے صاف و شفاف افکار و خیالات پیش کر کے ایک عالم کو ممنون کرتا ہے۔

مرزا ابوالحسن آگاہ کے تحت لکھتا ہے:

”..... روز عرس قاری دیوان بیدل است۔“ (۹۷۵)

عرس کے دن دیوان بیدل کی روایت کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ اب ان بیانات کی تحلیل و تجزیہ ملاحظہ ہو۔ درگاہ قلی خاں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ:

۱۔ دہلی کے اپنے سہ سالہ قیام (۱۱۵۱ھ تا ۱۱۵۴ھ) کے دوران درگاہ قلی خاں اپنے شاعرانہ ذوق کی تسکین کی خاطر بیدل کے عرس میں مسلسل حاضری دیتا رہا۔

۲۔ وہاں اس کی ملاقات بہت سے نازک خیال شاعروں سے ہوئی جن میں معنی یاب خاں، سراج الدین علی خاں آرزو اور مرزا ابوالحسن آگاہ جو کسی نہ کسی عنوان سے عرس سے زیادہ وابستہ تھے۔

۳۔ مذکورہ بالا شاعروں کے علاوہ درگاہ قلی خاں نے مرزا جان جاناں کا خصوصیت سے تذکرہ کیا ہے۔ شیخ علی حزین، میر محمد افضل ثابت، ابراہیم خاں راقم، میر شمس الدین مفتون، مرزا عبدالخالق وارستہ اور گرامی کا تذکرہ بھی کیا ہے اور ان کے بابت اہم معلومات فراہم کئے ہیں۔ ممکن ہے ان میں سے بعض سے اس کی وہاں ملاقات بھی ہوئی ہو جیسا کہ لفظ ”جمع موزونان شہر“ کے لفظ سے قیاد ہوتا ہے۔

۴۔ بیدل کا عرس صفر کی تیسری تاریخ کو منایا جاتا تھا اور اس کا تذکرہ اس نے تین جگہ کیا ہے۔ یہ بیان خوشگو اور آرزو کے بیانات سے جس کا تذکرہ پہلے ہوا، مختلف نظر آتا ہے۔ ایسی صورت میں ہم یا تو یہ کہیں کہ قلی خاں کو غلط فہمی ہوئی ہے یا یہ کہ عرس کے لئے تیاری تیسری تاریخ سے ہوتی ہوگی اور چوتھی تاریخ تک اس کا سلسلہ جاری رہتا ہو۔

۵۔ بیدل کے تمام شاگرد اور شہر کے شعراء فاتحہ خوانی اور مشاعرہ میں شرکت کی غرض سے وہاں اکٹھے ہوتے تھے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بیدل کا عرس لگا تا ۱۱۵۴ھ / ۷۴۱ء تک پورے اہتمام سے منایا جاتا رہا ہے اس کے بعد کیا صورت حال رہی اس پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر عبدالغنی آب حیات کے مصنف مولانا محمد حسین آزاد کے حوالے سے لکھتے ہیں:

احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے ہندوستان کو تباہ کر دیا اور میر تقی میر کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ سلطنت کی تباہی اور مرہٹہ گردی میں شرفا مفلوک اور تباہ حال ہو گئے اور خدا جانے کتنے لوگ پریشان ہو کر دہلی سے نکل کھڑے ہوئے۔ حالات حد درجہ ناسازگار تھے لیکن عرس بیدل پھر بھی منعقد ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک بار عرس بیدل کے موقع پر مولانا ندرت نے میرزا سودا کی ہجو میں ایک فارسی غزل پڑھی جس کا مطلع تھا:

خون معنی تا رفیع بادہ پیا ریختہ آبروی ریختہ از جوش سودا ریختہ  
مرزا سودا نے اس غزل کو محسوس کر کے ندرت کشمیری پر الٹ دیا۔ اس میں عرس بیدل منایا جاتا تھا۔  
ایسی غزل کا عرس میں تم سے جو انصرام ہو بحر میں جس کی ہر طرح شعبہ خاص و عام ہو  
بہر حال ان حالات سے واضح ہے کہ ۱۱۸۵ھ / ۷۷۱ء تک عرس بیدل منایا جاتا تھا۔ (۹۷۶)



## حواشی

### باب اول

- ۱۔ چار عنبر مطبوعہ نوکلشور ۱۸۷۵ء ص ۳۹۱
- ۲۔ ایضاً ص ۳۱۴
- ۳۔ نقد بیدل مطبوعہ تہران ۱۳۸۰ھ شمس ۲۰۰۲ ص ۱۱۶-۱۷
- ۴۔ چار عنبر ص ۳۹۰
- ۵۔ ایضاً ص ۵۱۲
- ۶۔ ایضاً ص ۴۹۱
- ۷۔ مجلی ہنر و مردم ش ۱۰۶ ص ۵۲
- ۸۔ مجلہ ”دخن“ دورہ ۲۲، ش ۶، ص ۵۶۹
- ۹۔ History of Iranian Literature by Jan Rypka P 516-17
- ۱۰۔ کلیات بیدل مطبوعہ کابل ج ۲ ص ۱۵۱
- ۱۱۔ مجلہ اقبال کراچی ش ۶
- ۱۲۔ چار عنبر ص ۵۵۱
- ۱۳۔ (الف) خلاصہ آثر عالمگیری تالیف محمد ساقی مستعد خان مطبوعہ ایٹانک سوسائٹی کلکتہ ص ۲۹ تا ۳۱
- ۱۴۔ (ب) ایضاً ص ۵۵۲
- ۱۵۔ مفتاح التواریخ ہالیف سرطاس ولیم بیل ص ۲۶۹
- ۱۶۔ چار عنبر ص ۱۸۲
- ۱۷۔ مفتاح التواریخ ص ۲۹۷
- ۱۸۔ ایضاً ص ۱۸
- ۱۹۔ ایضاً ص ۲۹۹
- ۲۰۔ ایضاً ص ۳۰۱ تا ۳۰۳
- ۲۱۔ جلوہ خضر از صفیر بلگرامی ج ۱ ص ۲۸
- ۲۲۔ مفتاح التواریخ ص ۳۰۵
- ۲۳۔ ایضاً ص ۳۰۵
- ۲۴۔ ایضاً ص ۳۰۶
- ۲۵۔ ڈاکٹر عبدالغنی نے اپنے ایک مفصل مضمون ”بیدل کی ایک جمالیاتی علامت“ مجلہ نگار جنوری ۱۹۶۱ء میں عہد مغلیہ کے شاعروں خصوصاً بیدل کے ذوق جمال پرستی پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔
- ۲۶۔ آثر عالمگیری ص ۵۳۰ تا ۵۳۲
- ۲۷۔ History of Iranian Literature P 517
- ۲۸۔ اویماق مغل تالیف عبدالقادر خان قراچار ص ۵۵۰
- ۲۹۔ آثر عالمگیری ص ۵۳۰ تا ۵۳۲
- ۳۰۔ دیوان بیدل مرتبہ حسین آری مطبوعہ تہران ص ۳۱
- ایضاً ص ۲۳، ۳۹، ۱۳۲، ۱۴۰، ۷۲، ۲۰۸، ۲۲۲، ۲۷۵، ۷۰

- ۳۱۔ ہندو ایران شمارہ ۱۵ سال ۵، نفوذ فرہنگ و تمدن ایرانی اسلامی در شبہ قارہ ازد کتر علی اصغر حکمت
- ۳۲۔ اویماق مغل تالیف عبدالقادر خان قراچا ص ۵۱۹
- ۳۳۔ آثار عالمگیری ص ۵۳۵
- ۳۴۔ اویماق مغل ص ۵۵۰
- ۳۵۔ تذکرہ باغ معانی قلمی خدا بخش لائبریری ورق ۲۰۳ الف
- ۳۶۔ فارسی ادب بہ عہد اورنگ زیب مطبوعہ انڈو پرشین سوسائٹی دہلی ص ۱۱
- ۳۷۔ سفینہ خوشگوشہ دفتر ثالث ص ۴۴
- ۳۸۔ اویماق مغل ص ۵۶۲
- ۳۹۔ ایضاً ۵۸۲
- ۴۰۔ مجلہ ہندو ایران ش ۱۵ سال ۵ ص ۴۴ نفوذ فرہنگ و تمدن ایرانی اسلامی از علی اصغر حکمت
- ۴۱۔ بہار میں اردو و زبان ادب کا ارتقا سید اختر اور نیوی ص ۱۱۲

## باب دوم (حالات زندگی)

- ۱۔ چار عشر صفدری مقدمہ
- ۲۔ کلیات بیدل (رقعات) ص ۱۵۱
- ۳۔ بیدل، سپہری و سبک ہندی مطبوعہ ایران ص ۱۲
- ۴۔ دیوان بیدل مطبوعہ تہران باہتمام حسین آبی ص ۵۲
- ۵۔ ایضاً ص ۱۲
- ۶۔ مرآۃ الخیال ص ۵۵۹، ید بیضا ص ۴۰، سفینہ خوشگوشہ دفتر ثالث ص ۱۰۵ نتائج الافکار ص ۱۱، نشر عشق ص ۳۱۲
- ۷۔ مخزن الغرائب ص ۱۱۱، نشر عشق ص ۳۱۲
- ۸۔ صحف ابراہیم ص ۴۳۱، خلاصۃ الکلام ص ۸۳، سفینہ عشرت ص ۱۲۵
- ۹۔ مجمع الفکس قلمی خدا بخش لائبریری ص ۶۵
- ۱۰۔ History of Iranian Literature ص ۵
- ۱۱۔ Life and Works of Abdul Qadir Bedil ص ۲۰۲
- ۱۲۔ فرہنگ ناظم الاطباع ص ۵۸۳
- ۱۳۔ Life & Works of Abdul Qadir Bedil ص ۳
- ۱۴۔ بحوالہ بیدل شناسی ج ۱ ص ۱۲ از غلام حسن مجددی
- ۱۵۔ History of Iranian Literature P. 517
- ۱۶۔ ایضاً ص ۵۱۷
- ۱۷۔ فرہنگ نفیسی ناظم ال الاطباع ص ۱۱۶
- ۱۸۔ لغت ترکی بقاری تالیف فضل اللہ خاں عموزادہ سیف خان ص ۱۱۶
- ۱۹۔ اویماق مغل تالیف مرزا محمد عبدالقادر خاں قراچا ص ۲۶۹
- ۲۰۔ ایضاً ص ۳۴
- ۲۱۔ طبقات اکبری ص ۷۰
- ۲۲۔ چار عشر ص ۵۵۱
- ۲۳۔ سفینہ خوشگوشہ ص ۱۰۴
- ۲۴۔ ایضاً ص ۱۰۶
- ۲۵۔ چار عشر ص ۵۵۱، سفینہ خوشگوشہ ص ۱۰۸
- ۲۶۔ شام غریباں ص ۵۳، ۵۴
- ۲۷۔ ایضاً ص ۵۳
- ۲۸۔ چار عشر (رقعات بیدل) ص ۱۵۲
- ۲۹۔ سفینہ خوشگوشہ ص ۱۰۹

- ۳۰۔ چار عشر (رقعات) ص ۱۴۷
- ۳۱۔ فقید انصاری پارہ دل بیدل، مضمون از صاحبزادہ شوکت علی خاں نوٹک
- ۳۲۔ کلیات بیدل مطبوعہ کابل ۱۳۱/۲
- ۳۳۔ کلیات بیدل نوٹک شورش..... سفینہ خوشگوشہ ص ۱۰۴/۳
- ۳۴۔ مرآۃ الخیال ص ۴۵۹
- ۳۶۔ شام غریباں بہ حوالہ مرآۃ واردات ص ۵۳
- ۳۷۔ سفینہ خوشگوشہ ص ۱۰۴
- ۳۸۔ ید بیضا ص ۵۰
- ۳۹۔ مجمع الفکس مخطوطہ خدا بخش لائبریری ج ۱ ص ۶۵
- ۴۰۔ خزائن عامرہ ص ۱۵۶
- ۴۱۔ سرو آزاد ص ۱۴۸
- ۴۲۔ تذکرہ بے نظیر بہ حوالہ مسلم شعرائے بہار سید احمد اللہ ندوی ص ۱۶۹
- ۴۳۔ سفینہ ہندی ص ۲۸
- ۴۴۔ نشر عشق ص ۳۱۲
- ۴۵۔ نتائج الافکار ص
- ۴۶۔ نتائج الافکار ص
- ۴۷۔ چار عشر نوٹک شورش ص ۴۹۲
- ۴۸۔ ایضاً ص ۴۵۹
- ۴۹۔ ایضاً ص ۵۸۱
- ۵۰۔ ایضاً ص ۴۳۹
- ۵۱۔ دیوان بیدل مطبوعہ ایران ص ۵۲
- ۵۲۔ چار عشر ص ۳۴۰
- ۵۳۔ ایضاً ص ۳۴۵
- ۵۴۔ ایضاً ص ۳۰۷
- ۵۵۔ ایضاً ص ۳۱۹
- ۵۶۔ ایضاً ص ۳۱۹
- ۵۷۔ ایضاً ص ۵۵۱
- ۵۸۔ ایضاً ص ۵۶۲
- ۵۹۔ ایضاً ص ۵۶۶
- ۶۰۔ ایضاً ص ۵۶۹
- ۶۱۔ کلیات بیدل مطبوعہ کابل ج ۳ ص ۳۷۴
- ۶۲۔ چار عشر ص ۳۹۵، ۳۹۷
- ۶۳۔ معارف ش اگست ۱۹۳۶ء کیا بیدل عظیم آبادی تھے؟ از سید سلیمان
- ۶۴۔ سفینہ خوشگوشہ ص ۱۰۵
- ۶۵۔ ایضاً ص ۱۰۵
- ۶۶۔ چار عشر ص ۳۰۱
- ۶۷۔ چار عشر ص ۳۰۰
- ۶۸۔ سفینہ خوشگوشہ ص ۱۰۵
- ۶۹۔ چار عشر ص ۳۰۰
- ۷۰۔ ایضاً ص ۳۰۱
- ۷۱۔ مجلہ نگار ش مارچ ۱۹۲۵ء
- ۷۲۔ چار عشر ص ۳۰۱، ۳۰۰
- ۷۳۔ بیدل شناسی تالیف غلام حسن مجددی ص ۵/۱
- ۷۴۔ مجلہ معارف ش اگست ۱۹۳۰ء (کیا بیدل عظیم آبادی تھے؟)
- ۷۵۔ سفینہ خوشگوشہ ص ۱۰۵
- ۷۶۔ بیدل تالیف خواجہ عباد اللہ اختر ص ۱۱
- ۷۷۔ سفینہ خوشگوشہ ص ۱۰۵
- ۷۸۔ Life & Works of Bedil
- ۷۹۔ چار عشر ص ۳۴۰
- ۸۰۔ ایضاً ص ۳۰۱
- ۸۱۔ ایضاً ص ۳۹۰
- ۸۲۔ ص ۳۴۰ یہاں بیدل نے ”دو دانشمند بی انصاف“ کی ترکیب استعمال کی ہے۔ بعض لوگ مثلاً خوشگوشہ، نیاز فتح پوری اور حسین قلی خاں نے اس

- ۸۳- ایضاً ص ۳۴۱  
۸۴- ایضاً ص ۳۰۱  
۸۵- ایضاً ص ۳۰۱  
۸۶- ایضاً ص ۳۴۲  
۸۷- ایضاً ص ۳۴۲  
۸۸- ایضاً ص ۲۴۳  
۸۹- ایضاً ص ۳۴۰  
۹۰- ایضاً ص ۳۳۳  
۹۱- ایضاً ص ۳۳۵  
۹۲- ایضاً ص ۳۳۵  
۹۳- ایضاً ص ۳۳۵  
۹۴- ایضاً ص ۳۳۶  
۹۵- ایضاً ص ۳۳۸  
۹۶- ایضاً ص ۳۳۳  
۹۷- ایضاً ص ۳۳۵  
۹۸- ایضاً ص  
۹۹- ایضاً ص ۳۰۱  
۱۰۰- ایضاً ص ۳۰۲  
۱۰۱- فیض قدس ص ۱۸
- ۱۰۲- چار غصص ۳۰۴  
۱۰۳- ایضاً ص ۳۰۵  
۱۰۴- ایضاً ص ۳۰۵  
۱۰۵- ایضاً ص ۳۰۶  
۱۰۶- ایضاً ص ۳۰۶  
۱۰۷- ایضاً ص ۳۰۶  
۱۰۸- ایضاً ص ۳۰۶  
۱۰۹- سفینہ خوشگودنتر ثالث ص ۱۰۷  
۱۱۰- مجلہ دانش، سرنیگر جولائی ۱۹۷۱ء  
۱۱۱- بیدل شناسی ج ۱ ص ۱۲  
۱۱۲- ”بیدل در دیار بیدلان“ پڑوہشتامہ دانشکدہ ادبیات دورہ جدید ص ۳۷۷  
۱۱۳- شعر العجم فی الہند، شیخ اکرام ص ۱۲۹  
۱۱۴- چار غصص ۳۰۷  
۱۱۵- ایضاً ص ۳۰۷  
۱۱۶- معارف اعظم گذشتہ اگست ۱۹۴۰ء  
۱۱۷- چار غصص ۳۰۸  
۱۱۸- چار غصص ۳۰۸  
۱۱۹- ایضاً ص ۳۱۰  
۱۲۰- ایضاً ص ۳۱۰  
۱۲۱- ایضاً ص ۳۱۱، ۱۲  
۱۲۲- ایضاً ص ۳۱۵  
۱۲۳- ایضاً ص ۳۱۵  
۱۲۴- ایضاً ص ۳۱۵  
۱۲۵- ایضاً ص ۳۱۵  
۱۲۶- ایضاً ص ۳۱۵  
۱۲۷- ایضاً ص ۳۱۸  
۱۲۸- ایضاً ص ۳۱۸ جناب کاشی ناتھ پنڈتا لکھتے ہیں کہ یہاں ”مصطلحات ہند“ سے بیدل کی مراد

- ۱۳۹- ایضاً ص ۳۲۱  
۱۴۰- ایضاً ص ۳۲۷  
۱۴۱- ایضاً ص ۳۳۰  
۱۴۲- ایضاً ص ۳۲۱  
۱۴۳- ایضاً ص ۳۳۰  
۱۴۴- ایضاً ص ۳۳۰  
۱۴۵- ایضاً ص ۳۳۱  
۱۴۶- ایضاً ص ۳۹۱  
۱۴۷- ایضاً ص ۳۹۱  
۱۴۸- نام حسین اور لقب منصور اور کنیت ابوالمغیث ہے۔ یہ حسین بیضاوی کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ کیونکہ ان کی جائے پیدائش بیضا ہے۔ ”بیضا“ فارس میں ایک مقام کا نام ہے۔ منصور علاج شیخ عمر بن عثمان کی کے مرید تھے اور عمر بن عثمان حضرت جنید بغدادی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ نو رالاصل، جسم الاکبر و جسم الاصفی، دبستان المعرفت طاسین الازل کے نام سے حضرت منصور کے چند تالیف ہیں۔ ”انا الحق“ کہنے کے جرم میں منصور کو عباسی خلیفہ مقتسم کے زمانے میں شہید کر دیا گیا۔ ان کی تاریخ شہادت ریاض العارفین میں ۳۲۹ھ لکھا تاریخ گزیدہ میں ۳۰۷ھ اور فہرست التواریخ میں ۳۰۹ھ ہے۔ اکثر عارفوں اور شاعروں نے ان کی مدح و ستائش کی ہے۔ شیخ ہمسری صاحب راز نے ان کے بابت کہا ہے۔ ”روا باشد انا الحق از درختی - چرا نبود روا از نیک بختی“۔ ایک درخت سے انا الحق کی آواز آئے تو جائز ہو سکتی ہے ایک نیک بخت آدمی سے وہی آواز اگر نکلے تو ناجائز کیوں ہو۔ مجلہ ارمغان ش ۵۶ سال
- ویدانت کی اصطلاحیں ہیں (مجلہ دانش سرنیگر ش ۲ جولائی ۱۹۷۱ء ڈاکٹر عبدالغنی لکھتے ہیں ویدانت کی اصطلاحی کے علاوہ ریختہ یعنی اردو زبان کے لئے بھی استعمال کیا تھا۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو لیکن بعد کا جملہ ”اقسام لغت رنگ ترتیب ریختہ بود“ واضح کرتا ہے ہندی یا ویدانت کی اصطلاحوں کے علاوہ بہت سی مقامی بولیوں کو استعمال کرتے تھے اور یہ قیاس یقین کے قریب ہے کیونکہ مجذوب لوگ عام طور سے مقامی بولیوں میں بات کرتے ہیں اور اس علاقے کی مقامی بولی بھوجپوری تھی بلکہ ہے جو ہندی کی ایک شاخ شمار کی جاتی ہے اور جس کا آج بھی اس علاقے میں رواج ہے۔
- ۱۲۹- ایضاً ص ۳۱۸  
۱۳۰- شعر العجم فی الہند ص ۱۲۷  
۱۳۱- ایضاً ص ۳۱۹  
۱۳۲- ایضاً ص ۳۱۹  
۱۳۳- ایضاً ص ۳۲۰  
۱۳۴- ایضاً ص ۳۲۸  
۱۳۵- ایضاً ص ۳۲۸  
۱۳۶- ایضاً ص ۳۲۸  
۱۳۷- ایضاً ص ۳۲۸  
۱۳۸- بیدل شناسی ج ۱ ص ۱۳، راقم السطور نے اپنے ایک فارسی مقالہ میں جو امراتھنسی، امریکہ کے شمارہ ۳، ۴، ۲۰۰۴ اور ۲۰۰۵ء میں بیدل شناسان ہندوستان و پاکستان و ایران و افغانستان و تاجیکستان و اروپا کے عنوان سے شائع ہوا ہے اس میں ان تمام مقامات کے بیدل شناسوں کے کارناموں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔



۱۳۹۔ چارغضرص ۳۹۵

۱۵۰۔ ایضاً ص ۳۹۳

۱۵۱۔ ایضاً ص ۳۹۴

۱۵۲۔ ایضاً ص ۳۹۴

۱۵۳۔ ایضاً ص ۳۳۳

۱۵۴۔ مجلہ ادب کاہل دورہ ۲۱، ش ۶، سال ۱۳۵۲

۱۵۵۔ چارغضرص ۵۵۱

۱۵۶۔ ایضاً ص ۵۵۱

۱۵۷۔ ایضاً ص ۵۵۲

۱۵۸۔ ایضاً ص ۵۵۲

۱۵۹۔ ایضاً ص ۵۵۲

۱۶۰۔ ایضاً ص ۵۵۲-۵۵۳

۱۶۱۔ بیدل کے اس مناسبت سے بیان اور اشعار کے

بابت جو مرزا عبداللطیف کے فوجی دستہ کی

پراگندگی سے متعلق ہے یہ واضح کرنا ضروری

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا عبداللطیف کے فوجی

دستے کی پراگندہ حالت سے وابستہ ہے نہ کہ

شجاع کی شکست خوردہ فوج کی حالت سے وابستہ

ہے جیسا کہ سیاق عبارت اس کی تائید کرتی ہے۔

غلام حسن مجددی کو غالباً مغالطہ ہوا ان اشعار کو الہ

آباد میں شاہ شجاع کی فوج کی پراگندہ حالت سے

وابستہ سمجھا لکھتے ہیں: ”قوای شکست خوردہ شجاع

بوہشت و سراپگی شدیدی گرفتار گردید و بیدل کہ

واقعات را چشم خویش مشاہدہ کردہ بودہ درایات

ذیل حالت سپاہ شکست خوردہ را ترسیم می کند“

بیدل شناسی ج ۱ ص ۱۶

۱۶۲۔ ایضاً ص ۵۵۴

۱۶۳۔ ایضاً ص ۵۶۲

۱۶۴۔ ایضاً ص ۵۶۲

۱۶۵۔ ایضاً ص ۵۶۴

۱۶۶۔ ایضاً ص ۵۶۶

۱۶۷۔ ایضاً ص ۵۶۶

۱۶۸۔ ایضاً ص ۵۶۹

۱۶۹۔ ایضاً ص ۱۰۹، دفتر ثالث ص ۱۰۹

۱۷۰۔ مجمع التفاسیر قلمی ص ۶۶، سفینہ خوشگوش ۱۰۹

۱۷۱۔ فیض قدس مجلہ دانش اسلام آباد شمارہ ۱۲، ص ۱۳۷

۱۷۲۔ مجلہ ادب کاہل شمارہ سال نوزدہم ۱۳۵ ص ۲۲

۱۷۳۔ بیدل شناسی ج ۱ ص ۱۹

۱۷۴۔ چارغضرص ۳۹۵

۱۷۵۔ ایضاً ص ۳۴۷

۱۷۶۔ ایضاً ص ۳۷۵

۱۷۷۔ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۱۲۱

۱۷۸۔ چارغضرص ۳۷۴

۱۷۹۔ ایضاً ص ۳۴۷

۱۸۰۔ Life & Works of Mirza Abdul

Qadir Bedil By Dr. Abdul Ghani

P. 22

۱۸۱۔ چارغضرص ۴۰۴

۱۸۲۔ ایضاً ص ۴۰۳

۱۸۳۔ ایضاً ص ۳۹۵

۱۸۴۔ ایضاً ص ۳۹۷

۱۸۵۔ ایضاً ص ۳۹۷

۱۸۶۔ ایضاً ص ۳۹۸

۱۸۷۔ ایضاً ص ۳۹۸

۱۸۸۔ ایضاً ص ۴۰۳

۱۸۹۔ ایضاً ص ۴۰۳

۱۹۰۔ ایضاً ص ۴۰۳

۱۹۱۔ ایضاً ص ۳۷۰

۱۹۲۔ کلیات بیدل مطبوعہ کاہل ج ۱ ص

۱۹۳۔ O Mally Bihar and Orisa

District Gaziter Cuttak P 221,

228

۱۹۴۔ چارغضرص ۳۷۴

۱۹۵۔ ایضاً ص ۳۶۵، ۳۴۷

۱۹۶۔ ایضاً ص ۳۳۹

خان دوران کا اصل نام سید محمود ہے۔ خان

دوران نصرت جنگ کا بیٹا تھا۔ باپ کے انتقال

کے بعد ایک ہزار ذات اور ایک ہزار سوار منصب

اسے حاصل ہوا ناصر خان کا لقب بھی اسے ملا۔

شاہجہان کے جلوس کے تیسویں سال عادل

شاہی مملکت کی فتح کرنے کے لئے اورنگ

زیب کی مدد پر مامور ہوا۔ اور جو خدمات اس نے

انجام دیئے تھے اس کی بنا پر اس کے منصب میں

اضافہ ہوا تین ہزار ذات اور دو ہزار پانچ سو سوار

کے منصب پر فائز ہوا۔ اورنگ زیب نے جب

اکبر آباد کا رخ کیا تو وہ اس وقت مالوہ میں

”رائے سن“ کے مقام پر تھا اور خان دوران کا

لقب اسے ملا تھا۔ سوگڑھ کی جنگ میں وہ

اورنگ زیب کی فوج کے دائیں بازو کا کمانڈر تھا

یہاں جنگ میں کامیابی کے بعد وہ پانچ ہزار

ذات اور پانچ ہزار سوار کے عہدے پر ترقی کی۔

واقعات عالمگیری تالیف حافل خاں رازی

ترجمہ انگریزی ص ۳۶

۱۹۷۔ چارغضرص ۳۷۴

۱۹۸۔ ایضاً ص ۳۷۴

۱۹۹۔ ایضاً ص ۳۷۵

۲۰۰۔ ایضاً ص ۳۷۵

۲۰۱۔ ایضاً ص ۳۷۵

۲۰۲۔ ایضاً ص ۳۷۶

۲۰۳۔ ایضاً ص ۳۷۶

۲۰۴۔ ایضاً ص ۳۷۷

۲۰۵۔ مجلہ دانش، اسلام آباد، شمارہ ۵۱، ص ۲۵

۲۰۶۔ مجلہ دانش، اسلام آباد، ش ۵۰، ص ۱۳

۲۰۷۔ چارغضرص ۳۳۶

۲۰۸۔ ایضاً ص ۳۳۵

۲۰۹۔ ایضاً ص ۳۷۸

۲۱۰۔ ایضاً ص ۳۷۸

۲۱۱۔ ایضاً ص ۳۸۰

۲۱۲۔ ایضاً ص ۳۸۱

۲۱۳۔ ایضاً ص ۳۸۱

۲۱۴۔ ایضاً ص ۳۷۷

۲۱۵۔ ایضاً ص ۳۷۷

۲۱۶۔ ایضاً ص ۳۷۳

۲۱۷۔ ایضاً ص ۳۵۰

۲۱۸۔ ایضاً ص ۳۵۱

۲۱۹۔ ایضاً ص ۳۵۱

۲۲۰۔ ایضاً ص ۳۵۳

۲۲۱۔ ایضاً ص ۳۵۳

۲۲۲۔ Persian English Dectionary By

Father Stingas P. 5

۲۲۳۔ چارغضرص ۳۵۸

۲۲۴۔ ایضاً ص ۳۶۰

۲۲۵۔ ایضاً ص ۳۶۲

۲۲۶۔ مغربی (وفات ۸۰۹ھ) نویں صدی کا مشہور

صوفی شاعر ہے۔ اصفہان کے قریب ایک مقام

نائین میں پیدا ہوا اور فارس کے ایک مقام



- اصطہانات میں سپرد خاک ہوا لیکن یہ مغربی  
تمریزی کے نام سے مشہور ہے۔ وہ شیخ محی  
الدین بن العربی کے پیروں میں ہے۔ دیوان  
مغربی غزلیات، ترجیعات اور رباعیات پر  
مشتمل ہے اور اس کے بیشتر اشعار صوفیاء اور  
عارفانہ ہیں۔ ”فرہنگ ادبیات دربی زہری  
خانگری کیس ۲۷۲“
- ۲۲۷۔ چارغضر ۶۳-۳۶۲  
۲۲۸۔ ایضاً ۳۶۵  
۲۲۹۔ قلمرو سعدی چاپ ابن سینا از علی دشتی ص ۲۰۶  
۲۳۰۔ چارغضر ص ۸۰  
۲۳۱۔ راقم السطور کی کچھ میں نہ آسکا کہ ان اشعار میں  
صنعت خیفہ کا استعمال کیسے ہوا۔ خانم زہرا  
خانگری نے اس صنعت کی مثال میں درج ذیل  
شعر پیش کیا ہے۔ ”زین عالم شد او بہ بخشش و  
مال۔ تیغ او زینت ممالک شد“ اس میں زین،  
شد، بہ بخشش، تیغ، زینت، شد، نظر دار الفاظ ہیں  
جن میں سے ہر ایک کے بعد ایک ایک بے نقط  
لفظ آیا ہے جیسے عالم، او، مال، او، ممالک۔
- ۲۳۲۔ ایضاً ص ۸۰  
۲۳۳۔ ایضاً ص ۸۰  
۲۳۴۔ ایضاً ص ۱۱۰ یہاں بیدل نے ”مجموعہ رسائل“ کا  
لفظ استعمال کیا ہے۔ غلام حسن مجددی ”بیدل  
شناسی“ میں لکھتے ہیں: ”اس سے مراد تذکرۃ  
الاولیاء فرید الدین عطار کا انتخاب ہے اور شاہ  
صاحب کے حسب ہدایت اس نے اس کتاب کا  
ایک انتخاب تیار کیا تھا جس کے آخر میں ایک  
منظوم مقدمہ لکھا تھا لیکن راقم السطور کے خیال  
میں اس بات کے لئے کہ وہ تذکرۃ الاولیاء کا ایک
- انتخاب تھا چارغضر میں کوئی اشارہ نہیں پایا  
جاتا ہے۔
- ۲۳۵۔ ایضاً ص ۴۱۱  
۲۳۶۔ ایضاً ص ۴۱۱  
۲۳۷۔ ایضاً ص ۴۱۴  
۲۳۸۔ ایضاً ص ۴۱۴  
۲۳۹۔ ایضاً ص ۴۱۴  
۲۴۰۔ ایضاً ص ۴۳۶  
۲۴۱۔ ایضاً ص ۴۳۶  
۲۴۲۔ ایضاً ص ۴۸۳  
۲۴۳۔ کلیات بیدل ج ۲ ص ۱۲۷ مطبوعہ کابل  
۲۴۴۔ Life & Works of Abdul Qadir P. 30  
۲۴۵۔ قال عبور با قاصدہ شہر دہلی افتاد  
۲۴۵۔ چارغضر  
۲۴۶۔ ایضاً  
۲۴۷۔ سید محمد بن عبدالحلیم نے اپنے روزنامہ ”تبصرۃ  
الناظرین“ میں بیدل کے حالات کے ضمن  
میں لکھا ہے کہ ایک دن ان کی مجلس میں رانی نام  
کے ایک ہندو نے ایک کہنا سنائی۔ میں نے اس  
سے کہا کہ بزرگوں کی محفل میں ایسی کہنا نہیں  
سنانا چاہئے جس کا مضمون مبتذل ہو۔ اس نے  
کہا اگر تم بہتر سنا سکتے ہو تو لاؤ اس نے پڑھا۔  
بیدل نے پوچھا ”میں ہندی سے واقف نہیں  
ہوں مجھے سمجھا دو۔ اس واقعہ سے ظاہر ہے بیدل  
اس زبان سے آشنا نہ تھے۔ اس میں شعر کہنا تو  
دور کی بات رہی۔
- ۲۴۸۔ کلیات بیدل مطبوعہ کابل ج ۳ ص ۱۹۹  
۲۴۹۔ مجلہ ندیم گیا بہار نمبر ۱۹۴۰ء (بہار اور اردو از حمید  
عظیم آبادی)

- ۲۵۰۔ سفینہ خوشگودفر ثالث ص ۱۰۹  
۲۵۱۔ ہندوستان اس زمانے میں دہلی اور اس کے آس  
پاس کا علاقہ مقہر، اکبر آباد، وغیرہ کہا جاتا تھا  
جیسا کہ مقہر میں اپنے قیام کے دوران جب  
۱۰۹۶ھ میں بدائی پھیلی تو اس کے سلسلے میں  
بیدل کہتا ہے: ہر روز حاکی از دکن متعین می گردید  
تاہندوستان رسید افعال کہنگی می کشید (۵۵۶)  
(روزانہ دکن سے ایک حاکم متعین کر کے بھیجا  
جاتا تھا جب تک وہ ہندوستان کا پچھتا قدامت اور  
کہنگی کی ندامت اسے لاحق ہو جاتی۔)
- ۲۵۲۔ عالمگیر نامہ ص ۸۸۴  
۲۵۳۔ چارغضر نو لکھنؤ ص ۲۲۳  
۲۵۴۔ نوائے وطن از شاد عظیم آبادی ص ۶۷  
۲۵۵۔ بیدل شناسی ج ۱ ص ۲۷  
۲۵۶۔ کلیات بیدل مطبوعہ کابل ج ۱ ص ۱۴۱ (مثنوی  
محیط اعظم)
- ۲۵۷۔ چارغضر ۲۱-۴۲۰  
۲۵۸۔ ایضاً ص ۴۲۲  
۲۵۹۔ ایضاً ص ۴۲۳  
۲۶۰۔ ایضاً ص ۲۵-۴۲۳ شیخ اکرام لکھتے ہیں بیدل کی  
شاہ کاہلی سے ملاقات اوڑیسہ میں ہوئی جبکہ وہ  
جوانی کے دور سے گزر رہا تھا ”شعر العجم فی الہند  
ص ۱۳۰ جبکہ ان کو غلط فہمی ہوئی ہے۔
- ۲۶۱۔ ایضاً ص ۴۲۵  
۲۶۲۔ ایضاً ص ۲۸-۴۲۶  
۲۶۳۔ ایضاً ص ۳۳-۴۳۳  
۲۶۴۔ ایضاً ص ۴۳۴  
۲۶۵۔ ایضاً ص ۴۳۵  
۲۶۶۔ شعر العجم فی الہند از شیخ اکرام ص ۱۳۱
- ۲۶۷۔ فارسی ادب بہار اور رنگ زیب ص ۱۸۶  
۲۶۸۔ شام غربیاں ص ۵۳  
۲۶۹۔ چارغضر ص ۱۳۳  
۲۷۰۔ مفتاح التواریخ از سر ولیم ہیل ص ۲۸۷  
۲۷۱۔ چارغضر ص ۴۳۰  
۲۷۲۔ چارغضر ص ۱۴۷  
۲۷۳۔ ایضاً ص ۷۶  
۲۷۴۔ ایضاً ص ۸۲  
۲۷۵۔ واقعات عالمگیری، انگریزی ترجمہ از مولوی  
حاجی ظفر حسن ۱۹۴۵ء ص ۵۰۴  
۲۷۶۔ چارغضر ص ۸۲  
۲۷۷۔ چارغضر ص ۴۱۵  
۲۷۸۔ ایضاً ص ۴۱۷  
۲۷۹۔ ایضاً ص ۳۰۶  
۲۸۰۔ ایضاً ص ۴۲۹  
۲۸۱۔ شعر العجم فی الہند ص ۱۳۴  
۲۸۲۔ چارغضر ص ۴۲۹  
۲۸۳۔ بیدل از پروفیسر بنی ہادی ص ۴۶  
۲۸۴۔ چارغضر ص ۴۳۰  
۲۸۵۔ صحف ابراہیم ص ۱۴۳  
۲۸۶۔ تذکرہ الشعراء ہندی ص ۵۲  
۲۸۷۔ مرآۃ الخیال ص ۴۵۹  
۲۸۸۔ سفینہ خوشگودفر ص ۱۰۹  
۲۸۹۔ مجمع الانشاء ص ۲۸۰-۳۳۴-۱۸۵۰  
۲۹۰۔ مآثر عالمگیری ص ۸۰  
۲۹۱۔ ایضاً ص ۵۳۶  
۲۹۲۔ مرآۃ الخیال ص ۴۶۹، شہزادہ اعظم ۱۰۸۵ھ تک  
مختلف عہدوں پر فائز ہو کر دہلی میں ہی مقیم تھا اس  
کے بعد وہ درج ذیل ترقیب سے مختلف سالوں

- میں مختلف مقامات پر رہا ہے۔  
 ۱۰۸۶ھ، ناظم ملتان، آثار عالمگیری ص ۱۳۹  
 ۱۰۸۸ھ، صوبہ دار پٹنہ، آثار عالمگیری ص ۱۶۱  
 ۱۰۸۹ھ، صوبہ دار اوڑیسہ، آثار عالمگیری ص ۱۶۹  
 ۱۰۹۰ھ، صوبہ دار بنگالہ، آثار عالمگیری ص ۱۸۰  
 ۱۰۹۱ھ، صوبہ دار دکن مختاب اعظم شاہ آثار عالمگیری ص ۲۱۱  
 ۱۰۹۳ھ، ناظم بچاپور، ص ۲۱۹  
 ۱۱۰۲ھ، ناظم پنجاب، ص ۳۲۸  
 ۱۱۱۳ھ، صوبہ دار احمد آباد، ص ۴۳۲  
 ۱۱۱۹ھ، راج لال دل جنگ جانشینی میں مارا گیا۔  
 ۲۹۳- شام غربیاں ص ۵۴  
 ۲۹۴- چار عشر ص ۱۳۳  
 ۲۹۵- مفتاح التواریخ ص  
 ۲۹۶- غیاث اللغات مطبوعہ نو لکھنؤ ص ۱۳۱  
 ۲۹۷- فرہنگ ناظم الاطباع ص ۲۸۶  
 ۲۹۸- مجلہ اقبال، کراچی شمارہ ۶ بیدل کی شخصیت اور اس کا اسلوب از ذاکر عبدالغنی  
 ۲۹۹- چار عشر ص ۷۷  
 ۳۰۰- ایضاً ص ۷۷  
 ۳۰۱- سفینہ خوشگودنتر ثالث ص ۴۴  
 ۳۰۲- ایضاً ص ۱۰۹  
 ۳۰۳- تذکرہ حبیبی مخطوطہ خدا بخش ورق  
 ۳۰۴- آثار عالمگیری ص ۹۹، ۹۸  
 ۳۰۵- ریاض الوداد از ایزد بخش رضا مخطوطہ باکی پور ص ۹  
 ۳۰۶- ایضاً ص ۱۰  
 ۳۰۷- چار عشر ص ۱۵۰  
 ۳۰۸- کلیات بیدل مطبوعہ کابل ج ۲ ص ۱۳۵  
 ۳۰۹- آثار عالمگیری ص ۱۰۸  
 ۳۱۰- ریاض الوداد قلمی باکی پور ورق ۱۰  
 ۳۱۱- آثار عالمگیری - اس کی پوری تفصیلات حوالیات کے ساتھ حاشیہ نمبر ۲۹۲ پر دی گئی جائے  
 ۳۱۲- نشر عشق قلمی باکی پور ص ۳۱۲  
 ۳۱۳- سفینہ خوشگودنتر ص ۱۰۹  
 ۳۱۴- مرآۃ الخیال ص ۴۵۹  
 ۳۱۵- ایضاً ص ۴۵۹  
 ۳۱۶- بیدل شناسی ج ۱ ص ۳۵، ۳۴  
 ۳۱۷- مجلہ ادب کابل ش ۵ فارسی ادب بہ عہد اورنگ زیب ص ۱۸۸  
 ۳۱۸- شام غربیاں (بحوالہ مرآت واردات) ص  
 ۳۱۹- مرآۃ الخیال ص ۴۵۹  
 ۳۲۰- سفینہ خوشگودنتر ثالث ص ۱۰۹  
 ۳۲۱- خزانہ عامرہ ص ۱۵۶  
 ۳۲۲- شام غربیاں ص  
 ۳۲۳- صحف ابراہیم ص ۱۴۳  
 ۳۲۴- نشر عشق ص ۳۲۴  
 ۳۲۵- نوائے وطن ص ۶۹  
 ۳۲۶- آثار عالمگیری ص ۲۶  
 ۳۲۷- ایضاً ص ۷۵۱  
 ۳۲۸- ایضاً ص ۱۹۰  
 ۳۲۹- چار عشر مطبوعہ نو لکھنؤ ص ۱۶۶  
 ۳۳۰- کافی تلاش کے باوجود حقیق اللہ کے بابت معلوم نہ ہوسکا کہ کون تھا۔  
 ۳۳۱- چار عشر مطبوعہ نو لکھنؤ ص ۱۶۶  
 ۳۳۲- ایضاً ص ۱۶۶  
 ۳۳۳- سفینہ خوشگودنتر ثالث ص ۱۰۹  
 ۳۳۴- چار عشر (رقعات) ص ۱۶۶  
 ۳۳۵- چار عشر (رقعات) ص ۷۷  
 ۳۳۶- فارسی ادب بہ عہد اورنگ زیب ص ۳۱۶  
 ۳۳۷- چار عشر (رقعات) ص  
 ۳۳۸- یہاں بیدل کے وہ تمام خطوط جو مجمع الانشاء میں اعظم شاہ کے نام ہیں نقل کئے جاتے ہیں۔  
 ۳۳۹- غزلیات دیوان بیدل مطبوعہ تہران ص  
 ۳۴۰- تذکرہ نویسی فارسی در ہندو پاکستان ص ۲۵۰  
 ۳۴۱- مجلہ ادب کابل سال نوزدہم حوت شمارہ ۵۰ بخشی در احوال و آثار بیدل  
 ۳۴۲- فارسی ادب بہ عہد اورنگ زیب ص ۱۸۴  
 ۳۴۳- چار عشر (رقعات) ص ۱۳۱  
 ۳۴۴- مجلہ ادب کابل سال نوزدہم جوت ۱۳۵۰ شمارہ ۲۴ ص ۵  
 ۳۴۵- فارسی ادب بہ عہد اورنگ زیب ص ۱۸۵  
 ۳۴۶- چار عشر ص ۵۸۳  
 ۳۴۷- ایضاً ص ۵۸۳  
 ۳۴۸- ایضاً ص ۵۸۵  
 ۳۴۹- ایضاً ص ۵۸۵  
 ۳۵۰- ایضاً ص ۵۸۵  
 ۳۵۱- ایضاً ص ۵۸۵  
 ۳۵۲- ایضاً ص ۵۸۶  
 ۳۵۳- ایضاً مثنوی محیط اعظم دیوان بیدل  
 ۳۵۴- چار عشر ص ۵۸۷  
 ۳۵۵- دیوان بیدل ص ۴۱۰  
 ۳۵۶- چار عشر ص ۴۹۴  
 ۳۵۷- ایضاً ص ۴۹۴  
 ۳۵۸- ایضاً ص ۴۹۹  
 ۳۵۹- سفینہ خوشگودنتر ثالث ص ۱۱۲  
 ۳۶۰- چار عشر ص ۴۴۱  
 ۳۶۱- ایضاً ص ۴۴۲  
 ۳۶۲- چار عشر ص ۴۳۰  
 ۳۶۳- کلیات بیدل مطبوعہ کابل ج ۲ ص ۱۳۵  
 ۳۶۴- آثار عالمگیری ص ۲۱۹  
 ۳۶۵- سر و آرا مخطوطہ پٹنہ ورق ۱۳۹  
 ۳۶۶- چار عشر (رقعات) ص ۱۳۶  
 ۳۶۷- چار عشر (رقعات) ص ۷۹  
 ۳۶۸- ایضاً ص ۱۵۸  
 ۳۶۹- ایضاً ص ۱۶۶  
 ۳۷۰- ریاض الوداد قلمی باکی پور ورق ۱۰  
 ۳۷۱- چار عشر ص ۵۳۰  
 ۳۷۲- اورینٹل کالج میگزین فروری ۱۹۳۳ء مرزا بیدل کے تعلقات از یلین خان نیازی  
 ۳۷۳- مجلہ ادب کابل سال نوزدہم حوت ۱۳۵۰ شمارہ ۵  
 ۳۷۴- فارسی ادب بہ عہد اورنگ زیب ص ۱۷۴  
 ۳۷۵- آثار عالمگیری ص ۱۲۳  
 ۳۷۶- ریاض الوداد قلمی ورق ۱۰، اصل عبارت یوں ہے ”آخر شہر رمضان یا اول شوال با بنگالی سد“۔  
 ۳۷۷- چار عشر ص ۳۲۳  
 ۳۷۸- ایضاً ص ۵۳۰  
 ۳۷۹- ایضاً ص ۵۳۱  
 ۳۸۰- بیدل شناسی ج ۱ ص ۳۸  
 ۳۸۱- چار عشر ص ۳۲۳  
 ۳۸۲- ایضاً ص ۲۶، ۲۵  
 ۳۸۳- تفسیر شبیری ص ۳۵۶  
 ۳۸۴- چار عشر ص ۳۲۵  
 ۳۸۵- ایضاً ص ۳۲۶  
 ۳۸۶- سفینہ خوشگودنتر ثالث ص ۱۱۸  
 ۳۸۷- بیدل شناسی ج ۱ ص ۳۸

- ۳۸۸۔ چارغضر (رقعات) ص ۱۳۱  
۳۸۹۔ ایضاً ص ۱۳۱  
۳۹۰۔ ایضاً ص ۱۵۸  
۳۹۱۔ ایضاً ص ۱۵۸  
۳۹۲۔ ریاض الوداد قلمی ص ۳۶  
۳۹۳۔ ید بیضا ص ۱۰۵  
۳۹۴۔ ریاض الوداد ورق ۲ بحوالہ فارسی بجد اورنگ  
زیب ص ۳۹۶  
۳۹۵۔ ایضاً ورق ۲۸  
۳۹۶۔ مجلہ ادب کا بل ص ۱۳۵۰، شمارہ ۵ فارسی ادب  
بجد اورنگ زیب ص ۱۸۴  
۳۹۷۔ ایضاً  
۳۹۸۔ سفینہ خوشگودفر ص ۱۹۷  
۳۹۹۔ ایضاً ص ۴۴  
۴۰۰۔ مجلہ کا بل شمارہ ۶، ۵، سال ۱۳۵۰  
۴۰۱۔ کلیات بیدل مطبوعہ کا بل ج ۳ ص ۲۸۲  
۴۰۲۔ بیدل شناسی ج ۱ ص ۳۹  
۴۰۳۔ مقالات دینی و علمی حصہ دوم تالیف ڈاکٹر محمد شفیع  
ص ۲۹  
۴۰۴۔ بیدل شناسی ج ۱ ص ۴۰  
۴۰۵۔ آثار عالمگیری ص ۱۶۴  
۴۰۶۔ چارغضر ص ۵۳۴  
۴۰۷۔ ایضاً ص ۵۳۵  
۴۰۸۔ ایضاً ص ۵۳۷  
۴۰۹۔ ایضاً (رقعات) ص ۷۴  
۴۱۰۔ بیدل شناسی ج ۱ ص ۴۱  
۴۱۱۔ چارغضر (رقعات) ص ۱۳۳  
۴۱۲۔ ایضاً ص ۷۶  
۴۱۳۔ ایضاً ص ۱۳۲
- ۴۱۴۔ ایضاً ص ۱۳۲  
۴۱۵۔ ایضاً ص ۳۰۱  
۴۱۶۔ ایضاً ص ۱۳۹  
۴۱۷۔ ایضاً ۱۵۲ اسلام آباد مقرر اکا نام ہے ۱۰۸۰ھ/  
۱۶۶۹ء میں اورنگ کے حسب حکم ایک بڑا مندر  
جس کو زہنگ دیو بندیلانے وہاں تعمیر کیا  
تھا۔ منہدم کیا گیا۔ اس کی جگہ ایک عالی شان مسجد  
تعمیر کی گئی اسی تاریخ سے مقرر اکا نام اسلام آباد پڑا  
اور دفتر میں اسی نام کو رواج دیا گیا۔ مآثر  
عالمگیری ص ۹۷  
۴۱۸۔ ایضاً ص ۵۱  
۴۱۹۔ ایضاً ص ۵۷۱  
۴۲۱۔ ایضاً ص ۵۷۳  
۴۲۲۔ ایضاً ص ۵۷۸  
۴۲۳۔ تفسیر شیرازی ص  
۴۲۴۔ Life & Works Bedil  
۴۲۵۔ چارغضر (رقعات) ص ۱۵۲  
۴۲۶۔ Life & Works of Bedil  
۴۲۷۔ چارغضر ص ۱۵۲  
۴۲۸۔ ایضاً ص ۱۵۲  
۴۲۹۔ مآثر عالمگیری ص ۳۰۴  
۴۳۰۔ سفینہ خوشگودفر ثالث ص ۱۰۹  
۴۳۱۔ شام غریباں بحوالہ مرآت واردات ص ۵۳  
۴۳۲۔ چارغضر (رقعات) ص ۱۴۷  
۴۳۳۔ سفینہ خوشگودفر ص ۱۰۹  
۴۳۴۔ چارغضر (رقعات) ص ۹۹  
۴۳۵۔ ایضاً ص ۱۱۸  
۴۳۶۔ ایضاً ص ۱۰۵  
۴۳۷۔ ایضاً ص ۱۲۶
- ۴۳۸۔ ایضاً ص ۱۱۲  
۴۳۹۔ ایضاً ص ۱۱۲  
۴۴۰۔ ایضاً ص ۱۷۲  
۴۴۱۔ Life & Works of Abdul Qadir  
Bedil  
۴۴۲۔ فارسی ادب بجد اورنگ زیب ص ۲۱۳  
۴۴۳۔ طور معرفت بہ حوالہ بیدل شناسی ج ۲ ص ۳۱۲  
۴۴۴۔ چارغضر ص  
۴۴۵۔ ایضاً ص ۱۲۹  
۴۴۶۔ سفینہ خوشگودفر ثالث ص ۱۱۲  
۴۴۷۔ تمبرۃ الناظرین قلمی ص ۲۵۶  
۴۴۸۔ بحوالہ بیدل شناسی ج ۱ ص ۵۸  
۴۴۹۔ فارسی ادب بجد اورنگ زیب ص ۴۱۶  
۴۵۰۔ ایضاً ص ۱۸۸  
۴۵۱۔ چارغضر ص ۵۵۲  
۴۵۲۔ مجمع الانباء محمد امین عرفان ص ۷۰  
۴۵۳۔ چارغضر ص ۵۵۲  
۴۵۴۔ محیط اعظم اعظم مشمول کلیات بیدل مطبوعہ کا بل  
ص ۱۴۱  
۴۵۵۔ چارغضر (رقعات) ص ۱۱۲  
۴۵۶۔ کلیات بیدل مطبوعہ کا بل ج ۲ ص ۱۳۰  
۴۵۷۔ ایضاً ص ۱۳۰  
۴۵۸۔ کلیات بیدل مطبوعہ کا بل ج ۲ ص ۱۰۶  
۴۵۹۔ بیدل شناسی ج ۱ ص ۲۴  
۴۶۰۔ چارغضر (رقعات) ص ۵۵۰  
۴۶۱۔ چارغضر (رقعات) ص ۱۱۲  
۴۶۲۔ سفینہ خوشگودفر ص ۱۱۵  
۴۶۳۔ کلیات بیدل مطبوعہ کا بل ج ۲ ص ۱۳۳  
۴۶۴۔ چارغضر (رقعات) ص ۱۸۷
- ۴۶۵۔ سفینہ خوشگودفر ثالث ص ۱۱۵  
۴۶۶۔ چارغضر (رقعات) ص ۱۸۵  
۴۶۷۔ ایضاً ص ۱۸۷  
۴۶۸۔ ایضاً ص ۱۸۱  
۴۶۹۔ ایضاً ص ۱۹۵  
۴۷۰۔ ایضاً ص ۱۹۸  
۴۷۱۔ ایضاً ص ۱۸۹  
۴۷۲۔ کلیات بیدل مطبوعہ کا بل ج ۲ ص ۱۱۸  
۴۷۳۔ چارغضر (رقعات) ص ۱۹۴  
۴۷۴۔ بیدل شناسی ج ۱ ص ۷۰  
۴۷۵۔ کلیات بیدل مطبوعہ کا بل ج ۲ ص ۱۵۶  
۴۷۶۔ سفینہ خوشگودفر ص ۱۱۴  
۴۷۷۔ نوئے وطن ص ۶۷  
۴۷۸۔ کلیات بیدل مطبوعہ کا بل ج ۲ ص ۱۵۶  
۴۷۹۔ کلیات بیدل مطبوعہ صفدری بمبئی (دیپاچہ)  
ص ۵  
۴۸۰۔ کلیات بیدل مطبوعہ کا بل ج ۲ ص ۱۵۴  
۴۸۱۔ سرو آواز ص ۱۴۵  
۴۸۲۔ خزانہ عامرہ ص ۱۵۶  
۴۸۳۔ مجمع النفائس خطی باکی پور ص ۶۵  
۴۸۴۔ سفینہ خوشگودفر ص ۱۱۴  
۴۸۰۔ ایضاً ص ۱۳  
۴۸۶۔ مآثر عالمگیری ص ۲۶، ۳۷، ۴۷، ۸۲، ۱۸۳  
۴۸۷۔ ۱۹۵، ۱۷۶  
۴۸۷۔ سفینہ خوشگودفر ص ۱۳۰  
۴۸۸۔ ایضاً ص ۱۳  
۴۸۹۔ چارغضر (رقعات) ص ۷۴  
۴۹۰۔ ایضاً ص ۸۲  
۴۹۱۔ ایضاً ص ۱۳۳

- ۳۹۲۔ فارسی ادب، بچہ اور نگ زیب ص ۹۷  
۳۹۳۔ کلیات بیدل مطبوعہ کابل ج ۲ ص ۱۳۱  
۳۹۴۔ فارسی ادب، بچہ اور نگ زیب ص ۹۷  
۳۹۵۔ سفینہ خوشگوش ۱۳  
۳۹۶۔ چارغضر (رقعات) ص ۱۵۴  
۳۹۷۔ ایضاً ص ۱۳۳  
۳۹۸۔ ایضاً ص ۱۳۳  
۳۹۹۔ ایضاً ص ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۰۳  
۵۰۰۔ کلیات بیدل مطبوعہ کابل ج ۲ ص ۱۵۲  
۵۰۱۔ مرآۃ الخیال ص ۳۹۹، ۴۰۱  
۵۰۲۔ فارسی ادب، بچہ اور نگ زیب ص ۳۱۸، ۳۱۷  
۵۰۳۔ صحائف شریف ورق ۹۳  
۵۰۴۔ سروآزاد ص ۱۵۳  
۵۰۵۔ مآثر عالمگیری ص ۲۰۹، ۲۱۲، ۲۲۲، ۲۰۳  
۵۰۶۔ چارغضر (رقعات) ص ۱۶۳، ۷۹  
۵۰۷۔ سروآزاد ص ۱۵۳  
۵۰۸۔ بحوالہ مسلم شعرائے بہار ص ۱۷۰  
۵۰۹۔ سروآزاد ص ۱۵۳  
۵۱۰۔ چارغضر (رقعات) ص ۱۳۶  
۵۱۱۔ بیدل شانی ج ۲ ص ۵۳۱  
۵۱۲۔ چارغضر (رقعات) ص ۱۳۲  
۵۱۳۔ ایضاً ص ۹۴  
۵۱۴۔ ایضاً ص ۱۱۴  
۵۱۵۔ ایضاً ص ۷۹  
۵۱۶۔ ایضاً ص ۱  
۵۱۷۔ ایضاً ص ۸۰  
۵۱۸۔ ایضاً ص ۱۵۳  
۵۱۹۔ ایضاً ص ۱۶۹  
۵۲۰۔ کلیات بیدل مطبوعہ کابل ج ۲ ص ۱۳۳، ۱۳۸، ۱۳۹
- ۵۲۱۔ چارغضر (رقعات) ۱۵۴  
۵۲۲۔ ایضاً ص ۱۵۵  
۵۲۳۔ ایضاً ص ۱۵۵  
۵۲۴۔ ایضاً ص ۱۳۲  
۵۲۵۔ ایضاً ص ۱۰۶  
۵۲۶۔ ایضاً ص ۸۹  
۵۲۷۔ ایضاً ص ۷۶  
۵۲۸۔ ایضاً ص ۹۷  
۵۲۹۔ ایضاً ص ۱۰۶  
۵۳۰۔ ایضاً ص ۹۶  
۵۳۱۔ ایضاً ص ۹۸، ۱۰۰، ۱۱۸، ۱۳۸  
۵۳۲۔ ایضاً ص ۱۳۲، ۱۵۱، ۱۶۷، ۱۷۱، ۱۷۹  
۵۳۳۔ ایضاً ص ۸۳، ۸۵، ۹۰، ۹۷، ۱۰۲، ۱۰۷، ۱۴۱  
۵۳۴۔ ایضاً ص ۱۶۱، ۱۶۳، ۱۷۵  
۵۳۵۔ ایضاً ص ۸۳  
۵۳۶۔ ایضاً ص ۱۱۷  
۵۳۷۔ ایضاً ص ۸۹  
۵۳۸۔ ایضاً ص ۱۰۳  
۵۳۹۔ ایضاً ص ۸۶  
۵۴۰۔ ایضاً ص ۹۵  
۵۴۱۔ ایضاً ص ۹۷  
۵۴۲۔ ایضاً ص ۱۴۵  
۵۴۳۔ ایضاً ص ۸۷  
۵۴۴۔ ایضاً ص ۱۰۴  
۵۴۵۔ ایضاً ص ۱۳۲  
۵۴۶۔ ایضاً ص ۱۳۲  
۵۴۷۔ ایضاً ص ۱۳۳  
۵۴۸۔ ایضاً ص ۱۱۷
- ۵۴۹۔ ایضاً ص ۱۳۴  
۵۵۰۔ ایضاً ص ۸۹  
۵۵۱۔ ایضاً ص ۱۱۰  
۵۵۲۔ ایضاً ص ۱۱۰  
۵۵۳۔ ایضاً ص ۱۴۷  
۵۵۴۔ ایضاً ص ۱۴۳  
۵۵۵۔ کلیات بیدل مطبوعہ کابل ج ۲ ص ۱۵۳  
۵۵۶۔ سروآزاد ص ۱۴۹  
۵۵۷۔ چارغضر (رقعات) ص ۱۴۴  
۵۵۸۔ ایضاً ص ۲۰۴  
۵۶۰۔ ایضاً ص ۱۷۰  
۵۶۱۔ ایضاً ص ۱۶۳  
۵۶۲۔ ایضاً ص ۱۶۴  
۵۶۳۔ ایضاً ص ۱۱۴  
۵۶۴۔ کلیات بیدل مطبوعہ کابل ج ۲ ص ۱۳۳  
۵۶۵۔ چارغضر (رقعات) ص ۱۸۵  
۵۶۶۔ ایضاً ص ۱۸۷  
۵۶۷۔ ایضاً ص ۱۹۵  
۵۶۸۔ ایضاً ص ۱۹۳  
۵۶۹۔ ایضاً ص ۲۰۸  
۵۷۰۔ ایضاً ص ۲۰۵  
۵۷۱۔ ایضاً ص ۱۹۶  
۵۷۲۔ ایضاً ص ۱۸۷  
۵۷۳۔ ایضاً ص ۲۰۲  
۵۷۴۔ مآثر عالمگیری ص ۳۱۴، ۳۱۵  
۵۷۵۔ چارغضر (رقعات) ص ۱۸۱، ۱۲۵  
۵۷۶۔ ایضاً ص ۱۸۱، ۱۷۸، ۱۲۵  
۵۷۷۔ ایضاً ص ۱۷۱  
۵۷۸۔ ایضاً ص ۲۰۰
- ۵۷۹۔ ایضاً ص ۲۰۰  
۵۸۰۔ ایضاً ص ۹۸  
۵۸۱۔ ایضاً ص ۱۰۶  
۵۸۲۔ ایضاً ص ۱۷۷  
۵۸۳۔ ایضاً ص  
۵۸۴۔ ایضاً ص ۱۵۹، ۱۸۱  
۵۸۵۔ ایضاً ص ۱۹۷  
۵۸۶۔ ایضاً ص ۱۸۸  
۵۸۷۔ ایضاً ص ۱۳۰، ۹۸، ۱۳۱  
۵۸۸۔ ایضاً ص ۱۰۶  
۵۸۹۔ ایضاً ص ۱۰۵  
۵۹۰۔ ایضاً ص ۱۸۹  
۵۹۱۔ فارسی ادب، بچہ اور نگ زیب ص ۷۲، ۷۱، ۳۷۱  
۵۹۲۔ چارغضر (رقعات) ص ۱۱۵  
۵۹۳۔ ایضاً ص ۱۳۰  
۵۹۴۔ ایضاً ص ۱۷۸  
۵۹۵۔ ایضاً ص ۸۱-۱۸۰  
۵۹۶۔ ایضاً ص ۱۰۱  
۵۹۷۔ ایضاً ص ۱۵۹  
۵۹۸۔ ایضاً ص ۸۴  
۵۹۹۔ ایضاً ص ۹۵  
۶۰۰۔ سفینہ خوشگوش ص ۵۸  
۶۰۱۔ ایضاً ص ۵۸  
۶۰۲۔ چارغضر (رقعات) ص ۱۶۵  
۶۰۳۔ ایضاً ص ۱۷۶  
۶۰۴۔ سفینہ خوشگوش ص ۵۸  
۶۰۵۔ چارغضر (رقعات) ص ۷۶  
۶۰۶۔ ایضاً ص ۱۸۴  
۶۰۸۔ ایضاً ص ۱۸۶







- ۲۰۔ سروآزاد ص ۱۵  
۲۱۔ سفینہ بنیہ خیر قلمی علی گڑھ ورق  
۲۲۔ ادبیات مغل ص ۵۷  
۲۳۔ تذکرہ نویسی فارسی در ہندوستان ص ۵۹  
الخیال ص ۱۸، ۱۳۳، ۱۵۶ تفصیل کے لئے دیکھئے  
فارسی ادب بہ عہد اورنگ زیب ص ۵۱۴  
۲۴۔ مجمع الانشاء ص ۱۵۷  
۲۵۔ ایضاً ص ۱۵۷  
۲۶۔ ایضاً  
۲۷۔ رقصات بیدل ص ۱۰۲  
۲۸۔ کلمات اشعراء ص ۱۹۵  
۲۹۔ رقصات بیدل ص ۱۲۷  
۳۰۔ ایضاً ص ۱۳۶  
۳۱۔ فارسی ادب بہ عہد اورنگ زیب ص ۴۱۸  
۳۲۔ رقصات بیدل نوکشتور ص ۱۱۴  
۳۳۔ ایضاً ص ۱۱۳  
۳۴۔ ایضاً ص ۹۱  
۳۵۔ ایضاً ص ۱۲۹  
۳۶۔ بیدل شناسی ج ۱ ص ۱۶  
۳۷۔ فارسی ادب بہ عہد اورنگ زیب ص ۴۱۲  
۳۸۔ رقصات بیدل ص ۱۸۶  
۳۹۔ آثار عالمگیری ص ۲۲۶  
۴۰۔ رقصات بیدل ص ۱۷۷  
۴۱۔ ایضاً ص ۱۸۹  
۴۲۔ شام غربیاں ص ۲۸۰  
۴۳۔ لغت نامہ دستخط اسے نقل  
۴۴۔ چہار عنصر مطبوعہ نوکشتور ص ۲۰۶  
۴۵۔ سفینہ خوشگوس ص ۱۱۵، ۵۳  
۴۶۔ تبصرۃ الناظرین قلمی در ذکر حالات ۱۱۳۸ھ
- ۴۷۔ بیدل شناسی ج ۱ ص ۶۸  
۴۸۔ سروآزاد ص ۲۶۱  
۴۹۔ صحائف شرایف قلمی ص ۳۳  
۵۰۔ مجمع النفاس قلمی ج ۱ ص ۱۵۹  
۵۱۔ سفینہ خوشگوس ۹  
۵۲۔ سفینہ خوشگو و فارسی ادب اورنگ زیب کے بعد  
مقالہ توحید عالم ص ۲۱۲  
۵۳۔ سفینہ خوشگوس ۱۱۳  
۵۴۔ آثار عالمگیری ص ۱۶۴  
۵۵۔ سفینہ خوشگوس ۳۷  
۵۶۔ ایضاً ص ۱۶۵  
۵۷۔ رقصات بیدل ص ۸۶  
۵۸۔ سفینہ خوشگوس ۲۳۳  
۵۹۔ رقصات بیدل ص ۱۱۹  
۶۰۔ فارسی ادب بہ عہد اورنگ زیب ص ۴۶۷  
۶۱۔ رقصات بیدل ص ۱۵۴  
۶۲۔ مخزن الغرائب قلمی ص ۱۱۲  
۶۳۔ تذکرۃ اشعراء ہندی ص ۵۲  
۶۴۔ مجمع النفاس قلمی باکی پور ص ۶۶  
۶۵۔ مرقع دہلی ص ۲۵  
۶۶۔ سفینہ خوشگوس ۳۳۱  
۶۷۔ معارف ج ۱ شمارہ ۳۳  
۶۸۔ مجمع النفاس قلمی ص ۸۸  
۶۹۔ سفینہ خوشگوس ۹۹  
۷۰۔ رقصات بیدل ۱۳۸  
۷۱۔ مقدمہ سفینہ خوشگو  
۷۲۔ سفینہ خوشگوس ۱۱۸  
۷۳۔ ایضاً ص ۱۱۲  
۷۴۔ تذکرہ نویسی فارسی در ہندوستان ص ۲۵۰

- ۷۵۔ سفینہ خوشگوس ۷۱  
۷۶۔ فارسی ادب بہ عہد اورنگ زیب ص ۳۸۸  
۷۷۔ رقصات بیدل ص ۱۳۸  
۷۸۔ تبصرۃ الناظرین قلمی ص ۲۵۶  
۷۹۔ ایضاً ص ۲۵۶  
۸۰۔ سفینہ خوشگوس ۹۹  
۸۱۔ بہارستان سخن (بحوالہ مسلم شعراء بہار ص ۱۷۱)  
۸۲۔ سفینہ خوشگوس ۵۴  
۸۳۔ ایضاً ص ۴۷  
۸۴۔ سفینہ خوشگوس ۱۶۷  
۸۵۔ مقالات اشعراء ص  
۸۶۔ سفینہ خوشگوس ۸۱  
۸۷۔ ایضاً ص ۸۷  
۸۸۔ باغ معانی قلمی ورق ۹۸  
۸۹۔ سفینہ خوشگوس ۲۶۵  
۹۰۔ باغ معانی ورق ۸۹  
۹۱۔ سفینہ خوشگوس ۲۶۵  
۹۲۔ باغ معانی قلمی ورق ۱۹۹  
۹۳۔ رقصات بیدل ص ۱۰۸  
۹۴۔ سفینہ خوشگوس ۲۷۰  
۹۵۔ خزائن عامرہ ص ۴۴  
۹۶۔ مجلہ نقوش لاہور شمارہ ۱۳۸ ص ۸۸۱  
۹۷۔ سفینہ خوشگوس ۲۷۶  
۹۸۔ ایضاً ص ۲۷۷  
۹۹۔ ایضاً ص ۲۱۳  
۱۰۰۔ ایضاً ص ۲۴۰  
۱۰۱۔ ایضاً ص ۲۴۷  
۱۰۲۔ باغ معانی قلمی ورق ۷  
۱۰۳۔ سفینہ خوشگوس ۲۸۱  
۱۰۴۔ رقصات بیدل ص ۱۱۶  
۱۰۵۔ سفینہ خوشگوس ۳۵۳  
۱۰۶۔ ایضاً ص ۳۳۸  
۱۰۷۔ ایضاً ص ۳۱۱  
۱۰۸۔ سفینہ خوشگوس ۱۶۹  
۱۰۹۔ ایضاً ص ۱۸۳  
۱۱۰۔ باغ معانی قلمی ورق  
۱۱۱۔ تبصرۃ الناظرین قلمی ۲۵۶  
۱۱۲۔ گلزار ابراہیم ص ۳۰  
۱۱۳۔ باغ معانی ورق  
۱۱۴۔ مجمع النفاس قلمی ور  
۱۱۵۔ رقصات بیدل ص ۱۵۴  
۱۱۶۔ فارسی ادب بہ عہد اورنگ زیب ص ۸۰  
۱۱۷۔ تذکرہ حسنی قلمی ص ۴۰  
۱۱۸۔ کلمات اشعراء ص ۷۴  
۱۱۹۔ سفینہ بنیہ خیر قلمی آزاد لاہوری ص  
۱۲۰۔ مخزن الغرائب قلمی ص ۱۱۲  
۱۲۱۔ سفینہ خوشگوس ۷۴  
۱۲۲۔ مخزن الغرائب قلمی باکی پور ج ۱ ص ۱۱۳  
۱۲۳۔ ایضاً ج ۱ ص ۱۱۳  
۱۲۴۔ تذکرہ حسین قلمی باکی پور ص ۳۲ تا ۳۱  
۱۲۵۔ بحوالہ فارسی ادب بہ عہد اورنگ زیب ص ۸۹، ۸۸  
(تذکرہ شیر خاں لودی ص ۲۵۸)  
۱۲۶۔ سفینہ خوشگوس ۷۴  
۱۲۷۔ کلمات اشعراء قلمی ص ۱۹  
۱۲۸۔ کلمات اشعراء قلمی ۲۹  
۱۲۹۔ مجمع النفاس ج ۱ ص  
۱۳۰۔ سفینہ خوشگوس ۵۹  
۱۳۱۔ فارسی ادب بہ عہد اورنگ زیب ص ۱۲۳

- ۸۳۲۔ آثار الامریہ ج ۲ ص ۶۸۹  
۸۳۳۔ فارسی ادب، بعد اورنگ زیب ص ۱۳۱  
۸۳۴۔ مجمع الفہام ج ۲ ص ۳۲۵  
۸۳۶۔ سفینہ خوشگوس ۱۱۲  
۸۳۷۔ چار عنصر ص ۴۹۳  
۸۳۸۔ سفینہ خوشگوس ۱۱۸  
۸۳۹۔ رقصات بیدل ص ۲۱۲  
۸۴۰۔ ایضاً ص ۹۱، مجمع الانشاء تالیف محمد امین عرفان  
میں یہ خط غالب خاں کے نام ہے  
۸۴۱۔ ایضاً ص ۱۵۱  
۸۴۲۔ ایضاً ص ۱۱۶  
۸۴۳۔ ایضاً ص ۱۶۰  
۸۴۴۔ ایضاً ص ۲۱۳  
۸۴۵۔ ایضاً ص ۲۱۵  
۸۴۶۔ کلیات بیدل کا بل ج ۲ ص ۱۲۸  
۸۴۷۔ ایضاً ص ۱۲۸  
۸۴۸۔ ایضاً ص ۱۲۸  
۸۴۹۔ ایضاً ص ۱۳۵  
۸۵۰۔ آثار عالمگیری ۲۵۲  
۸۵۱۔ کلیات بیدل کا بل ج ۲ ص ۱۲۶  
۸۵۲۔ چار عنصر (رقصات) ص ۹۸  
۸۵۳۔ ایضاً ص ۱۰۰  
۸۵۴۔ ایضاً ص ۱۳۶  
۸۵۵۔ ایضاً ص ۱۳۷  
۸۵۶۔ ایضاً ص  
۸۵۷۔ کلیات بیدل کا بل  
۸۵۸۔ آثار عالمگیری ص ۲۳۵  
۸۵۹۔ دیوان بیدل تہران ص ۴۷۵  
۸۶۰۔ بیدل شناسی ص ۶۸
- ۸۶۱۔ ایضاً ص ۶۸  
۸۶۲۔ ایضاً ص ۷۴  
۸۶۳۔ فارسی ادب، بعد اورنگ زیب ص ۱۵۶  
۸۶۴۔ بیدل شناسی ج ۲ ص ۷۴  
۸۶۵۔ مرآۃ الخیال ص ۴۵۹  
۸۶۶۔ رقصات بیدل ص ۹۸  
۸۶۷۔ سفینہ خوشگوس ۱۰۹  
۸۶۸۔ چار عنصر ص ۴۲۹  
۸۶۹۔ مثنوی عرفان (کلیات بیدل کا بل ج ۲ ص  
۸۷۰۔ چار عنصر ص ۷۷  
۸۷۱۔ ایضاً ص ۷۷  
۸۷۲۔ رقصات بیدل ص ۱۵۲  
۸۷۳۔ سفینہ خوشگوس ۱۱۳  
۸۷۴۔ رقصات بیدل ص ۱۹۶  
۸۷۵۔ سفینہ خوشگوس ۱۱۳  
۸۷۶۔ رقصات بیدل ص ۱۹۶  
۸۷۷۔ ایضاً ص ۱۹۶  
۸۷۸۔ کلیات بیدل مطبوعہ کا بل ج ۲ ص ۱۶۹  
۸۷۹۔ سفینہ خوشگوس ۱۱۲  
۸۸۰۔ کلیات بیدل کا بل ج ۲ ص ۱۶۹  
۸۸۱۔ سفینہ خوشگوس ۱۱۳، ۱۱۴  
۸۸۲۔ کلیات بیدل کا بل ج ۲ ص ۱  
۸۸۳۔ رقصات بیدل ص ۱۲۸  
۸۸۴۔ سفینہ خوشگوس ۱۲۱  
۸۸۵۔ مرقع دہلی ص ۱۰  
۸۸۶۔ مجموعہ نثر ج ۲ ص ۱۷۹  
۸۸۷۔ رقصات بیدل ص ۹۸  
۸۸۸۔ خزائن عامرہ ص  
۸۸۹۔ کلمات اشعار قلمی ص ۱۵
- ۸۹۰۔ مجمع الفہام قلمی ص ۶۵  
۸۹۱۔ رقصات بیدل ص ۱۶۷  
۸۹۲۔ چار عنصر ص ۵۵۰  
۸۹۳۔ ایضاً ص ۷۸  
۸۹۴۔ ایضاً ص ۴۹۲  
۸۹۵۔ دیوان بیدل ص ۱۷۳  
۸۹۶۔ مرآۃ الخیال ص ۲۵۸  
۸۹۷۔ کلمات اشعار ص ۶۵  
۸۹۸۔ سفینہ پنجر قلمی آزاد لائبریری  
۸۹۹۔ مرآت الخیال ص ۴۵۹  
۹۰۰۔ مرآۃ واردات بہ حوالہ شام غربیان ص ۵۵  
۹۰۱۔ مجمع الانشاء ص ۱۵۷  
۹۰۲۔ سفینہ خوشگوس ۱۱۲، ۱۱۱  
۹۰۳۔ رقصات بیدل ص ۱۱۸  
۹۰۴۔ ایضاً ص ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۶  
۹۰۵۔ سفینہ خوشگوس ۱۱۸  
۹۰۶۔ فہرست ربو  
۹۰۷۔ مجمع الفہام قلمی ص ۶۵  
۹۰۸۔ رقصات بیدل ص ۱۲۹  
۹۰۹۔ سفینہ خوشگوس ۱۱۸  
۹۱۰۔ مثنوی عرفان (کلیات بیدل کا بل ج ۳ ص ۲۰۰  
۹۱۱۔ مرقع دہلی ص ۱۰  
۹۱۲۔ رقصات بیدل ص ۱۸۹  
۹۱۳۔ سفینہ خوشگوس ۱۱۰  
۹۱۴۔ ایضاً ص ۱۱۱  
۹۱۵۔ ایضاً ص ۱۱۰  
۹۱۶۔ چار عنصر ص ۵۵۲  
۹۱۷۔ سفینہ خوشگوس ۱۱۰، ۱۱۱  
۹۱۸۔ اورنٹل کالج میگزین ماہ اگست ۱۹۳۲ء
- ۹۱۹۔ سفینہ خوشگوس ۱۱  
۹۲۰۔ مجلہ اقبال کراچی ج ۳، شمارہ ۶  
۹۲۱۔ چار عنصر ص ۵۷۷  
۹۲۲۔ سفینہ خوشگوس ۱۱۱  
۹۲۳۔ مخزن الغرائب قلمی ج ۱ ص ۱۱۳  
۹۲۴۔ سفینہ عشرت قلمی ص ۱۲۸  
۹۲۵۔ دیوان بیدل مطبوعہ تہران ص ۵۱۶  
۹۲۶۔ اورنٹل کالج میگزین اگست ۱۹۳۲ء  
۹۲۷۔ سفینہ خوشگوس ۱۰۹، ۱۱۰  
۹۲۸۔ چار عنصر ص ۳۳۸  
۹۲۹۔ چار عنصر (نکات) ص ۱۰  
۹۳۰۔ اورنٹل کالج میگزین اگست ۱۹۳۲ء  
۹۳۱۔ مجلہ اقبال کراچی (مرزا بیدل کی شخصیت اور ان  
کا اسلوب) ج ۶ شمارہ ۴  
۹۳۲۔ چار عنصر (رقصات) ص ۱۱۶  
۹۳۳۔ ایضاً ص ۲۱۳  
۹۳۴۔ سفینہ خوشگوس ۱۱۲  
۹۳۵۔ رقصات بیدل ص ۸۳، ۹۰، ۹۷، ۱۶۳  
۹۳۶۔ ایضاً ص ۱۰۷، ۱۰۲  
۹۳۷۔ ایضاً ص ۱۶۱  
۹۳۸۔ غیاث اللغات ص ۴۹۱  
۹۳۹۔ سفینہ خوشگوس ۱۱۲  
۹۴۰۔ چار عنصر ص ۵۵۰  
۹۴۱۔ چار عنصر (رقصات) ص ۸۵، ۱۶۱، ۱۷۵  
۹۴۲۔ تذکرہ حسینی ص  
۹۴۳۔ رقصات بیدل ص ۲۰۴، ۲۰۵  
۹۴۴۔ مفتاح التواریخ ص ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳  
۹۴۵۔ سرآزاد ص ۱۶۳  
۹۴۶۔ بیدل شناسی ج ۲ ص ۷۲

- ۹۴۷۔ سیدان شاہ گرس ۲۸  
۹۴۸۔ مفتاح التواضع ص ۳۰۵  
۹۴۹۔ سفینہ خوشکوس ۱۲۱  
۹۵۰۔ رفات بیدل ص ۲۰۹  
۹۵۱۔ ایضاً ص ۲۱۰  
۹۵۲۔ اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۳۲ء  
۹۵۳۔ نشر عشق ص ۳۱۳  
۹۵۴۔ بیدل شناسی ج ۱ ص ۸۱، ۸۲  
۹۵۵۔ سفینہ خوشکوس ۱۲۱  
۹۵۶۔ تبصرۃ الناظرین ص ۲۵۶، مرقع دہلی ص ۱۰  
۹۵۷۔ سفینہ خوشکوس ۱۲۲، ۱۲۳  
۹۵۸۔ ایضاً ص ۱۲۲  
۹۵۹۔ تبصرۃ الناظر قلمی ص ۲۵۶  
۹۶۰۔ نگار مئی ۱۹۵۹ء (آرامگاہ بیدل از ڈاکٹر عبدالغنی)  
۹۶۱۔ سروآزاد ص ۱۵۰
- ۹۶۲۔ نگار مئی ۱۹۵۹ء (آرامگاہ بیدل از ڈاکٹر عبدالغنی)  
۹۶۳۔ بیدل ص ۱۰۸ تا ۱۱۲  
۹۶۴۔ نقش پارسی درآبشار ہند ص ۱۲۰  
۹۶۵۔ نقد بیدل ص ۸۷  
۹۶۶۔ سفینہ خوشکوس ۱۲۲  
۹۶۷۔ دیوان بیدل مطبوعہ تہران ص ۵۱۰  
۹۶۸۔ سفینہ خوشکوس ۱۲۲، ۱۲۳  
۹۶۹۔ مجمع النفائس قلمی ص ۶۵  
۹۷۰۔ مجلہ نگار مئی ۱۹۵۹ء (آرامگاہ بیدل)  
۹۷۱۔ ایضاً  
۹۷۲۔ مرقع دہلی ص ۱۰۱، ۱۰۲  
۹۷۳۔ ایضاً ص ۱۰۲، ۱۰۳  
۹۷۴۔ ایضاً ص ۱۰۳  
۹۷۵۔ ایضاً ص ۱۰۹  
۹۷۶۔ مجلہ نگار مئی ۱۹۵۹ء (آرامگاہ بیدل)



## کتابیات

### تذکرے اور تواریخ

نام کتاب	مصنف، مولف، مترجم	سن تالیف	مطبوعہ یا مخطوطہ	تاریخ کتابت
مرآۃ الخیال	شیر خاں لودی	۱۱۰۰۲	مطبوعہ	
خزانہ عامرہ	میر غلام علی آزاد	۱۱۷۶	مطبوعہ فولکشور پریس	
تاریخ الافکار	قدرت اللہ گوپاموی	۱۲۵۷	مطبوعہ	
عقد ثریا	مصطفیٰ	۱۱۹۹	مطبوعہ	
مخزن الغرائب	شیخ احمد علی	۱۲۱۸	قلمی	
مجمع النفائس	سراج الدین علیچاں آرزو	۱۱۳۶	قلمی	قرن یزدہم
ریاض الشعراء	علی قلی خان والہ	۱۱۶۱	قلمی	
سروآزاد	میر غلام علی آزاد	۱۶۶	مطبوعہ لاہور	
تذکرہ فی نظیر	میر عبدالوہاب افتخار	۱۱۷۲	مطبوعہ	
نشر عشق	آقا حسین خان عظیم آبادی	۱۲۳۳	قلمی	
تبصرۃ الناظرین	سید محمد بن میر عبدالجلیل		قلمی	۱۳۱۵ کاتب ولایت حسین
مرقع دہلی	درگاہ قلی خان		مطبوعہ	
صحف ابراہیم	علی ابراہیم خان خلیل	۱۲۰۸	قلمی	
ہمیشہ بہار	کشن چندا خلاص	۱۲۳۶	قلمی	
تذکرہ حسینی	میر حسین دوست	۱۱۶۲	قلمی	
سفینہ عشرت	درگاہ داس عشرت	۱۱۷۵	قلمی	
اویماق مغل	میرزا محمد عبدالقادر خان	۱۱۹	مطبوعہ امرتسر	
گل رعنا	بچھی نرائن شفیق	۱۱۸۱-۸۲ھ	قلمی	
خلاصۃ الکلام	علی ابراہیم خان خلیل	۱۱۸۷-۹۸	قلمی	
تذکرۃ طاہر نصر آبادی	طاہر نصر آبادی	۱۰۸۳	قلمی	

تذکرۃ الشعراء ہندی	سید میر تقی میر	قلمی	تاریخ جدید صوبہ اڑیسہ بہار سید اولاد حیدر بلگرامی	مطبوعہ
سفینہ سبب خبر	قدرت اللہ قاسم	قلمی	جلوہ خضر ج ۱	مطبوعہ نورالانوار آراء
سفینہ ہندی، تذکرۃ شعراء فارسی بھگوان داس بناری	عظمت اللہ بختیگر	۱۱۴۱	نوامی وطن	مطبوعہ
کلمات الشعراء	محمد افضل سرخوش	۱۲۱۹	حیات فریاد	مطبوعہ
مفتاح التوارخ	طامس ولیم بیل	۱۲۶۴	بہار میں اردو زبان و	مطبوعہ
ریاض العارفین	رضا قلی بدایت	۱۲۶۰	ادب کا ارتقا	
شیخ انجم	سید محمد صدیق حسن خان	۱۲۹۳	شاہکار ہای شرف فارسی	مطبوعہ کا لون معرفت تہران
سفینہ خوشگو دفتر ثالث	بندرا بن داس خوشگو	۱۱۳۷-۴۷	سبک شناسی ج ۳	مطبوعہ تہران
شعرالحم فی الہند	شیخ اکرام اللہ		فارسی ادب بجد اور نگ زیب	مطبوعہ دہلی
ید بیضا	میر غلام علی آزاد	۱۱۴۸	فرہنگ ادبیات فارسی دری	مطبوعہ بنیاد فرہنگ
تذکرہ نویس فارسی در ہندو	دکتر سید علی رضا نقوی		در کتب استاد	مطبوعہ تہران
پاکستان			نقش پاری در اجار ہند	مطبوعہ تہران
تذکرۃ الشعراء	محمد عبدالغنی خان	۱۳۲۸	Jan Rypka History of Iranian Literature	
زینۃ الخواطر	مولانا سید عبداللہ		By Dr. Abdul Ghani Life & Works of	
عمدہ منتخبہ	نواب اعظم الدولہ میر محمد	۱۲۱۹	Abdul Qadir Bedil	
تذکرہ مسلم شعرائی بہار ج ۱	حکیم سید احمد اللہ ندوی		روح بیدل	مطبوعہ لاہور
واقعات عالمگیری	عاقل خان رازی		کلیات و دواوین و رقعات	
وفیات الشعراء	میر تقی میر		کلیات بیدل ۴ چار	مطبوعہ کابل
نکات الشعراء	لا معلوم		کلیات بیدل یک جلد	مطبوعہ ولکھنؤ
تذکرۃ الکتاب المصنفین	محمد ساقی مستعد خان		کلیات بیدل	مطبوعہ صفدر جہتی
آثار عالمگیری	محمد کاظم ابن محمد امین		کلیات بیدل	قلمی
عالمگیر نامہ	حسین فریور		رباعیات بیدل	قلمی
تاریخ ادبیات ایران و			رباعیات بیدل	قلمی
تاریخ شعرا			چهار عنصر	قلمی
تاریخ ادبیات ایران	ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا		ریاض الوداد	قلمی
سرخ سخن	دکتر ذبیح اللہ صفا		کلمات طہیات	قلمی
سیدان بادشاہ گر	دکتر سید صفدر حسین		دیوان بیدل	مطبوعہ تہران





# Rampur Raza Library Publications Series

© Rampur Raza Library, 2009

All rights reserved. No part of this book may be reprinted or reproduced or utilized in any form or by any electronic, mechanical or other means, now known or hereafter invented, including photocopying and recording, or in any information storage or retrieval system, without prior permission of the publisher, except as brief quotation for academic purpose.

## About the Book:

Name of the Book : **Mirza Abdul Qadir Bedil: Hayat Aur Karname**  
(Life and Works) (Vol-I [Hayat])

Name of Author : **Dr. Syed Ahsanuz Zafar**

Published by : **Prof. Shah Abdus Salam**  
O.S.D. Rampur Raza Library  
Rampur

First Edition : 2009

Printed by : **Diamond Printers, New Delhi**  
9811126868

Pages : 504

Price : Rs.500/-

## Rampur Raza Library

Hamid Manzil,  
Rampur - 244 901

Phone Library : 0595-2325045, 2327244

0595-2325346

Fax : 0595- 2340546

Website : [www.razalibrary.com](http://www.razalibrary.com)

E-mail : [osdrampurrazalibrary@gmail.com](mailto:osdrampurrazalibrary@gmail.com)

بیدل کی ایک جمالیات علامت	دکتر عبدالغنی	نگار
میرزا بیدل کے تخلیقات	نیازی لیلیں	اورینٹل کالج میگزین
راما این بیدل	قاضی عبدالودود	معاصر پبلشر
بجٹی در احوال و آثار	پروفیسر میر حسن شاہ مترجم	ادب کامل
میرزا عبدالقادر بیدل		
عجلی عرفان و تصوف در ادب پارسی	دکتر سید جعفر سجادی	ہندو مردم
شعر چیست	عبدالعظیم یمنی	ارمغان
یک تحقیق علمی در بارہ رویا	کالون ایس. ہال	نخن
انواع و سبک های ادبی	پرویز نائل خاٹری	نخن
زبان فصیح	پرویز نائل خاٹری	۲۴
زبان و ادب فارسی	جعفر محبوب	یغما
طبیعت در نظر صائب	پرویز نائل خاٹری	نخن

۶۰۵

۱۳۲

۱۲۰۱

۳

۵

۲

۵

۲۵

بہشت

\*\*\*

# **MIRZA ABDUL QADIR BEDIL**

## **HAYAT AUR KARNAME**

(Life and Works)

(A comprehensive and reliable study of life  
and works of Mirza Abdul Qadir Bedil,  
The greatest exponent of Indian style of  
Persian poetry, based on latest researches)

Vol-I

(Hayat)

**Dr. Syed Ahsanuz Zafar**

Ex Reader Deptt of Persian  
Lucknow University, Lucknow

**Rampur Raza Library**

Rampur (U.P.) 244 901